# آج

۵۳

ونود کمار شکل

وینڈل اسٹیونسن

ژاں پال سارتر

سودیش دیپک

نوم چومسکی

ترتیب

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

# آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ ۵۳

مئی ۲۰۰۶ء

سالانہ خریداری:

پاکستان: ایک سال (چار شمارے) ۳۰۰ روپے (بشمول ڈاک خرچ)

ہندستان: ایک سال (چار شمارے) ۲۴۰ روپے (بشمول ڈاک خرچ)

بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) ۳۰ امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)


رابطہ:

پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

فون: 5213916 5650623

ای میل: ajmalkamal@gmail.com, aajquarterly@gmail.com

ہندستان:

C/o Dr/ Ather Farouqui, First Floor,

80, Sukhdev Vihar, New Delhi 110 025

دیگر ممالک:

Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,

Ontario M1V 3G1, Canada.

Phone: (416) 292 4391Fax: (416) 292 7374

E-mail: bbakht@rogers.com


Scanned with CamScanner

مشفق خواجہ

کی یاد میں

Scanned with CamScanner

# ترتیب


وِنود کمار شکل

نوکر کی قمیض

(ناول)

❋

وینڈل اسٹیونسن

۲۴۹

مقدس جنگ کا قیدی

❋

ژاں پال سارتر

۲۸۵

دیوار


Scanned with CamScanner

❁

سودیش دیپک

۳۰۹

کورٹ مارشل

❁

نوم چومسکی

۳۳۹

ناکام ریاستیں: ایک گفتگو

Scanned with CamScanner

## نئی کتابیں

**On the Outside**
Poems by Zeeshan Sahil
Translation by Tehmina Ahmed
Rs.150

**انیس**

(سوانح)

نیر مسعود

Rs.375

**مرثیہ خوانی کا فن**

نیر مسعود

Rs.150

**جوئندہ یابندہ**

حیات، کمیونزم اور سب کچھ

رالف رسل

انگریزی سے ترجمہ: ارجمند آرا

Rs.295

Scanned with CamScanner

ونود کمار شُکل

کا مکمل ناول

# نوکر کی قمیض

ہندی سے ترجمہ:

عامر انصاری، اجمل کمال

Scanned with CamScanner

آئندہ صفحات میں ونود کمار شکل کے ہندی ناول ’’نوکر کی قمیض‘‘ کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ونود کمار شکل کو ہندی کے نہایت منفرد اور صاحب اسلوب فکشن نگاروں اور شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ ہندوستانی ریاست چھتیس گڑھ کے راج نند گاؤں میں ۱۹۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ ’’لگ بھگ جے ہند‘‘ ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا، اور دوسرا ’’وہ آدمی چلا گیا نیا گرم کوٹ پہن کر وچار کی طرح‘‘ ۱۹۸۱ء میں۔ ۱۹۸۸ء میں ان کی کہانیوں کا مجموعہ ’’پیڑ پر کمرہ‘‘ کے عنوان سے چھپا۔ ناول ’’نوکر کی قمیض‘‘ ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا، اور ایک اور ناول ’’دیوار میں ایک کھڑکی رہتی تھی‘‘ ۱۹۹۸ء میں۔

اسد زیدی کے الفاظ میں، ونود کمار شکل کو ان کے باریک بیں مشاہدے اور کان کنوں کے سے عزم کی خصوصیات کی بنا پر اور ہندوستانی قصبوں میں رہنے والے متوسط طبقے کے لوگوں کی روزمرہ زندگی کی مابعد الطبیعیات کے نرم خو شارح کی حیثیت سے ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ ان کی آواز ان کی اپنی ہے، اور ان کی نثر ایک منفرد آہنگ رکھتی ہے۔

اس ناول کے انوکھے پن کا احساس اسے شروع کرتے ہی ہو جاتا ہے۔ اس انوکھے پن میں ناول کی مخصوص بیانیہ نثر، تفصیلات کا انتخاب اور راوی/مرکزی کردار کے خیالوں کی رو کے ماجرا میں خوبصورتی اور ضبط کے ساتھ سموئے جانے کی خصوصیت شامل ہیں۔ اس نسبتاً نامانوس بیانیے سے گزرتے ہوئے کہانی کے اجزا پڑھنے والے کے ذہن میں رفتہ رفتہ واضح ہوتے چلے جاتے ہیں اور ایک مکمل تصویر بنانے لگتے ہیں۔

ترجمے کے دوران متعدد مقامی الفاظ اور اصطلاحات کے معنی دریافت کرنے کے عمل میں ہندی کے نامور ادیبوں اسد زیدی اور اُدے پرکاش نے پرخلوص تعاون کیا جس کے لیے ان دونوں کا شکریہ واجب ہے۔

اس ناول کی بنیاد پر ہندوستان کے اتنے ہی منفرد اسلوب کے حامل ہدایت کار منی کول نے اسی عنوان سے فلم بنائی۔

Scanned with CamScanner

کتنا سُکھ تھا کہ ہر بار گھر لوٹ کر آنے کے لیے
میں بار بار گھر سے باہر نکلوں گا۔

اگر میں کسی کام سے باہر جاؤں تو یہ گھر سے خاص باہر نکلنا نہیں تھا، کیونکہ مجھے واپس لوٹ کر آنا ہوتا تھا۔ اور اس بات کی پوری کوشش کر کے کہ کام پورا ہو، یعنی پان کھا کر۔ گھر باہر جانے کے لیے اتنا نہیں ہوتا جتنا لوٹنے کے لیے ہوتا ہے۔ باہر جانے کے لیے دوسروں کے گھر جاتے ہیں، دوسرے یعنی واقف کار، یا جن سے کام ہو۔ جن کے یہاں اٹھنا بیٹھنا ہو، یا بازار باغیچے، دفتر، کارخانہ ہو۔ لوٹنے کے لیے اپنا خود کا گھر ضروری ہوتا ہے، چاہے کرائے کا ایک کمرہ ہو یا ایک کمرے میں کئی کرائے دار ہوں۔

میری بیوی کے لیے گھر باہر نکلنے کے لیے بہت کم تھا، اس لیے گھر لوٹنے کے لیے بھی کم تھا۔ جب بھی وہ باہر گئی، جلدی لوٹ آئی۔ اکیلے رہنے سے جاتے وقت گھر میں تالا لگانا ہوتا ہے، جو بیوی، باپ، ماں، بھائی، بہن یا ان میں سے کسی ایک کے رہنے سے نہیں کرنا پڑتا۔ نوکر کو گھر کی چابی کا گچھا نہیں دیا جاتا۔ اگر گھر چھوٹا ہے تو ایک چابی بھی نہیں دی جا سکتی ہے۔

گھر میں خاندان کے رہنے سے بڑا ہی سکھ تھا کہ دھڑ دھڑاتے ہوئے اندر جا کر چارپائی پر لیٹ گئے۔ یا زور کا پیشاب لگا ہو اور باہر آڑ والی صاف جگہ نہ ملی ہو تو گھر کے اندر آتے ہی سیدھے پیشاب کرنے کے بعد فرصت ہوتی ہے۔ نوکری میں ہونے سے گھر لوٹنے کا وقت شام کو دفتر بند ہونے کے بعد ہوتا تھا۔ جب بے کار تھا تب کبھی بھی آنا جانا ہوتا تھا۔ کوئی مقرر وقت نہیں تھا۔ چھٹی کے دن مجھے بار بار گھر سے باہر نکلنا پڑتا تھا۔ بنا کسی وجہ کے۔

صبح سے ہی میں نے طے کر لیا تھا کہ باہر جا کر بہت دیر بعد لوٹوں گا۔ جب میں نے کھنکھار کر تھوکا تو کف میں خون کے ریشے تھے۔ سردی پک گئی تھی۔ پاس میں اماں کھڑی تھیں۔ ناٹے قد کی، دبلی

Scanned with CamScanner

پتلی، منھ میں ایک بھی دانت نہیں، سفید بال بکھرے ہوئے، بالکل ماں کی طرح۔ باہر جاتے جاتے دھیرے سے میں نے اماں سے کہا، ''اماں، میرے منھ سے خون نکلا ہے۔'' یہ کہتے وقت میری آواز میں بہت کمزوری تھی۔ مثال کے طور پر ایک ایسے بیمار آدمی کی کمزوری جسے بستر سے سہارا دے کر اٹھایا جاتا ہے۔ کئی دنوں سے اسے بھوک نہیں لگی۔ چٹ پٹی سبزی کھانے کی اس کو بہت خواہش ہوتی ہے، پر سبزی کوئی بناتا نہیں۔ جو کچھ بھی وہ کھاتا ہے، الٹی ہو جاتی ہے۔ پانی پیتا ہے۔ کراہتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر کو پوری امید ہے کہ وہ بچ جائے گا۔ اس لیے گھر کے لوگ خوش ہیں، اور جتنی تکلیف بیمار کو ہے، اتنا دکھ ان لوگوں کو نہیں ہے۔ تب اس کی ماں اس کا ماتھا سہلاتی ہوئی کہتی ہے کہ گھبراؤ نہیں، ڈاکٹر نے کہا ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اسے پیاس لگتی ہے تو بیوی کٹوری میں دودھ لے کر آتی ہے۔ مجبوری میں تھوڑا دودھ پی لیتا ہے۔ تب اسے قے کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ اس سے ملنے کے لیے اس کے دفتر کے لوگ آتے ہیں۔ کمزوری میں وہ کسی سے بات نہیں کر سکتا۔ گلے تک چادر اوڑھے پڑا رہتا ہے۔ اس کے بجائے اس کی ماں یا بیوی ملنے والوں سے بات کرتی ہیں۔ لوگوں کے پوچھنے سے پہلے کہ کیسی طبیعت ہے، دونوں میں سے کوئی کہے گا کہ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ غصے میں وہ بیوی کو گالی دینا چاہتا ہے۔ ماں سے بات کرنا نہیں چاہتا۔ پر کمزوری کے باعث خاموش رہتا ہے۔ مرتا نہیں، تھک کر سو جاتا ہے۔

حقیقت میں میں بیمار نہیں تھا۔ اور نہ میرا مکان نرسنگ ہوم تھا۔ پر جس مکان میں میں رہنے آیا تھا اس کا مالک شہر کا ایک بڑا ڈاکٹر تھا۔ پچاس روپے مہینہ مکان کا کرایہ دیتا تھا جو مکان کو دیکھتے ہوئے آدھا تھا۔ اور ڈاکٹر کی سہولت مفت ملے گی، یہ میرے ذہن میں نہیں تھا۔

اماں نے تھوڑا جھک کر دیکھا۔ ''مجھے تو سمجھ میں آتا نہیں ہے۔ لگتا ہے پان کھایا تھا۔ بہو، تو دیکھ۔ خون ہے کیا؟'' پانی کی بالٹی لے جاتے ہوئے بیوی بالٹی وہیں چھوڑ کر ماں کے پاس آئی۔ مسکراتے ہوئے ماں سے کہا، ''رات کو دو پان لائے تھے، صبح پڑیا میں بندھا ایک پان بچا تھا۔ کف میں سپاری کے ٹکڑے ہیں۔''

''اس کو سردی تو ہے۔ کھنکھار کر جب تب تھوکتا رہتا ہے۔''

اماں ایک لوٹے میں پانی لے کر کف کو بہانے لگیں۔ تبھی بیوی نے بھری بالٹی لے کر انڈیل دی۔ باہر سے ہو کر پانچ منٹ میں میں گھر لوٹ آیا تھا۔ اتنی تھوڑی دیر میں آنا جانا ہی ہوا تھا۔ منظر

Scanned with CamScanner

بدلنے کے لیے پلک کا جھپک جانا ہی بہت ہوتا ہے۔ پانچ منٹ کے لیے باہر جانا، مطلب پانچ منٹ تک گھر کے منظر پر پردہ پڑا رہنا۔ میری غیر حاضری میں بیوی اور ماں کا کوئی اور ہی منظر رہتا ہوگا، کہ فرصت ملی، یا میری موجودگی میں ان کو کام کرنے میں اڑچن ہو رہی تھی۔

جب میں اندر آیا تو اماں کچھ چپ چاپ لگیں۔ بیوی کے ہاتھ میں ایک خالی بالٹی تھی۔ اماں نے مجھے سب سے پہلے لوٹا ہوا دیکھا تھا۔ اس طرح دیکھا تھا کہ میں اتنی جلدی کیسے آ گیا، یا مجھے کوئی سامان لینے لوٹنا پڑا ہے، یا میری عادت ہی ہے کہ گھر کے اندر اور سڑک کے بیچ میں صرف چہل قدمی کرتا ہوں۔ نوکری کے بعد پہلی بار اماں میرے پاس رہنے آئی تھیں۔

دوسری بار گھر سے نکلتے ہی ٹھاکر کی پان کی دکان کے سامنے مجھے سمپت دکھائی دیا۔ سمپت، میرا بچپن کا دوست۔ چیچک کے گہرے داغ، سانولے رنگ اور گول گول ناک والے چہرے کی مجھے عادت پڑ گئی تھی۔ کیا اس طرح کی لت پڑ جانا ہی دوستی تھی؟ بچپن میں جب میں اپنی بے ڈول ناک کا ذکر سنتا تھا تو دکھی ہو جاتا تھا۔ اپنی ناک کی عادت تو اپنے آپ پڑ جاتی ہے۔ دو ہاتھ ہوتے ہیں، پر ایسے کہاں کہ لٹکے ہوئے ہیں۔ ہاتھ میں ایک خالی ماچس کی ڈبیا بھی ہو تو اس کا بھی وزن ہوتا ہے، لیکن ہاتھ کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔ وزن تب ہوگا جب بائیں کٹے ہوئے ہاتھ کو داہنے ہاتھ سے اٹھایا جائے۔ چہرے میں دو کان ہیں اس کی یاد بہت دنوں تک نہیں رہتی۔ کان چہرے سے کہاں جائیں گے؟ اس طرح کی لاپروائی سماجی تحفظ کو ظاہر کرتی ہے۔ سب جگہ امن چین ہے، یہ معلوم ہوتا ہے۔

سمپت میرے شہر کا تھا۔ چوتھی ہندی تک ہم دونوں ساتھ ساتھ پڑھے تھے۔ اس کے بعد وہ فیل ہو گیا۔ جب میں نے بی اے پاس کیا تب اس نے دسویں پاس کی تھی۔ اس کے بعد ہم دونوں کی نوکری اسی شہر میں لگ گئی۔ وہ پوسٹ گریجویٹ کالج کی کیمسٹری کی تجربہ گاہ میں کام کرتا تھا۔ میرے گھر کے پاس اس کا گھر تھا۔

مجھے دیکھتے ہی سمپت خوش ہو گیا۔ ''پان کھاؤ گے؟''

''پان کی عادت مجھے نہیں ہے۔ بنا عادت کے پان کھاؤ تو تھوکنے سے لگتا ہے بیمار ہوں۔ خون نکلتا ہے،'' میں نے کہا۔

''سبزی خریدنے جا رہا ہوں،'' تھیلا دکھلاتے ہوئے اس نے کہا۔ میں خوش ہوا۔ سبزی لانا

ضروری تھا۔ ہفتے بھر سے بازار جانے کو جی نہیں چاہا تھا۔

''رکنا، گھر سے تھیلا لے کر آتا ہوں،'' کہتا ہوا میں گھر کی طرف پلٹا۔

جب میں گھر آیا تو مجھے بیوی کے ہاتھ میں بھری بالٹی پھر دکھائی دی۔ البتہ اماں چاول چن رہی تھیں۔ میں نے بیوی سے کہا، ''آج میں جب بھی گھر لوٹ کر آؤں گا، تم پانی کی بالٹی لیے ہوے ہی دکھو گی؟''

میں نے اماں سے کہا، ''اماں، تم کل شام کو بھی چاول چن رہی تھیں۔ آج بھی چن رہی ہو۔ اپنے گھر میں کیا بوروں چاول ہے؟ اور جو پانی بھرنے کے لیے پیتل کا ڈرم ہے، وہ ڈرم نہیں ہے پیتل کا کنواں ہے۔ اسی لیے تمھیں اس کو بھرنے کا شوق ہے؟''

بیوی نے کہا، ''بالٹی تو سسرال کی ہے۔''

میں چڑ گیا۔ بالٹی اس سے چھین کر میں نے نیچے رکھ دی تو بہت سا پانی چھلک کر نیچے بہہ گیا۔

''سب کا دماغ خراب ہے!'' ماں بڑبڑائیں۔

''اماں، روز مجھ سے سبزی لانے کے لیے کہا جاتا تھا۔ آج چھٹی کا دن ہے تو کوئی نہیں کہہ رہا ہے،'' میں نے کہا۔

''آدھے گھنٹے میں تو دو بار گھر آ گیا ہوگا۔ ڈیڑھ گھنٹے تک دھیرے دھیرے نل چلتا ہے۔ بورنگ کب کی خراب ہوگئی ہے۔ نل میں لائن سے بالٹی رکھو، باری لگاؤ، تب پانی ملتا ہے۔ نل بند ہونے میں ابھی وقت ہے، دو بالٹی پانی اور مل جائے گا۔ باہر جا کر پندرہ منٹ بعد پھر آؤ گے تب بھی تم کو بہو کے ہاتھ میں بالٹی دکھے گی۔ پر اس سے کیا ہوتا ہے۔ ایک ایک کام پورا نپٹانا پڑتا ہے۔ تب میں بھی چاول چنتے ہوے دِکھوں گی۔ ابھی جتنا چاول چنا گیا ہے، دو وقت میں ختم ہو جائے گا۔ تیری چھٹی رہتی ہے تو کوئی کام ٹھیک سے نہیں سہاتا۔ تیرا برتاؤ بہو کے ساتھ اچھا نہیں ہے،'' ماں بولیں۔

''سبزی لائی ہے یا نہیں، اکیلے میں ہی سبزی کھاتا ہوں؟'' میں نے اداس ہوتے ہوے کہا۔

''لائی تو ہے۔ میں سبزی نہیں کھاتی۔ بہو تیرا جھوٹا کھاتی ہے۔ تجھ سے بچ جائے گا تو کھائے گی۔ کتنی مہنگی سبزی ہے۔ تم کو سبزی اچھی لگتی ہے اس لیے بنانے کو جی کرتا ہے۔ نہیں تو کبھی نہ بنے۔''

بیوی تھیلا لے کر آئی تو اس سے تھیلا میں نے جھپٹ لیا۔ جب میں نے بیوی سے تھیلا چھینا تھا

تو وہ مسکرائی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ میں اس سے تھیلا جھپٹ کر ہی لوں گا۔

''کیا لانا ہے؟'' میں نے بیوی سے سکون سے پوچھا۔

جب میں پرسکون ہوتا تھا تو اسی آدمی کی طرح جس کی ایک شیر کی دیکھ ریکھ کرنے کی نوکری تھی۔ (گھوم پھر کر میرے خیال میں نوکری کا یہی مطلب تھا۔) ایک بار بھولے سے شیر کا پنجرہ کھلا رہ گیا۔ اس کی غلطی نہیں تھی۔ شیر کی نوکری کے ڈر سے اسے رات بھر نیند نہیں آتی تھی۔ جب اس کی بیوی کھانا لے کر آئی تو اس نے دیکھا کہ شیر کا پنجرہ کھلا ہوا ہے۔ وہ ڈر کر چیخی تو اس کی نیند کھلی۔ اس نے دیکھا کہ شیر کا پنجرہ کھلا ہوا ہے۔ شیر کھانا کھانے میں لگا تھا، جلدی سے اس نے پنجرے کو بند کیا اور اس کی جان بچ گئی۔ اسے لگتا تھا جس دن شیر کو کھانا ٹھیک وقت پر نہیں ملے گا، مالک کے ڈر سے وہ خود شیر کے پنجرے میں گھس جائے گا۔ شیر سے زیادہ وہ مالک سے ڈرتا تھا... گھر کے لیے سبزی لانا نوکری نہیں تھی۔ چونکہ میں نوکری کرتا تھا، اس لیے آج چھٹی کا دن تھا اور چھٹی کے دن مجھے گھر کے کچھ بقایا کام کرنے تھے۔

''ایک کلو آلو، دھنیا، مرچ، لہسن پاؤ بھر، بر بٹی[1] پاؤ بھر۔ یا جو جی چاہے،'' اماں نے کہا۔

''ناریل کا تیل بھی لے آنا،'' بیوی نے کہا۔

سبزی کے ساتھ ناریل کا تیل لانا مجھے کوئی الگ ہٹ کر کام لگا۔ لوگ سبزی بازار سے لوٹتے وقت کیسے صراف کی دکان میں گھس جاتے ہیں اور ایک سونے کی انگوٹھی خرید لیتے ہیں؟ سونے کی انگوٹھی خریدنے گھر کا نوکر کبھی نہیں جائے گا۔ سبزی خریدنے جا سکتا ہے۔ نوکر کو ایک حد تک نقصان کرنے دیا جا سکتا ہے۔ اس سے ایک دو روپے کھو جائیں، یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ پر دس بیس روپے وہ نہیں بچا سکتا۔ دفتر کے صاحب کے لیے مہنگو کتنا بھی ایماندار ہو، پر سو روپے کے لیے اس کی نیت ڈول سکتی تھی۔ یعنی ننانوے روپے تک وہ ایماندار تھا۔ نیت ڈولنے کی حد حیثیت کے مطابق طے ہوتی ہے۔ میری جیسی حیثیت والا، یعنی سنتو بابو، جس کی سال بھر سے زیادہ کی نوکری ہو گئی تھی اور قریب سال بھر شادی کو ہو گیا، وہ چار پانچ سو پر اپنی نیت خراب نہیں کرے گا۔

سبزی لاتے ہوئے پھل لائے جا سکتے تھے۔ پھل — جیسے جامن، سیتا پھل، امرود، کیلے وغیرہ۔ لیکن سبزی کے ساتھ ناریل کا تیل یا سگوی[2] کی جالی یا صراحی لانا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ یہ عام

---

[1] بر بٹی: پھلی والی ایک سبزی جو چھتیس گڑھ کے علاقے میں پائی جاتی ہے۔ [2] سگوی: مٹی کے تیل کا چولھا۔

بات تھی کہ کیالانا ہے کہنے کے بعد بات فوراً ختم ہونی چاہیے، نہیں تو ایک کے بعد ایک چیزیں جڑتی چلی جاتی تھیں، چاہے ان کے لیے پیسے ہوں یا نہ ہوں۔ ناریل کا تیل مجھے ایک نہ ایک دن ہر حال میں لانا تھا۔ 'بعد میں' یا 'پھر کبھی' کہہ کر خود کی گرہستی میں بھی زیادہ دیر تک کے لیے چھٹکارا نہیں پایا جا سکتا۔ میرا ایک نہ ایک دن ابھی، آج ہی ہو جائے گا یا پھر کل۔ زیادہ سے زیادہ پرسوں، بس۔ اپنی ضمانت پر بھی میں زیادہ دنوں تک چھوٹ نہیں سکتا تھا۔ اور بیوی بیوی کی ضمانت پر، ماں ماں کی ضمانت پر زیادہ دنوں تک بچ نہیں سکتی تھیں۔

تب بھی میں رکا رہا۔ اماں چاول چننے لگی تھیں۔ بیوی چنے ہوئے چاولوں کو ٹین کے ایک ڈبے میں بھر رہی تھی۔ میں ان لوگوں کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ سبزی والی بات ادھوری ختم ہو رہی ہے۔ اس کا نتیجہ میری مرضی کے مطابق نکلنا چاہیے، شاید یہ میرے ذہن میں ہو۔ لیکن میں کس طرح کا نتیجہ چاہتا تھا یہ مجھے خود نہیں معلوم تھا۔ اماں اور بیوی کو بھی نہیں۔ نہیں تو وہ دیر کیوں کرتیں۔ دونوں اپنے کام میں مصروف تھیں جیسے میں ان کے سامنے موجود نہیں ہوں۔ کبھی کبھی اردگرد میں اپنے کو نظرانداز کیا ہوا پا کر جیسے میں غائب ہو جاتا تھا۔ نظرانداز موجودگی ہونے سے آدمی کو ان دیکھا ہونے میں وقت نہیں لگتا۔ چاول کے دانے اٹھا کر چبانے لگا، تب بھی میں غائب تھا۔

بے خیالی میں پاس پڑے ہوئے گلاس کو لات لگی۔ ایک سائنسی حقیقت تھی کہ پیتل کے گلاس کو اٹھا کر لگنے سے جو آواز ہو گی وہی جھنجھناہٹ کی آواز ہوئی تھی۔ پر میں ایک ایسا جادوگر تھا جو دوسرے جادوگروں کے مقابلے میں ہار چکا تھا۔ اور دوسرے جادوگر نہ تو بیوی تھی اور نہ اماں۔ دوسرے جادوگر کون تھے، یہ میں نہیں جان پایا تھا۔ یہی ان کا سب سے بڑا جادو تھا کہ ایسی صورت حال میں میں میدان چھوڑ کر چلا جاؤں، صرف یہی ایک راستہ میرے پاس بچا تھا۔ بیوی یا ماں وہ لوگ نہیں تھے جن کی وجہ سے مجھے میدان چھوڑنا پڑ رہا تھا۔ اور میدان چھوڑ کر جاتا کیا گھر سے باہر نکلنا تھا؟ تب میں باہر سے بھی ہارا ہوا کیوں لوٹتا؟ میرا چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، سونا، سب میدان چھوڑنا تھا۔

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میدان چھوڑنے کی میری خواہش کبھی نہیں ہوئی۔ میں زیادہ دیر تک نہ تو گھر سے باہر رہ سکتا تھا اور نہ گھر کے اندر۔ پھر بھی میری ذہنی کیفیت ایسی تھی جس میں میں ابد تک گھر لوٹنا نہیں چاہتا تھا۔ پر جب بھی لوٹوں، بیوی کو اسی طرح بھری بالٹی لیے ہوئے، ماں کو چاول چنتے ہوئے پانا چاہتا

Scanned with CamScanner

تھا— یعنی ابد کے بعد بھی ہر چیز کو بالکل ابھی جیسا— اس گھر کو، گرے ہوے گلاس کو، لیکن کھپریلوں میں لگے مکڑی کے جالوں کو نہیں۔ اور اس مکھی کو بھی نہیں جو میری بیوی کے پیر پر بار بار آ کر بیٹھ رہی تھی۔ چاہتا تھا کہ ابد سے لوٹنے کے بعد دونوں خوش ملیں۔ بیوی کی آنکھ کے نیچے جو کالے دھبے ہیں، وہ نہ ہوں۔ گھر کی لپائی پتائی ہو جائے تو اور بھی اچھا ہے۔

میری ایک حد تھی کہ میری غیر حاضری میں میرا گھر کیسا لگتا ہوگا یہ میں کبھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے جب کوئی یہ کہتا کہ آنے والے بیس برسوں میں یہ ملک بہت خوشحال ہو جائے گا تب میں سوچتا تھا کہ خوشحالی بیس برسوں میں کیوں؟ بیس برسوں کے بعد بھی خوش حالی ہوگی، یہ کیسے کوئی کہہ سکتا تھا؟ خوشحالی ابھی ہو، اِسی وقت، میرے دیکھتے دیکھتے۔

سمپت کے باہر نہ ملنے کی مجھے توقع تھی۔ اسی لیے میں تھیلا لے کر نہیں آیا تھا۔ اب ابد تک گھر نہ لوٹنے کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے؟ میرے پاس یہ چھوٹا سا شہر بچا تھا، جسے میں آدھے گھنٹے میں پیدل پار کر سکتا تھا، جس میں دوستی کے لیے سمپت آس پاس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں تیزی سے ایک طرف چلنے لگا۔ وقت کاٹنے کے لیے تیزی سے چلنا بے وقوفی تھی۔ وقت کوئی دوری نہیں تھی جسے دھیرے چل کر بچایا جا سکتا، یا تیز چل کر جلدی بِتایا جا سکتا۔ یہ تو کدال چلتے بھی بیتتا تھا۔ بے کار ہوں تب بھی بیتتا۔ پھر بھی میں ایک فالتو آدمی دکھائی نہیں دینا چاہتا تھا۔ اسپتال، لال باغ، چاند ماری کو پار کرتے ہی میں شہر کے باہر آ گیا۔ اتنا فاصلہ آدھے گھنٹے میں طے ہو گیا۔ اب یہاں سے گھر لوٹنے کے لیے مجھے شہر لوٹنا ہوگا۔ بغیر شہر لوٹے باہر ہی باہر گورا بابا بوا اپنے گھر لوٹ سکتے تھے کیونکہ ان کا گھر شہر کی سرحد پر تھا۔ اپنے گھر سے ایک قدم باہر رکھتے ہی وہ شہر سے باہر ہو جاتے۔ گورا بابا بو مجھ سے تین چار سال ہی بڑے تھے۔ ان کا مکان الگ تھلگ ہونے کی وجہ سے میں ان کے گھر ابھی تک جا نہیں پایا تھا۔ آج وہ کیا کر رہے ہوں گے؟ اگر وہ بھی باہر گھومنے آئے ہوں گے تو وہ ایک ساتھ شہر اور گھر لوٹیں گے۔

میں پلیا کے اوپر بیٹھ گیا۔ میں تھکا نہیں تھا۔ کچھ دیر تک پلیا کے اوپر بیٹھنا، ابد میں سے کچھ منٹ بِتانا ہی تھا۔ اس سے زیادہ دیر بیٹھنا اپنے کو بالکل فالتو ظاہر کرنا تھا۔ سب فالتو ہے، اس کا احساس چوبیس گھنٹے ہوا کی طرح میرے پاس رہتا تھا، جس میں سانس لے کر میں باقاعدہ زندہ تھا۔ میں تیزی سے

لوٹ پڑا۔

اس سڑک سے آتے جاتے موتی تالاب ضرور دکھائی دے گا۔ موتی تالاب وہیں رہے گا، پر کبھی بائیں ہاتھ کی طرف ہوگا کبھی داہنے ہاتھ کی طرف۔ اس کا پاٹ اتنا اونچا تھا کہ سڑک سے اس کا پانی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پانی دیکھنے کے لیے پاٹ کے اوپر چڑھنا پڑتا۔ تالاب کے پانی کو دیکھنے کے بعد تالاب کی مچھلیاں دکھائی دے جائیں یہ ضروری نہیں۔ پر تالاب میں بہت سی مچھلیاں ہیں، یہ میں جانتا تھا اور ٹھیکے دار بھی۔ آنکھوں سے جو کچھ دیکھا جاتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ دنیا کا کام تجربے سے چلتا ہے۔ تجربے سے زیادہ اندازے سے، جس میں غلطیاں ہی غلطیاں ہوتی ہیں۔ اندازے ہی سے نہیں، ہوشیاری اور چالاکی سے بھی دنیا چلتی ہے جس میں غلطیوں کا امکان کم ہوتا ہے۔ اس میں خود کا نقصان کم، دوسروں کا نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ ہم لوگوں کی ساری تکلیف ان لوگوں کی ہوشیاری اور چالاکی کے باعث تھی جو بہت مزے میں تھے اور جن سے ہمارا تعارف نہیں تھا۔ ان سب کے بیچ زندگی کا مقصد ڈھونڈنا مشکل کام نہیں تھا۔

بزرگ اور بوڑھے آدمیوں کی کمی نہیں تھی۔ کسی کو چھانٹ کر پوچھا جائے، ''بابا! سیدھے سیدھے بتلا دیجیے، میری زندگی کا مطلب کیا ہے؟ مجھے کیا حاصل کرنا ہے؟ میں ابھی نوکر ہوں۔ میری عمر بائیس تیئیس برس کی ہے۔ ابھی بتا دیجیے۔ اس کے بعد میں آپ سے کچھ نہیں پوچھوں گا، میں سب کر لوں گا۔ مجھے بہت احساس ہے۔ بار بار آپ کو پریشان نہیں کروں گا۔'' اتفاق سے وہ بوڑھا شخص اگر باپ جی ہوا تو جواب کا انداز ہوگا، ''زیادہ لالچ نہیں کرنا چاہیے۔ قناعت کرنا سیکھو۔ جو تم سے بڑے ہیں، امیر ہیں، ان کی نقل مت کرو۔ جو تم سے غریب ہیں ان کو دیکھ کر قناعت کرو کہ تم کتنے سکھی ہو۔ تمھاری ساری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ جو حالت تمھاری ہے اس سے خراب نہ ہو۔ اس سے تمھاری زندگی میں سکون رہے گا۔ تمھیں اپنے کام کو ٹھیک کرنا ہے۔ دنیا کا کام آپ ٹھیک چلتا ہے۔ جیسے چل رہا ہے چلنے دو۔ اتنی ہی آگ اور لکڑی اکٹھا کرو جتنی کھانا بنانے کے لیے ضرورت ہے۔ دنیا میں آگ لگانے کی ماچس سات سمندر کے نیچے ہے، اور وہ بھیگ کر سینکڑوں برس پہلے خراب ہو چکی ہے۔ وہاں کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ دنیا کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ اگر تم اکیلے بدل جاؤ گے تو بری موت مرو گے۔ مجھے سکون سے مرنے دو، اور تم سب لوگ سکون سے مرو۔''

مجھ میں سمجھ کی کمی تھی۔ پھر بھی میں سمجھنے لگا تھا کہ تالاب سوکھا بھی ہوتا ہے، اور اس میں کم بیشی پانی بھی بھرا رہتا ہے۔ پانی ہونے سے اس میں کائی، لدّی، پتھر، لکڑی، مچھلی، مینڈک وغیرہ ضرور ہوں گے۔ مگر مچھ کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ ویل مچھلی سمندر میں پائی جاتی ہے۔ دھوبی تین بجے رات کو کپڑے دھونے تالاب چلے جاتے ہیں۔ بھیک مانگنے والے اور رئیس کوئی کام نہیں کرتے۔ دو سال پہلے پانی ٹھیک سے نہ برسنے سے کئی تالاب سوکھ گئے تھے۔ ''چھوٹے چھوٹے تالاب چاروں طرف بکھرے پڑے ہیں'' کہنے سے تالاب کا پانی نہیں بکھرتا۔ سب سے بڑا تالاب رانی تالاب ہے — زندگی کے بارے میں میری یہی سمجھ تھی، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

کسی دن پچاسیوں بار ایسا ہوتا تھا کہ بس دکھ ہی دکھ ہے۔ اُسی دن یا دوسرے دن کچھ ایسی باتیں بھی ہوتی تھیں جن سے دکھ نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی بہت خوشی کی بات ہوتی تھی۔ دکھ کو گھٹا کر محسوس کرنے کی طاقت مجھ میں نہیں تھی۔ میں ایسے ناپ کا گلاس بن گیا تھا کہ تھوڑی تکلیف میں بھی دکھ سے بھر جاتا تھا، اور زیادہ تکلیف میں بھی یہی ہوتا۔ ایسی عقلمندی نہیں تھی کہ ایک لکیر کو بغیر مٹائے چھوٹا کرنے کے لیے طریقہ ایک بڑی لکیر کھینچنے کا ہے۔ ایسی عقلمندی کس کام کی کہ ہر آنے والا دکھ پہلے سے بڑا ہوتا چلا جائے اور بیتے دکھ پر اطمینان ہو کہ بڑا نہیں تھا۔

شہر میں فرانسس نام کا ایک لڑکا تھا۔ کچھ سال پہلے ہی اس نے ہاکی کھیلنا شروع کیا تھا۔ محنت سے مشق کرتے ہوئے وہ شہر کی سطح کا اچھا کھلاڑی ہوا۔ پھر پردیس بھی ہاکی کھیلنے گیا۔ شہر میں سب سے پہلا ٹرانزسٹر ریڈیو وہی لایا تھا۔ اس کے باپ کو پہلے کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ پولیس بینڈ میں تھا۔ جیسے ہی وہ شہر کی سطح کا کھلاڑی ہوا، اس کے باپ کو سب جاننے لگے۔ بہت سے لوگ دکھ سہنے کی مشق بچپن سے کرتے ہیں۔ اس کی مشق کرنے کے لیے میدان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ گھر کے کسی کونے میں پڑے پڑے یا دن بھر کھٹتے ہوئے، پیٹ بھرنے کی کوشش میں مشق ہوتی رہتی ہے۔ میں دکھ سہنے کا شہر یا ضلعے کی سطح کا کھلاڑی نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس سے کبھی کسی کا باپ نہیں جانا جاتا۔ گھر پر ساری مشق اور صبر ٹوٹ جاتے تھے کیونکہ میں بیوی کو، ماں کو، بھائیوں کو، دوستوں کو، سب کو پیار کرتا تھا۔ میں دکھ کو ختم کرنے کی کوشش کے لیے اسٹیمنا چاہتا تھا۔ ایک اچھا فارم پانا چاہتا تھا۔ زندہ رہنا اور دکھ سہنا، دونوں کی شکل اتنی ملتی جلتی تھی جیسے جڑواں ہوں۔

Scanned with CamScanner

زمانے کے خاص خاص دروازے تجوری کی طرح مضبوط اور کانچ کی طرح شفاف تھے۔ انھی شیشوں سے اُس پار دیکھ کر مجھ میں سمجھ آئی تھی، عام سوجھ بوجھ بڑھی تھی۔ میں کبھی گھوڑے پر نہیں بیٹھا تھا لیکن خیالوں میں پرانا گھڑسوار تھا۔ کبھی ہوائی جہاز میں نہیں بیٹھا تھا لیکن ہوائی جہاز میں بیٹھنا کتابوں اور سینما میں اتنا عام ہوگیا تھا کہ ہوائی جہاز میں بیٹھنا مجھے معلوم تھا۔ دلی بمبئی یا بھوپال دلی یا ناگ پور دلی کا ہوائی کرایہ مجھے معلوم تھا۔ بمبئی کے اوبرائے کانٹی نینٹل کی سہولتیں مجھے معلوم تھیں۔ اخباروں اور اشتہاروں سے میں بہت سی چیزوں کو سیکھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایر ہوسٹس کی تصویروں سے مجھے معلوم تھا کہ وہ کیسی ہیں۔ بنا خرچ کے جدید ہونے کے لیے یہ ضروری ہے۔ یہی میں بیوی سے چاہتا تھا۔ یعنی سہولتوں کی معلومات ہونی چاہیے۔ میک اَپ کس طرح سے کرتے ہیں یہ وہ اشتہار سے سیکھ سکتی تھی جبکہ اسے، اور مجھے بھی، اس کے چہرے پر پاؤڈر لگانا پسند نہیں تھا، کہ یہ فالتو خرچ ہے۔ میں سادہ سستی قمیض پتلون پہنتا تھا پر اچھے فیشن کی مجھ میں سمجھ تھی۔ عورتوں اور گرہستی کے موضوع پر ماہانہ رسالہ میں بیوی کے لیے کبھی کبھی لے آیا کرتا تھا۔ اس کے باوجود ایک سویٹر کا بنانا بہت مہنگا کام تھا۔ اخبار بیوی کے لیے ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ ہوٹل میں آدھا کپ چائے پی کر میں اخبار پڑھ لیا کرتا تھا۔ جس دن گھر میں شوربے دار سبزی یا کڑھی بنتی تھی، اس دن دال نہیں بنتی تھی۔ مہینے میں آٹھ دس دن اسی طرح دال نہیں بنتی تھی۔

جدوجہد کا دائرہ بہت چھوٹا تھا۔ حملے دور دور سے اور دھیرے دھیرے ہوتے تھے اس لیے چوٹ بہت زور کی نہیں لگتی تھی۔ استحصال اتنے معمولی طریقے سے اثر ڈالتا تھا کہ مزاحمت کرنے کی کسی کو خواہش نہیں ہوتی تھی۔ یا مزاحمت بھی بہت معمولی قسم کی ہوتی۔ جب سبزی بہت مہنگی ملتی تو اس کا سبب ان سبزی بیچنے والوں کو سمجھتا جو ٹوکری میں سبزی بیچنے محلے محلے گھومتے تھے۔ ان سے سبزی تولتے وقت ڈپٹ کر بولتا: تول ٹھیک ہونا چاہیے۔ سڑے آلو مت ڈال دینا۔ تم لوگ ٹھگتے ہو، ڈنڈی مارتے ہو، لوٹتے ہو — یہی میری مزاحمت تھی۔

زندگی کے ہر لمحے سے پچاسیوں لال چیونٹیاں چپکی رہتی تھیں۔ شاید پسینہ اس کی وجہ ہو۔ لیکن ان کو سہنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ جس لمحے سے چیونٹی الگ ہوتی وہ لمحہ بھی چیونٹی کے ساتھ ساتھ مر کر نیچے گر جاتا تھا۔ اگر یکبارگی کوئی گردن کاٹنے کے لیے آئے تو جان بچانے کے لیے جی جان سے لڑائی ہوتی۔ اس لیے ایک دم سے گردن کاٹنے کوئی نہیں آتا۔ پیڑھیوں سے گردن دھیرے دھیرے کٹتی

ہے۔اس لیے خاص تکلیف نہیں ہوتی اور غریبی پیدائشی رہتی ہے۔گردن کو ہلگائے ہوئے سب لوگ اپنا کام جاری رکھتے ہیں — یعنی گردن کاٹنے کا کام۔

میری تنخواہ ایک کٹہرا تھا جسے توڑنا میرے بس میں نہیں تھا۔یہ کٹہرا مجھ میں قمیض کی طرح فٹ تھا۔ اور میں اپنی پوری طاقت سے کمزور ہونے کی حد تک اپنی تنخواہ پار ہا تھا۔اس کٹہرے میں سوراخ کر کے میں سنیما دیکھتا تھا، یا خواب۔ ہفتے بھر بعد ہی مجھے فلم دیکھنے کی خواہش ہو جاتی تھی۔فلم اور لوگوں کی طرح مجھ میں بھی جینے کا یقین بڑھاتی تھی۔ یہ یقین حقیقی صورت حال میں جینے کا تھا۔رکشے والے سے ایک کروڑ پتی کی لڑکی کی شادی ہو سکتی تھی تو رکشے والا اسی اطمینان سے رکشہ چلاتا رہے گا۔امیر لڑکی سے غریب لڑکے کے پریم کو دیکھ کر غریبوں کو ویسا ہی سکھ ملتا تھا جو اپنی چارپائی یا زمین پر سونے سے زیادہ، بڑھیا گدے دار پلنگ کے نیچے جھاڑو لگانے میں نوکر کو ملتا ہوگا۔کھانا بنانے والا نوکر زیادہ کھانا بنائے گا تا کہ کھانا بچے۔لیکن سائنس سے غریبوں کو خاص فائدہ نہیں ہوا تھا۔مالکن بچا ہوا کھانا ریفریجریٹر میں رکھ دے گی۔ نوکر کو کبھی نہ کبھی کچھ ضرور ملے گا، کیونکہ ریفریجریٹر میں رکھے رکھے بھی بہت دنوں کی چیزیں خراب ہو جاتی ہیں۔آدمی کا سواد زیادہ تر مٹھائی کے ڈھیر سے تھوڑی مٹھائی چرا کر چکھ لینے کا سواد تھا۔آدمی کے خیالات تیزی سے بدل رہے تھے۔لیکن اتنی ہی تیزی سے ردی پن اکٹھا ہو رہا تھا۔ردی پن دیر تک تازہ رہے گا۔ اچھائی فوراً سڑ جاتی تھی۔زیادہ سے زیادہ گھنٹے دو گھنٹے یا ایک دو دن تک ہی رہتی تھی۔

گھر کے سامنے آ کر بھی میری اندر جانے کی خواہش نہیں ہو رہی تھی۔چہل قدمی کرتا ہوا میں پان کی دکان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔"ٹھاکر، ایک کا فوری پان دو،" میں نے کہا۔

"کچھ پریشان لگتے ہو؟" پان لگاتے ہوئے ٹھاکر نے کہا۔

"پریشان نہیں ہوں۔چھٹی کا دن ہے۔گھر جا رہا ہوں۔"

ہوٹل کی طرف سے گھوم کر میں گھر کو پار کرتے ہوئے آگے نکل آیا۔اپنی دکان سے گھورتے ہوئے گپتا جی نے مجھے دیکھا۔چونکہ میں گپتا جی کی دکان سے ادھار سامان لاتا تھا، اس لیے ان کا دیکھنا مجھے گھورنے جیسا لگتا تھا۔"کہاں جا رہے ہو؟" انھوں نے پوچھا۔"گھر جا رہا ہوں،" میں نے کہا۔"گھر تو پیچھے چھوٹ گیا ہے،" انھوں نے کہا۔"اچھا!" کہتا ہوا میں بجائے گھر جانے کے نائی کی دکان میں بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگا۔نائی کی دکان کے بڑے بڑے آئینوں میں مجھے بھرم ہوتا تھا۔سڑک کے آتے ہوئے

Scanned with CamScanner

آدی مجھے جاتے ہوئے لگتے تھے۔ اگر میں گھر کی طرف جاؤں تو آئینے میں گھر سے لوٹتا ہوا لگوں گا۔

آئینوں میں اپنے کو دیکھ کر ہمیشہ مجھے لگتا کہ میں اتنا ٹھیک نہیں دکھائی دے رہا ہوں جتنا ٹھیک ہوں۔ اسی طرح کی امید سے زندگی کچھ ٹھیک لگتی تھی۔ زندگی جتنی خراب لگتی ہے اتنی خراب نہیں ہے۔ بچپن میں اس نائی نے بال کاٹنے کے بعد بہت اچھی طرح سنوار دیے تھے۔ بال کاٹنے کے بعد فوراً نہانا پڑتا تھا۔ میں نہانے سے بچ رہا تھا کیونکہ نہانے سے سنورے ہوئے بال خراب ہو جاتے۔ اماں نے بڑے بھائی سے زبردستی نہلانے کے لیے کہا تھا۔ بڑے بھائی نے مجھے سمجھایا تھا کہ نہانے کے بعد وہ بالوں کو پہلے جیسا سنوار دیں گے۔ بڑے بھائی نے ویسے ہی بال سنوار دیے۔ یہی اسٹائل ہمیشہ رہی۔ اور میرے چہرے کے ناک نقشے میں بال سنوارنے کا ایک ڈھنگ مستقل طور پر شامل ہو گیا۔ میں چاہتا تو اسے بدل سکتا تھا۔ سر کے بال پتا، چچیرے بڑے بھائی، اجیا، بابا اور چاچاؤں کی موت کے بعد کئی بار گھٹے تھے۔ لیکن جب بھی بال بڑھے تو ان کا وہی ڈھنگ تھا۔ پہننے کا ڈھنگ یا پہناوا آدمی کے نقشے میں شامل ہو جاتا ہے جو مرتے دم تک نہیں چھوٹتا۔ پتلون، پاجامہ پہننے والا، پتلون، پاجامہ پہنے پہنے مرے گا۔ اس کے سوٹ پہن کر مرنے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ گھٹنے کے اوپر سے موٹی دھوتی لپیٹے رہنے والا بڑھئی اسی کو پہنے پہنے مرے گا۔ ادھ ننگا ادھ ننگا ہی مرے گا۔

''داڑھی بنواؤ گے؟'' نائی نے پوچھا۔ نائی سفید دھلی قمیض اور سفید پتلون پہنے تھا۔ پچاس پچپن کی عمر ہو گی پر سارے بال کالے تھے۔ ہلکی جھریوں والا چکنا چہرہ۔ پورے شہر میں اکیلا گجراتی نائی تھا۔ دوسرے مقامی نائیوں کی طرح اسے نیچی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ پر گجراتیوں کے بیچ اس کی وہی صورت حال تھی جو سب نائیوں کی تھی۔

''داڑھی میں خود بناؤں گا۔ گھر جانے کے لیے بیٹھا ہوں،'' میں نے کہا۔ یہ میرا ٹھیک جواب نہیں تھا۔ گھر جانے کے لیے بیٹھے رہنے کا کیا مطلب؟ اپنے گھر جانے کے لیے مجھے بیٹھے رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں بس کے انتظار میں نہیں بیٹھا تھا کہ گھر بس کی طرح یہاں آتا اور میں اس میں گھس جاتا۔ گھر کا دروازہ میرے لیے بند نہیں تھا۔

''سمپت!'' میں چلایا اور قریب دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچا۔ ''میں تمھارے انتظار میں بیٹھا ہوں۔ تمھاری مجھے سخت ضرورت ہے۔ دوستی واقعی ایک شاندار چیز ہوتی ہے۔ تمھاری مدد کی

Scanned with CamScanner

ضرورت ہے۔اب مجھے فکر نہیں ہے۔''
''کیا ہے؟ پریشان کیوں ہو؟ میں تمھارا انتظار کرتا رہا۔گھر میں ایسے گھستے ہو کہ نکلنے کا نام نہیں لیتے۔تم گھر گھسنے ہو۔آخر میں اکیلے بازار گیا۔تمھاری بات کا اعتبار نہیں ہے۔اگر پہلے روکا نہ ہوتا تو کب کا سبزی لے کر گھر پہنچ جاتا۔''
''یار، میری بات سچ ہے۔تم مجھے بچا سکتے ہو۔میں گھر سے باہر کم سے کم ایک گھنٹہ گزارنا چاہتا ہوں۔پکچر کا ٹائم ہوتا تو پکچر دیکھنے چلا جاتا۔''
''گھر بند ہے کیا؟''سمپت نے پوچھا۔
''نہیں بھائی، سب ہیں۔''
سمپت کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔وہ حیران تھا۔
''اس میں انہونی یا تعجب کی کون سی بات ہے؟ چاہوں تو ابھی گھر جا سکتا ہوں۔مجھے کوئی روک نہیں سکتا۔پر ابھی میں جانا نہیں چاہتا۔مجھے وقت بتانا ہے۔دیر ہو جائے گی تب شان سے گھر جاؤں گا۔''
''ابھی جاؤ گے تو کیا ہوگا؟''اس نے اشتیاق سے پوچھا۔
''ہوگا کچھ نہیں۔اماں چاول چنتی ہوئی دِکھیں گی اور بیوی بالٹی لیے ہوے۔جب میں جلدی جلدی گھر لوٹتا ہوں تو گھر کے لوگوں کو گھر آنے کی وجہ بتانے کی خواہش ہوتی ہے۔وجہ مجھے سمجھ میں نہیں آتی۔چھٹی کے دن بہت اُوبتا ہوں۔تم کو کبھی ایسا ہوا تھا؟''
''شروع میں مجھے چھٹی کے دن کی عادت نہیں پڑی تھی۔چھٹی کا دن مجھے بے کاری کے دن یاد دلاتا تھا۔چھٹی کا دن نوکری سے الگ کر دیا گیا دن لگتا تھا۔جیسے اتوار کا دن۔تب ہر سوموار کو لگتا تھا کہ پتا نہیں نوکری لگتی ہے یا نہیں۔عارضی نوکری ہونے کی وجہ سے ایسا لگتا ہوگا۔اب عادت پڑ گئی ہے۔مجھے پنشن پانے تک نوکری کرنی ہے۔''
''تمھاری لمبی عمر ہوگی، اسی لیے پنشن کی بات کر رہے ہو۔''
''کیا تم مر رہے ہو؟''
''دوست، تم مجھے بچا لوگے،''میں نے کہا۔
''میں چلتا ہوں۔بہت سے گھریلو کام آج کے دن اکٹھے ہو جاتے ہیں۔''

Scanned with CamScanner

''باپ کے ساتھ مل کر اماں کی پٹائی کرنی ہے؟''

''اماں کی پٹائی دفتر کے دن بھی ہوتی ہے۔''

''چھٹی کے دن پٹائی بند کیوں نہیں رکھتے؟''

''روز روز پٹائی تھوڑی ہوتی ہے۔ گھر میں تم سے کسی نے کہا تھا کہ ابھی لوٹ کر مت آنا، دیر سے آنا؟'' سمپت نے پوچھا۔

''نہیں کہا۔''

''تب کیا پریشانی ہے؟ تم اپنے گھر جاؤ۔ میں اپنے گھر جاؤں گا۔ جا کر سوؤں گا۔ دن کو بہت دنوں سے سویا نہیں۔''

''میرے ساتھ ایک گھنٹہ نہیں گزار سکتے؟''

''تم کچھ چھپا رہے ہو۔ تمھارا کسی سے جھگڑا ہوا ہے۔ چلو، میں تم کو گھر پہنچا دیتا ہوں۔'' بازو پکڑ کر لگ بھگ کھینچتے ہوئے وہ مجھے گھر کی طرف لے چلنے لگا۔ گلی کے سامنے لا کر اس نے مجھے چھوڑ دیا۔

جب وہ کھینچ لیے جا رہا تھا تو گپتا جی مجھے دیکھ رہے تھے۔

''اب تم چلے جاؤ گے یا اندر تک چھوڑ دوں؟'' کندھا پکڑ کر مجھے ٹھیلتے ہوئے اس نے کہا، ''جاؤ نا، کھڑے کیوں ہو؟'' بیوی مجھے گلی میں دکھائی دی۔ اس نے دیکھا ہوگا کہ سمپت مجھے زبردستی گھر بھیج رہا ہے۔ اگر اس نے دیکھا ہے تو مجھے اطمینان تھا، کیونکہ ان لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ میں گھر نہیں آ رہا تھا، میری گھر آنے کی خواہش نہیں تھی۔ بیوی اندر چلی گئی تھی۔ اماں کو اس نے میرے آنے کی خبر کی ہوگی۔

''چھوڑو،'' کندھا چھڑاتے ہوئے میں نے کہا۔

''تم تو جھگڑا کرنے پر اتارو ہو۔ میں جا رہا ہوں۔ سبزی پہنچانی ہے۔ کتا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

سمپت کے جانے کے بعد سڑک کی طرف گھوم کر آتے جاتے لوگوں کو دیکھتے ہوئے میں ایسی بات سوچنے لگا جس کے ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ جیسے، ہو سکتا ہے بیوی کہے، ''تھوڑی دیر کے لیے اور باہر رہ لو۔ ہم لوگوں کی خاطر تم تھوڑی دیر کے لیے باہر نہیں رہ سکتے؟ کھانا بنانے میں ابھی بہت ٹائم ہے۔ یہ چائے کا وقت بھی نہیں ہے۔ گھر میں کتنے کام باقی ہیں۔ کپڑے دھونے ہیں، برتن مانجھنے ہیں،

پانی بھرنا ہے، جھاڑو لگانی ہے۔ شادی ہوئے زیادہ وقت نہیں ہوا ہے، پر لگتا ہے پچھلے جنم سے تمھارے ساتھ ہوں۔ ساری زندگی تمھارے ساتھ رہنے کے لیے تیار ہوں۔ غصے سے نہیں، پریم سے رہنے کے لیے تیار ہوں۔ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے تم ملے۔ دوسرا معلوم نہیں کیسا ہوتا۔'' یہ کہنے کے بعد دروازے کے سامنے اڑی رہے گی اور گڑگڑائے گی۔

ہو سکتا ہے ماں کہے، ''تو اتنی جلدی آ گیا؟ اب تو کہے گا، روز روز صبح شام کھانا کیوں بنتا ہے۔ اب تو دو چار دن بعد میں آنا۔ ہم لوگ جیسے تیسے گذارا کر لیں گے۔ میری عمر تو کٹ گئی، بس دلہن کی مجھے فکر ہے۔''

گھر میں گھسنے کے بعد میں گھر کے حالات سے سمجھوتا کرنے کے لیے تیار تھا۔ میں کسی سے کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا تھا۔ آنگن میں کوئی نہیں تھا۔ اتنے دبے پیر گھر میں گھسا تھا کہ ذرا بھی آہٹ نہیں ہوئی۔ اماں کو اور بیوی کو، جو چوکے میں تھیں، میرے اندر گھستے ہی معلوم ہو گیا کہ میں آ گیا ہوں۔

''سنتو، ہاتھ منھ دھو کر کھانا کھا لے،'' اماں نے چوکے سے آواز لگائی۔

ہاتھ منھ دھویا۔ ایک دو بار کھنکھار کھنکھار کے کلّی کرنے کے بعد پہلے سے تیار پٹرے پر بیٹھ گیا۔ سبزی نہیں تھی۔ کئی دن سے سبزی نہیں بن رہی تھی۔ مٹھا تھا۔ بھر پیٹ کھانا کھایا۔ چارپائی میں لیٹا تو نیند آ گئی۔

قریب دو گھنٹے سویا ہوں گا۔ کیونکہ نیند کھلتے ہی میری نظر چوکے میں گئی، اماں چائے بنا رہی تھیں۔ اگر سوتا رہتا تو چائے بن جانے کے بعد مجھے اٹھا دیتیں۔ بیوی چارپائی کے پاس زمین پر بیٹھی لوکی کاٹ رہی تھی۔

''لوکی کہاں سے آئی؟'' میں نے پوچھا۔

''سبزی بیچنے والی آئی تھی۔ اماں نے خریدی ہے۔ میں نے منع کیا، یہاں مت خریدو، تم ناراض ہو گے۔ پر کئی دنوں سے سبزی نہیں بنی تھی۔ ماں کا بہت جی چاہ رہا تھا کہ تمھارے لیے سبزی بننی چاہیے۔''

''صفائی مت دو۔ میں کب کہہ رہا ہوں کہ تم نے خریدی ہے؟ شام کو بازار جانے والا تھا۔ جتنی لوکی بولتیں، سب لے آتا۔''

Scanned with CamScanner

''پتا نہیں جاتے کہ نہیں جاتے۔ اماں کو اچھا نہیں لگتا کہ تم بنا ترکاری کے کھانا کھاؤ۔''

''تم کو میرا بنا ترکاری کے کھانا اچھا لگتا ہے؟ اب مجھ سے سبزی لانے کے لیے کبھی مت کہنا۔''

''نہیں کہوں گی۔''

''کیسے نہیں کہو گی؟ ہزار بار کہو گی۔ اس کے بنا تم زندہ نہیں رہ سکتیں۔''

''میں سبزی ترکاری کے بنا زندہ رہ سکتی ہوں۔ لانے کے لیے نہیں کہوں گی، تب بھی زندہ رہوں گی۔''

''تمھاری جگہ کوئی اور ہوتی تو جواب نہ دیتی۔''

''میرا کسی کے ساتھ مقابلہ مت کرو۔''

''بہو! چائے لے جاؤ'' اماں نے چوکے سے کہا۔

وہ اٹھ کر جانے لگی۔

''رہنے دو'' میں نے کہا۔ ''اماں، میں وہیں آ رہا ہوں۔'' اٹھ کر میں چوکے میں چلا گیا۔

چائے پیتے ہوئے میں نے اماں سے پوچھا، ''لوکی کیا بھاؤ لی؟''

''دلہن سے پوچھ لینا۔ مجھے یاد نہیں ہے۔ اُدھر دلہن سے لڑ رہا تھا، اب مجھ سے لڑے گا۔''

''اماں! کون لڑ رہا ہے؟ تم لوگ کچھ سمجھتیں نہیں۔''

چائے پی کر پتلون قمیض بدلنے لگا۔ قمیض کے بٹن لگاتے ہوئے میں چپل ڈھونڈ رہا تھا۔

''باہر جا رہے ہو؟'' بیوی نے پوچھا۔

''کچھ منگوانا ہے؟'' میں نے چڑتے ہوئے کہا۔

''کب تک آؤ گے؟''

''اگر ابھی پانچ منٹ میں لوٹ کر آؤں گا تو مجھے تم گھر کے اندر گھسنے نہیں دو گی۔ کیا کام ہے؟''

''ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔ کام کچھ نہیں ہے۔''

''سبزی نہیں منگوانی ہے؟ ناریل کا تیل نہیں لانا ہے؟''

''لانا ہے، پر ضروری نہیں ہے۔''

''پہلے ضروری تھا، اب ضروری نہیں ہے!''

Scanned with CamScanner

''کبھی نہ کبھی تو چیزیں آ ہی جاتی ہیں، اور کبھی نہ کبھی تم ناریل کا تیل بھی لے کر آؤ گے۔''

''مجھے ابھی سب سامان لانا ہے۔ تھیلا اور شیشی دو۔ میں زیادہ دیر تک کھڑا نہیں رہ سکتا۔''

بیوی تھیلا لے کر جلدی آ گئی پر شیشی اسے نہیں مل رہی تھی۔ وہ بڑبڑاہٹ میں شیشی تلاش کر رہی تھی۔

''شیشی نہیں مل رہی ہے،'' بیوی نے مجھ سے کہا۔

''میں تھوڑی دیر اور رکوں گا، بس،'' میں نے کہا۔

''اماں! شیشی نہیں مل رہی ہے،'' اس نے اماں سے کہا۔

میں اطمینان سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ بیوی کے ساتھ اماں بھی ناریل کے تیل کی شیشی ڈھونڈ نے لگیں۔

''بہو! تمھارا ابھی دماغ بائے بڑنگ ہے۔ اتنی بڑی شیشی نہ معلوم کہاں رکھ دی۔''

''کئی دنوں سے تیل نہیں لگا رہے ہیں، اس لیے اسے بھول جاتی ہوں۔''

میں اگر موجود نہ ہوتا تو شیشی انھیں آسانی سے مل جاتی۔

''ایک منٹ میں دوسری شیشی دھو کر دیتی ہوں،'' اس نے کہا۔

وہ کباڑ سے ایک شیشی نکال، دھو پونچھ کر لے آئی۔

ایک ذمے دار آدمی کے مانند تھیلا شیشی لے کر میں باہر نکلا۔ بہت خوش تھا۔ پتا نہیں سمپت سو پایا نہیں۔

سبزی لے کر لوٹتے لوٹتے اندھیرا ہو گیا۔ لوٹتے وقت کسی نے نہیں پوچھا کہ کہاں جا رہا ہوں۔ کوئی کیوں پوچھتا۔

رات کو جب وہ چارپائی پر، بازو سے ٹی، تھکی ماندی لیٹی تو مجھے اس پر بہت پیار آیا۔ اس کی طرف گھوم کر میں نے اپنا داہنا پیر اس کے پیروں کے اوپر رکھ دیا۔ اس کی ساڑھی کا اور پیٹی کوٹ کا نیچے کا حصہ بہت گیلا تھا۔ میں نے اپنا پیر فوراً ہٹا لیا۔

''تمھاری ساڑھی نیچے بالکل گیلی ہے،'' میں نے کہا۔

''ابھی بدل لیتی ہوں،'' کہتی ہوئی وہ اٹھی اور ساڑھی بدلنے لگی۔

Scanned with CamScanner

''پیٹی کوٹ بھی بدل لینا۔ پیٹی کوٹ بھی گیلا ہے۔''

''بدل لیتی ہوں،'' اس نے کہا۔

آڑ میں جاکر میں نے اسے سر کے اوپر سے دوسرا پیٹی کوٹ ڈالتے دیکھا۔ کپڑے بدل کر جب وہ آئی تب اپنی چارپائی میں اس کے لیے جگہ بناتے ہوئے میں نے کہا: ''پیٹی کوٹ تم اس طرح پہنتی ہو جیسے میں قمیض پہنتا ہوں۔ پیر ڈال کر کیوں نہیں پہنتیں، جیسے میں پتلون پہنتا ہوں؟''

''سب اسی طرح پہنتے ہیں۔ اگر تمھاری طرح پہنوں تو مجھے تولیہ لپیٹنا پڑے گا۔''

''چڈی پہننا چاہیے۔ جیسے فراک کے نیچے پہنتے ہیں۔''

''پیٹی کوٹ کے نیچے چڈی پہننے کی میری عادت نہیں ہے۔ بہت سے نہیں پہنتے۔ فراک چھوڑنے کے بعد میں نے اسکرٹ بلاؤز کہاں پہنا؟ سیدھے ساڑھی پہننے لگی تھی۔ آٹھویں نویں کلاس سے ساڑھی پہن رہی ہوں۔''

ہاف پینٹ میں نے میٹرک تک پہنا۔ پوسٹ گریجویٹ کالج میں آنے کے بعد پتلون پہننا شروع کیا تھا۔ پہلی پتلون خاکی رنگ کی تھی۔ بڑے بھائی کے چھوٹی ہو گئی تھی۔

''آج سبزی والی سے سبزی خریدنا مجھے بہت اچھا لگا۔''

''کسی دن میں تمھیں اپنے ساتھ بازار لے جاؤں گا۔ کتنے دنوں سے تم گھر سے باہر نہیں نکلیں؟''

''آٹھ دس روز پہلے شکن کے گھر گئی تھی۔ اماں گھر میں رہ گئی تھیں۔ وہاں سے دس منٹ میں واپس آ گئی۔ اماں کو گھر میں اکیلے چھوڑنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔''

''دن بھر گھر میں رہنے سے تمھارا جی نہیں اُوبتا؟''

''باہر کوئی کام نہیں ہے۔ گھر میں کام کرتے کرتے دن گزر جاتا ہے۔''

''اگر تم یہ بھول جاؤ کہ آج کون سا دن ہے اور کون سی تاریخ ہے تو تم کو کیسا لگے گا؟''

''کچھ نہیں لگے گا۔ دنوں کو میں کل، پرسوں، کچھ دن اور بہت دن کہہ کر یاد رکھتی ہوں۔ جیسے بھیا کی چٹھی کل آئے گی تو کہوں گی کل آئی تھی۔ بہت دنوں سے نہیں آئے گی تو کہوں گی بہت دنوں سے بھیا کی چٹھی نہیں آئی۔''

ہم دونوں چت لیٹے ہوئے کھپریلوں کو دیکھ رہے تھے۔ بلیوں اور آڑی لکڑیوں میں جمی ہوئی

کھپریلیں تھیں۔

"میں سو جاؤں؟" اس نے پوچھا۔ وہ بہت تھکی ہوئی تھی۔

"سو جاؤ،" میں نے کہا، "اپنی چارپائی پر چلی جاؤ۔"

وہ اپنی چارپائی پر چلی گئی۔ میری طرف کروٹ لے کر تھوڑی دیر تک مجھے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے آنکھیں موند لیں۔ منٹ بھر میں وہ سو گئی۔ دھیرے دھیرے اس کے ہونٹ باریک درار بھر کھلتے کھلتے تھوڑا کھل گئے۔ رات بھر جلنے والی پھیکی بتی کی طرف اس کا چہرہ تھا۔ وہ میری طرف ہی کروٹ لے کر سوتی تھی۔ یہ اس کی عادت تھی۔

گھر سے سنیما بہت پاس تھا۔ آخری شو کے شروع ہونے کا دھارمِک گانا بجنے لگا۔ گانے کے ختم ہوتے ہی نیوز ریل شروع ہونے کی دھن سنائی دی۔ کسی بنتے ہوئے بند کا ذکر ہو رہا تھا کہ وقت سے پہلے بن کر تیار ہو جائے گا۔ شاید پانچ چھ لاکھ ایکڑ زمین میں سنچائی ہو سکے گی۔ تب قریب تیس کروڑ روپے کا منافع ہوگا۔ ہزاروں مزدور رات دن بند کو پورا کرنے میں لگے ہیں۔ بیچ بیچ میں ٹرک اور دوسری مشینوں کے چلنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ ہوائی جہاز کے اڑنے کی ہلکی گڑگڑاہٹ تھی۔ پھر ہزاروں آدمیوں کا شور۔ ایسا شور جو کسی معزز ہستی کے کسی ملک میں اترنے سے ہوتا ہے۔ غیر ملکی بینڈ کی دھن۔ کس ملک کا قومی ترانہ ہو سکتا ہے؟— تبھی کھپریلوں میں چوہوں کے بھاگنے کی آواز سنائی دی اور میں نے فوراً اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ لمحے بھر بعد چوہوں کی ہلچل کی وجہ سے اپنے چہرے پر اوپر سے گرے کچرے کو محسوس کیا۔ میں آنکھ موندے موندے اٹھ کر بیٹھ گیا، پھر آنکھ کھولی۔ آنکھ میں کچرا جا نہیں پایا تھا۔ رات کی خاموشی میں نہ معلوم کتنی آوازیں تھیں جن سے مجھے کوئی مطلب نہیں تھا۔ بیوی کے ہاتھ پر دو مچھر پاس پاس بیٹھے تھے۔ 'چٹ' سے ایک ساتھ دونوں مچھروں کو میں نے مار ڈالا۔ وہ جاگ پڑی۔

"تم کو نیند نہیں آ رہی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"دوپہر کو سویا تھا اس لیے نیند نہیں آ رہی ہے۔ ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا ہے۔ دس ساڑھے دس بجے ہوں گے۔"

"تمھاری کھٹیا میں آ کر سو جاؤں؟" اپنی چارپائی پر لیٹے لیٹے اس نے پوچھا۔

"نہیں، تم وہیں سوؤ۔ میں باہر سے ایک چکر لگا کر آتا ہوں۔" میں اٹھ کر کپڑے بدلنے لگا۔

Scanned with CamScanner

تب تک وہ گہری نیند میں سو چکی تھی۔ میں نے سوچا دروازہ بند کرنے کے لیے وہ جاگتی رہے گی۔

چپل پہن کر کمرے سے باہر آیا۔ ماں نے آواز لگائی، ''سنتو ہے کیا؟ پیشاب کرنے جارہا ہے؟''

''اماں، میں باہر جارہا ہوں۔ ابھی دس بجے ہوں گے۔ تھوڑی دیر میں واپس آجاؤں گا۔'' اماں قندیل لے کر دروازہ بند کرنے آگئیں۔ ''اماں، بتی کیوں نہیں جلالیتیں؟'' سوئچ کے نیچے اماں کی کھٹیا تھی۔

''قندیل اچھی لگتی ہے۔ دیر مت کرنا، جلدی آجانا۔''

اماں کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ بکھرے سفید بال دیکھ کر ان کا اور خیال رکھنے کی خواہش ہوتی تھی۔ رات میں تو بہت بوڑھی اور کمزور لگتی تھیں، خاص کر تب جب رات میں ان کی نیند کھل جاتی۔ رات میں اماں کی نیند کئی بار کھلتی تھی۔ لگاتار دو گھنٹے بھی نہیں سو پاتی تھیں۔

اس سڑک پر آخری شو کے ختم ہونے تک چہل پہل رہتی تھی۔ ٹھیلے خوانچے لے کر مونگ پھلی والے، چاٹ والے، چائے والے، بجلی کے کھمبے کے نیچے یا کاربائیڈ کی بتی جلائے شو کے ختم ہونے تک آخری بکری کے انتظار میں رہتے تھے۔

سنیما کی طرف نہ جا کر بازار کے اندر جانے والی گلی میں مڑ گیا۔ تھوڑی دور آگے، بجلی کے کھمبے کے پاس خالی خوانچہ پرات لیے مہاویر جاتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کی مونگ پھلی شاید جلدی ختم ہوگئی تھی۔ وہ دن بھر میونسپل اسکول میں خوانچہ لگاتا تھا اور کبھی کبھی شام کو سنیما کے سامنے۔ مہاویر دور سے پہچان میں آگیا تھا۔ اس کے گلے میں دو سال کے بچے کے سر کے برابر رسولی تھی۔ انجانے لوگوں کو دھوکا ہوجاتا کہ اس کی پیٹھ پر بچہ لدا ہوا ہے، جبکہ مہاویر بالکل اکیلا تھا۔ اس کا کوئی نہیں تھا۔

میں مہاویر کے برابر پہنچنا چاہتا تھا اور بنا دوڑے اسے پکڑ نہیں سکتا تھا۔ بوڑھا ہوتے ہوئے بھی وہ بہت تیز چل رہا تھا۔ گلی میں ایک جگہ سڑک کے آرپار گڈھا تھا، جسے اس نے آسانی سے پار کرلیا۔ پوری گلی میں صرف ایک بجلی کا کھمبا تھا۔ اس میں دھیما بلب جل رہا تھا۔ گلی کے ختم ہوتے ہی ایک کم چوڑی سڑک تھی۔ اس سڑک کے دونوں طرف دور تک مہاویر مجھے دکھائی نہیں دیا۔ بائیں طرف ایک دیسی شراب کی دکان تھی۔ شراب کی دکان کے اوپر جو اکیلا بلب تھا وہ بہت تیز تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ مہاویر شراب کی دکان میں تو نہیں چلا گیا۔ شراب کی دکان کے پاس ایک بڑی سِگڑی جل رہی تھی جس میں ایک آدمی بھجیے تل رہا تھا۔ شراب کی دکان سے دو لوگ ڈولتے ہوئے نکلے۔ ان کے ہاتھوں میں

Scanned with CamScanner

ڈنڈا تھا۔ ڈنڈے کے سہارے وہ چل پا رہے تھے۔۔ شراب کے نشے میں کم، لاکھڑی کی دال کھانے کے نتیجے میں ہاتھ پیر ٹیڑھے ہو جانے سے زیادہ، ڈولتے ہوئے چل رہے تھے۔ دکان کی کھپریلی چھت پر بوتلوں اور کانچ کے گلاسوں کے بہت سے ٹکڑے پڑے تھے، جو کبھی کبھی چمکنے لگتے۔ اس کے آگے ستنامیوں کا محلہ تھا۔ شراب کی دکان ان لوگوں سے ہی چلتی تھی۔

بائیں طرف تھوڑا آگے بڑھنے پر مجھے مہاویر دکھائی دیا۔ سڑک پر جھکا ہوا کچھ ڈھونڈ رہا تھا، اس لیے پہلے وہ مجھے دکھائی نہیں دیا ہوگا۔ اجالا نہیں تھا۔ جو کچھ اجالا تھا وہ شراب کی دکان کے بلب کا تھا۔ زمین پر اس کا خوانچہ پرات رکھا تھا۔ اس کے پاس جا کر میں نے پوچھا، ''کیا کھو گیا ہے؟ روپے گر گئے؟''

مہاویر مجھے پہچان گیا۔ ''روپے نہیں گرے۔ دو سو گرام اور پچاس گرام کے باٹ گر گئے ہیں۔''

اس سے کچھ ہٹ کر میں بھی بیٹھے بیٹھے زمین پر نگاہ گڑائے ہاتھوں سے ٹٹولتے ہوئے باٹوں کو ڈھونڈنے لگا۔ آخر مجھے دو سو گرام کا بڑا باٹ مل گیا۔ فوراً میں نے خوش ہو کر کہا، ''دو سو گرام کا باٹ مل گیا ہے۔''

''پچاس گرام کا باٹ اسی کے آس پاس ہوگا،'' مہاویر نے کہا۔

''اتنے کم اجالے میں چھوٹا باٹ نہیں ملے گا۔'' تھوڑی دیر ڈھونڈنے کے بعد میں نے کہا، ''ماچس ہوگی؟''

''نہیں ہے،'' اس نے کہا۔

''کل صبح آ کر ڈھونڈ لینا۔''

''ابھی نہیں ملا تو کل صبح بھی نہیں ملے گا۔''

''کچھ تو مل گیا،'' میں نے کہا۔

''دو سو گرام کا باٹ نہ بھی ملتا تو کام چل جاتا۔''

''تمھارا مطلب ہے زیادہ وزن کے باٹ سے کم تول پانا مشکل ہے، کم وزن کے باٹ سے بار بار تول کر زیادہ وزن تولا جا سکتا ہے؟''

''یہ بات نہیں ہے۔ دو سو گرام مونگ پھلی خریدنے ایک دو لوگ آتے ہیں۔ کبھی نہیں بھی آتے ہیں۔ پچاس گرام خریدنے والے زیادہ ہوتے ہیں۔ سب سے کام کا باٹ پچاس گرام کا باٹ ہے۔''

بحث کرنے کی مہاویر کو عادت تھی۔ بلکہ اپنی بات کہنے کی عادت تھی، جو بحث کی طرح ہوتی تھی۔

Scanned with CamScanner

''تمھارے پاس پچیس گرام کا باٹ تو ہوگا؟''

''پچیس گرام کا باٹ نہیں ہے۔''

''کیوں؟ پچیس گرام تو اور بھی چھوٹا ہے۔ یہ ہونا چاہیے۔''

''تھا، وہ بھی کھو گیا۔ اسکول کے لڑکوں کو میں نے کہہ دیا ہے کہ کم سے کم پچاس گرام تو لوں گا۔ جب ان کی چھٹی ہوتی ہے تو اتنی بھیڑ ہو جاتی ہے کہ الگ الگ پچیس گرام تول نہیں پاتا۔ پچاس گرام تول کر کسی ایک لڑکے کو دے دیتا ہوں، دوسرا اس سے آدھا بانٹ لیتا ہے۔ دو لڑکے ایک ساتھ نپٹ جاتے ہیں۔ کبھی کسی ایک سے پچاس گرام کے پیسے لے لیتا ہوں یا دونوں سے آدھے آدھے پیسے لے لیتا ہوں۔ لڑکے آپس میں حساب کر لیتے ہیں۔ مجھے کوئی دقت نہیں ہوتی۔''

''میں چلتا ہوں،'' میں نے کہا۔

''کہاں جا رہے ہیں؟''

''کام سے نکلا ہوں،'' میں نے کہا۔ وہ بھی پاس کی ایک گلی کے اندر گھس گیا۔ میں ستنامی محلے کی طرف سے بڑھا۔ میرے لیے وہی شارٹ کٹ تھا۔

ستنامی محلے میں پہنچتے ہی اندھیرا گھپ تھا۔ ایک بجلی کا کھمبا ضرور تھا پر اس میں بلب نہیں تھا۔ پیچھے دور شراب کی دکان سے آتے ہوئے نہیں کے برابر اجالے میں یہ کھمبا اندھیرے کے مینار کی طرح گڑا تھا۔ جب بھی اس کھمبے میں سال چھ مہینے میں ایک بار بلب لگایا جاتا تو اس محلے کے لڑکے پتھر سے نشانہ لگا کر اسی دن یا دوسرے دن تک ضرور توڑ دیتے تھے۔ جھونپڑیوں میں بیٹھے بڑے بوڑھے لوگ بلب پر نشانہ لگاتے ہوئے لڑکوں کو دیکھتے تو بھی کچھ نہیں بولتے تھے۔ کچھ عورتیں آدمی شوق اور مزے سے دیکھتے رہتے کہ کس کا نشانہ ٹھیک لگتا ہے۔ ہوسکتا ہے ان کو اپنے یکساں اندھیرے ماحول میں ایک بلب لگا دینے کا اچھا کام مذاق لگتا ہو۔

اِکّی دُکّی جھونپڑیوں میں قندیل یا ڈھبری کا اجالا تھا۔ کھلے میدان میں ایک طرف اور اجالا تھا۔ وہ اجالا عوامی بیت الخلا کا تھا، اس لیے گندا، پیلا اور شفاف لگتا تھا۔ میدان میں جگہ جگہ میونسپلٹی کی کچرے کی ڈھیریاں تھیں۔ چاروں طرف بدبو تھی۔ محلے کے زیادہ تر لوگوں کے ہاتھ پیر لاکھڑی کی دال کھانے سے لقوہ مارے جیسے ہو گئے تھے۔ اس محلے سے لگا ایک حصہ گندرا پارا کہلاتا تھا۔ دفتر کا چپراسی مہنگو اسی

کندراپارا میں رہتا تھا۔ اب بھی عوامی بیت الخلا کے سامنے پانچ چھ لوگ کھڑے تھے۔

میں بڑی سڑک پر آ گیا۔ ٹیوب لائٹ کے اجالے میں ڈامر کی سڑک کی چمک میں چکناہٹ تھی۔ دراصل سڑک بہت چکنی تھی۔ یہ نیشنل روڈ نمبر چھ تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد مجھے اپنا دفتر دکھائی دیا جو ایک پرانے بنگلے میں تھا۔ قریب دو ایکڑ زمین سے گھرا ہوا یہ وسیع بنگلہ کسی انگریز کا تھا۔ احاطے میں کنارے کنارے چاروں طرف بانس کے اونچے جھرمٹ تھے۔ کئی لمبے لمبے موٹے بانس زمین میں ایک جگہ سٹے اگے ہوئے اوپر اس طرح پھیلے تھے کہ بانس کا اندھیرا فوارے جیسا گھنا جھنڈ لگتا تھا۔ احاطے میں آم، کٹھل، تاڑ کے بہت سے پیڑ تھے۔

بنگلے کے پیچھے مین آفس کی نئی بلڈنگ تھی۔ نئی بلڈنگ اور بنگلے کے بیچ، کونے میں پیر کا مزار تھا جس کے اوپر ہرے رنگ کے کئی چھوٹے چھوٹے بلب رات بھر جلتے رہتے۔ جب ہوا بنگلے کی طرف چلتی تو مزار سے اگربتی اور لوبان کی خوشبو دفتر میں آتی۔ جب ہوا کا رخ دوسری طرف ہوتا تو یہ خوشبوئی بلڈنگ کی طرف چلی جاتی۔ اس بنگلے میں جہاں میرا کمرہ تھا، میں اس طرف گیا۔ رات میں اپنا دفتر میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ہر کمرے میں ایک ایک ٹیوب لائٹ جل رہی تھی۔ باہر کھڑکی میں کانچ تھے۔ میں اپنا کمرہ جھانکنے لگا۔ میرا کمرہ ہال کے بائیں طرف تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میری ٹیبل کے اوپر والی ٹیوب لائٹ جل رہی تھی۔

بنگلے میں گھستے ہی ایک ہال تھا۔ ہال کی داہنی دیوار پر آتشدان بنا ہوا تھا۔ دفتر یہاں آنے کے پہلے بنگلہ بہت دنوں تک خالی تھا۔ ریواں کا پنڈت ایک چپراسی اس کی دیکھ ریکھ کرتا تھا۔ آگ جلانے کی جگہ اسے بھگوان رکھنے کی جگہ جیسی لگی ہوگی۔ پنڈت ہنومان جی کا بھگت تھا۔ اس نے پتھر کے ایک گول ٹکڑے کو سیندور سے پوت کر وہاں رکھ دیا تھا اور باقاعدگی سے اس کی پوجا کرتا تھا۔ دفتر آنے کے پہلے اسے دوسری جگہ کام پر لگا دیا گیا۔ اس کے ہنومان جی وہیں چھوٹ گئے، جو دفتر آنے کے بعد بھی وہیں رہے۔ انھیں کسی نے چھیڑا نہیں۔ دفتر کے کام میں ان کی وجہ سے کوئی اڑچن نہیں ہوتی تھی اور کوئی بہت پروا بھی نہیں کرتا تھا۔ البتہ صبح دفتر کھول کر جھاڑو لگانے والا فراش، ہال کا دروازہ کھولتے ہی ہنومان جی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتا تھا۔

ہال کے الگ الگ تین حصے بنا دیے گئے تھے۔ یہ حصے لوہے کی الماریوں کی آڑ بنا کر کیے گئے

Scanned with CamScanner

تھے۔ ہال میں کل چھ بڑے بڑے دروازے تھے۔ دیواریں بہت اونچی تھیں۔ اوپر کھڑکی جتنے بڑے روشن دان تھے۔ ان کو بند کر کے لوہے کی آڑی کھڑی پٹیاں ٹھونک دی گئی تھیں۔ ہال کے دائیں اور بائیں طرف دو دو دروازے اور تھے اور پورچ سے ہال میں داخل ہونے کے دروازے کے ٹھیک سامنے بھی ایک دروازہ تھا جو ایک آڑے لمبے کمرے میں کھلتا تھا۔ اس کمرے سے ہو کر ایک لمبا فرش کا راستہ بنا تھا جو دونوں طرف جافری سے گھرا ہوا تھا۔ یہ فرش کا راستہ جہاں ختم ہوتا تھا، وہاں آزو باز و دو کمرے تھے، جو پہلے رسوئی گھر تھے۔ ان دونوں کمروں کو ٹوٹے پھوٹے فرنیچر اور فالتو سامان کا کباڑ خانہ بنا دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ چار پانچ سال پرانے کئی صراحیاں، گھڑے رکھے تھے جو دفتر میں استعمال ہونے کے باوجود ہر سال پھوٹنے سے بچ جاتے تھے۔ کچھ پچھلے سال کے بھی تھے۔ دس پندرہ نئی پرانی جھاڑوئیں تھیں۔ ٹیبلوں کے اوپر پھٹی دریوں کے بڑے بڑے بنڈل رکھے تھے۔ ایک کمرہ قنات اور شامیانے کے اونچے اونچے بنڈلوں سے آدھا بھرا ہوا تھا۔ اس کے اوپر چار پانچ مہینے میں دیمک مارنے کی دوائی چھڑک دی جاتی تھی۔ ہال کے داہنے طرف کے دو دروازے دو کمروں میں کھلتے تھے۔ ان دونوں کمروں کے بیچ ایک دروازہ تھا۔ دونوں کمروں سے ایک ایک کمرہ اور جڑا تھا۔ کونے کے کمرے سے ایک بڑا کمرہ لگا تھا جو نہان گھر اور پاخانہ تھا۔ نہانے کے لیے جو فوارہ لگا تھا وہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ کبھی اس میں ایک بڑا ٹب بھی تھا جس کے بڑے بڑے ٹکڑے بنگلے کے پچھواڑے ابھی تک پڑے تھے۔ جیسا داہنی طرف تھا ویسا ہی بائیں طرف تھا۔ فرق اتنا تھا کہ بائیں طرف ایک چھوٹا کمرہ اور تھا۔ یہ کمرہ پیر کے نام سے بالکل خالی رکھا گیا تھا۔ بڑے بابو کی ٹیبل کے پاس دیوار میں پہلے کبھی نل تھا۔ اس کے پائپ کو بند کر دیا گیا تھا۔ برسات کے دنوں میں کبھی کبھی اس پائپ سے پانی رسنے لگتا تھا۔ شروع شروع میں بڑے بابو اس پائپ کے باعث بہت پریشان رہے۔ زنگ لگا سڑا ہوا پائپ ہونے کی وجہ سے چھید ہوتے ہی پانی کی باریک دھار فوارے کی طرح نکلنے لگتی تھی۔ کئی دنوں بعد جا کر وہ بالکل ٹھیک ہوا۔ دفتر کے شروع ہوتے ہی سب کمروں میں بابوؤں کی بھیڑ ہو جاتی تھی۔ جو بڑے بڑے سیکشن تھے ان کے حصے میں تین تین کمرے تھے۔ کئی لوگوں کا ایک کمرے سے کام نکل جاتا تھا۔ ہم لوگوں کے پاس صرف ایک کمرہ تھا۔ پورا بنگلہ گولائی میں تین فٹ چوڑے برآمدے سے گھرا ہوا تھا۔ کچھ کھڑکیوں میں نیلے رنگ کے کانچ لگے تھے۔ یہ انگریزوں کے زمانے سے پھوٹنے سے بچے آرہے تھے۔ بنگلے میں ایک نیا

کمرہ اور جوڑ دیا گیا تھا۔ اس کمرے میں مال خانہ تھا۔ نئی بلڈنگ میں بڑے صاحب کا دفتر، خزانہ وغیرہ تھا۔ دور سے پورا بنگلہ گول گول بنگلوری کھپریلوں کے چھتے کو اوڑھا ہوا لگتا تھا۔ اس وقت اندھیرے میں تو عام کالی چھت کی طرح لگ رہا تھا۔

میں گھوم کر بڑے بابو، گوراہا بابو اور دیوانگن بابو کی ٹیبلوں کو دیکھتا رہا۔ بڑے بابو کی ٹیبل پر ایک موٹا کانچ بچھا تھا۔ اور کسی کی ٹیبل پر کانچ نہیں بچھا تھا۔ دیوانگن بابو کی ٹیبل میری اور گوراہا بابو کی ٹیبل سے بڑی تھی۔ پر گوراہا بابو اور دیوانگن بابو کی ٹیبلوں میں دراز تھی، میری ٹیبل میں نہیں تھی۔ پن کشن میری ٹیبل کے اوپر رکھا تھا۔ دونوں کے پن کشن دراز کے اندر ہوں گے۔ بڑے بابو کی ٹیبل کا سارا سامان دفتر بند ہونے کے بعد لوہے کی الماری میں رکھ دیا گیا تھا اس لیے ان کی ٹیبل صاف ستھری اور خالی تھی۔ میں جن کاغذوں کو جما کر پیپر ویٹ سے دبا کر گیا تھا وہ تتر بتر ہو کر پیپر ویٹ سے دبے ہوئے تھے۔ دفتر چھوڑنے کے بعد بڑے بابو نے کوئی ضروری کاغذ ڈھونڈا ہوگا۔ میری ٹیبل میں فائلیں جمی تھیں۔ انھی فائلوں کے بیچ مجھے ایک بڑا سا چوہا دکھائی دیا۔ یہ ٹھیک نہیں تھا۔ چوہا فائلوں کو کتر سکتا تھا۔ اسی لیے بڑے بابو ٹیبل پر بھجیا چوڑا کھانے کے لیے منع کرتے تھے۔ کچھ نہ کچھ چھوٹ جاتا ہے۔ پر کل ایسا نہیں ہوا تھا۔ کھڑکی کے کانچ پر انگلیوں سے کھٹ کھٹ کر کے اور ہش ہش بول کر میں نے چوہے کو بھگانے کی کوشش کی۔ چوہا ٹرے کے اوپر سے کود کر پن کشن کے پاس ایک لمحے کو رکا اور فائلوں کے بیچ میں گھس گیا۔

''وہاں کون ہے؟'' زور کی آواز آئی۔

''دوست!'' میں چلایا۔

نئی بلڈنگ کی طرف سے خزانے کے سنتری کی دوڑنے کی آواز آئی۔ میں سامنے کی طرف آ گیا۔ میں اجالے میں کھڑا تھا، اس لیے سنتری پاس آتے ہی مجھے پہچان گیا۔

''سنتو بابو، آپ؟'' چوکس سنتری نے حیرت سے پوچھا۔

''میں ایسے ہی گھومنے چلا آیا تھا۔''

''اندر مال خانے میں آپ کے بڑے بابو، ناظر اور دوسرے صاحب لوگ بھی ہیں۔ شام سے ہیں۔''

''صبح سے آئے ہوئے یہ لوگ ابھی تک گھر نہیں گئے؟ رات کو یہاں کیا کر رہے ہیں؟ کوئی

Scanned with CamScanner

میٹنگ ہے؟''

''پہلی ڈیوٹی والا سنتری یہی بتارہا تھا۔''

''کون ہے، سنتری؟ کس سے باتیں کررہے ہو؟'' مجھے بڑے بابو کی آواز سنائی دی۔ ان کی ڈھیلی ڈھیلی پتلون کی پھسر پھسر آواز آرہی تھی۔ وہ اسی طرف آرہے تھے۔

''سنتو بابو ہیں صاحب!'' کہہ کر سنتری دوڑتا ہوا اپنے ساتھی کے پاس چلا گیا۔

''سنتو بابو!'' بڑے بابو مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

''نمسکار، بڑے بابو،'' میں نے کہا۔

''رات میں ادھر کیسے آگئے؟ مجھ سے کوئی کام ہے؟'' انھوں نے پوچھا۔

''نیند نہیں آرہی تھی، دوپہر کو سوگیا تھا۔ گھومتے گھومتے اِدھر آگیا۔ دور سے دفتر کو دیکھا تو پاس سے دیکھنے کو جی چاہا۔ کوئی میٹنگ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں،'' بڑے بابو سوچتے ہوئے بولے۔ وہ بار بار دیوار کا سہارا لیتے تھے۔ پھر دیوار سے پیٹھ ٹکا کر کھڑے ہوگئے۔

''میں چلوں بڑے بابو،'' میں نے کہا۔ وہ مجھے کچھ نشے میں لگ رہے تھے۔

''سنتو بابو! میں تم سے بہت خوش ہوں۔ صاحب بھی بہت خوش ہیں۔ تم میرے لڑکے کی طرح ہو۔ پر تم میرے دوست ہو۔ اب تم آگئے ہو تو میرے ساتھ چلو۔ شراب پیو گے؟ مال خانے میں بڑھیا شراب کی بوتلیں آئی ہیں۔''

''بڑے بابو، میں شراب نہیں پیتا۔''

''تو گانجا پیو۔ افیم کھاؤ۔ آخر پرسوں تک سب ضائع کردی جائیں گی۔ گانجے کی تھیلیوں کے نیچے چوہوں نے چھید کردیا ہے۔ اوپر سیل ٹھیک ہے۔ اوپر کی سیل بھی چوہے کاٹ سکتے ہیں۔ بھنگ کھاؤ۔ چلو!'' بڑے بابو نے تھوڑا غصہ ہوتے ہوئے اور تھوڑا سمجھاتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''بڑے بابو، میں نشہ نہیں کرتا۔'' مجھے لگا، بڑے بابو کہیں غصہ نہ ہوں۔

''تو جاؤ۔ کل دفتر ٹھیک وقت پر آنا۔'' بڑے بابو مجھے ناراض سے لگے۔ تب بھی میں نے کہا:

''میں دفتر سب سے پہلے پہنچتا ہوں۔ بڑے بابو، ایک بات کہنی ہے۔ میں باہر کی کھڑکی سے

اپنے کمرے میں جھانک رہا تھا۔ میری ٹیبل کے اوپر ایک چوہا فائلوں کے بیچ گھسا ہوا ہے۔ چوہے فائلیں کتر ڈالیں گے۔ میں نے بھگانے کی کوشش کی تو وہ بھاگا نہیں۔"

بڑے بابو ہنسنے لگے۔ ہنستے ہنستے انھوں نے کہا، "سنتو بابو! مال خانے کے آس پاس کے سب چوہے یا تو افیم کی پینک میں رہتے ہیں یا شراب کے نشے میں۔ چوہے شراب کی بلیڈر میں چھید کر دیتے ہیں تو پوری زمین پر شراب پھیل جاتی ہے۔ تھوڑی بہت شراب چوہوں کے پیٹ میں ضرور جاتی ہوگی۔ کئی بار میں نے چوہوں کو لڑکھڑا کر جھومتے ہوئے چلتے دیکھا ہے۔ فائلوں سے ان کو کیا لینا دینا ہے؟ اب گھر جا کر سو جاؤ۔ اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ اور یہ بھی نہیں کہ رات کو تم نے یہاں اپنی ٹیبل پر چوہا دیکھا تھا۔ پر جاؤ گے کیسے؟ پیدل؟ نہیں، تم جلدی گھر پہنچو۔ مال خانے کی ایک اچھی سائیکل بھجواتا ہوں۔ تم یہیں رہنا۔ سمجھ گئے نا؟"

"جی ہاں،" میں نے کہا۔ بڑے بابو چلے گئے۔ ان کی چال میں مستی تھی۔

بڑے بابو کافی موٹے تھے۔ قد زیادہ نہیں تھا۔ ہائیڈروسل ہونے کے سبب ڈھیلی ڈھیلی پینٹ اور کافی نیچے تک ڈھیلی بش شرٹ پہنتے تھے۔ ان کو ہرنیا بھی تھا۔ ہرنیا کا آپریشن جاڑے میں کروانے والے تھے۔ پر جاڑا نکل جاتا تھا، کسی وجہ سے آپریشن کروا نہیں پاتے تھے۔ جب کبھی ان کی آنتیں اوپر چڑھ جاتیں تو وہ ہاتھ سے سہلا سہلا کر انھیں نیچے لے آتے تھے۔

ایک دن میں نے بڑے بابو سے کہا، "جب آپ کی آنتیں اوپر چڑھ جائیں تو بتلا دیجیے گا۔" گھنٹے بھر بعد ہی انھوں نے کہا، "دیکھو، آنتیں اوپر چڑھ گئیں۔" بش شرٹ کے بٹن کھول کر، بنیان چھاتی تک اوپر چڑھا کر انھوں نے اپنا پیٹ دکھایا۔ لمبائی سے ٹیڑھی ایک سوجن تھی۔ سب نے دیکھا۔ دھیرے دھیرے ہاتھ سے مالش کرتے ہوئے انھوں نے آنتوں کو نیچے اتارا۔

"دیکھا۔ اب سوجن دکھائی دیتی ہے؟" بڑے بابو نے کہنا شروع کیا۔ "میں جان ہتھیلی پر رکھ کر نوکری کرتا ہوں۔ کب یہ آنتیں موٹی رسیوں کی طرح دل کو جکڑ کر کسنے لگیں، کہا نہیں جا سکتا۔ میری جب بھی موت ہوگی، اس دفتر میں ہوگی۔ تم لوگوں کو ہاتھ پیر میں درد ہوگا تو تین دن کی چھٹی لے کر بیٹھ جاؤ گے، یا میری خوشامد کرو گے کہ ایک دو دن کی چھٹی بچا دوں۔ اگر مفت کی چھٹی نہیں ملی تو ٹیبل پر سر رکھ

کر سوتے رہو گے۔"

دیوانگن بابو نے کہا: "اس روز میرے سر میں کتنا درد تھا۔ اس کے باوجود میں نے دھیرے دھیرے پورا کام نمٹایا۔ آپ سے آدھے دن کی چھٹی کے لیے کہا تو آپ ناراض ہو گئے تھے۔"

دیوانگن بابو پانچ فٹ دو انچ کے تھے۔ ان کی دراز میں ایک ڈائری تھی، اس میں قد کے خانے میں انھوں نے پانچ فٹ دو انچ لکھا تھا۔ وزن میں ۵۸ کلو لکھا تھا۔ اسکوٹر، کار کے نمبر کی جگہ سائیکل کا نمبر تھا۔ ڈرائیونگ لائسنس نمبر کی جگہ ان کے دولڑکوں کا نام تھا— مدن لال دیوانگن اور سوہن لال دیوانگن۔ ٹیلی فون نمبر کی جگہ والد رام چرن دیوانگن، گرام ڈونگر گاؤں تھا۔ ریڈیو لائسنس کے نمبر کی جگہ انھوں نے ریڈیو لائسنس کا نمبر ہی لکھا تھا۔ سیف ڈپازٹ والٹ کی جگہ انھوں نے لکھا تھا— ہرے رنگ کی پیٹی۔

گاؤں میں ان کی ناٹک منڈلی تھی۔ بڑے بڑے گھنگریالے بال اور صاف رنگ تھا۔ جب تب دیوانگن بابو گاؤں کی ناٹک منڈلی کا ذکر کرتے تھے۔ انھیں دکھ تھا کہ نوکری کے بعد ان کی ناٹکوں سے دلچسپی بہت کم ہو گئی۔

گوراہا بابو نے بڑے بابو سے کہا: "آپ کسی کے ساتھ مروت نہیں کرتے۔ میری انگلی کٹ گئی تھی۔ اب بھی اس میں درد ہے۔ پرسوں بہت درد تھا۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ آج ٹائپنگ کا کام نہیں کروں گا۔ پر آپ نے زور دے کر ٹائپ کرنے کے لیے کہا۔ آپ کے پیٹ کی سوجن منٹ بھر میں دور ہو گئی۔ میری ہتھیلی اور انگلی میں دیکھیے کتنی سوجن ہے! رات کو درد کے مارے نیند نہیں آتی۔ گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح رک رک کر درد ہوتا رہتا ہے۔ صفائی کرتا ہوں لیکن جہاں کا تہاں ہے۔ لگتا ہے سوجن اور بڑھ گئی۔" انھوں نے اپنا سوجا ہوا ہاتھ ٹیبل کے اوپر رکھ دیا۔ ان کی انگلی میں پٹی بندھی تھی۔

"پان کا پتا رکھ کر پٹی باندھے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، گھی میں پان کا ہرا پتا کڑکڑا کر گھاؤ میں رکھا ہے۔" گوراہا بابو نے کہا۔

"اصلی گھی تھا؟" دیوانگن بابو نے پوچھا۔

"جیسا بھی ہو، پچیس روپے کلو کے خالص گھی کے بھاؤ سے آدھا کلو لایا ہوں۔" گوراہا بابو نے کہا۔

"میں گھی نہیں کھاتا۔ اس لیے نہیں کہ کنجوسی کرتا ہوں، پر گھی کھانا بھوجن میں رواج کی طرح

شامل ہو گیا ہے۔ میں اس رواج کو نہیں مانتا۔''

''آپ کی ذات کا کوئی گھی نہیں کھاتا؟'' گوراہا بابو نے پوچھا۔

''گھی کھانا کوئی ذات پات کا قاعدہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

ذات پات کا قاعدہ ہو یا نہ ہو، پر اچھی چیزیں مہنگی ہوتی تھیں اور خالص ہوں تو بہت مہنگی، اس لیے ان کا استعمال اونچے طبقے تک ہی محدود ہوتا تھا۔ گوراہا بابو کا آدھا کلو گھی تین چار مہینے ضرور چلتا ہوگا۔

اب بڑے بابو نے کہا، ''ناظر کو تم سب نے دیکھا ہے، دیکھا ہے نا؟ ان کی صرف ایک آنکھ ہے۔ نظارت اور مال خانے کی، دونوں کی ذمے داری ان کی ہے۔ ان کی نگاہ دونوں طرف رہتی ہے۔ بیس سال سے اسی طرح کام کر رہے ہیں، یعنی ایک آنکھ سے۔ سب ان کے کام سے خوش ہیں۔ ہاتھوں میں دس انگلیاں ہوتی ہیں۔ ان میں سے صرف ایک انگلی خراب ہوئی، باقی تو ٹھیک تھیں۔ میں نے گوراہا بابو سے کہا کہ ضروری کاغذ ہے، آج ہی ٹائپ ہو جانا چاہیے۔ آج ہی ٹائپ ہو جانا چاہیے کا مطلب ابھی فوراً ٹائپ ہونا چاہیے نہیں ہوتا۔ دھیرے دھیرے نو انگلیوں سے ٹائپ کرو۔ ایک انگلی سے اناڑی بھی ٹائپ کر لیتا ہے۔ تب گوراہا بابو کے ہاتھ میں سوجن نہیں تھی۔ کیا غلط کہا تھا؟ دیوانگن بابو نے سر درد کے بعد بھی کام نپٹائے۔ سر تو ایک ہے۔ ان کو اسی درد والے سر سے سوچ سوچ کر کام نپٹانا تھا۔ گوراہا بابو نو انگلیوں سے کام نپٹا سکتے تھے۔''

''اس دن کے کام کی وجہ سے پورے ہاتھ میں سوجن ہے۔''

''گوراہا بابو، کہیں تمھارے پیٹ کی آنت انگلی میں تو نہیں چڑھ گئی؟'' دیوانگن بابو نے کہا۔

بڑے بابو ہنسنے لگے۔ بولے، ''انگلی میں گھسی آنت کو مالش کر کے ہاتھ میں اتارنا پڑتا۔ ہاتھ سے پیٹ تک آنت کو لے جانا مشکل کام ہے۔ خطرناک بھی۔ دماغ میں چڑھ جاتی تو؟''

گوراہا بابو سنجیدہ ہو کر بولے، ''اس طرح آنت انگلی میں چڑھنے لگی، پھر انگلی سے فاؤنٹین پین کے سہارے ٹیبل پر۔ سامنے ٹائپ رائٹر ہوا تو ساری آنت کی بورڈ میں پھنس جائے گی۔ بڑے بابو، آپ کو ہی نہیں سب کو ہرنیا ہے۔'' گوراہا بابو بہت بے پروا لگ رہے تھے۔

''صرف ہرنیا ہی نہیں، اور بھی بھیانک بیماریاں سب کو ہیں،'' میں نے کہا۔

''اور کون کون سی بیماریاں ہیں، تمھی گنا دو۔ پہلے اپنی بیماریاں گناؤ،'' بڑے بابو نے مجھ سے کہا۔

Scanned with CamScanner

میں جھینپ گیا۔

''لگتا ہے کسی اسپتال کے دفتر میں کام ہورہا ہے،'' دیوانگن بابو نے کہا۔

''آپریشن کی ٹیبل پر دفتر کا کام ہورہا ہے،'' میں نے کہا۔

گوراہا بابو تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھے رہے، پھر اٹھ کر بڑے بابو کے سامنے آ کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے دھیرے سے کہا، ''آج میں کام نہیں کر سکوں گا۔ لگتا ہے مجھے بخار ہے۔ ہاتھ میں بہت درد ہے۔''

بڑے بابو نے فائل دیکھتے دیکھتے کہا، ''چھٹی دینا میرا کام نہیں ہے۔ جا کر صاحب سے مل لو۔ ساتھ میں اپنا ہاتھ بھی لے جانا۔ صاحب کو دکھا دینا۔''

''صاحب سے آپ بات کر لیجیے۔ میں بات نہیں کر پاؤں گا۔''

''کون سا ہاتھ ہے؟''

''بایاں۔''

''چھٹی کی درخواست میں جب تم صاف صاف لکھو گے کہ بائیں ہاتھ میں درد ہے تو شاید صاحب سوچیں کہ داہنے ہاتھ سے تو کام کر سکتے ہو۔''

''بڑے بابو، بایاں ہاتھ مجھ سے الگ نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے پورے بدن میں تکلیف ہے۔ میں صاحب کے پاس نہیں جاؤں گا۔ اگر بلائیں گے تو آپ کی چٹھی بھی ان کو دکھا دوں گا۔''

''آپ لکھ دیجیے کہ آپ کام نہیں کر پارہے ہیں۔''

''آپ سمجھتے ہیں میں جھوٹ بول رہا ہوں؟''

''نہیں، یہ تم نے کیسے سمجھ لیا! چونکہ تم نے کہا ہے اس لیے اب شک ہوتا ہے۔ سچ سچ بتلایئے، بہت تکلیف ہے؟''

''میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں؟''

''مجھے یقین ہے۔ صاحب کو یقین دلانے کے لیے ان کے سامنے آپ کا ہاتھ ہونا ضروری ہے۔ بغیر آپ کو لے جائے آپ کا ہاتھ میں کیسے لے جاؤں گا؟ اس لیے آپ میرے ساتھ ساتھ چلیے۔ آپ کو بات کرنے سے ڈر لگتا ہے تو آپ چپ رہیے گا، میں بات کر لوں گا۔'' بڑے بابو خاموش ہو کر اپنے کام میں لگ گئے۔ گوراہا بابو ٹائپ رائٹر کے سامنے بیٹھ گئے۔ انھوں نے ایک بار ہم سب کی

طرف دیکھا۔ صرف میں ان کی طرف دیکھ رہا تھا، باقی سب کام کر رہے تھے۔ گوراہا بابو نے داہنے ہاتھ سے ٹائپ رائٹر سرکایا، پھر ٹیبل پر سر ٹکا کر آنکھ موندی اور سو گئے۔ ان کا سوچا ہوا ہاتھ سنبھلا ہوا ان کی گود میں تھا۔ داہنا ہاتھ کرسی کے ہتھے پر تھا۔

شام کو گھر لوٹتے وقت میں نے گوراہا بابو کا داہنا ہاتھ چھو کر دیکھا۔ ہلکا بخار تھا۔ گوراہا بابو سے دیوانگن بابو نے کہا، ''رکشے سے چلے جائیں۔'' گوراہا بابو نے کہا کہ ہلکی حرارت ہے۔ دونوں سے میں نے ذکر کیا کہ یہ بڑے بابو کی زیادتی ہے۔ ''دیوانگن بابو، آپ کچھ کیجیے،'' میں نے کہا۔

''میں صرف ناٹک کر سکتا ہوں،'' دیوانگن بابو نے کہا۔ انھوں نے میری بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ اس لیے میں نے کہا، ''تو ناٹک کیجیے۔ دیکھیے، سامنے اسٹیج ہے،'' سڑک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا۔ دونوں اسی طرف دیکھنے لگے۔ ڈاک بنگلے کی طرف جاتی ہوئی ایک لڑکی بہت سندر تھی۔ لڑکی کالج میں پڑھتی ہوگی، یا بالکل اسی سال کالج سے نکل کر کسی دفتر میں نوکری کرتی ہوگی، یا دفتر میں نوکری نہ بھی کرتی ہو۔ سفید وردی اور سفید ٹوپی پہنے پانچ لوگوں کی ٹولی، جو میونسپلٹی کے چپراسی تھے، ڈاک بنگلے کی طرف مڑ گئی۔ سامنے جو میں نے اشارہ کیا تھا اسے گوراہا بابو اور دیوانگن بابو نے لڑکی کی طرف کیا گیا اشارہ نہیں سمجھا ہوگا، چپراسیوں کی طرف کیا گیا اشارہ سمجھا ہوگا۔

''منچ کے پیچھے ایک سفید پردہ لگا ہے۔ سفید پردہ سفید کاغذ کی مانند۔ پردے کے داہنی طرف تاریخ ہونی چاہیے۔ جس دن ناٹک ہو اس دن کی تاریخ یا کوئی تازہ تاریخ۔ پھر بڑے بڑے حروف میں مختصر موضوع لکھا ہونا چاہیے۔ اتنے بڑے بڑے حروف میں کہ دیکھنے والے پڑھ سکیں۔ یا پڑھ کر دیکھنے والوں کو موضوع بتلا دیں۔ کھٹ کھٹ کئی ٹائپ رائٹروں کی آواز گونجتی رہنی چاہیے۔ اچانک سناٹا ہو، پھر ایک ٹائپ کے دبنے کی زور کی آواز ہونی چاہیے اور کاغذ سے سٹ کر ایک آدمی اچانک کھڑا ہو جائے۔ ابھر کر آئے ہوئے ایک حرف کی طرح۔ یہ آدمی گاؤں کا آدمی ہوگا۔ سانولا، روکھڑ کھال والا، دھول سے گھٹنوں تک بھرے اس کے پیر ہونے چاہییں۔ اور وہ جو بھندئی جوتا پہنے ہو اس کے چمڑے اور دیہاتی کے چمڑے میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔ باقی جسم پسینے سے چمکتا رہنا چاہیے۔ اور وہ تماشائیوں کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ کھڑے کھڑے جھکے، خوشامد کرتا ہوا۔ کبھی سر جھکائے کافی دیر تک کھڑا رہے جیسے اس سے غلطی ہوگئی ہے۔ اب اس کی سزا اسے ضرور ملے گی۔ کھٹ کی ایک اور آواز ہو۔ اس بار ایک

Scanned with CamScanner

عورت موچی ہوگی۔ وہ آ کر دیہاتی کے پاس بیٹھ جائے گی۔ عورت ادھیڑ دیہاتی عورت ہی ہوگی۔ جوتے میں کیلیں ٹھوکتی ہوئی۔ جوتا ایسا ہو جسے ایک غریب نے بے کار ہونے کے بعد ایک بار پھینکا ہوگا۔ پھر کسی دوسرے اور زیادہ غریب نے پہننے کے لیے سڑک یا گھر سے اٹھا لیا ہوگا۔ اور اس طرح ہزار بار پھینکا گیا جوتا ہو۔ اس کے بازو میں، ٹائپ رائٹر کی کھٹ کی آواز ہوتے ہی ایک چار پانچ سال کا لڑکا آ کر کھڑا ہو جائے۔ پھر چھ سات لوگوں کا ایک جملہ بنائیے جس میں کئی طرح کے لوگ ہوں۔ عام سا جملہ۔ ضرورت کا جملہ، جیسے 'میں آ گیا ہوں'، یا 'چپ چاپ کھڑے ہوں گے'، 'بھوک لگ رہی ہے'، 'سگندھ آ رہی ہے'، 'دو گھنٹے میں بیس پیسے'، وغیرہ۔ مجھے کچھ سوجھ نہیں رہا ہے۔ گورا بابو، آپ کوئی جملہ بنائیے،'' میں نے کہا۔

''کیا وقت ہوا ہے؟'' گورا بابو نے پوچھا۔

''آپ یہ جملہ بتا رہے ہیں یا وقت پوچھ رہے ہیں؟'' میں نے کہا۔

''کافی دیر ہو گئی،'' دیوانگن بابو نے کہا۔

''آپ جملہ بنا رہے ہیں یا گورا بابو کی بات کا جواب دے رہے ہیں؟'' میں نے دیوانگن بابو سے کہا۔ اب دونوں چپ تھے۔ میں نے کہنا شروع کیا،'' پھر کاغذ سے نکل کر یہ اہم جملہ، یعنی سب کردار مل کر کسی چھوٹے موٹے واقعے کو اسٹیج کریں، کوئی چھوٹی بات ہو، یا کوئی درخواست ہی ہو۔''

گورا بابو نے کہا،'' وہ درخواست میری چھٹی کی ہونی چاہیے، کہ ایسے حالات کے باعث جن سے میں بچ نہیں سکتا، دو روز کی اتفاقی چھٹی دینے کی مہربانی کریں۔ نیچے میرا دستخط ضرور ہونا چاہیے۔''

دیوانگن بابو نے کہا،'' ان حالات کی وضاحت کرنی ہوگی۔''

گورا بابو بولے،'' ایک خراب حالت میں رہتے رہتے اس کی بھی عادت پڑ جاتی ہے اور وہ خراب نہیں لگتی۔ اور بہت خراب حالت ہو جائے تب دفتر سے چھٹی لینی پڑتی ہے۔''

میں نے کہا،'' انتہائی خراب حالت کی بھی عادت پڑ جائے، اس لیے آپ کی چھٹی منظور نہیں ہوگی۔''

دیوانگن بابو نے کہا،'' دیکھنے والوں میں صرف بابو نہیں ہوں گے۔ بہت سے محلے والے ہوں گے۔ صاحب بھی ہوں گے۔ مہمان خصوصی ان کو بنانا ہوگا۔''

Scanned with CamScanner

''اگر صاحب بھی ہوں گے تو درخواست کے نیچے میرا دستخط نہیں رہے گا،'' گورا بابو نے کہا۔

''ڈر گئے؟'' میں نے کہا۔

''ڈر نہیں۔ میرا نام ہی کیوں؟ سب کا ہونا چاہیے۔''

''چھٹی کی تم کو ضرورت نہیں ہے؟'' دیوانگن بابو نے پوچھا۔

''ہے، پر میری چھٹی کا ناٹک نہیں ہوگا۔''

''درخواست کس کام کے لیے ہونی چاہیے؟'' میں نے کہا۔

''میں نہیں جانتا۔ ناٹک کا مجھے تجربہ نہیں ہے،'' گورا بابو نے کہا۔

''میں اسکول میں ناٹکوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔ کالج میں میں نے ایک ناٹک لکھا تھا۔ اور وہ کسی کو پسند نہیں آیا،'' میں نے کہا۔

''میں ہمیشہ سے دیکھنے والا رہا،'' گورا بابو نے کہا۔

پانچوں چپراسیوں کی ٹولی لوٹ کر آ رہی تھی۔ وہ ہم لوگوں کے پاس سے نکلے۔ تین بابو اور پانچ چپراسی۔ ایک چپراسی کے ہاتھ میں پتوں میں لپٹا پان تھا۔ اسی کی سفید وردی میں پان سے ٹپکا ہوا کتھا لگ گیا تھا۔

''ان سفید وردی والے چپراسیوں سے خاکی وردی والا اپنا مہنگو اچھا ہے،'' گورا بابو نے کہا۔

مہنگو مال خانے سے جو سائیکل لایا تھا، وہ بالکل نئی تھی۔ جیسے کل خریدی گئی اور کل ہی لاوارث ہو کر ضبط ہوئی۔ ''رام رام صاحب!'' مہنگو نے کہا۔ سائیکل کو اس نے برآمدے سے اتارا۔ آگے بڑھ کر میں نے اس سے سائیکل لے لی۔

''رات کو روز آتے ہو مہنگو؟ یہاں تو پورا دفتر خالی ہے۔''

وہ چپ تھا۔ اس کی بھی گانجا پینے کی عادت تھی۔ پر وہ بہت ایماندار اور کام کرنے والا چپراسی تھا۔ صاحب لوگوں میں مہنگو کو اپنے کام کے لیے لینے کی ہوڑ رہتی تھی۔ مہنگو کی وجہ سے مال جمعدار سے صاحب لوگ ناراض ہو جاتے۔ اس لیے مہنگو کے بارے میں مال جمعدار دخل اندازی نہیں کرتا تھا۔ سب سے بڑے صاحب کے لیے سب سے اچھا چپراسی طے تھا۔ مہنگو اپنے آپ میں کئی نوکروں کے برابر تھا۔

Scanned with CamScanner

کھانا اچھا بناتا تھا۔ طرح طرح کی ناشتے کی چیزیں بناتا تھا۔ دورے میں صاحب کے ساتھ وہ ضرور جاتا، پر بائی صاحب کو تکلیف ہو جاتی تھی۔ یہ تکلیف صاحب کی غیر موجودگی میں برداشت کی جا سکتی تھی کیونکہ صاحب کے نہ ہونے سے کام بھی کم ہو جاتا۔ صاحب کے رہتے ہوئے اگر مہنگو غائب ہو جائے تو بائی صاحب کی کیا حالت ہوگی یہ وہ نہیں جانتی تھیں، کیونکہ ایسی نوبت نہیں آئی تھی۔ بلکہ مہنگو دس دس دن لگاتار اپنے گھر نہیں جاتا تھا۔ بائی صاحب کہتیں، ''اب رہنے دو۔ رات کے دس بج گئے۔ اب گھر جاؤ۔'' وہ کہتا، ''جی صاحب، رسوئی گھر صاف کرنا بچا ہے۔'' پھر وہ کسی جگہ وردی پہنے پہنے سو جاتا تھا۔

سائیکل بہت ہلکی چل رہی تھی۔ راستے میں بہت رات ہو جانے کا سناٹا تھا۔ گھر لوٹتے وقت مجھے لگا کہ آج کے دن میں آخری بار گھر لوٹ رہا ہوں۔ ابھی دفتر سے کام ختم کرنے کے بعد لوٹنے کا سکھ مجھے مل رہا تھا اور آج گویا دفتر میں کام بہت تھا۔

''اماں! او اماں!'' کنڈی کھٹکھٹاتے ہوئے میں چلّایا۔ اماں کے آنے کی آہٹ سنائی دی۔ دروازے کی دراڑ سے میں نے دیکھا تو قندیل کا ہلتا ڈلتا اجالا دکھائی دیا۔ دروازہ کھلنے کے پہلے ماں نے پوچھا، ''سنتو؟''

''ہاں اماں۔''

اماں نے دروازہ کھولا۔ ''کتنا بجا ہوگا؟''

''ایک دو بجے ہوں گے۔''

''کہاں گیا تھا؟''

''دفتر گیا تھا۔ بہت ضروری کام تھا۔ تم سو جاؤ۔ میں دروازہ بند کر لوں گا۔''

اماں کی عادت تھی، رات کو جب بھی اٹھتیں، قندیل لیے گھر کے بند دروازے کو ٹٹول کر دیکھتی تھیں کہ بند ہے یا نہیں۔

پیچھے کا دروازہ بند تھا۔ پھر بھی جی چاہا اسے کھول کر دیکھوں۔ دروازہ کھولتے ہی سامنے مکان مالک کے بنگلے پر رات بھر جلنے والے بلب کے اجالے میں مکان مالک کے قبضے کا ماحول تھا۔ قریب ایک ایکڑ کے احاطے میں یہ بنگلہ تھا۔ بنگلے کے ٹھیک سامنے ایک بڑا سا باغیچہ تھا۔ جگہ جگہ نیم کے پیڑ تھے۔ ایک بہت بڑا ببول کا پیڑ تھا۔ قریب قریب سبھی پیڑ اینٹوں کے چبوترے سے گھیر لیے گئے تھے۔ مکان

Scanned with CamScanner

مالک ڈاکٹر تھا، اس لیے علاج کروانے کے لیے آئے دیہاتی مریضوں کو، جو دور دور کے گاؤں سے آتے تھے، ان چبوتروں کا بڑا آسرا تھا۔

جب تب کچھ نہ کچھ بنتا رہتا تھا۔ اس لیے ہزار پانچ سو اینٹوں کی بچی ہوئی تھپی ببول کے پیڑ کے پاس جمی رہتی تھی۔ ان اینٹوں کا استعمال دیہاتی مریضوں کے ساتھ آئے ناتے رشتے دار چولھا بنانے میں کرتے تھے۔ یہ لوگ گاؤں سے چاول، آٹا، لکڑی، کنڈے بھی لے کر آتے تھے۔ کنویں میں ہینڈ پمپ لگا تھا۔ اس کا پائپ کنویں میں زیادہ نیچے نہیں تھا اس لیے مارچ اپریل کے مہینے میں ہی پانی ہینڈ پمپ کے پائپ سے نیچے اتر جاتا تھا۔ تب ہینڈ پمپ بے کار ہو جاتا تھا۔ جان بوجھ کر پائپ چھوٹا رکھا گیا تھا۔ موٹر پمپ سے ڈاکٹر گری بھر اپنے لیے پانی پاتا تھا۔ اسے کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ ہینڈ پمپ کرائے داروں کے لیے بنایا گیا تھا۔ ابھی اکیلا میں کرائے دار تھا۔ کنویں کے بازو کے موٹر پمپ کے لیے ٹین کا ایک شیڈ بنا تھا۔ پچھواڑے سے ہی سورج اور چاند نکلتا تھا۔ بہت رات ہو جانے کا ماحول تھا۔

بیوی میرے بستر پر سو رہی تھی۔ وہ جان بوجھ کر میرے بستر پر سو رہی تھی کہ میرے لوٹتے ہی اسے میرے آنے کی خبر ہو جائے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری موجودگی وہ اپنی وجہ سے جانے۔ جبکہ میں اسے اپنی موجودگی جتلانا چاہتا تھا۔ مجھے پیاس لگ رہی تھی۔ کھاٹ کے نیچے لوٹے میں پانی رکھنا وہ بھول گئی تھی اور مجھے میری وجہ مل گئی۔ اسے ہلاتے ہوئے میں نے جگایا، ''مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ تم پانی رکھنا بھول گئیں۔''

ساڑھی کے آنچل کو اٹھاتے ہوئے وہ اٹھی۔ ''پانی رکھا تو تھا'' کہہ کر اس نے آنکھ کھول کر مجھے دیکھا۔ پھر آنکھ بند کر بیٹھے بیٹھے وہ اونگھنے سی لگی۔

''تم کو تو اٹھانا آفت ہے۔'' چارپائی کے نیچے اس نے ایک بھرا لوٹا، کٹوری سے ڈھک کر اندر رکھ دیا۔ پھر وہ اپنی چارپائی پر جا کر لیٹ گئی۔ تب میں نے پانی پیا۔

''کتنا بجا ہوگا؟''

''ڈیڑھ دو بجا ہوگا،'' میں نے کہا۔

''کہاں گئے تھے؟''

''دفتر گیا تھا۔''

Scanned with CamScanner

''اتنی رات کو؟''

''ہاں، صاحب نے بلایا تھا۔ ضروری کام تھا۔''

یہ سننے کے پہلے ہی وہ سو چکی تھی۔ میں بستر پر پڑے پڑے دیر تک جاگتا رہا۔ دھوبیوں کے کپڑے دھونے کی آواز دور تالاب سے آتی ہوئی سنائی دینے لگی۔ پھر مرغے نے بانگ دی۔ کچھ دیر بعد دھان کی فصل سے لدی بیل گاڑیاں سڑک پر گزرنے لگیں۔ میں اماں کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔ سب سے پہلے اماں ہی اٹھتی تھیں۔ میں سویا نہیں تھا، اس لیے نیند کھلنے والی کوئی بات نہیں تھی۔

رات بھر جاگ کر ہی آنے والے دن کو پکڑ سکتے تھے۔ اگر سوتے رہے تو لگتا تھا کہ دن کا پیچھا نہیں کر رہے ہیں، راستے میں سو گئے ہیں۔ ایسے میں دوسرا دن پکڑ میں کہاں آتا تھا؟ اور گلے پڑ جاتا تھا۔ نیند کھلتے ہی گلے پڑا ہوا دن۔ آخر ایک کچھوے کی طرح چل کر میں نے دوڑ پوری کی۔

میں بار بار گھر سے باہر جاؤں گا اور بار بار گھر لوٹوں گا۔ دن میں کئی بار اور رات میں بھی۔

❄

دھوپ کمرے میں آتی ہے۔ سورج نہیں آتا۔ بارش کے دن لگاتار

تین دن کی دھوپ کی ضرورت تھی۔

اس سے زیادہ دن کی دھوپ نہیں چاہتا تھا۔

صبح کے ساڑھے چھ بجے تھے۔ وہ پیچھے کی کھڑکی کھول کر ڈاکٹر کے بنگلے کی طرف دیکھتی ہوئی کھڑی تھی۔ پندرہ بیس منٹ ہو گئے۔

میں نے اس سے کہا، ''اب تم جاؤ، میں دیکھتا ہوں۔ تمھارے دیکھنے سے ڈاکٹر صاحب نہیں نکلیں گے۔''

صبح صبح کے دوسرے کام نپٹانے کے لیے وہ چلی گئی۔ میں کھلی کھڑکی سے ببول کے پیڑ، پھر اس کے بعد باغیچے میں کینا کے آس پاس دیکھ رہا تھا۔ باغیچے کا اتنا ہی حصہ دکھائی دیتا تھا۔ باقی حصہ ڈاکٹر صاحب کے بنگلے سے چھپا ہوا تھا۔ بنگلے کے سامنے کا حصہ باغیچے کی طرف تھا، اس لیے پورچ وغیرہ کچھ

Scanned with CamScanner

نہیں دکھائی دیتا تھا۔ صبح کچھ دیر کے لیے ڈاکٹر صاحب باغیچے میں گھومتے تھے۔ انھیں دیکھتا تو ان سے جا کر بات کرتا۔ باغیچے کے بعد بائیں طرف سول لائن سے آتی ہوئی سڑک تھی جو باغیچے کے کنارے کنارے ہوتی ہوئی نکل جاتی تھی۔ سڑک پر چلتے ہوے لوگ باغیچے کی جھاڑیوں کی آڑ میں آتے ہی ایسے لگتے تھے جیسے باغیچے کے اندر ہوں۔ سڑک پر چلنے والے ایرے غیرے آدمی سے بھی باغیچے کی آڑ میں دھوکا ہو جاتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب ہیں۔ ایک آدمی، جسے دیکھ کر مجھے دھوکا ہوا تھا کہ ڈاکٹر صاحب ہیں، جب کھلی سڑک پر آیا تو معلوم ہوا کہ نالی صاف کرنے والا مہتر ہے۔ احاطے کی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ دیوار کے اوپر لوہے کے کنٹیلے تار لگا دیے گئے تھے۔ جب تک مہتر کی بانس میں بندھی جھاڑو نہیں دکھی تب تک یہ پتا نہیں چلا تھا کہ مہتر ہے۔ اگر اس کے ہاتھ میں جھاڑو نہ ہوتی تو اسے مہتر کہنا مشکل تھا۔ سول لائن کی سڑک اونچائی سے نیچے اترتی تھی اس لیے بائیں طرف اونچے میں آتے جاتے لوگ پورے دکھائی دیتے تھے۔ آدمی کے پیروں کے نیچے دبی ہوئی سڑک اور زمین بھی دکھائی دیتی تھی۔

راستے میں باغیچے کی آڑ میں جو ٹرک کھڑا تھا وہ بھی باغیچے کے اندر کھڑا لگتا تھا۔ اتنی صبح ہو گئی تھی تب بھی بنگلے کے اوپر جلنے والا بلب بجھایا نہیں گیا تھا۔ چوکیدار بھول جاتا تھا۔ جب اسے یاد آتا بجھا دیتا تھا۔ آٹھ نو تو روز بجتے تھے۔ اس سے پہلے بلب کبھی نہیں بجھتا تھا۔ اس مکان میں آنے پر شروع شروع کے دنوں میں جلتے ہوے بلب کو دیکھ کر میں چوکیدار کو جا کر بتلاتا کہ بلب فالتو جل رہا ہے، بجھا دو۔ ایک بار اسے ڈھونڈنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت لگ گیا تھا۔ چار پانچ دنوں کے بعد میں نے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ مجھے لگا تھا کہ اس طرح بلب بجھانے کی ذمے داری میری ہو جائے گی۔ موٹر پمپ چالو ہوا تو ٹین کے اوپر بیٹھا ہوا کوا چونک کر اڑ گیا۔ اگر آس پاس کوئی کتا ہوتا تو لمحے بھر کے لیے اس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ وہ چوکنا ہو جاتا۔ کوئی انجان ہوتا تو جان جاتا کہ وہاں شیڈ میں موٹر پمپ ہے۔ موٹر پمپ کے چلنے کے بعد مجھے یاد آیا کہ منظر میں موٹر پمپ ہے۔ منظر میں اَن گنت چیزیں ہوتی ہیں۔ پر کسی سبب سے معلوم ہوتی ہیں، ویسے نہیں۔

چھت کے ٹپکنے کی پریشانی ہر حالت میں مالک مکان سے کہنی تھی۔ برآمدہ، چوکا اور دونوں کمرے ٹپکتے تھے۔ چاہتا تھا کہ باہر ٹہلتے ہوے وہ دکھائی دے جائیں تو اچھا ہے۔ بنگلے میں جا کر گھنٹی بجاؤں گا، کوئی آ کر دیکھ جائے گا، پھر اندر خبر جائے گی۔ لمبے وقت تک انتظار کرنے کی اس وقت سے

میں بچنا چاہتا تھا۔ میں نے بیوی سے کہا تھا کہ صبح اٹھ کر وہ ڈاکٹر صاحب کے نکلنے کا دھیان رکھے۔

میرا سارا دھیان ڈاکٹر صاحب کے نکلنے کی طرف تھا۔ جیسے شکاری شیر کا انتظار کرتا ہے، ویسا دھیان نہیں تھا۔ گھیرے کے لیے پیڑ کے نیچے بندھی بکری کا جیسا دھیان ہوگا ویسا بھی نہیں تھا۔ میرا دھیان ہو بہو ایک کرائے دار کی طرح تھا، مکان مالک کا راستہ دیکھتے ہوئے۔ جب شیر نکلتا ہے تب دوسرے جانوروں، چڑیوں میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ میں نے دیکھا، ببول کے پیڑ کے نیچے بیٹھے مریض کے ناتے رشتے دار اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ قریب قریب ایک ساتھ ان لوگوں نے بنگلے کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑے تھے۔ بعد میں مریض بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ کنویں کے پاس کھڑے لوگ اسی طرف جانے لگے۔ مجھے ڈاکٹر صاحب کے نکلنے کی اطلاع مل گئی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب آ گئے ہیں،'' چپل پہنتے ہوئے میں نے کہا اور کھڑکی سے کود کر کمپاؤنڈ کی ٹوٹی دیوار کے بیچ سے تیزی سے نکلا۔ کمپاؤنڈ کے اندر یعنی پگڈنڈی پر جلدی جلدی قدم رکھتا ہوا بنگلے کی طرف گیا۔

میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ ڈاکٹر صاحب باغیچے میں ٹہل رہے تھے۔ ساٹھ پینسٹھ سال کی عمر میں بھی ان کے کافی بال کالے تھے۔ چھ فٹ اونچا اور بھاری بدن تھا۔ وہ بہت دھیرے دھیرے باغیچے میں ٹہل رہے تھے۔ میں نے انھیں نمسکار کیا۔

وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے۔

میں جیسے اپنے آپ ان کے پیچھے چلنے لگا۔ عام طور پر یہ ہوتا ہی ہے۔ جب ندی بہہ رہی ہو اور اس میں ایک سوکھی ٹہنی ڈال دی جائے تو وہ ضرور بہے گی۔ ندی کے کنارے کے پیڑ سے سوکھی ہری پتیاں ٹوٹ کر گریں گی اور بہنے لگیں گی۔

آنے والی برسات کے لیے وہ باغیچے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

''مالی!'' انھوں نے پکارا۔

میں نے گلاب کی جھاڑیوں سے نکلتا ہوا مالی دیکھا۔ وہی لمبا بوڑھا مالی تھا جو ایک بار دفتر آیا تھا۔ صاحب کے باغیچے میں بھی یہی مالی کام کرتا تھا۔ بڑے بابو نے کہا تھا کہ اس کے ساتھ جا کر ٹاؤن ہال سے کچھ پودے نکلوا کر صاحب کے لیے بھجوا دوں۔ سائیکل لیے لیے تھوڑی دور تک اس کے ساتھ پیدل چلا تھا۔

Scanned with CamScanner

میں نے کہا، ''تم ٹاؤن ہال جاتے ہو؟''

موٹی آواز میں اس نے جواب دیا، ''ہاں۔''

''پہلے کیوں نہیں بتلایا! تمھارے ساتھ پیدل سائیکل لے کر چل رہا ہوں۔ میں سائیکل سے چلتا ہوں، تم آجانا۔'' کہہ کر میں سائیکل سے چل پڑا۔

ٹاؤن ہال کے گیٹ کے پاس میں اتر گیا کہ اس کا انتظار کرلوں۔ پر دو منٹ بھی انتظار نہیں کرنا پڑا، وہ میرے پاس آ گیا تھا۔

مالی نے مجھے ایک لمحے کے لیے گھور کر دیکھا۔ پتا نہیں اس نے مجھے پہچانا یا نہیں۔

اب ڈاکٹر صاحب کے پیچھے مالی چلنے لگا تھا۔

''امرود کے لیے یہاں گڈھا کھودنا ہے۔'' انھوں نے اپنی چھڑی سے زمین پر ایک گول نشان بنا دیا۔ ''اس پیڑ کو کاٹنا ہے،'' انھوں نے منگنے کے پیڑ کی طرف چھڑی سے اشارہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب بار بار آنے والی برسات کے بارے میں مالی کو ہدایت دے رہے تھے۔

ابھی تک صرف ایک بار پانچ منٹ پہلے پانی برسا تھا۔ کافی تیز برسا تھا۔ باغیچے کی مٹی ابھی تک گیلی تھی۔ اس طرح کی بارش کی امید نہیں تھی۔ پہلے ایک بار بھی بونداباندی نہیں ہوئی تھی اور نہ بادل گھرے تھے۔ اس پانی کے برستے ہی لوگ گرمی کے گزرنے اور آنے والی برسات کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔

مالی کے ہاتھ میں جو قریب پون میٹر لوہے کی چھڑ تھی اس کی وجہ سے مجھے اس سے کافی پیچھے چلنا پڑ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پتلی لکڑی کی طرح تھے جو بہت آگے پیچھے ہوتے تھے۔ چھڑ کی نوک لگنے کا ڈر تھا۔ باغیچے سے باہر نکل کر ڈاکٹر صاحب اس طرف بڑھے جہاں دو عورتیں ابھی ابھی آئی موٹر کار سے اتر رہی تھیں۔ وہ ان کے ساتھ بنگلے کے اندر چلے گئے۔

مالی ڈاکٹر کے بتائے ہوئے کے مطابق باغیچے میں کام کرنے لگا تھا۔

ببول کے پیڑ کی طرف آ کر میں نے دیکھا کہ بیوی کھڑکی میں کھڑی میرا انتظار کر رہی ہے۔ ہاتھ ہلا کر میں نے اشارہ کیا کہ ڈاکٹر صاحب سے ابھی تک بات نہیں ہوئی ہے۔

اچانک بڑی بڑی بوندیں گرنے لگیں۔ میں نے سوچا ببول کے پیڑ کے نیچے کھڑا ہو جاؤں۔

Scanned with CamScanner

پانی سے بچنے کے لیے دوسرے لوگ دوڑتے ہوئے برآمدے میں چڑھ گئے۔ ببول کے پیڑ کے نیچے والا مریض اور اس کے ساتھ دو لوگ دھیرے دھیرے بھیگتے ہوئے چڑھے۔ برآمدے میں ایک تخت پڑا تھا۔ تین بنچیں تھیں اور کئی کرسیاں۔ یہ سب مریضوں کے لیے رکھا تھا۔ برآمدے سے لگے ہوئے ایک کمرے میں ڈاکٹر صاحب بیٹھے تھے۔ اس کے بعد اندر ایک کمرہ اور تھا جہاں جانچ پڑتال ہوتی تھی۔ ایکسرے مشین کمرے میں تھی۔ برآمدے میں اوپر ایک چھت کا پنکھا لگا تھا۔ بہت اُمس تھی۔ پنکھے کی ہوا سے مجھے اچھا لگا۔ میں بھی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ بازو میں ایک ادھیڑ بیوپاری جیسا آدمی بیٹھا تھا۔ وہ مریض نہیں لگ رہا تھا۔ پر انگوچھے سے ہوا کرتے ہوئے پریشان لگ رہا تھا۔

''آپ پنکھے کے نیچے بیٹھ جائیے،'' میں نے کہا۔

یہ سن کر اس نے انگوچھے کو گھمانا بند کر دیا۔ پنکھے سے یہاں تک تھوڑی ہوا آتی تھی۔ انگوچھے سے ہوا کرنا شاید اس کی عادت تھی۔

''ڈاکٹر صاحب کب آئیں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''آٹھ بجے ان کا یہ اسپتال کھل جاتا ہے۔ آٹھ تو بج رہے ہوں گے؟'' میں نے کہا۔

گھڑی دیکھ کر اس نے کہا، ''ہاں۔''

''آپ کے ساتھ بیمار ہے؟'' میں نے پوچھا۔

بنچ پر لیٹی ہوئی ایک موٹی عورت کی طرف اس نے اشارہ کیا۔ اس کی کمر میں سونے کی پتلی زنجیر تھی۔ کروٹ میں کمر کا جو حصہ اوپر تھا، اس سے چابیوں کا ایک گچھا لٹک رہا تھا۔ چربی والا پیٹ نیچے لٹک گیا تھا۔

میں نے پوچھا، ''کیا تکلیف ہے؟''

کچھ سوچ کر اس نے کہا، ''چکر آتے ہیں۔''

اس کے بعد وہ میری طرف گھوما۔

''تم کو کیا ہوا ہے؟''

''میں بیمار نہیں ہوں۔ برسات شروع ہو گئی ہے۔ کچھ دیر پہلے ہلکی سی بدلی چھائی تھی۔ کسے معلوم تھا کہ پانی برسنے لگے گا۔ اب جھڑی لگ گئی۔ میں پریشان ہوں، اس لیے آپ کو بیمار لگ رہا ہوں گا۔

Scanned with CamScanner

میں ڈاکٹر صاحب کا کرائے دار ہوں۔ پانچ دن پہلے جو پانی برسا تھا، اس سے پتا چلا کہ پورا گھر ٹپکتا ہے۔ گھر میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نہ ٹپکنے والی سوکھی جگہوں کا پتا لگا کر سامان سمیٹ لیا گیا۔ پر زیادہ دن یہ کیسے چلے گا؟ ابھی تو برسات شروع ہوئی ہے۔ بیوی پانی برسنے سے پریشان ہو رہی ہوگی۔ سامان کو اِدھر اُدھر ہٹا کر ٹپکتے پانی سے بچا رہی ہوگی۔"

"ارے، کتنی دور گھر ہے؟" اس نے پوچھا۔ اس نے انگوچھے سے پھر ہوا کرنی شروع کر دی تھی۔ اسے میری بات میں مزہ آ رہا ہوگا۔

"یہیں ہے، ببول کے پیڑ کے پاس سے نظر آتا ہے۔"

"بھلے آدمی، دوڑ کر چلے کیوں نہیں جاتے؟"

میں اپنی بات پوری کرنے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب بہت مصروف آدمی ہیں۔ آٹھ سے ایک بجے تک یہاں رہیں گے۔ پھر تین سے چھ بجے شام تک رہیں گے۔ بیچ میں کھانا کھائیں گے۔ آرام کریں گے۔ شام کو کلب چلے جاتے ہیں۔ رات کو بارہ بجے تک لوٹتے ہیں۔ اب آپ بتائیے، صبح گھنٹہ آدھا گھنٹہ ان کے پاس رہتا ہوگا، اس بیچ اگر ملاقات نہیں ہوئی تو کبھی نہیں ہوگی۔ اگر میں بیمار ہوا تو یہاں نہیں آؤں گا۔ ان کی فیس بہت زیادہ ہے۔ بیس روپے فیس دے کر میں علاج نہیں کرا سکتا۔ میں سرکاری اسپتال جاتا ہوں۔ سرکار جو سہولت دیتی ہے، اس کا استعمال کرنا چاہیے۔ یہاں کوئی کیس خراب ہو جاتا ہے تو سرکاری اسپتال جاتا ہے۔ مجھے دکھ ہے کہ دیہات کے غریب یہاں آتے ہیں۔ ببول کے پیڑ کے نیچے پڑے رہیں گے۔ برسات کے لیے ادھر دیکھیے ایک پرانا کوٹھا ان کے لیے صاف کروا دیا گیا ہے۔ لگتا ہے بارش کم ہو رہی ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔ نمسکار۔"

اگر میں رکا رہتا اور اسی طرح باتیں کرتا رہتا تو اسے اچھا لگتا۔

احاطے کی دیوار کے نیچے گھر کے پچھواڑے میں بہت پانی جمع ہو گیا تھا۔ بھیگا ہوا میں گھر کے اندر گھسا۔ گھر کا پورا سامان پانچ دن پہلے جس طرح تتر بتر تھا ویسا ہی پھر ہو گیا۔ بیچ کے دنوں میں دھیرے دھیرے بے ترتیب سامان اپنی اپنی جگہ جانے لگا تھا۔

"ڈاکٹر سے بات ہوئی؟" بیوی نے پوچھا۔

Scanned with CamScanner

''نہیں ہوئی۔''

''کیوں؟''

''بیچ میں مالی آ گیا،'' میں نے مایوس ہو کر کہا۔ میری گردن پر چھت کا پانی ٹپ ٹپ ٹپکا تو میں تھوڑا ہٹ گیا۔

''کون مالی؟'' بیوی نے پوچھا۔

''صاحب کا مالی۔'' ایک بار اسے لے کر ٹاؤن ہال گیا تھا، صاحب کے لیے پھولوں کے پودے نکلوانے۔ ڈاکٹر صاحب کے پیچھے وہ تھا، اس کے پیچھے میں۔ بوڑھا ہے۔ مجھ سے لمبا ہے۔ باغیچے میں گھومنے کے لیے اتنا پتلا راستہ ہے کہ صرف ایک آدمی چل سکتا ہے۔ دوسرا ہو تو اسے پیچھے چلنا پڑے گا۔ ڈاکٹر صاحب اور میرے صاحب میں اچھی پہچان ہوگی، اس لیے میں تھوڑا ڈر بھی گیا۔ اچھے نوکروں کو یہ لوگ آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ صاحب ایک روز کسی کو فون کر رہے تھے کہ ایک اچھی نوکرانی ہے، انھیں ضرورت نہیں ہے، ان کو رکھنا ہے تو رکھ لیں۔ نوکرانی سے کام کروانا صاحب بالکل پسند نہیں کرتے ہیں۔ ان کے گھر کے کام کے لیے ایک بھی نوکرانی نہیں ہے۔ برتن وغیرہ سب نوکر دھوتے ہیں۔ میرے پاس چھت سے جہاں پانی گر رہا تھا، اس کے نیچے ہتھیلی پھیلا کر بوند کے ٹپکنے کا انتظار کرنے لگا، ایک بوند ہتھیلی میں ٹپکی اور اس کے باریک باریک چھینٹے میں نے چہرے پر محسوس کیے۔

''ڈاکٹرنی بائی سے تم ملو،'' میں نے کہا۔

ڈاکٹر مصروف رہتے تھے، پر ڈاکٹرنی بائی مصروف نہیں رہتی تھی۔ بنگلے سے بہت کم باہر نکلتی تھی۔ پانچ سات دنوں میں کبھی باہر دکھائی دیتی تھی۔ وہ ہمیشہ موٹے موٹے گہنوں سے لدی رہتی تھی۔ اتنے بڑے بنگلے میں بہت کم لوگ ہوتے تھے۔ ڈاکٹر کی ایک بیوہ بوڑھی بہن تھی۔ ایک بھتیجا تھا، جس کا مکان پاس ہی بن کر تیار ہو گیا تھا۔ وہ اپنے مکان میں کبھی بھی جا سکتا تھا۔ بنگلے میں اور کوئی نہیں تھا۔ ڈاکٹر کی بیوہ بہن بہت احسان مند تھی کہ ڈاکٹر نے اسے سہارا دیا۔ گھر کا سارا کام وہی کرتی تھی۔ پانچ بجے صبح سے رات کے ایک بجے تک، جب تک ڈاکٹر کھانا کھا نہیں لیتے تھے، اسے فرصت نہیں ملتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی گرہستی میں اس کے لیے کام کی کمی نہیں تھی۔

میری بیوی سے اس کی اچھی پہچان ہو گئی تھی۔ بیوی کو اس پر بہت دیا آتی تھی۔ ایک بار اس کے

Scanned with CamScanner

ساتھ جا کر ڈاکٹرنی سے مل چکی تھی۔ بیوی کو یقین تھا کہ ڈاکٹرنی اس کی بات پر دھیان دے گی۔ پہلی بار جب ڈاکٹرنی سے مل کر آئی تھی تب وہ کہہ رہی تھی کہ اتنے بڑے آدمی ہیں، پر انھوں نے ایک کپ چائے کے لیے نہیں پوچھا۔ ایک کپ چائے کی اسے امید تھی۔ اس کے سوا وہ ڈاکٹرنی کی بہت تعریف کرتی تھی۔ اب یہ اس کا دوسری بار ملنا ہوگا۔

آسمان صاف ہو گیا تھا۔ وہ جانے کے لیے تیار تھی۔ مجھے بھوک نہیں لگ رہی تھی۔ سوچ رہا تھا، دوپہر کو دفتر سے آکر کھانا کھا لوں گا۔ میں داڑھی بنانے بیٹھ گیا۔

"یہ ساڑھی ٹھیک ہے؟" بیوی نے پوچھا۔ سستی چنری ساڑھی تھی پر اس میں وہ بہت اچھی لگتی تھی۔

"بڑھیا،" میں نے کہا۔

داہنی طرف سے بنگلے کے اندر جانے کے لیے ایک اور دروازہ تھا۔ یہ دروازہ بنگلے کے آنگن میں کھلتا تھا۔ جمعدارنی، نوکرانی، گائے اسی راستے سے آتی جاتی تھیں۔ ڈاکٹر کی بہن اسی راستے سے بیوی کو ڈاکٹرنی سے ملانے لے گئی تھی۔ ڈاکٹر کا بھتیجا، جس کی بہت چلتی تھی، وہ بھی اسی دروازے سے آتا جاتا تھا۔ بنگلے میں کھانا دو طرح کا بنتا تھا۔ ڈاکٹر اور ڈاکٹرنی کے لیے الگ کھانا بنتا تھا، اس کی بیوہ بہن اپنے اور بھتیجے کے لیے الگ کھانا بناتی تھی۔ جب دوسرے ناتے رشتے دار آتے تھے تو انھی کے ساتھ اُن کے لیے بھی کھانا بن جاتا تھا۔ ڈاکٹر اور ڈاکٹرنی کے لیے بہت غذائیت اور ذائقے والا کھانا بنتا تھا۔ شہر میں ڈاکٹر بہت کنجوس آدمی مانے جاتے تھے۔ پانچ روپے لے کر کلب تاش کھیلنے جاتے تھے۔ ضرورت ہوتی تو کسی سے ادھار مانگ لیتے تھے۔

میں نے سوچا، بیوی آنگن کے دروازے سے ہی اندر جائے گی۔ میں بے فکر ہو کر گھر میں گھوم پھر سکتا تھا کیونکہ بارش بند ہونے سے چھت کا ٹپکنا بند ہو گیا تھا۔

دفتر جانے کے لیے میں بہت دیر سے تیار تھا۔ بیوی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ گھر بند کر کے جا یا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

سامنے کے دروازے سے سائیکل نکال کر میں اندر کرسی پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ جیسے ہی وہ آئے، گھر اسے سونپ کر میں دفتر چلا جاؤں۔ دفتر کی ایک منٹ کی دیر میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ہمیشہ وقت سے پہلے پہنچتا تھا۔ چارپائی پر لیٹنے کی خواہش ہو رہی تھی پر میں کپڑے بدل چکا تھا۔ غصہ

Scanned with CamScanner

آنے لگا۔ اسے گئے بہت دیر ہو گئی تھی۔

بیوی بڑبڑاتی اندر گھسی۔

''اسی طرح بڑبڑ چلتی آ رہی ہوگی۔ پھسل کر گر جاتیں،'' میں نے کہا۔

''تمھارے دفتر جانے کو دیر ہو رہی تھی اس لیے جیسے تیسے نکل کر آ رہی ہوں۔ تمھاری چھٹی کا دن ہوتا تو شام تک نکل نہ پاتی۔''

''اتنا وقت کیسے لگ گیا؟ ڈاکٹرنی سے بات کی؟'' میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''ہوئی ملاقات۔ ڈاکٹرنی برآمدے میں کرسی پر بیٹھی تھی۔ نوکرانی سے چاول چنوا رہی تھی۔ میرے منھ سے نکل گیا کہ نوکرانی ٹھیک سے چاول نہیں چن رہی ہے۔ ڈاکٹرنی نے کہا، 'بہو اس کو بتلا دو۔'

''میں نوکرانی کو چاول چننا بتلانے لگی، تبھی ڈاکٹرنی نے نوکرانی کو دوسرے دس کام بتلا دیے۔ وہ چلی گئی۔ میں چاول چنتی رہی۔ جب میں نے گھر ٹپکنے کے بارے میں بتلایا تو انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب یہ کام دیکھتے ہیں۔ وہ کچھ نہیں جانتیں۔''

''بات کر کے تم فوراً آ جاتیں۔''

''انھوں نے میرے میکے کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔''

''چاول چنتی رہیں اور اپنے میکے کے بارے میں بتلاتی رہیں؟ اس طرح تم بہت دیر تک چاول چنتی رہی ہوگی۔''

''کیا ہو گیا؟ بات کرتے کرتے کام کرتی رہی۔''

''ان کی بہن کہاں گئی تھی؟''

''کھانا بنانے کی تیاری کر رہی تھی۔ بے چاری کو بہت کام کرنا پڑتا ہے۔''

''تم کل سے اس کی مدد کرنے چلی جایا کرو گی؟'' میں نے ناراض ہو کر کہا۔ ''انٹر پاس ہو گئیں، لیکن تم جیسی بے وقوف عورت میں نے نہیں دیکھی،'' میں نے غصے سے کہا۔ ''کیا تم نے وہاں چائے پی؟''

''ہاں،'' اس نے کہا۔ یہ سن کر میں مایوس ہو گیا۔

''تمھیں چائے کیسی لگی؟''

''اچھی تھی۔'' بیوی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

مجھے بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ گورا بابو کی بات یاد آ رہی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ صاحب کے گھر کی چائے ایک بار انھوں نے پی تھی۔ انھیں چائے بہت اچھی لگی تھی۔ دوبارہ انھیں چائے نہیں ملی جبکہ صاحب کے گھر انھیں کئی بار جانا پڑتا تھا۔

بیوی چپ چاپ مجھے دیکھتی رہی کہ آگے میں کوئی ایسی بات کروں گا جس سے اسے سمجھ میں آ جائے گا کہ اس نے ڈاکٹر کے گھر کی چائے پی کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔

اپنے بس میں کرنے اور اپنا خرید اغلام بنانے کے طریقے بدل گئے تھے۔ سڑک کے کنارے کوئی آدمی تھکا ہوا ستانے کھڑا ہو جائے تو ایک رعب دار آدمی آئے گا اور سمجھاتے ہوئے کہے گا کہ یہ تمھارے کھڑے ہونے کے لائق جگہ نہیں ہے۔ وہ سوچے گا، جگہ کھڑے ہونے لائق کیوں نہیں ہے؟ رعب دار آدمی اشارہ کر کے بتلائے گا کہ وہاں کھڑے رہو جہاں اس کی موٹر کار ہے۔ پھر بہت اپنائیت سے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس جگہ تک لے جائے گا۔ پھر کہے گا کہ کھڑے کھڑے موٹر کار تاکتے رہو، میں ابھی خریداری کر کے آتا ہوں۔ آج کل پلک جھپکاتے چوری ہو جاتی ہے، موٹر کار کوئی نہ لے جائے۔ پھر اس پر جمی دھول پر بدمعاش لڑکے انگلی سے گندی گالیاں لکھ دیتے ہیں۔ معلوم ہوتا نہیں، موٹر کار کے ساتھ ساتھ گندی گالیاں گھر تک پہنچ جاتی ہیں جن پر گھر میں لڑکے، لڑکی، نوکر، بیوی سب کی نظر پڑتی ہے۔ یہ حرکت بھی موٹر کاروں کے ساتھ ہوتی ہے، پھر بھی شک تو ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ کیوں؟ کوئی اس سے ضرور چڑا ہوا ہے جو سامنے نہیں آنا چاہتا، چھپ کر وار کرنے کی کوشش میں ہے۔ تب وہ آدمی پوری ایمانداری سے، انسانیت کی بنیاد پر، جو اسے ورثے میں ملی تھی، ٹکٹکی باندھے موٹر کار کو تاکتا رہے گا۔ یہاں تک کہ تاکتے تاکتے تھک جائے گا۔ تب اسے گرہستی کے بہت سے ضروری کام یاد آئیں گے۔ وہ پریشان ہو کر چہل قدمی کرنے لگے گا۔ چہل قدمی کرتے کرتے پھر تھک جائے گا اور ستاتے ہوئے موٹر کار کو تاکتا رہے گا۔ آخر میں وہ دیکھے گا کہ موٹر کار والا کب کا موٹر کار لے کر چلا گیا۔ موٹر کار کا نمبر اسے یاد نہیں رہے گا، پر موٹر کار کے پیچھے دھول میں لکھی گالیاں اسے یاد رہیں گی۔

رات میں پانی نہیں برس رہا تھا۔ بیوی جلدی اٹھ گئی تھی۔ جب میں اٹھا تب وہ اپنے کام نپٹا کر کھڑکی کے پاس اسٹول پر بیٹھی تھی۔ کھڑکی پر گال ٹکائے وہ ڈاکٹر کے بنگلے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چونکہ

پچھواڑے سے سورج نکلتا تھا اس لیے اِس کمرے میں آ کر لگتا تھا کہ اٹھنے میں بہت دیر ہوگئی اور اُس کمرے میں لگتا تھا کچھ دیر اور سو یا جائے۔

''کب سے بیٹھی ہو؟''

''ابھی تھوڑی دیر سے۔'' وہ نہا دھو کر تیار تھی۔

''لگتا ہے چار بجے سے اٹھ گئی ہو،'' میں نے کہا۔

میں نے جلدی کی اور پندرہ منٹ میں تیار ہو کر آ گیا۔ وہ چائے بنانے چلی گئی۔ ابھی تک جھٹ پٹا تھا۔ میں بھی اسٹول پر بیٹھ گیا اور بیوی کی طرح کھڑکی پر گال ٹکا کر باہر صبح کو دیکھنے لگا۔ یہ وقت ڈاکٹر کے نکلنے کا تھا۔ جب دس منٹ تک بھی ڈاکٹر مجھے دکھائی نہ دیتے تب بھی آگے انھیں اسی طرح دیکھنے کا سلسلہ چلتا رہتا اور گھنٹی بجا کر ان سے میں بنگلے کے اندر نہ ملتا۔ وہ زیادہ تکلیف دہ تھا۔ باہر بنگلے کی بتی جل رہی تھی۔ مجھے پھر برا لگا۔

چائے پی کر میں اور بھی چست ہو گیا۔ اب پورے دن کا سامنا اپنی طرح سے کرنے کے لیے میں تیار تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آج بھی مالی نظر آئے۔

آخر ڈاکٹر صاحب باغیچے میں دکھلائی دیے۔

''میں جا رہا ہوں،'' ڈاکٹر کو دیکھتے ہی میں نے بیوی سے چلّا کر کہا اور دروازے سے، ٹوٹی دیوار کے بیچ بنے رستے پر آ گیا۔ وہاں کیچڑ تھی اس لیے میری تیزی کم ہو گئی۔ اس کو پار کرتے ہی میں پھر اپنی کل والی تیزی میں آ گیا۔

ڈاکٹر صاحب مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں ان کے اتنے پاس تک چلا گیا کہ اپنی بات کہہ سکوں۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میری بات سننے کے لیے تیار دکھائی دیے۔ میں نے کہا،'' ڈاکٹر صاحب، گھر کی چھت بہت ٹپکتی ہے۔ کھانا بنانے میں، سونے میں دقت ہوتی ہے۔ کل بھی اسی لیے آپ کے پاس آیا تھا۔ آپ سے بات نہیں کر پایا تو بیوی ڈاکٹرنی بائی کے پاس گئی تھی۔ انھوں نے کہا کہ مجھے آپ سے بات کرنی چاہیے۔ برسات شروع ہو گئی ہے۔ اچانک پانی برس جاتا ہے۔''

ڈاکٹر میری بات سنتے رہے۔

''بہت پریشانی ہو رہی ہو گی آپ کو؟ دو کمرے ہی تو ہیں،'' فکر مند ہوتے ہوئے انھوں نے کہا۔

Scanned with CamScanner

''جی ہاں، بہت تکلیف ہے۔ پانچ چھ دن پہلے جو گدے بھیگے تھے وہ ابھی تک گیلے ہیں۔''

''جب پانی نہیں برستا تب تو کوئی تکلیف نہیں ہوتی ہوگی؟'' ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

''تب کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ یہ مون سون ہے۔ بمبئی میں کل مون سون آیا ہے۔ یہاں آنے میں آٹھ روز لگ جائیں گے۔ آپ نے پہلے بتلایا ہوتا۔ کل کی بارش سے بھیگ کر کھپریلیں گیلی ہوگئی ہوں گی۔ گیلی کھپریلوں میں کام نہیں ہوتا۔ کاریگر چڑھیں گے تو کھپریلیں چور چور ہو جائیں گی۔ کھپریلوں کو دھوپ کھا کر سوکھ جانے دیجیے۔ سوکھ جائیں گی تو بنوا دیں گے۔ اور کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟''

''جی نہیں،'' میں نے کہا۔ ڈاکٹر صاحب ٹہلنے لگے۔ میں کچھ دیر تک ان کے پیچھے پیچھے گھومتا رہا۔ تب میں نے کہا، ''میں جاتا ہوں۔''

ڈاکٹر نے کہا، ''چوکیدار بتلا رہا تھا کہ آپ کی بائی بہت سی اینٹیں لے گئی ہے۔ کام ہو گیا ہو تو بھجوا دیجیے گا۔ گھر میں نل کے پاس ایک ٹنکی بنوا رہے ہیں، کچھ اینٹیں کم پڑ گئی ہیں۔ پوری گاڑی کی ضرورت نہیں ہے۔ اینٹیں آج کل بہت مہنگی ہوگئی ہیں۔ برسات میں تو اناپ شناپ قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ اینٹوں کے بھٹے بند ہو جاتے ہیں۔ ابھی پانچ دن میں قیمت ڈیڑھ گنا ہوگئی۔ پانی اور برسنے دیجیے تب دیکھیے گا۔ آپ کے دفتر میں صوبائی گزٹ تو آتا ہوگا؟''

''جی ہاں، آتا ہے،'' میں نے کہا۔

''پچھلے چار پانچ لے آیئے گا۔''

''جی، اچھا،'' میں نے کہا۔

بیوی نے پوچھا، ''کھپریلوں کی مرمت کروانے کے لیے تیار ہو گئے؟''

''بنوا دیں گے، پر ابھی نہیں۔ کھپریلیں پانی سے گیلی ہوگئی ہیں۔ کاریگر چڑھے گا تو ٹوٹ جائیں گی۔ دھوپ کھا کر جب سوکھ جائیں گی تب کاریگر آکر بنا دے گا۔'' میں ڈاکٹر کی اینٹوں کو کمرے میں ڈھونڈنے لگا۔

''کیا ڈھونڈ رہے ہو؟''

''اینٹیں ڈھونڈ رہا ہوں جو تم ڈاکٹر کے کمپاؤنڈ سے اٹھا لائی تھیں۔ چوکیدار نے شکایت کی ہے۔

ڈاکٹر کہہ رہے ہیں جتنی اینٹیں ہیں بھجوادوں۔'' آنگن میں تین اینٹیں پڑی تھیں۔ ''ان اینٹوں کو کس نے توڑا؟''

''جب طبیعت خراب ہوگئی تھی تب برتن مانجھنے کے لیے محلّے کی رَدتائن کو بلوالیا تھا۔ اس نے اینٹوں کے چورے سے برتن مانجھے ہوں گے۔ اس لیے اس کے مانجھے برتن بہت چمکتے تھے۔ میں ڈاکٹر کی بہن سے پوچھ کر اینٹیں لائی تھی۔''

پیٹیوں کے نیچے بھی اینٹیں تھیں۔ پیٹی ہٹا کر اینٹوں کو نکالا تو بیوی نے کہا، ''پیٹی زنگ کھا جائے گی۔'' آٹے کے پیپے کے اوپر ایک اینٹ رکھی تھی۔ چوہے ڈھکن کھول کر اندر گھس آتے تھے، اس لیے ڈھکن کو اینٹ سے دبادیا گیا تھا۔ چاول کے پیپے کے اوپر بھی ایک اینٹ رکھی تھی۔ پورے گھر میں پندرہ اچھی اینٹیں نکل آئی تھیں۔

جہاں ساٹھ انچ بارش ہوتی ہو، وہاں برسات میں دھوپ کا نکلنا اچھا سٹہ ہوسکتا تھا۔ سدّانی چوک میں سیٹھ لوگ دس بجے سے لے کر شام تک سٹہ کھیلتے تھے۔ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے یہ لوگ کالے بادل کے چھوٹے ٹکڑوں کو دیکھ کر سٹہ لگاتے۔ بوندوں کے ٹپکنے پر 'ٹپکی ٹپکی' چلّاتے ہوئے ہلّا مچانے لگتے۔ سیدھے آسمان سے بوند ٹپکنے پر، چھت پر اکٹھی ہوکر بوندوں کے ٹپکنے پر سٹہ لگتا تھا۔ یہ لوگ، جھڑی لگی ہوگی تو اس کے دوپہر یا شام تک بند ہوجانے پر یا رات بھر برستے رہنے پر سٹہ لگا کر چوک کی دکانوں کے پٹے میں کھڑے رہیں گے۔

تین دن سے جھڑی لگی تھی اس لیے گھر کا پچھواڑا ایسا ہوگیا تھا کہ اس میں گھٹنوں تک پانی بھر گیا تھا۔ ڈاکٹر کے کمپاؤنڈ سے سارا کوڑا کرکٹ پانی کے ساتھ ٹوٹی دیوار کے راستے آکر وہاں جمع ہوگیا تھا۔ میری سمجھ میں آگیا کہ کمپاؤنڈ کی دیوار جان بوجھ کر توڑی گئی ہوگی تاکہ پانی ڈاکٹر کے کمپاؤنڈ میں جمع نہ ہو۔ سڑک کی نالی بھر گئی تھی اس لیے پچھواڑے کے پانی کی نکاسی نہیں ہو پارہی تھی۔ میں نے سوچا اگر دیوار کو باندھ دیا جائے تو پانی یہاں نہیں آپائے گا۔ مجھے غصہ آگیا۔

میں پانی اور کیچڑ سے اوب گیا تھا۔ کمروں میں مینڈکوں کے بچے کودتے دکھائی دیتے تھے۔ رات میں بہت سے مینڈک آجاتے۔ اس سے کھانا کھاتے وقت کھپریلیں گرنے کا اتنا ڈر نہیں رہتا تھا

جتنا مینڈک کے اچک کر تھالی میں آ جانے کا رہتا تھا۔ سانپ ابھی تک نہیں نکلا تھا۔ تب بھی کونے میں میں نے ایک ڈنڈا رکھ لیا۔ چوکا بے کار ہو چکا تھا۔ وہ پھوٹے ہوئے برتن کی طرح ٹپکنے لگا تھا۔ وہاں کھانا بنانے کی جگہ نہیں تھی۔ پورے گھر میں سونے کے لیے ایک چارپائی جتنی جگہ بچ گئی تھی۔ دوسرے کمرے میں کھانا بنانے کے لیے ایک جگہ ڈھونڈ لی گئی تھی۔

رات کو چارپائی پر بستر ڈالتا ہوا میں چلّایا، ''اِدھر آؤ۔''

بیوی نے سوچا ہوگا کہ سانپ نکلا ہے۔ اپنے کو ٹپکتے پانی سے بچاتے ہوئے وہ جلدی سے آئی۔ تب میں نے خوش ہو کر اس سے کہا، ''اچھا ہوا ہم دونوں میاں بیوی ہیں۔ بس ایک چارپائی کی جگہ بچ گئی ہے جہاں ہم پانی سے بچے رہ کر رات بھر آرام سے سو سکیں گے۔ اگر ماں ہوتیں تو اس چارپائی پر وہ سو جاتیں اور ہم لوگ کیا کونے میں کھڑے کھڑے بات کرتے اونگھتے ہوئے رات گزارتے؟''

بیوی بہت خوش تھی۔ گھر کے سب دروازے بند کر لیے گئے تھے۔ پیچھے کی کھڑکی بھی بند کر دی گئی تھی۔ رات بھر وہ کبھی کھلی نہیں رکھی جاتی۔ اس میں سلاخیں نہیں تھیں۔ کھڑکیوں کے کھلے رہنے سے بوچھار اندر آتی تھی۔

چونکہ چارپائی نہ ٹپکنے والی جگہ کے مطابق جمائی گئی تھی اس لیے وہ کمرے میں بے ڈھنگے طریقے سے رکھی تھی۔ آنے جانے میں دقت ہوتی تھی۔ دروازے سے بالکل سٹ کر چارپائی بچھی تھی۔ ایک انچ اِدھر اُدھر ہونے سے وہ ٹپکنے کی حد کے اندر چلی جاتی۔

''چارپائی بالکل نہیں سرکنی چاہیے۔ میں نے حساب سے جمادی ہے۔''

آنے والے دنوں میں بھی چارپائی کو اسی طرح بچھنا تھا، اس لیے جہاں اس کے پائے تھے وہاں میں فرش پر چاک سے نشان لگانے کی سوچ رہا تھا تاکہ دوسرے دن انھی نشانوں پر پائے رکھ دیے جاتے۔ تب اچانک بارش ہونے سے بھی چارپائی پر پانی نہ ٹپکتا اور نیند خراب نہ ہوتی۔ لیکن فرش اتنا گیلا تھا کہ اس پر کوئی نشان نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ پھر بھی چارپائی جس طرح جمائی گئی تھی وہ نقشہ میں نے یاد کر لیا تھا۔

چارپائی کے نیچے دو پٹیاں، کچھ کپڑے اور ڈبے ڈبیاں رکھ دیے گئے تھے، یعنی جن کو بچانا ضروری تھا۔

جب وہ چارپائی پر آ کر لیٹی تو سرک کر میں نے اس کے لیے تھوڑی اور جگہ بنا لی۔

Scanned with CamScanner

''اچھا ہوا جو ہم دونوں میاں بیوی ہیں،'' میں نے پھر کہا۔

''تم کو مشکل تو نہیں ہو رہی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''چار پائی چھوٹی ہے تو کیا ہوا۔ چار پائی میں تمھارے لیے جو جگہ ہے، دل میں جو جگہ ہے دونوں کو ملا کر کتنی ساری جگہ ہو گئی،'' اسے زور سے بانہوں میں لے کر کستے ہوے میں نے کہا۔ ''تم کو اب جگہ کم لگ رہی ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''میں تو آرام سے ہوں، پر بعد میں تم مجھ کو چار پائی پر برداشت نہیں کر سکتے۔ ایک نیند پوری ہو جانے کے بعد تم کو اڑچن ہونے لگتی ہے۔''

''تھکنے کے بعد خوب پھیل کر سونے کو جی کرتا ہے۔ مجھے بعد میں اڑچن ہونے لگے گی تو تم کہاں سوؤ گی؟'' اسے پھر ایک بار کستے ہوے میں نے کہا۔

''ہے ایک جگہ۔ نہ ہوتی تو کہیں بھی سو جاتی۔''

''مجھے تو کوئی جگہ نہیں دکھتی۔ کیا دوسرے کمرے میں ہے؟''

''دوسرا کمرہ تو اور بھی گیا گزرا ہے۔ وہاں بس کھڑے ہونے کے لائق دو تین جگہیں باقی ہیں۔ چار پائی جتنی سوکھی جگہ کہیں نہیں ہے۔''

''تو کہاں سوؤ گی؟'' میں نے پوچھا۔

''اس چار پائی میں لیٹتے ہوے مجھے وہ جگہ معلوم ہو گئی تھی۔''

اسٹور روم پورا کا پورا ٹھیک تھا، پر وہ اتنا چھوٹا کمرہ تھا کہ ڈبے ڈبیاں اور برتن جمانے کے بعد ایک آدمی کے کھڑے ہونے لائق گنجائش رہتی تھی۔ اس میں کھڑکی بھی نہیں تھی۔ وہ ایک کند چھوٹی سی کوٹھری تھی۔

''اچھا اب بتا دو،'' میں نے چڑتے ہوے کہا۔

''تمھارے پاس، تمھارے نیچے، یعنی چار پائی کے نیچے چار پائی جتنی زمین بچی ہے۔ سامان ہٹا کر چار پائی کے نیچے سو جاؤں گی۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی اور پیٹی سرکانے لگی۔ ہم دونوں نے مل کر پیٹیاں جیسے تیسے اسٹور روم میں لے جا کر جمائیں۔ باقی سامان وہ خود رکھ آئی۔ پھر میری چار پائی پر آ کر لیٹ گئی۔ اس کی سانس، زور سے

Scanned with CamScanner

چل رہی تھی۔ پیٹی اٹھانے سے تھکن ہوگئی ہوگی۔

''تھک گئیں؟'' اسے پیار کرتے ہوے میں نے کہا۔

''تم میرے پاس ہی سوؤ گی، یہیں!'' میں نے قانون کی طرح بات کی۔

یہ کرو، یہ مت کرو والی میری باتیں قانون ہی ہوتی تھیں۔ پر یہ قانون میں نے نہیں بنائے تھے۔ میں تو گرہستی کی پولیس تھا، بنے ہوے قانونوں کی مستعدی سے حفاظت کر رہا تھا۔ اور قانون سب کے لیے برابر تھا، چاہے وہ گھر والی ہی کیوں نہ ہو۔ جب وہ مجھے بہت پیاری لگتی تھی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ یہ میری خواہش تھی۔ پیار کی شروعات میں اس کے موٹے موٹے چکنے گالوں کو دھیرے سے کاٹتے ہوے کرتا تھا اور اس بات کا پورا دھیان رکھتا تھا کہ اسے چوٹ نہ لگے۔

جب سو کر اٹھا تو مجھے لگا کہ اب مجھے نیند نہیں آئے گی۔ ساتھ سونے سے نیند کھلتے ہی اڑچن ہونے لگی تھی۔ سوچا پانی تو نہیں برس رہا ہے؟ بیوی کے کھلے بالوں سے میرے چہرے میں سرسراہٹ ہو رہی تھی۔ گہری نیند میں بھی وہ سکڑ کر، میرے لیے زیادہ سے زیادہ جگہ بنا کر سو رہی تھی۔ میری چت لیٹنے کی خواہش ہو رہی تھی، پر میں اپنے پیروں اور ہاتھوں کو آرام دینے والی حالت میں نہیں پھیلا سکتا تھا۔ اس کی کہنی مجھے گڑتی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ کو سیدھا کرنا چاہا تو اس کی نیند کھل گئی۔

''نیند نہیں آ رہی ہے؟'' اس نے بہت پیار سے پوچھا۔ میں چپ رہا، جیسے سو رہا ہوں۔

''پانی پیو گے؟''

''ہاں،'' آخر میرے منھ سے نکل گیا۔ جھک کر چارپائی کے نیچے سے اس نے لوٹا اٹھایا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پانی پی کر لوٹا میں نے اسے دے دیا۔ چارپائی کے نیچے لوٹا رکھ کر وہ کمرے میں رکھی بالٹیوں کا پانی باہر رکھنے کے لیے اٹھی۔

''پانی برسنا بند ہو گیا ہے،'' اس نے کہا۔

بالٹی چھت کے ٹپکنے سے کافی بھر گئی تھی۔ وہ پانی پھینکے گی نہیں۔ صبح برتن دھونے کے کام آ جائے گا۔

پوری چارپائی پر اچھی طرح پھیل کر میں نے اپنے بدن کو آرام دیا۔ مجھے نیند آنے لگی۔ نیند لیتے ہوے مجھے لگا کہ اب وہ کہیں اور سونے چلی جائے گی، یا تو چارپائی کے نیچے، یا کمرے میں کہیں اور، یا

کھٹ پٹ کھٹ پٹ کچھ کام کرتی رہے گی۔

سونے سے پہلے والے سارے خیال اہم ہوتے ہیں یا نہیں، یہ مجھے نہیں معلوم۔ ان خیالوں میں میں کسی دن بہت طاقتور ہونا۔ کئی جادوئی یا بہادری کے کرتب دکھاتا۔ کبھی پہاڑ سے نیچے کود جاتا۔ اڑتے اڑتے کسی بہت خوبصورت لڑکی کے کمرے میں گھس جاتا۔ کبھی بہت کمزور اور بیمار رہتا۔ بہت دنوں سے میں سونے کے پہلے والے خیالوں میں کمزور اور بیمار آدمی ہی ہو رہا تھا۔ ہوسکتا ہے موسم بدلنے کے باعث ایسا ہو۔ بادل اور بارش سے موسم بدل گیا تھا۔

صبح خوب پیلی دھوپ نکل آئی۔ اتنی خوبصورت دھوپ میں نے بچپن میں کبھی دیکھی تھی۔ سب سے پہلے بیوی نے دھوپ کو نکلتے دیکھا تھا۔ اس نے فوراً آ کر مجھے جگایا۔

''دھوپ نکل گئی، دھوپ نکل گئی'' کی آواز سے میں ایک دم اٹھ بیٹھا تھا۔ دھوپ نے صبح صبح گیلے پن کے احساس کو اندر تک سکھا دیا تھا۔ مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ لگا، سورج اور دھوپ کا میرے پچھواڑے آنا ٹھیک نہیں ہے۔ اسے سامنے بیٹھک کے کمرے میں آنا چاہیے تھا، جہاں دو کرسیاں اور ایک میز ہم لوگوں نے ڈال رکھی تھی۔ ایک چارپائی بھی رہتی تھی۔ اس میں دری بچھی رہتی تھی، لیکن برسات میں اسے کھڑا کر دیا گیا تھا۔

باہر آ کر میں نے کھپریلوں کی طرف دیکھا۔ سامنے کی کھپریلوں پر دھوپ نہیں پڑ رہی تھی۔ دس گیارہ بجے تک ان پر دھوپ آئے گی، میں نے اندازہ لگایا۔ یہ کھپریلیں یہیں بنتی تھیں پر الہ آبادی کہلاتی تھیں اور دوسری دیسی کھپریلوں سے بہت مہنگی تھیں۔ ان کا بھاؤ چالیس روپے سینکڑا تھا۔

وہ بھی کھڑکی سے نہیں ہٹی اور ہم دونوں ڈاکٹر کے نکلنے کی راہ دیکھنے لگے۔ اس بار کھڑکی میں آنے میں دیر بھی ہو گئی تھی۔ سات بج گئے ہوں گے۔ میں اسٹول پر بیٹھا تھا، وہ کھڑی تھی۔ اس وجہ سے میں ٹھیک سے دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ بار بار سامنے سے دھیان ہٹ کر اس کی طرف یا اس کے باعث کہیں اور چلا جاتا تھا۔ ببول کے پیڑ کے نیچے ایک بھی آدمی نہیں تھا۔ نہیں تو اس کی حرکت سے اندازہ ہو جاتا کہ ڈاکٹر صاحب باہر آ گئے ہیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ ڈاکٹر ٹہل کر بنگلے میں چلے گئے ہوں گے۔ اب کی بار دھوپ کے نکلنے سے ڈاکٹر کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ پانی نہ بھی گرتا، بدلی ہی چھائی رہتی، تب بھی ڈاکٹر کو دیکھنے کا سوال نہیں اٹھتا تھا۔ کھپریلیں سوکھ جائیں اس کے لیے پہلے دھوپ ضروری ہو گئی تھی، بعد میں ڈاکٹر۔

ڈاکٹر کا بھتیجا بنگلے کے دروازے سے نکلا۔ ٹہلتا ہوا کنویں کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

''ڈاکٹر کے بھتیجے کو بتلا دوں، دھوپ نکل گئی ہے۔ کل پرسوں تک یہ کاریگر بھجوا دیں گے؟'' بیوی سے میں نے پوچھا۔

''ہاں، پوچھ لو،'' بیوی نے کہا۔

''تم جانا نہیں، یہیں کھڑکی پر کھڑی رہنا،'' میں نے کہا۔

ڈاکٹر کا بھتیجا مجھے آتا ہوا دیکھ کر جلدی نپٹانے کے انداز میں میری طرف دیکھتا ہوا، میرے پاس آنے کا انتظار کرنے لگا۔ غنیمت تھا اس نے مجھے نظر انداز نہیں کیا تھا۔ میں نے اس سے کہا:

''ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کہ دھوپ نکلنے پر کھپریلیں سوکھ جائیں گی، تب کاریگر ان کی مرمت کر دیں گے۔ چھت کے ٹپکنے سے بہت پریشانی ہوتی ہے۔''

مجھ سے پہلے بھی کرائے دار رہتے ہوں گے۔ ان کو بھی مسئلے ہوتے ہوں گے، اس لیے ڈاکٹر کا بھتیجا ایسے معاملوں کو جانتا تھا۔ اس کا جواب تھا، ''کم سے کم تین دن تک لگاتار دھوپ رہے، تب کھپریلیں سوکھیں گی۔''

''اگر دو دن دھوپ رہے اور تیسرے دن بدلی چھا جائے تو؟''

''مجھے معلوم ہے اتنی جلدی کھپریلیں نہیں سوکھیں گی۔ کم سے کم تین دن کی لگاتار دھوپ چاہیے۔''

اس کا مطلب تھا، اگر آپ دھوپ لا سکتے ہیں تو لے آئیے، آپ کی غرض ہے۔ اگر نہیں لا سکتے تو پھر انتظار کیجیے۔ میری نظر باغیچے میں کام کرتے ہوئے مالی کی پیٹھ پر گئی جو دھوپ میں پسینے سے چمک رہی تھی۔ جتنی دھوپ پڑے گی، پسینہ اور نکلے گا اور اس کی پیٹھ چمکتی رہے گی۔ الٰہ آبادی کھپریلوں کی چھت مزدور کی پیٹھ نہیں تھی۔ دیسی کھپریلوں کی چھت بھی مزدور کی پیٹھ نہیں ہو سکتی۔ دفتر میں گرین ایڈوانس، پے ایڈوانس مل سکتا تھا۔ دفتر میں دھوپ رہے اور میرے گھر میں نہ رہے تو دفتر سے کچھ امید کی جا سکتی تھی۔ اگر دفتر کچھ نہیں کر سکتا تو سرکار بھی کچھ نہیں کر سکتی۔ ویسے سرکار پر تنقید کی گنجائش جمہوریت میں ہمیشہ رہتی تھی پر میں نے اس کا استعمال کبھی نہیں کیا، جس طرح سال بھر میں پوری اتفاقی چھٹیاں استعمال نہیں کر پایا۔ چار پانچ دن کی چھٹی بے کار گئی۔

''آپ کاریگر کو بلوا تو دیجیے، دھوپ تیز ہو گی تو کھپریلیں تیسرے دن کے بجائے ایک دن میں

بھی سوکھ سکتی ہیں۔ کاریگر اندازہ کرلے گا کہ اسے کھپریلوں پر کام کرنا ہے یا نہیں۔''

''کاریگر اس بات کی پروا نہیں کرے گا کہ آپ کا نقصان ہوتا ہے یا نہیں۔ آپ کو بھی اگر پروا ہوتی تو میری بات سمجھ جاتے۔ پروا ہم لوگ کریں گے جن کا روپیہ لگتا ہے۔ کاریگر اپنی روزی سے مطلب رکھتا ہے، کام سے نہیں۔ وہ کام بنانے پر یقین رکھے گا تو اس کی روزی نہیں چلے گی۔ آپ کو لگے گا کہ کام ہوگیا ہے، پر بعد میں پتا چلے گا کہ نئی پریشانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ بہت مجبوری میں ان سے کام لینا چاہیے۔ اگر بھروسے مند کاریگر مل جائیں تو اچھا ہے، نہیں تو جتنا سہہ سکتے ہیں سہنا چاہیے۔ اور جب بھی ان سے کام کروائیں، سامنے کھڑے ہو کر کروائیں۔''

''میں دفتر سے چھٹی لے لوں گا اور اپنے سامنے کام کرواؤں گا۔ میری بہت چھٹیاں بچی ہوئی ہیں۔ میں اپنی چھٹیاں گھر میں کوئی کام نہ ہونے کی وجہ سے استعمال نہیں کر پاتا۔ اتوار ہی کو ایسا لگتا ہے کہ بے کار ہوں۔ کسی بھروسے مند کاریگر کو بھیج دیجیے۔''

''مجھے ایک بھروسے مند کاریگر نے ہی بتایا ہے کہ ایک بار کی بھیگی کھپریلوں کو سوکھنے کے لیے کم سے کم تین دن کی دھوپ چاہیے۔''

ڈاکٹر کے بھتیجے کے جانے کے بعد میری پریشانی وہیں تھی۔ دھوپ کے نکلنے سے مجھ میں امید تھی۔ آئینے میں چہرہ دیکھ کر اپنی پریشانی کا کوئی احساس نہیں کرتا۔ بغیر آئینہ دیکھے بھی پریشانی خود پر ظاہر ہوتی ہے۔ زمین پر، دھوپ میں پڑی ہوئی اپنی پرچھائیں کو دیکھ کر پریشانی کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ اگر بدلی چھا گئی تو کیا ہوگا! آدمی کی پرچھائیں کا چہرہ کہاں ہوتا ہے اور اس میں غصے کی جھلک کہاں دکھائی دے گی؟ میں کتنا پریشان ہوں، یہ مجھے بغیر آئینہ دیکھے ٹھیک ٹھیک معلوم ہونا چاہیے۔

میں ببول کے پیڑ کے پاس آ کر کھڑا ہوا تو دیکھا کہ بیوی اشارے سے مجھے بلا رہی تھی۔ اشارے سے بلانے میں خاموشی رہتی ہے، پھر بھی میں نے منھ پر انگلی رکھ کر اسے چپ چاپ کھڑی رہنے کے لیے کہا۔ بیوی کی حرکت مجھے اچھی نہیں لگی۔ مجھے دیکھ کر وہ سمجھ گئی ہوگی کہ کام نہیں بنا۔ وہ مجھے بلا کر کہنا چاہتی ہوگی کہ جانے دو، بعد میں دیکھ لیں گے۔

بنگلے سے کوئی باہر ہی نہیں نکل رہا تھا۔ مریض آنے شروع ہوگئے تھے۔ اس بنگلے کے لوگ بہت کم باہر نکلتے تھے، بیچ میں کبھی باہر نہیں نکلتے تھے۔ اس کے پیچھے بھی کوئی سیاسی سبب ہوگا!

Scanned with CamScanner

جب میں گھر پہنچا تو دیکھا، بیوی بہت خوشی میں تھی۔ فرش جو کیچڑ سے گندا ہو چکا تھا، اس پر وہ کپڑے سے پونچھا لگا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے کہا، "پونچھا لگا کر کھانا دیتی ہوں۔" پونچھے کے پانی کو ایک ٹین کے ڈبے میں نچوڑ کر وہ فرش کو جلدی سکھانا چاہتی تھی۔ فرش کا سوکھنا بہت ضروری تھا۔ اس لیے میں نے کھڑکی دروازے کھول دیے۔

"دروازے کھڑکی کیوں کھول دیے؟ گھر بالکل گندا ہو گیا۔" دروازے کے کھلتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہو گئی۔

کھڑکی کو بند کرتے ہوئے میں نے کہا، "لو، گھر کو چڈی پہنا رہا ہوں۔" پچھواڑے کے دروازے کے بند کرتے ہوئے میں نے کہا، "گھر کو پاجامہ پہنا رہا ہوں۔" میرے خیال سے سامنے کے دروازے کو پاجامہ کہنا ٹھیک تھا۔ یا دونوں دروازے مل کر پاجامہ کہے جا سکتے تھے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ مستقبل میں سامنے کا دروازہ میرے حصے میں آئے گا اور پیچھے کا دروازہ بیوی کے حصے میں۔ سامنے کے دروازے کو بھی میں نے بند کر دیا جس کے کھل جانے سے بیوی کو الجھن ہوئی تھی۔ ایک تو وہ چوکے والی گندی ساڑھی پہنے تھی اور پونچھا سہولت سے لگانے کے لیے اسے گھٹنے تک ساڑھی کو سمیٹنا پڑا تھا۔

جب میں کھانا کھا رہا تھا تبھی دھوپ کا اجالا کم ہو گیا۔ وولٹیج ایک دم کم ہونے سے جس طرح بلب کا اجالا کم ہو جاتا ہے بادل آنے سے مجھے اسی طرح کا احساس ہوا۔ میں سمجھ گیا کہ بادل چھانے لگے ہیں۔ لیکن بہت گھنے بادل ہیں یا نہیں، یہ دیکھنے کے لیے میں نے بیوی سے کہا۔ کھانا کھاتے کھاتے میں سوچ رہا تھا کہ دھوپ اور بادل کی پریشانی میں پڑا ہوا دنیا میں ابھی صرف میں ہوں۔ مجھے وبائی بیماری لگ گئی ہے جس کا پہلا شکار میں ہوں۔ سامنے الگنی پر کل کی دھلی چڈی بنیان بغیر چھوئے دیکھنے سے ہی معلوم ہو رہی تھی کہ سوکھی نہیں ہے۔ اسے چھو کر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کھپریلوں کو دیکھ کر اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ سوکھی ہیں یا نہیں۔ پرانی ہو جانے کی وجہ سے بدرنگ تھیں۔ کھپریلوں میں پچھلے سال کی سوکھی کائی تھی جو پانی پڑنے سے مٹ میلی سی ہو گئی تھی۔ یا یہ میرا وہم تھا۔ میں کھپریلوں کو چھو کر دیکھنا چاہتا تھا۔ انھیں چھو کر دیکھنے کے لیے ایک سیڑھی کی ضرورت ہوتی۔

کھانے میں جی نہیں لگ رہا تھا۔ بھوک نہیں تھی اور سواد بھی نہیں آ رہا تھا۔

"بادل تو ہیں۔ ہوا زور کی چل رہی ہے، اس لیے لگتا ہے چھٹ جائیں گے۔ باہر ڈاکٹر صاحب

ٹہل رہے ہیں،'' بیوی نے کہا۔

میں نا امید ہو گیا۔ ڈاکٹر کو دھوپ کے ساتھ باہر ہونا چاہیے تھا۔ اگر بدلی چھا جاتی اور میں ڈاکٹر سے کہتا کہ کچھ دیر پہلے دھوپ تھی تو وہ شاید یقین نہ کرتے۔ ان کا یقین نہ کرنا فطری ہوتا کیونکہ زیادہ وقت وہ اپنے کمروں میں رہتے تھے۔ میں تین دن کی لگاتار دھوپ کی بات کو کم کرا کے ایک دن کی تیز دھوپ پر لانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے مجھے کوشش کرنا پڑے گی، خوشامد کرنی پڑے گی۔

ہاتھ دھوتے دھوتے پھر دھوپ نکل آئی، پر ڈاکٹر کے پاس جانے کی خواہش نہیں ہوئی۔ دفتر جانے کا ابھی وقت نہیں ہوا تھا۔ اچانک مجھے چٹھی لکھنے کا خیال آ گیا۔ بہت دنوں سے بیوی چٹھی لکھنے کو کہہ رہی تھی۔ سالے کی دو چٹھیاں آ گئی تھیں۔ پہلے میں نے اپنے بڑے بھائی کو چٹھی لکھی، کہ یہاں سب ٹھیک ہے، بہت دنوں سے اماں کی خیر خبر نہیں ملی، اماں کی طبیعت کیسی ہے، وغیرہ۔ پھر میں نے یہ بھی جوڑ دیا کہ یہاں پچھلے دنوں بہت بارش ہوئی ہے، چھت بہت ٹپکتی ہے۔ اگر اماں ابھی آ رہی ہوں تو مت بھیجیے گا۔ مکان مالک سے کھپریلیں بنوانے کے لیے کہہ دیا ہے۔ دھوپ نکلنے کے بعد کام شروع ہوگا۔ دھوپ نکلتی ہے پر بدلی بھی چھا جاتی ہے۔

سالے کو جو چٹھی لکھی اس میں میں نے جوڑ دیا کہ یہاں کا موسم خراب ہے، بارش اچانک ہوتی ہے۔ وہاں کا موسم کیسا ہے لکھنا، فکر لگی ہے۔ کچھ سوچ کر بعد میں میں نے 'فکر لگی ہے' کو کاٹ دیا۔

دفتر میں سب کمروں میں ٹیوب لائٹ جل رہی تھی۔ بڑے بابو کی ٹیبل کے نیچے پائپ سے رس کر پانی جمع ہو گیا تھا۔ کسی نے اس جگہ کپڑا باندھ دیا تھا۔ دیوانگن بابو سے میں نے کہا، ''کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔''

دیوانگن بابو نے کہا، ''مجھے بھی سردی لگی ہے۔ سر میں درد ہے۔ اگر بڑے بابو مان گئے تو میں جلدی گھر چلا جاؤں گا۔'' بڑے بابو کرسی پر نہیں تھے۔ فائل لے کر صاحب کے پاس گئے تھے۔

''طبیعت میری بھی اچھی نہیں ہے، پر میں گھر نہیں جانا چاہتا۔ گھر بہت ٹپکتا ہے۔''

''میں برسات میں خوش رہتا ہوں،'' گوراہا بابو نے کہا۔

''کیوں؟'' ہم دونوں نے پوچھا۔

''ایک تو چاروں طرف بجری کی زمین ہے، پانچ انچ پانی برسے تو بھی وہاں جمع نہیں ہوتا۔ کیچڑ کا

Scanned with CamScanner

سوال نہیں ہے۔ پانی برستا ہے تب بھی سائیکل سرر سرر چلتی ہے۔ گھر کی چھت ٹین اور ازبسٹاس کی ہے۔ ایک بوند پانی نہیں ٹپکتا۔ بس ایک بات کا ڈر رہتا ہے کہ زور کی ہوا سے پوری چھت نہ اڑ جائے۔ پچھلے سال تو کچھ نہیں ہوا۔ میرے آس پاس کوئی نہیں ہے، میدان میں اکیلا میرا گھر ہے۔ ٹین کے اوپر میں نے بڑے بڑے پتھر رکھ دیے ہیں۔ ازبسٹاس کے اوپر نہیں رکھے، اس کے ٹوٹنے کا ڈر رہتا ہے۔ پہلے میرا گھر ایک چھوٹا سا گودام تھا۔ گینتی، پھاوڑے، گھمیلے، سبّل جیسی چیزیں یہاں رکھی جاتی تھیں۔ بازو میں بجری کی کان ہے۔ بجری کی کانوں میں پانی بہت بھر جاتا ہے۔ انجان آدمی تو ڈوب جائے۔ میرا چھوٹا لڑکا بھی سمجھدار ہے، سپاٹے سے اسکول جاتا ہے اور ہم لوگوں کو فکر نہیں ہوتی کہ وہ ڈوب جائے گا۔''

گوراہا بابو پان کھاتے تھے۔ دن بھر میں تین چار پان کھانے کی ان کو عادت تھی۔ جب مہنگو گوراہا بابو کے لیے پان لینے جا رہا تھا تب میں نے اس سے کہا، ''مہنگو، لوٹتے وقت دیکھ لینا کہ پانی برسے گا یا نہیں۔''

بڑے بابو نے کہا، ''راستے میں میرا کام بھی کر دینا۔ چاہے جاتے وقت یا لوٹتے وقت مزار میں پانچ پیسے کی اگربتی جلا دینا۔ آج جمعہ ہے۔'' بڑے بابو نے مہنگو کے پاس پانچ پیسے پھینک دیے۔ ہر جمعے کو پانچ پیسے کی اگربتی بڑے بابو کی طرف سے جلتی تھی۔

مہنگو گوراہا بابو کے لیے پان لایا، بڑے بابو کے لیے مزار میں اگربتی جلا آیا، پر میرا کام وہ بھول گیا۔

''مہنگو، میرے کام کا کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''بھول گیا،'' اس نے کہا۔

بڑے بابو نے کہا، ''جاؤ ابھی دیکھ کر آؤ۔ کوئی خاص بات ہوگی تبھی وہ کہہ رہے ہیں۔''

برآمدے میں نکل کر اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ وہاں سے پورا آسمان نہیں دکھا ہوگا۔ نیچے اتر کر وہ کھلے میں آ گیا۔ چاروں طرف دیکھ کر وہ لوٹا۔ ''پکی بات ہے پانی برسے گا،'' اس نے کہا۔

''سن لیے؟'' بڑے بابو نے کہا۔

''ہاں،'' میں نے کہا۔

''اب مجھ کو سمجھاؤ، پانی نہ برستا تو کیا ہوتا؟'' بڑے بابو نے کہا۔

Scanned with CamScanner

''بڑے بابو آپ سرکاری کوارٹر میں رہتے ہیں، اس لیے مزے میں ہیں۔ میرے گھر کی چھت بہت ٹپکتی ہے۔ میں کرائے کے مکان سے دنیا دیکھتا ہوں۔ میری طبیعت دو تین دن سے گڑ بڑ ہے۔ مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ یہ مت سوچیے کہ میں آپ سے چھٹی کے لیے کہوں گا۔''

''خود کے مکان سے دنیا دیکھنے کا سکھ میرے پاس بھی نہیں ہے،'' گوراہا بابو اور دیوانگن بابو نے ایک ساتھ کہا۔

''سرکاری کوارٹر میرا مکان نہیں، سب کا مکان ہے۔ سب کا مکان ہونے سے میں بھی اس میں شامل ہو گیا۔ رہتا ہوں تب بھی، نہیں رہتا ہوں تب بھی۔ اس لیے سرکاری کوارٹر آپ سب کا بھی ہے۔''

''دلوا دیجیے،'' ایک ساتھ ہم تینوں نے کہا۔

''صاحب بھی اپنی تنخواہ سے خود کا مکان نہیں بنا سکتے۔ جس ٹھاٹھ سے رہتے ہیں اس میں تو پانچ دن میں ان کی تنخواہ ختم ہو جائے گی۔ باقی پچیس دن ان کی خفیہ تجوری میں بند رہتے ہیں۔ ہمارے پچیس دن گھورے پر پڑے رہتے ہیں۔ ہمارا مہینہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تیس دن ہوتا ہے،'' میں نے کہا۔

''چندی چندی ہو کر تیس دن،'' دیوانگن بابو نے کہا۔

''میں سوچ سمجھ کر چلنے والا آدمی ہوں۔ نہیں تو شہر سے باہر میدان کے بیچ میں اکیلے نہ رہتا۔ سنتو بابو کی طرح بیچ شہر میں پچاس روپے کا ایک مکان میں بھی لے لیتا۔ ایک ایک دن جوڑ کر مہینہ پورا کرتا ہوں۔ میں اپنی زندگی سے بہت خوش ہوں۔ ہائے ہائے مجھے اچھی نہیں لگتی۔ میں نہ معلوم کتنے لوگوں سے اچھا ہوں۔''

''تم پانچ روپے کی کھولی میں رہو گے تب بھی بہت سے لوگوں سے اچھے رہو گے، جن کی میں گنتی نہیں لگا سکتا،'' میں نے گوراہا بابو سے کہا۔

''تم کو روز پچھتر پیسے مل جائیں تب بھی تم گذارا کر لو گے اور بہت لوگوں سے اچھے رہو گے، کیونکہ تم سوچ سمجھ کر چلنے والے آدمی ہو،'' دیوانگن بابو نے گوراہا بابو سے کہا۔

''نوجوان دوستو، کل سے تم لوگ تاش کی گڈی دفتر میں لے آنا،'' بڑے بابو نے کہا۔

میں مسکرایا۔ مجھے ان کا 'نوجوان دوستو' کہنا بہت اچھا لگا۔

''سنتو بابو، آپ اپنا پیٹ صاف رکھا کیجیے۔ آپ کی گڑ بڑ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی،'' بڑے بابو

Scanned with CamScanner

نے کہا۔

''بڑے بابو، آج آپ قوالی سننے جائیں گے؟'' گورا بابو نے پوچھا۔

''میں ہر روز یہاں آتا ہوں اور مجھے رات کے دس گیارہ بج جاتے ہیں۔ دفتر کے بچے ہوئے کام نپٹا کر میں گھر جاتا ہوں۔''

یہ سن کر ہم سب لوگ مسکرانے لگے۔

پیر کے مزار کی وجہ سے یہ دفتر دیہاتیوں، تانگے والوں کے بیچ 'مزار والا دفتر' کہلاتا تھا۔ 'بابا جی کا دفتر' کہنے سے بھی لوگ سمجھ جاتے تھے۔ ہر جمعے کو یہاں دیر تک قوالی ہوتی تھی۔ برسات میں قوالی گانے والے چار پانچ لوگ ہوتے اور سننے والے بھی دو چار لوگ ہوتے۔

منگل کو پرساد چڑھانے والے دفتر میں بہت تھے۔ پر یہ لوگ دفتر کے اندر کے ہنومان جی پر اتنا اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔ صرف دفتر کھولنے والا چپراسی ہال کھولتے ہی آتشدان میں رکھے ہنومان جی کو پرنام کرتا تھا۔ پر جہاں دفتر ہو وہاں ہنومان جی کی مورتی پر کسی کی نظر نہیں جاتی۔ بس صاحب تھے، ان کے کمرے میں چپراسی اگربتی جلا کر ماحول کو پاک کرتا تھا۔ صاحب نے قاعدے کے مطابق اسے ایسا کرنے کے لیے کہا تھا۔ دفتر کے لوگ ان کو اگربتی والے صاحب کہتے تھے۔ ایک بار ایک کسان اپنے لمبے چوڑے کنبے کے ساتھ، ناریل اور اگربتی لے کر، بغیر کسی سے پوچھے تاچھے، ٹیبلوں کے بیچ سے گھستے ہوئے ہنومان جی کی طرف جانے لگا۔ چپراسی اور بابوؤں نے ٹوکا، ''ارے ارے! کہاں گھس رہے ہو؟ کیا کام ہے؟ رکو، باہر چلو۔''

کسان نے گھبرا کر کہا، ''مہاراج، منت مانی تھی۔ ہنومان جی کو پرساد چڑھانا ہے۔''

''کب منت مانی تھی؟'' ایک نے پوچھا۔

''پچھلے سال مالک۔ جب قرضہ لینے آیا تھا۔'' اس کے پورے کنبے کے لوگ گھبرا گئے تھے۔

''کیا مانا تھا؟''

''ہم لوگ، فصل اچھی ہو یہی مانے تھے مالک۔''

''کیا چڑھاؤ گے؟''

"آدھا کلو پیڑا ہے۔ فصل اچھی ہوئی۔ چنا، السی، لاکھڑی اچھی تھی۔"

"جلدی پرساد چڑھا کر بھاگ جاؤ۔ یہ دفتر ہے۔ اب دوبارہ یہاں پرساد چڑھانے مت آنا، سمجھے؟"

بابو لوگوں نے کرسی ٹیبل سرکا کر ان کے لیے جگہ بنائی۔ ان سب نے ڈرتے ہوئے جلدی جلدی پھول پتی چڑھا کر پوجا کی۔ ایک چپراسی نے ناریل پھوڑا۔ پیڑا چڑھایا گیا۔ پرساد بانٹا گیا۔ بہت تھوڑے لوگوں کو پرساد ملا۔ دیوانگن بابو کو جو ٹکڑا ملا تھا اس کے انھوں نے بہت چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیے۔ یہ ٹکڑے انھوں نے ہم سب لوگوں میں بانٹ دیے۔ ایک چٹکی بھر پیڑے کا ٹکڑا مجھے بھی ملا تھا۔ کئی دنوں بعد صاحب کو یہ واقعہ معلوم ہوا۔ وہاں بیٹھنے والے بابو کو بہت ڈانٹ پڑی۔ صاحب نے ہنومان جی کی مورتی کو ہٹا کر کمپاؤنڈ میں کہیں اچھی جگہ رکھنے کے لیے کہا، پر یہ کام کسی نے نہیں کیا۔ ٹیبل پر بچھانے والی ایک پھٹی ہوئی چادر اس کے اوپر ٹانگ دی گئی تا کہ آتے جاتے لوگوں کی نظر اس پر نہ پڑے۔

پیر کے نام سے ایک کمرہ خالی ہے، یہ بات صاحب کو معلوم تھی۔ کام چل رہا تھا اس لیے اس کمرے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ بعد میں جگہ کی بہت دقت ہونے لگی تھی۔ چھوٹا ہونے کے باوجود اس کمرے میں چار ٹیبلیں آ سکتی تھیں۔ جن لوگوں کو بیٹھنے میں دقت ہو رہی تھی ان سب نے وہاں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ بنگلے والے دفتر میں آٹھ مسلمان چپراسی تھے۔ اتفاق سے یہ لوگ الگ الگ سیکشن میں تھے۔ ایک کو چھوڑ کر یہ سب لوگ اس کمرے میں بیٹھنے کے لیے تیار تھے۔ دوسرے بہت سے لوگ بھی وہاں بیٹھنے کے لیے تیار تھے۔ مجھے لوگوں کا اس کمرے میں نہ بیٹھنے کا سبب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ گوراہا بابو تیار نہیں تھے۔

"گوراہا بابو، آپ تیار کیوں نہیں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہاں بیٹھنے کے لیے بالکل پاک صاف ہونا چاہیے۔ کبھی کبھی تو میں نہا بھی نہیں پاتا۔ کپڑے چار پانچ دن بعد بدلتا ہوں۔ الٹا سیدھا ہو جائے، ڈر لگتا ہے۔" اس طرح سے ہم لوگوں نے نہیں سوچا تھا۔ صاحب نے بازو والے کمرے کی الماری اور ریک اٹھوا کر پیر کے کمرے میں رکھوا دیے۔ اس سے بازو کے کمرے میں جو جگہ خالی ہوئی وہاں کرسیاں ٹیبلیں رکھوا دی گئیں۔ پہلے پیر کے کمرے میں کسی کا آنا جانا نہیں ہوتا تھا۔ فائل کی الماری اور ریک ہونے سے بابو، چپراسی لوگ اس کمرے میں آنے جانے لگے۔

Scanned with CamScanner

مہنگو نے آ کر بہت دھیرے سے میرے کان میں کہا، ”بوندا باندی ہو رہی ہے۔“

میں نے بھی دھیرے دھیرے اس سے کہا، ”جب دھوپ نکلے تب بتلانا۔“

جب مہنگو چلا گیا تو دیوانگن بابو نے مجھ سے پوچھا، ”مہنگو کیا کہہ رہا تھا؟“

”کچھ نہیں،“ میں نے کہا۔ دیوانگن بابو کا اس طرح پوچھنا مجھے اچھا نہیں لگا۔

”صاحب کا کوئی پیغام ہے کیا؟“

”نہیں،“ میں نے کہا۔

”آپ بھی بات چھپانے لگے۔“ دیوانگن بابو کے چہرے میں تناؤ تھا۔

بڑے بابو دیوانگن بابو کی بات سن کر بہت خوش لگے، اس لیے مجھے چڑ ہوئی۔ میں نے کہا، ”آپ کی بات مجھے اچھی نہیں لگی۔ آپ مجھے ابھی تک نہیں سمجھ پائے۔“

”نوکری میں سمجھنے کے لیے کچھ ہوتا نہیں ہے۔ کچھ لوگ اس لیے نہیں سمجھتے کہ ان کے لیے کٹھن ہے اور کچھ لوگوں کے لیے سمجھنے کے لیے کچھ ہوتا ہی نہیں۔ میرے لیے کٹھن ہے۔“

”آپ مجھے کس طرح کا نا سمجھ سمجھتے ہیں؟“

”میں آپ کو بہت ہوشیار سمجھتا ہوں۔“ مجھے لگا دیوانگن بابو کی یہی اصلیت ہے۔

”چھوڑو، کون سی بات لے کر بیٹھ گئے!“ گورا بابو نے کہا۔

میں نے گورا بابو سے کہا، ”جتنی برائیاں ہیں وہ صرف اس لیے کہ کچھ باتیں چھپائی نہیں جاتیں اور اچھائیاں اس لیے ہیں کہ کچھ باتیں چھپالی جاتی ہیں۔“

میں نے پھر کہا، ”میرے لیے یہ چھپانا اور دکھانا ویسا ہی ہے جیسے ایک ادھ کھلی الماری ہے۔ دراصل میں کچھ نہیں چھپاتا۔“

”ایک گلاس ہے جو آدھا بھرا ہے اور وہی آدھا خالی ہے،“ بڑے بابو نے زور سے ٹیبل ٹھونکتے ہوئے کہا۔ سب اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔

مہنگو پھر آیا، آ کر میرے کان میں دھیرے سے کہا، ”بوندا باندی بند ہو گئی۔“

وہ جانے لگا۔ میں نے اس سے رکنے کے لیے کہا۔ ”جو تم نے ابھی میرے کان میں کہا ہے اسے

یہاں زور سے سب کے سامنے کہو۔''

یہ سن کر بڑے بابو لوہے کی الماری کھولتے کھولتے دھپ سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ مہنگو میری بات سن کر کچھ نہ سمجھ پانے کے باعث ہنسنے لگا۔ مہنگو کے اکا دکا دانت بچے ہوں گے۔ وہ بہت چھوٹے چھوٹے بال رکھتا تھا۔ بہت دبلا اور قریب پچاس سال کا ہوگا۔ جب وہ ہنستا تو اس کی زبان ہلتی دکھتی تھی۔

''ہنسنے کی بات نہیں ہے، یہ دفتر ہے۔ سب کو شک ہوتا ہے۔ زور سے کہو!'' ڈپٹتے ہوئے میں نے مہنگو سے کہا۔ ''مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ کوئی مجھ پر شک کرے،'' دیوانگن بابو کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔

''بوندا باندی بند ہوگئی ہے،'' سب سن لیں اتنی زور سے مہنگو نے کہا۔ اور مہنگو کا چہرہ میری طرف تھا۔

''دیوانگن بابو، آپ نے سن لیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں،'' دیوانگن بابو نے اداس ہو کر کہا۔

''مہنگو، اس کے پہلے جو بات تم نے میرے کان میں کہی تھی وہ بھی زور سے سب کے سامنے بول دو۔ ٹھہرو! دیوانگن بابو کی طرف ہو کر بولو۔''

مہنگو گھوم کر دیوانگن بابو کی طرف ہو گیا۔ ''بوندا باندی ہو رہی ہے،'' اس نے زور سے کہا۔ پھر بڑبڑاتا ہوا باہر چلا گیا۔

میں کھڑکی سے رات کو دیکھ رہا تھا۔ چاند کا اتنا اجالا آ رہا تھا کہ میں اپنی ہتھیلی کی لکیروں کو دیکھ سکتا تھا۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں نے بیوی کو جگایا۔ ''مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔ اجلی رات ہے۔''

''پرسوں پورے چاند کی رات ہے۔ ہاتھ پیر دبا دوں؟'' اس نے پوچھا۔

''آدھی رات کو اگر دھوپ نکل آئے تو کیسا لگے گا؟''

''میں سمجھوں گی صبح ہوگئی۔ سب یہی سمجھیں گے،'' اس نے کہا۔

''پر ڈاکٹر صاحب اصلیت جان جائیں گے کہ آدھی رات کو دھوپ نکلی ہے!''

بیوی چپ رہی۔ شاید اسے نیند آنے لگی تھی۔

Scanned with CamScanner

''رات بہت اچھی لگ رہی ہے۔ گھومنے کو جی چاہ رہا ہے،'' میں نے بیوی کو ہلا کر جگاتے ہوئے کہا، ''چلو اٹھو۔ ٹہلیں گے۔''

آنگن میں ٹہلتے ہوئے میں پیڑے سے ٹکرا گیا۔ ''پیڑا بیچ میں رکھ دیا۔ کنارے رکھنا تھا۔'' میں اپنے انگوٹھے کو سہلانے لگا۔

''زور سے لگ گئی؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں،'' میں نے کہا۔ آنگن اینٹوں سے پکا بنا دیا گیا تھا۔ سامنے کے اس کھلے ہوئے حصے کو بھی ہم لوگ آنگن کہتے تھے۔ جہاں پر اینٹیں ہموار نہیں تھیں وہاں گیلا پن تھا، اور جہاں گڈھا تھا وہاں پانی جمع تھا۔

بیوی پیڑے کو دیوار کے پاس رکھ کر اس پر بیٹھ گئی۔ ''مجھ کو تھکاوٹ لگ رہی ہے،'' اس نے کہا۔

میں نے پوچھا، ''چاندنی سے کھپریلیں نہیں سوکھیں گی؟''

''نہیں!'' گھٹنوں کے اوپر سر رکھ کر اس نے کہا۔ چاندنی میں اس طرح وہ مجھے بہت اچھی لگی۔ رکشے کی کھڑ کھڑ اور اس میں بندھے گھنگھروؤں کی آواز سنائی دینے لگی۔ یہ وقت ہاوڑا بمبئی ایکسپریس کا تھا۔

''ایکسپریس گاڑی آ گئی ہے،'' میں نے کہا۔

''پتا جی جب بھی آئے اسی گاڑی سے آئے،'' اس نے کہا۔ اب اس کی آواز میں تھکاوٹ نہیں تھی۔ وہ دھیرے دھیرے ہوشیار ہو گئی تھی۔ میرے سسر آنے کی اطلاع تار سے دیتے تھے۔ پھر بھی جب رکشہ گھر کے پاس آنے لگا تو میں رکشہ دیکھنے باہر نکل آیا۔ باہر آ کر دیکھا کہ رکشہ گھر سے آگے دور جا چکا تھا۔ سڑک خالی تھی۔ سڑک میں، سڑک کی بتیوں سے چاند کا اجالا بدرنگ ہو گیا تھا۔

مجھے اپنے سسر کا انتظار کہاں تھا؟ مجھے دھوپ کا انتظار تھا۔ چاندنی رات نے دھوپ والی صبح کا امکان بڑھا دیا تھا۔ سورج بمبئی ہاوڑا ایکسپریس سے نہیں آتا۔ وہ میرا سسر نہیں تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے سوچا۔

اوس گرنے کا یہ موسم نہیں تھا۔ یہ موسم برسات کا تھا۔ اوس سے کھپریلیں شاید تھوڑی گیلی ہو جاتیں، پر اوس سے چھت نہیں ٹپکتی۔ اگر اوس سے چھت ٹپکتی تو یہ اتنا کم اور رک رک کر ہوتا کہ اس کے

Scanned with CamScanner

ٹپکنے سے مزہ آتا۔ اوس سے چھت ٹپکنے کی بات سوچتے سوچتے مجھے نیند آنے لگی۔ بیوی کب کی سونے چلی گئی تھی۔

صبح میں بہت دیر سے اٹھا۔ آٹھ بج گئے تھے۔ نیند کھلنے کے بعد بھی میں بستر سے نہیں اٹھا۔ دفتر جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں بہت کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ ہاتھ پیروں میں درد ہو رہا تھا۔ میں سمجھ گیا اب مجھے تیز بخار آئے گا۔

''تم کو بخار چڑھا ہے۔'' بیوی مجھے اٹھا دیکھ کر پاس آئی۔ ''کیسا لگ رہا ہے؟'' ماتھا سہلاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ ہاتھ پیروں میں بہت درد ہو رہا ہے،'' میں نے کہا، ''ٹھنڈ لگ رہی ہے۔''

وہ اوڑھنے کے لیے چادریں لے آئی۔ میں دو چادریں سر تک اوڑھ کر لیٹا تھا۔ پھر بھی مجھے ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ وہ زیادہ دودھ کی چائے لے کر آئی۔ اس میں سونٹھ پڑی تھی۔ چائے مجھے اچھی لگی۔ مجھ میں طاقت آ گئی۔ میں پیشاب کرنے کے لیے اٹھا۔

دھوپ نکل آئی تھی۔ دھوپ میں مجھے بیٹھا دیکھ کر اس نے کہا، ''دھوپ میں بخار اور چڑھ جائے گا۔''

''بہت ٹھنڈ لگ رہی ہے۔ کمبل دو اوڑھنے کے لیے۔''

''سنو! اپن لوگ کھپریلیں خود بنوا لیں گے۔ ڈاکٹر سے اب کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا ہوا جو اپنے ہی پیسے خرچ ہو جائیں گے۔''

بیوی مجھے سمجھا رہی تھی۔ بستر پر لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی۔ بیچ بیچ میں میری نیند کھل جاتی تھی۔ تب بیوی چائے یا دودھ کے لیے پوچھتی۔ میں صرف پانی پیتا۔

بخار چڑھتا ہوا دیکھ کر بیوی نے دودھ والے سے خبر بھجوا کر سمپت کو بلوا لیا تھا۔ بخار میں میں ایسا محسوس کر رہا تھا کہ بہت گہری نیند آ رہی ہے اور مجھے جاگنا بھی ہے۔ لگتا تھا ہڈیوں کے پورے ڈھانچے پنجر میں درد ہو رہا ہے۔

مجھے کسی نے کندھے پر لاد لیا تھا۔ آنکھ کھول کر میں نے دیکھا، سمپت تھا۔ ٹوٹی دیوار کے بیچ سے گزرتے ہوئے سمپت کچھ لڑکھڑایا، پھر دیوار کا سہارا لے کر سنبھل گیا۔ دیکھی ہوئی کسی جنگ عظیم کی فلم کا سین مجھے بخار میں اپنی طرح یاد آ رہا تھا کہ میں لڑائی میں زخمی ہو چکا ہوں اور بچپن کا دوست سمپت اپنی

جان کی پروا نہ کرتے ہوئے مجھے لاد کر بھاگنے لگا ہے۔ رائفلوں، مشین گنوں کی گولیوں کی بوچھاڑ کے بیچ سے مجھے کندھے پر لادے ہوئے بھاگا جا رہا ہے۔ دلدل، کیچڑ، اونچی اونچی گھاس سے چھپتا بچتا ہوا جا رہا ہے۔ جب تک وہ ببول کے پیڑ کے پاس نہیں پہنچا تھا تب تک مجھے بری طرح زخمی ہونے کے باوجود بچنے کی امید تھی اور اب کوئی امید نہیں ہے، جیسے وہ مجھے دشمنوں کی سرزمین میں لے آیا تھا۔

''مجھے اتار دو، میں چل سکتا ہوں،'' کراہتے ہوئے میں نے کہا۔

سمپت نے میری بات کی پروا نہیں کی۔ میں گڑگڑانے لگا،''ڈاکٹر کے پاس مجھے مت لے چلو۔ وہ مجھے مار ڈالے گا۔ پیر پکڑتا ہوں، کسی اور کے پاس لے چلو۔ مجھے بچالو۔'' میں اس کے کندھے سے اترنے کی کوشش کرنے لگا۔ پر وہ رکنے اور جواب دینے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ میں ہچکیاں لے لے کر دبی آواز میں رونے لگا، پھر پرسکون ہو گیا۔

برآمدے کی بنچ پر باغیچے کی طرف کروٹ لیے مجھے لٹایا گیا تھا۔ میں گھوم کر دیوار کی طرف ہو گیا۔ دیوار میں میرے چہرے کے پاس پنسل سے انگریزی کا ''اے'' لکھا تھا۔ اس ''اے'' کے حرف کو دیکھتے ہوئے میں سوچنے لگا کہ میں پھنس گیا۔ ڈاکٹر میرا علاج کر کے، میرے شائستہ رویے اور شرمیلے پن کو صورت دے کر مجھے بہت دبو اور قابل رحم آدمی بنا دے گا۔ میں اتنے بڑے ڈاکٹر کے علاج کے لائق مریض نہیں تھا۔

لیٹے لیٹے جب میں نے آنکھ کھولی تو ڈاکٹر کو دیکھ کر لگا کہ وہ زمین سے چھت تک اونچا ہے۔ میں نے تاڑ کے پیڑ کو برگد کی طرح موٹا سوچا۔ اس کا چہرہ مجھے جانچتے ہوئے، میرے پاس جھکا ہوا تھا۔ میں نے اس کے نقلی جبڑے کی کڑکڑ آواز صاف صاف سنی۔ اس کے منھ سے قیمتی تمباکو کی خوشبو آ رہی تھی۔ ڈاکٹر کے پیچھے میں نے ادھیڑ بیوپاری کو کھڑے دیکھا۔ اس کے کندھے پر انگوچھا رکھا تھا۔ میری نظر جیسے ہی اس سے ملی، وہ انگوچھے سے ہوا کرنے لگا۔ ڈاکٹر مجھے سوئی لگانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے میرے دل میں بہت احترام کا جذبہ تھا۔ جب میں نے اسے سوئی لیے ہوئے دیکھا تو میرا سارا احترام ختم ہو گیا۔ وہ مجھے بہت واہیات اور گھناؤنا آدمی لگا۔ کچھ لوگوں نے مجھے پکڑ رکھا تھا۔ میں سوئی نہیں لگوانا چاہتا تھا۔ میں آنکھ بند کر دل ہی دل میں ڈاکٹر کو گالیاں دینے لگا۔

دوسرے دن میں بہت ٹھیک ہو گیا۔ ڈاکٹر نے اناج کے لیے منع کر دیا تھا۔ میرے ہاتھ پیروں

Scanned with CamScanner

میں کھجلی ہونے لگی تھی۔ کھجلی دھیرے دھیرے دوپہر تک کم ہوگئی۔ تب بھی مجھے مچھر، چیونٹی یا کھٹمل کے کاٹنے کا وہم ہوتا تھا۔ دوپہر کو اچانک میری نظر کھڑکی پر گئی تو دیکھا کہ مہنگو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں، کچھ نہیں!'' کہتا ہوا وہ بھاگ گیا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ میری آواز سن کر بیوی دوڑ کر آئی۔

''مہنگو ٹوہ لینے آیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بھاگ گیا۔''

جب میں بیمار نہیں تھا تب مجھے رات کو جھینگروں کی آواز سنائی دیتی تھی۔ اب مجھے دن کو بھی جھینگروں کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ کونے کونے میں مجھے نحوست دکھائی دیتی تھی اس لیے زیادہ وقت میں آنکھ بند کیے رہتا تھا۔ ایک کپ دودھ پینے کے بعد جب میں آنکھ بند کر لیتا تو مجھے ایک منظر دکھلائی دیا کہ میں ایک تیز گیند کے پیچھے اسے پکڑنے کے لیے کودتا پھاندتا بھاگ رہا ہوں۔ وہ گیند ایک سمجھدار گیند ہے۔ مجھ سے بچنے کے لیے وہ لڑھکتی ہوئی جھاڑیوں کے بیچ جا کر کھو گئی، نہیں، جان بوجھ کر چھپ گئی ہے۔ گیند نہ ملنے کے سبب میں مایوس ہو کر لوٹتا ہوں۔ تب ڈاکٹر کے کمپاؤنڈ میں ایک ٹرک اینٹ سے بھرا آ کر رکتا ہے۔ میں ڈرائیور سے جا کر پوچھتا ہوں کہ یہ اینٹیں کس لیے ہیں؟

بہت مشکل کے بعد ملے اس مکان کے اندر میں، میرا خاندان، میری گرہستی اندر سے کنڈی لگا کر محفوظ تھے۔ یا جان بوجھ کر قیدی؟ آخر کہاں جایا جا سکتا ہے؟ سمجھ بوجھ کر، پڑھ لکھ کر قیدی؟ اس سے چھٹکارا کہاں ہوگا؟ اپنا خود کا مکان اس سے چھٹکارا ہے کیا؟ اس بات کے تصور میں ایک بڑا سوراخ تھا۔ اہم بات زندہ آدمی کی کلائی میں بند گھڑی نہیں تھی، مرے ہوئے آدمی کی کلائی میں بندھی چلتی گھڑی تھی۔ میرا معاملہ مردہ آدمی کی چلتی گھڑی کا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب نے روز دکھلانے کے لیے کہا ہے،'' بیوی نے کہا۔

وہ بہت سہم کر بولی تھی۔ گھبرائی ہوئی بھی تھی، جبکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں اسے جھڑک دیا کرتا تھا۔ ہر بار جھڑکی کھانے کے بعد اس کی خاموشی ویسی ہی ہوتی تھی جیسے نیوز ریل میں طوفان اور سیلاب کے سین آتے رہتے ہیں پر کسی سبب سے آواز بند ہو جاتی ہے اور تباہی کے سین گزرتے رہتے

ہیں۔ اس کی گھبراہٹ اور دکھ کو میں ان دیکھا کر دیا کرتا تھا، اسی باڑھ کی نیوز ریل کی طرح جو مجھے گھر بیٹھے سنائی دیتی تھی۔ پر منظر کہاں دکھائی دیتا تھا، تباہی کے اعداد و شمار اور دکھ بھری دھن سنائی دیتی تھی۔

دفتر سے میں نے پانچ روز کی چھٹی لے لی تھی۔ دوپہر کو بڑے بابو آئے۔ بڑے بابو اسٹول پر بیٹھ گئے۔ میرے ماتھے پر ہاتھ لگا کر انھوں نے پوچھا، ''کیسی طبیعت ہے؟''

''ٹھیک ہوں۔ آپ کو تکلیف ہوئی بڑے بابو۔ میں بہت مجبوری میں ہوں۔ میں چھٹی نہیں لیتا، یہ آپ جانتے ہیں۔'' کہتے ہوئے میرا گلا بھر آیا۔

''ارے! تکلیف کیسی؟ تم تو میرے لڑکے کی طرح ہو۔ مہنگو سے معلوم ہوا کہ تمھاری طبیعت بہت خراب ہے۔ چھٹی کی درخواست پا کر میں نے مہنگو کو تمھیں دیکھنے کے لیے بھیجا تھا۔ تمھارا کام گوراہا بابو دیکھیں گے۔ دیوانگن بابو سے میں نے دیکھنے کو کہا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ گوراہا بابو تیار ہیں۔ میں نے کہہ دیا ہے۔ آج شام کو تم سے آ کر ملیں گے۔ چھٹی کی درخواست میں نے بھجوا دی ہے۔ تم بالکل فکر مت کرو۔ خرچ کے لیے روپے کی ضرورت تو نہیں ہے؟''

''نہیں، ضرورت ہوگی تو آپ سے مانگ لوں گا۔ میں آپ کو اپنا بہی خواہ سمجھتا ہوں۔ مکان مالک ڈاکٹر ہیں۔ ان کا ہی علاج چل رہا ہے۔ فیس کے پیسے نہیں لیں گے، ایسا مجھے لگ رہا ہے،'' میں نے کہا۔

''اچھا ہے جو پانی نہیں برس رہا ہے، نہیں تو تم جھنجھٹ میں پھنس جاتے۔ کھپریلوں کی مرمت ہو گئی ہوگی؟''

''نہیں! ابھی تک تو نہیں ہوئی۔ تین دن تک لگاتار دھوپ نہیں نکلی۔ برابر بدلی چھائی رہتی ہے۔ کھپریلیں سوکھ جائیں گی تب کاریگر بنائے گا۔''

چھت کا ذکر مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ بیوی چائے لے آئی تھی۔

''تم لوگ بے فکر رہو۔ دفتر کی فکر مت کرو،'' بیوی کو بھی سناتے ہوئے بڑے بابو نے کہا۔

شام کو دفتر سے دیوانگن بابو آئے۔ آتے ہی انھوں نے پوچھا، ''بڑے بابو آئے تھے؟''

''ہاں!'' میں نے کہا۔

''کیا کہہ رہے تھے؟''

"دفتر کے بارے میں بے فکر رہنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ چھٹی کی درخواست انھوں نے آگے بڑھادی ہے۔ کیا بات ہے؟"

"ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔"

کچھ دیر بعد گوراہا بابو بھی آ گئے۔ "آپ یہاں ہیں اور میں آپ کو ڈھونڈ رہا تھا کہ ساتھ ساتھ چلیں گے،" گوراہا بابو نے دیوانگن بابو سے کہا۔

دیوانگن بابو کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ گوراہا بابو میری چارپائی پر بیٹھے۔ میں دیوار سے پیٹھ ٹکائے چارپائی پر بیٹھا تھا۔ دونوں کے آجانے سے مجھے لگ رہا تھا کہ میں دفتر میں ہوں۔

"بڑے بابو آ کر گئے،" دیوانگن بابو نے گوراہا بابو سے کہا۔

"کب؟" گوراہا بابو نے پوچھا۔

"دوپہر کو،" میں نے کہا۔

دس پندرہ منٹ بیٹھ کر دونوں چلے گئے۔ گھر میں دودھ نہیں تھا اس لیے چائے نہیں بنی۔ آدھا کلو زیادہ دودھ لینے کے باوجود آج دودھ نہیں بچا تھا۔ کافی دودھ میں پی گیا تھا۔

میں نے بیوی سے کہا، "ڈاکٹر صاحب کے پاس جانا ہے۔ چھ بج رہے ہوں گے۔ مریض رہتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب دیر تک بیٹھتے ہیں۔"

"میں بھی چلوں؟" بیوی نے پوچھا۔

"اکیلا چلا جاؤں گا۔ اب تو بہت اچھا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے انجکشن نے جادو کی طرح کام کیا ہے۔ مجھے تو لگ رہا تھا کہ مہینوں اٹھ نہیں سکوں گا۔" وہ میرے ساتھ ساتھ کمپاؤنڈ کی ٹوٹی دیوار تک آئی۔ میں نے اس سے کہا، "اب تم جاؤ۔"

"کنویں تک چلتی ہوں،" اس نے کہا۔

"اس کے بعد کہوگی، ببول کے پیڑ تک چلوں گی۔"

"نہیں کہوں گی۔"

کنویں کے پاس پہنچتے ہی میں نے کہا، "اب تم جاؤ۔" میرے کہتے ہی وہ گھر چلی گئی کیونکہ گھر خالی تھا۔ سامنے کا دروازہ بند تھا اس لیے اتنا خطرہ نہیں تھا، آدمی کا بھی اور بلی کا بھی۔ دودھ گھر میں تھا ہی نہیں۔

Scanned with CamScanner

برآمدے میں بالکل بھیڑ نہیں تھی۔ زیادہ تر لوگ نپٹ چکے تھے۔ تین چار لوگوں کے ساتھ دو مریض برآمدے میں تھے۔ ایک اندر تھا۔ ادھیڑ بیوپاری بھی بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ بیمار عورت نہیں تھی۔ وہ اکیلا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔

"کیسی طبیعت ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔"

"کل آپ کی طبیعت بہت خراب تھی۔ اب بہت اچھے ہیں۔ ڈاکٹر کی دوا نے اچھا کر دیا ہے۔" کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔

"کیوں ہنس رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بخار میں آپ ڈاکٹر صاحب کو گالیاں دے رہے تھے۔"

یہ سن کر میں سُن رہ گیا۔

"کیا میں گالیاں دے رہا تھا؟" میرے منھ سے نکلا۔

"ہاں۔ بیمار کی بات کا کوئی برا نہیں مانتا۔ پھر آپ تو بخار میں بے ہوش تھے۔ ڈاکٹر صاحب بہت اچھے ہیں، یہ میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا۔"

"سمپت نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔"

"آپ کے ساتھ جو تھے، ان کا نام سمپت ہے؟"

"جی ہاں! میرا دوست ہے۔"

"آپ کی بڑی فکر کر رہا تھا۔"

"بہت پرانی دوستی ہے۔ ہم دونوں ایک ہی جگہ کے رہنے والے ہیں۔ سچ سچ بتلائیے، کیا میں گالیاں دے رہا تھا؟" میں نے تصدیق کرنی چاہی۔

"مجھے کیا پڑی جو آپ سے جھوٹ بولوں گا۔ میں اپنی فکر سے مر رہا ہوں اور یہاں آپ بھی باغیچے میں بیٹھنے نہیں آئے ہیں۔ بیمار ہیں۔ کل بہت بیمار تھے۔ کیا ہوا جو اب اچھی طبیعت ہے۔ بالکل صحت مند تو نہیں ہیں۔ ایسی ویسی نہیں، آپ چھانٹ چھانٹ کر گالیاں دے رہے تھے۔ جب ڈاکٹر آپ کو انجکشن لگانے لگا تب آپ غصے سے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگے۔ کہہ رہے تھے: سالا حرامی

ڈاکٹر مار ڈالے گا۔ مالی، بچاؤ۔ میرا دوست سمیت میری جان کا دشمن ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر سے ملا ہوا ہے۔ مالی، مجھے بچاؤ۔ تب میں نے اور آپ کے دوست نے آپ کو پکڑ رکھا تھا۔ مالی تو سچ مچ دوڑتا ہوا آ گیا تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے مالی سے بچانے کی امید کیوں کی تھی۔ جب ڈاکٹر نے آپ کو انجکشن لگایا تب تو آپ بہت گندی گندی گالیاں دینے لگے تھے۔ ڈاکٹر نے آپ کی بات کا برا نہیں مانا۔ آپ کا دوست بار بار ان سے معافی مانگ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کچھ نہیں کہا، بس اتنا کہا کہ اناج ابھی مت دینا اور روز جانچ کے لیے لے آنا۔ اچھا ہوتا کہ آپ بچانے کے لیے میرا نام لیتے۔''

''مجھے آپ نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔''

ہم لوگ بہت دھیرے دھیرے بات کر رہے تھے۔ دن کے گزرنے کا اجالا اور رات کے آنے کا اندھیرا ملا جلا ہو گیا تھا۔ چوکیدار آ کر برآمدے کی بتی جلا گیا۔ میں بہت شرمندہ اور پچھتایا ہوا اپنی ساری بیماری بھول کر ڈاکٹر صاحب سے معافی مانگنے کی سوچ رہا تھا۔ اس وقت کتنا غیر مہذب، بدمعاش اور غنڈا لگ رہا ہوں گا۔ پتا نہیں یہ سب کیسے ہوا۔

''میں ڈاکٹر صاحب سے معافی مانگ لوں گا۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔ وہ آپ کو ضرور معاف کر دیں گے۔ سرکاری ڈاکٹر آپ کو کبھی معاف نہ کرتا۔ جب وہاں مریض ڈاکٹر کی بے پروائی سے مر جاتا ہے، بیماری سے نہیں مرتا، تب ڈاکٹر کے ناراض ہونے پر مریض کی کیا حالت ہوتی ہوگی، یہ آپ سوچیے۔''

''لیٹنے کی خواہش ہو رہی ہے، چکر آ رہا ہے،'' میں نے کہا۔

وہ سرک کر بنچ کے کنارے ہو گیا۔ آنکھ بند کر کے لیٹتے ہی مجھے آرام آیا۔ آنکھ بند کرنے سے لگا کہ میں اردگرد کے ماحول سے بچ گیا ہوں۔ شیر کو سامنے دیکھ کر، آنکھ بند کر کے میں اپنے کو بچانا چاہتا تھا۔ میں بے ہوش ہونے کی اس حالت سے بچنا چاہتا تھا جس میں ڈاکٹر صاحب کو میں نے گندی گندی گالیاں دی تھیں۔

مجھے ڈاکٹر صاحب نے ایک انجکشن اور لگایا۔ گھر جانے کے پہلے میں نے ادھیڑ بیوپاری سے پوچھا، ''اس بار بھی میں نے ڈاکٹر صاحب کو گالیاں دی تھیں؟''

''نہیں۔ اس بار تم ڈاکٹر صاحب سے معافی مانگ رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے لیے مستقبل

میں گردن کٹوانے کے لیے تیار تھے۔ انجکشن لگانے کے لیے تم نے ہاتھ خود آگے بڑھا دیا تھا۔''

''مجھے کچھ یاد نہیں ہے،'' میں نے کہا۔

پھر بھی مجھے اچھا لگ رہا تھا کہ میں نے کوئی گندی حرکت نہیں کی۔ اچھا لگنے کا سبب انجکشن کا فوری اثر بھی ہوسکتا تھا۔

ایک دن آدھے گھنٹے کے لیے ہلکا پانی برسا تھا۔ باقی وقت دھوپ تھی۔ مون سون آنے کا وقت کب کا نکل چکا تھا اور بارش کے دور دور تک آثار نہیں تھے۔ گرمی اسی طرح پڑ رہی تھی۔

میں دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا تو دیکھا چوکیدار کمپاؤنڈ کی ٹوٹی دیوار کے پاس کھڑا آواز دے رہا ہے۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کی بائی کو بلایا ہے۔''

''کس نے؟''

''ڈاکٹرنی بائی نے۔''

''کچھ کام ہے؟''

''ضروری کام ہے۔ جلدی بلایا ہے۔''

''اچھا بھیجتا ہوں،'' میں نے کہا۔

چوکے میں آکر میں نے بیوی سے کہا، ''تم کو ڈاکٹرنی بائی بلا رہی ہے۔''

''کھانا پروس دوں، پھر چلی جاؤں گی۔''

''کھانا میں نکال کر کھالوں گا۔ تم جاؤ۔ ضروری کام ہے،'' جلدی مچاتے ہوئے میں نے کہا۔

''سبزی کلبھارنا [۳] باقی ہے۔''

''تم جاؤ،'' میں نے کہا۔

وہ جلدی جلدی جیسے تیسے وہی چنری ساڑھی پہن کر گئی۔

---

[۳] کلبھارنا: الٹنا پلٹنا۔

دس منٹ بعد لوٹ کر آ گئی۔ میں کھانا کھا کر اٹھا ہی تھا۔

''تم نے کھانا کھالیا؟'' اس نے پوچھا۔

''بس ابھی کھا کر اٹھا ہوں۔''

''تم تھوڑی دیر رک جاتے تو میں پروس دیتی۔ چٹنی رکھی تھی، کھائی؟''

''مجھے کیا معلوم کہاں رکھی تھی۔''

''طشتری میں ڈھکی رکھی تھی،'' افسوس کرتے ہوئے بیوی نے کہا۔

''کیوں بلایا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ڈاکٹر کی بہن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کھانا نہیں بنا سکتی۔ ڈاکٹرنی مدد کرنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ میں ساڑھی بدلنے آئی تھی اور سوچا تھا تمھیں کھانا کھلا دوں گی۔ انکار کرتے نہیں بنا۔ پر ڈر لگتا ہے کہ ان لوگوں کا کھانا مجھ سے بن بھی پائے گا۔ مجھے چوکے کی ساڑھی پہننا ہے۔''

''پہن لو۔ پر یہی ساڑھی رہے تو کیا ہوگا؟''

''یہ تو بہت اچھی ساڑھی ہے۔ بہت سنبھال کر کام کروں گی تب بھی چوکے کا کام ایسا ہوتا ہے کہ ایک دن میں خراب ہو جائے گی۔ پھر چوکے کے سوا کسی کام کی نہیں رہے گی۔''

''اچھا۔'' میرا ایک سست جواب تھا۔

چوکے کی ساڑھی پہن کر جب وہ تیار ہوئی تب میں نے کہا، ''یہ تو پھٹی ہوئی بھی ہے۔''

''تھوڑی سی پھٹی ہے۔ ڈاکٹرنی اور بہن کے سوا اُدھر کوئی نہیں آتا۔''

''ہاں۔ تھوڑی سی پھٹی ہے۔''

گویا میں نے کچھ نہیں کہا تھا، پر کہا تو۔

جب میں چنری ساڑھی اس کے لیے لایا تھا تب اس نے کئی دنوں تک اسے نہیں پہنا۔ آخر پہننا پڑا۔ کب تک سینچ کر رکھتی؟ جب ایک ساڑھی نہیں بچا سکتے تو گرہستی بچانا تو اور بھی مشکل ہے۔ اور وہ اسے چوکے کی ساڑھی ہونے سے، بہت دنوں تک بچانا چاہتی تھی۔

چپ چاپ کھڑی ہوئی وہ، ''میں جاتی ہوں، دیر ہو رہی ہے'' کہنا چاہتی تھی، اور چپ چاپ کھڑا ہوا میں، ''رہنے دو، فالتو ہے وہاں جانا'' کہنا چاہتا تھا، جبکہ ''ٹھیک ہے'' میں نے کہا۔

Scanned with CamScanner

دوپہر کو تھوڑی دیر کے لیے گھر آ گیا۔ جلدی مچاتے ہوئے میں کہا، ''بھوک لگی ہے۔ کچھ کھانے کو دو۔ خود نکال کر کھانے سے میرا پیٹ نہیں بھرا تھا۔''

''ابھی دیتی ہوں۔ پر دال نہیں بچی،'' اس نے کہا۔

''جو ہو وہ دو۔ ڈاکٹرنی کے یہاں سے کب آئیں؟'' میں نے پوچھا۔

میرے پاس آ کر وہ بولی، ''ابھی تھوڑی دیر پہلے تو آئی ہوں۔ ڈاکٹرنی ارہر کی دال نہیں کھاتی۔ پر ڈاکٹر صاحب دونوں وقت ارہر کی دال کھاتے ہیں۔ ڈر ڈر کر تو کھانا بنائی ہوں۔ ڈاکٹرنی پورے ٹائم کرسی پر بیٹھی مجھے بتلاتی جا رہی تھی۔ اس کو بلڈ پریشر رہتا ہے اس لیے چوکے میں نہیں گھستی۔ دھویں اور جلتے کوئلوں کی بو سے اس کو چکر آنے لگتا ہے۔ ان کے گھر کے کام میں بہت پنچایت ہے۔ ڈاکٹرنی بہت مین میخ نکالتی ہے۔ کم سے کم دس بار تو کہی ہو گی کہ تمھاری ساڑھی بہت گندی ہے، ساڑھی سمیٹ کر کام کرو۔ ان کا چوکا بہت بڑا اور چکا چک صاف ہے۔ ڈھیر سارا سامان ہے۔ ڈاکٹر کی بہن پر مجھے دَیا آتی ہے۔ نوکرانی کی طرح کام کرتی ہو گی۔ نوکرانی کی طرح رہتی ہے۔''

تھالی میں دو روٹی، تھوڑا چاول، دال نہیں تھی پر اسٹیل کی کٹوری میں ایک شاندار رنگت والی رسے دار پرول کی سبزی تھی۔ رسے پر اتراتی ہوئی ہرے دھنیے کی پتی تھی۔ سبزی ابھی تک گرم تھی۔ ہرا دھنیا میں کبھی نہیں لاتا تھا۔ یہ بہت مہنگی چیز لگتی تھی۔ پانچ پیسے میں تین چار پودے بندھے ہوئے ملتے تھے۔ کٹوری میں کسی کا نام نہیں لکھا تھا۔

وہ لوٹے میں پانی لے کر آئی۔ ''تم نے کھانا ابھی تک شروع نہیں کیا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

دوپہر کو دفتر سے میں جب بھی آتا تھا تو جلدی کھا پی کر دفتر بھاگ جاتا تھا۔

''سبزی ڈاکٹر صاحب کے گھر سے لائی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''مانگ کر نہیں لائی۔''

''ڈاکٹر کی بہن کے لیے بھی تم نے الگ سے کھانا بنایا ہو گا؟''

''ڈاکٹر کی بہن کا کوئی خاص تو کھانا نہیں تھا۔ آلو ابال کر رکھ دینے کے لیے ڈاکٹرنی نے کہا تھا۔ ان کا بھتیجا اپنے مکان میں چلا گیا ہے۔ چاول الگ بنائی ہوں۔ راشن کا چاول اس کے لیے بنایا تھا۔''

میری تھالی میں جو چاول تھا وہ بھی راشن کا چاول تھا۔

''یہ ڈاکٹر والی سبزی ہے؟''

''ہاں،'' بیوی نے کہا۔''ڈاکٹرنی نے کہا کہ دیکھو کتنی بڑھیا سبزی بنائی ہو۔ چکھ کر دیکھنا۔''

کھاتے کھاتے میں نے کہا،'' روٹی اور ہوگی؟ بڑھیا سبزی ہے۔''

مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ تھوڑی سبزی بیوی کے لیے بھی بچا دینی چاہیے۔ میں نے دوبارہ پورا کھانا کھایا۔

مالکن کی عادت ہوتی ہے کہ گھر میں اگر کوئی خاص چیز بنتی ہے تو اس میں سے تھوڑا نوکرانی کو ضرور چکھا دیا جاتا ہے۔ روزمرہ کی چیزوں کو چکھانے کا کام نہیں کیا جاتا۔ چاہے وہ کتنی بھی بڑھیا چیز کیوں نہ ہو۔ وہ دیکھنے والوں کے دل میں لالچ نہیں پیدا کرتی۔ اسے دیکھنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ کوئی چیز چکھا دی جاتی ہے تو اس کی للچائی نظر اور اس چیز کے بیچ میں ایک پردہ پڑ جاتا ہے۔ تب کھانے والا پورے اطمینان کے ساتھ پیٹ بھر کر کھا سکتا ہے، نہیں تو کھانے میں مزہ نہیں آتا۔

دفتر کے صاحب کبھی چپراسی یا نوکر کو گھر کی بچی ہوئی چیز نہیں دیں گے۔ وہ مہنگو جیسے لوگوں کو بچی ہوئی چیزوں کے لائق نہیں سمجھتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک پیپا بھر کا جو گھن لگ کر خراب ہو چکا تھا، بائی صاحب نے مہنگو سے کہہ کر اسے دھوپ میں ڈلوا دیا۔ کاجو میں جالے بھی لگ گئے تھے۔ مہنگو اتنا ایماندار اور ڈرا ہوا چپراسی تھا کہ چوری سے ایک کاجو کا ٹکڑا منھ میں ڈال لینے کی اس کی ہمت نہیں تھی۔ صاحب سے وہ تھر تھر کانپتا تھا۔

دن بھر میں پانچ دس بابوؤں کا چکر صاحب کے بنگلے میں لگ جاتا تھا۔ یہ لوگ فائلیں لے کر آیا جایا کرتے تھے۔ شروعات گورا بابو سے ہوئی۔ صاحب کے بنگلے سے نکلتے وقت ان کے ہاتھ میں انگریزی اخبار میں بندھا ایک پڑا تھا۔ وہ اپنے طریقے سے اس پڑے کو چھپا چکے تھے۔ بڑے بابو اس معاملے میں تجربہ کار تھے۔ وہ ایک پڑا لے کر آئے اور کھلے عام اپنی ٹیبل پر رکھ دیا۔ اتفاق سے دیوانگن بابو کو بھی صاحب کے گھر ضروری فائل لے کر جانا پڑا تھا۔ ایک پڑا چھپا کر وہ بھی لے آئے۔ میرا جانا نہیں ہوا تھا۔ ہوتا بھی نہیں۔ کوئی کام نہیں پڑتا۔ بڑے بابو کو میری فکر تھی۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا،

''سنتو بابو، کاجو کھاؤ گے؟''

''آپ کاجو کھارہے ہیں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''کیوں، کیا ہوا؟'' بڑے بابو نے پوچھا۔

''اگر آپ کاجو کھا رہے ہیں تو میں سمجھوں گا مہاویر مونگ پھلی کے بجائے کاجو بیچنے لگا ہے!''

''اگر میں چنا کھا رہا ہوں تو؟''

''تب میں سمجھوں گا مہاویر مونگ پھلی ہی بیچ رہا ہے۔''

''اگر میں بادام کھانے لگوں تو؟''

''میں سمجھوں گا، مہاویر بادام بیچنے لگا ہے۔''

''میں کاجو کھا رہا ہوں۔ صاحب کے گھر گیا تھا۔ بائی صاحب نے دیا ہے۔ کھانے پینے کی چیز میرے پاس رکھی ہو تو لاکھ روکوں، میں کھانا شروع کردوں گا۔ اسی لیے اتنا موٹا ہو گیا۔''

''کھلائیے'' کہتا ہوا میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ مٹھی بھر کاجو بڑے بابو نے مجھے دیے۔

کاجو دیکھ کر میں نے کہا، ''اس میں گھن لگ چکا ہے۔''

''گھن لگا ڈیڑھ روپے کلو کا گیہوں جب ہم لوگ کھا سکتے ہیں تو تیس روپے کلو کا کاجو بھی ضرور کھا سکتے ہیں۔ کھانے کی کون سی چیز خراب ہو گئی ہے، یہ جوانی میں سمجھ میں نہیں آتا۔ بے فکر ہو کر کھاؤ۔''

گورا ہا بابو کو جب میں اپنی مٹھی کے کاجو کا کچھ حصہ دینے لگا تو بڑے بابو نے ٹوک دیا، ''ارے! تم کھاؤ۔ گورا ہا بابو کو دینا ہوتا تو میں بھی دے دیتا۔ اس میں حصے داری مت کرو۔ گورا ہا بابو کے پاس بہت ہیں۔''

میں کچھ سوچ کر دیوانگن بابو کی طرف بڑھا تو بڑے بابو نے پھر ٹوکا، ''ان کو بھی مت دو، بلکہ ان سے ایک مٹھی اور لے لو۔''

دیوانگن بابو کا چہرہ لال ہو گیا۔ گورا ہا بابو سر جھکائے چپ چاپ تھے۔ شام کو جب چھٹی ہوئی تو میں نے انگریزی اخبار میں اسی طرح لپٹے پڑے دوسرے سیکشن کے تین بابوؤں کے پاس اور دیکھے۔ پڑے اتنے ہی بڑے تھے جتنا بڑا بڑے بابو کے پاس تھا۔ دیوانگن بابو اور گورا ہا بابو کا پڑا میں دیکھ نہیں پایا۔ اس روز دونوں شام کو لوٹتے وقت مجھ سے دور رہے۔

اتوار کے دن قانون کے مطابق ساری دکانیں بند رہا کرتی تھیں، اس لیے صبح صبح کرانے کی

Scanned with CamScanner

دکان والے گپتا جی ساڑھے چھ بجے کے قریب فرصت سے دکھائی دیے۔ میں پیچھے کے دروازے میں کھڑا تھا۔ وہ ڈاکٹر کے احاطے کی طرف سے آرہے تھے۔ ایک تھیلا لٹکائے ہوئے تھے۔ پھول توڑتے ہوئے ادھر آ گئے تھے۔

صبح بہت سے بوڑھے بزرگ لوگ تھیلا لے کر گھومنے نکلتے تھے۔ گھومتے ہوئے بنگلوں کے احاطے کے پاس لگے ہوئے کنیر، گلاب، دودھ موگرا وغیرہ پھولوں کو باہر ہی باہر توڑ کر وہ تھیلے میں ڈال لیتے تھے۔ اونچے پھول توڑنے کے لیے ہاتھ کی چھڑی سے بھی کام لیتے تھے۔ چھڑی سے ڈال کو جھکا لیتے۔

سول لائن کی سڑک سے اترتے ہوئے محلے کے ایک بوڑھے برہمن بیوپاری دکھائی دیے۔ سفید ٹوپی، سفید کرتا دھوتی پہنے اور گٹھیا کے باعث لنگڑاتے ہوئے۔ یہ دور دور کا چکر لگا کر پھول اکٹھا کرتے تھے۔ ایک چھوٹی ٹوکری بھر پھول انھیں پوجا میں لگتا تھا۔ بازار سے پھول خریدیں تو کم سے کم ان کا ایک روپیہ لگے۔ یہ تین تین گھنٹے تک پوجا کرتے تھے۔ گھومنے سے انھیں جو کچھ بھی فائدہ ہوتا ہو، پر پھولوں کا ایک روپیہ بچا لیتے تھے، جو ان کے لیے اہم تھا۔ تندرستی جب بنتی تھی تو مجبوری سے بنتی تھی، جس سے خوشی ہوتی تھی۔ دکان کی گدی میں بیٹھنا انھوں نے بند کر دیا تھا کیونکہ بیوپار میں جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ ان کا لڑکا، بیوپار میں ان سے بھی زیادہ چالاک اور فریبی ہو کر روپیہ کمانے میں لگا تھا۔ کبھی کبھی ان کو بھی گدی پر بیٹھنا پڑتا تھا۔ تب یہ گدی کو گنگا کہہ کر بیٹھتے۔

صبح گھومنے والوں میں عموماً سول لائن کی طرف سے، ریٹائر ہونے والے افسر ریٹائر ہو چکے افسروں کے ساتھ دکھائی دیتے تھے۔ ریٹائر ہونے تک سول لائن میں ان کے مکان بن کر تیار ہو جاتے تھے۔ یہ لوگ مرتے دم تک سول لائن میں رہتے تھے۔

صدر بازار کے بیوپاری صبح گھومنے کے معاملے میں پکے تھے۔ ٹھنڈ میں بھی یہ دکھائی دیتے تھے۔ ہاتھ میں نیم کی دتون ہوتی۔ کبھی سفید باریک ململ کی طرح کی دھوتی اور سفید بنیان پہنے ہوتے۔ زیادہ تر لوگوں کے گلے میں سونے کی زنجیر ہوتی۔ اس طرح گلے میں سونے کی زنجیر، سفید دھوتی اور سفید بنیان کے یونیفارم میں یہ مجھے کسی اہم ادارے یا بڑی تنظیم کے نمائندوں کی طرح لگتے تھے۔

نچلے بندھوؤں کا چوتھائی صدر بازار پر قبضہ تھا۔ ان کا لمبا چوڑا کاروبار تھا۔ شہر کے باہر بھی ان

کے بنگلے تھے۔ صبح موٹر کار سے اپنے بنگلوں کو چلے جاتے۔ وہاں باغیچے میں گھومتے، دتون کرتے، نہادھو کر پوجا کرتے، پھر لوٹ کر صدر بازار کے مکان میں آجاتے۔ یہاں مکان کے بھگوان کی پوجا کرتے۔

سول لائن میں ایک بنگلہ دن بھر خالی رہتا تھا۔ یہ بنگلہ سیٹھ رام چندر اگروال کا تھا۔ رام چندر اگروال دن بھر بازار والے مکان میں رہتے تھے۔ رات کو ہلنے گلنے کے باعث ان کو نیند نہیں آتی تھی، اس لیے یہاں تنہائی میں سونے کے لیے انھوں نے یہ بنگلہ بنایا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی کافی زمین شہر سے لگی ہوئی تھی جس میں یہ کھیتی کرتے۔ کھیت شہر کے پاس ہونے کی وجہ سے چھڑائی کے لیے دھان کٹ کر یہاں احاطے میں جمع ہوتا تھا۔ دھان کی ڈھیری کو دیکھ کر ہم لوگ اندازہ لگانے کی کوشش کرتے تھے کہ فصل کیسی ہوئی۔ پر اندازہ لگانا بےکار ہوتا کیونکہ ان کے پاس کتنی زمین تھی یہ ہم لوگوں کو ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں تھا۔ بیوی کو دھان کی ڈھیری دیکھ کر اپنا گاؤں یاد آتا تھا۔

صدر بازار کی شروعات کوتوالی سے ہوتی تھی۔ پھر کپڑے، صرافے، دواؤں کی دکانیں تھیں، بیڑی کارخانے کی دو تین گدیاں اور کپڑے کی تھوک دکانیں وغیرہ سڑک کے دونوں طرف تھیں۔ عام طور پر سامنے دکان، پیچھے ایک گودام اور اوپر رہنے کی جگہ ہوتی۔ دو منزلہ سے کم ایک بھی مکان نہیں تھا۔ اس راستے میں آگے میونسپل اسکول اور ایک کالج تھا۔ تمیروں [*] کے گھر کے بعد دو کتابوں کی، دو ڈاکٹر کی، اور کئی برتنوں وغیرہ کی دکانیں تھیں۔

جس شہر میں میرا بچپن گزرا تھا اور جہاں بڑے بھائی تھے اس شہر میں بھی صدر بازار میں کوتوالی تھی۔ شہر کی بساوٹ میں یہ شروع سے دھیان دیا جاتا تھا کہ کوتوالی سیٹھوں، مارواڑیوں، بیوپاریوں جیسے بڑے لوگوں کے بیچ میں ہو۔ عدم تحفظ انھی کو تھا۔ انگریزوں کے زمانے میں جہاں کوتوالی تھی وہیں اب بھی تھی۔ بڑے سیٹھ جہاں تھے وہیں اب بھی تھے۔ جہاں جھگڑے زیادہ ہوتے تھے، جیسے ستنامی محلّہ اور شراب بھٹی، جنگ، اسٹیشن وغیرہ، وہاں چھوٹی چھوٹی پولیس چوکیاں بنادی گئی تھیں۔ کوتوالی کے ایک طرف جہاں صدر بازار تھا ٹھیک اس کے دوسری طرف مسلمانوں کا محلّہ تھا۔ بہت سے لوگوں کا تحفظ کے بغیر گذارا ہونا مشکل تھا۔ بھلے کچھ نہ ہو، امن امان ہو، پر کوتوالی کا آسرا تو رہتا ہے۔ گاؤں کی بساوٹ بھی بھی ایک ہی طرح کی ہوتی تھی۔ یعنی گاؤں کے بیچ میں مندر ہوگا — یہ بساوٹ کی شروعات ہوگی۔ مندر

---

[*] تمیرے: تانبے کو ڈھالنے کا کام کرنے والے۔

کے پاس کنواں ہوگا۔ چوپال ہوگی۔ اس کے آس پاس ٹھاکروں اور برہموں کے مکان ہوں گے۔ گاؤں کے آخری سرے پر باہر ہی باہر چماروں اور مہتروں کے گھر ہوں گے۔ گاؤں میں مہتر کم ہوتے تھے، چمار بہت ہوتے تھے۔ شہروں کی نئی بساوٹ میں ذات پات پر کوئی خاص دھیان نہیں دیتا۔ پر مکان بنانے والے پلاٹ خریدتے وقت پاس پڑوس کی طرف ضرور دھیان دیتے تھے۔ غریبی شہر کی بساوٹ میں بہت اہم ہوتی تھی۔ غریبوں کے محلے بہت دور ہوتے اور وہ شہر کا سب سے گندا علاقہ ہوتا تھا۔

''آیئے،'' گپتا جی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میں نے کہا۔

''میں بیٹھوں گا نہیں۔ آپ کی طبیعت کے بارے میں سنا تھا۔''

''اب تو ٹھیک ہوں۔ دفتر بھی جانے لگا ہوں،'' میں نے کہا۔

''شہر کے باہر سے گھومتا آ رہا ہوں۔ پورب کی طرف دیکھیے، آسمان بالکل صاف ہے۔ شروع میں جو پانی برسا تھا، مون سون کے دھوکے میں کسانوں نے بوائی کر دی ہوگی۔ پودے نکل آئے ہوں گے، اور پانی کا نام نہیں۔ اگر اب اور دو دن پانی نہیں برسا تو کھیت تو سوکھ جائیں گے۔ بہت سے کسان جو بوائی کے انتظار میں ہوں گے ان کا بیج بچا ہوگا۔ پانی آ گیا تو بو دیں گے۔ نہیں تو کھا پی کر وہ بھی برابر ہو جائے گا۔ پھر سب بھوکوں مریں گے۔ میں نے سنا تھا کہ دھوپ نہ نکلنے کی وجہ سے آپ کی طبیعت خراب ہو گئی تھی؟ برسات میں پانی برسے اس سے ہم لوگوں کی طبیعت خراب ہوتی ہے۔ دھوپ نکلی رہے تو فائدہ ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر کے احاطے میں یہ ذکر مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

''کس نے کہا آپ سے؟'' میں نے پوچھا۔ میں ان کی دکان سے ادھار لیا کرتا تھا، اس لیے انھیں دیکھتے ہی لگتا تھا کہ کبھی بھی یہ تقاضا شروع کر دیں گے۔ سانولے رنگ کے، دبلے پتلے، پر بڑا سا پیٹ نکلا تھا۔ جسم کے لحاظ سے وہ اس بچے کے بڑے سائز کی طرح تھے جس کا جگر بڑھ گیا ہو۔

''ڈاکٹر کے بھتیجے نے،'' گپتا جی نے جواب دیا۔

''اوہ! وہ مکان مالک کے خاندان کا ہے،'' میں نے کہا۔

''مجھے معلوم ہے۔ ڈاکٹر سے آپ کی جھنجھٹ ہو گئی تھی۔ آپ نے ڈاکٹر صاحب کو گالیاں دیں۔ پھر آپ کو پچھتاوا ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے آپ کو معاف کر دیا۔''

Scanned with CamScanner

’’یہ بھی ڈاکٹر کے بھتیجے نے کہا ہے؟‘‘

’’نہیں، ایک گاہک نے کہا۔‘‘

’’بخار کی حالت میں میرے منھ سے کچھ نکل گیا ہوگا۔ ہوش آنے پر پچھتاوا ہوا۔ ڈاکٹر نے برا نہیں مانا۔ آپ یہ اپنے گاہک سے کہہ دیجیے گا۔‘‘

’’کس گاہک نے کہا تھا یہ یاد تھوڑی ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے جھنجھٹ مول لے کر آپ چین سے نہیں رہ سکتے۔ میں بھی نہیں رہ سکتا۔‘‘

بات بدلنے کے لیے میں نے کہا، ’’چھٹکا دھان بونے والا چھوٹا کسان ہوگا یا لاپروا بڑا کسان۔ کنویں موٹر پمپ وغیرہ بڑے کسانوں کے پاس ہیں۔ نہر کے کنارے کی زمین بھی ان کی ہوگی۔ روپا بونے کا خطرہ چھوٹا کسان نہیں اٹھاتا۔ زندہ رہنے کے لیے چھوٹا چھٹکا بونے کا خطرہ اٹھانا پڑتا ہے۔ اگر ان کی فصل خراب ہوگئی تو یہ لوگ بڑے کسانوں کے یہاں مزدور ہو جاتے ہیں اور بہت سستے میں کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ تب سستی مزدوری کی وجہ سے بڑے کسان کی دھان کی لاگت کم ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ خراب فصل ہونے کی وجہ سے بازار میں دھان کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ وہاں بڑے کسان کا دھان کئی گنا منافع پاتا ہے۔ بیچ میں چھوٹے چھوٹے بیوپاریوں کے بیچ سے گزرتا ہوا چاول ان کے منافعے سے مہنگا ہوتا ہوا خریداروں کے پاس پہنچتا ہے۔ زیادہ تر خریدار وہی یعنی چھٹکا بنانے والے چھوٹے کسان اور چھوٹے لوگ۔ گپتا جی، تب آپ کی دکان سے مجھے چاول کس بھاؤ سے خریدنا ہوگا؟‘‘

’’آپ خریدتے کہاں ہیں؟ ادھار لیتے ہیں،‘‘ ہنستے ہوئے گپتا جی نے کہا۔

’’ادھاری خریداری نہیں ہوتی؟‘‘ میں نے کہا۔

’’نہیں۔ خریداری میں روپے اور سامان کا لین دین ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ ادھاری میں وصولی ہوتی ہے۔ نقد لین دین میں دکان دار بے فکر ہوتا ہے۔ ادھاری میں معلوم نہیں وصولی ہوتی ہے کہ نہیں۔ سختی برتو تو تھوڑی بہت ہو جاتی ہے، نہیں تو روپے ڈوب جاتے ہیں۔ بولیے، روپے کب دے رہے ہیں؟ ڈیڑھ مہینے سے بقایا ہے۔ ہر مہینے تنخواہ پاتے ہی دے دیا کریں تو اچھا رہے۔‘‘

’’اس مہینے کی تنخواہ ملتے ہی میں پورا ادھار چکا دوں گا۔ اس بیچ بیمار پڑ گیا۔‘‘

Scanned with CamScanner

''میں آپ کی بات نہیں کر رہا ہوں، اس سے پہلے جو کرائے دار تھا وہ ہر مہینے کرایہ پٹا نہیں پاتا تھا۔ اوپر سے ڈاکٹر صاحب کو تنگ کیا کرتا تھا، کہ یہ پریشانی ہے، یہ بنوادو، دیواروں کے پلستر اکھڑ گئے، آنگن کی نالی خراب ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنا کرایہ وصول کیا، پھر اس کی بدلی کرادی۔ مجھے پتا نہیں چل پایا اور وہ گھر خالی کر کے چلا گیا۔ ستر روپے کا میرا نقصان ہوا۔ جب تب اس کو دفتر کے پتے سے ایک پوسٹ کارڈ ڈال دیتا ہوں تاکہ لوگ پوسٹ کارڈ پڑھ کر جان لیں کہ وہ میری ادھاری لے کر بھاگ گیا ہے۔ پہلے پوسٹ کارڈ کا اس نے جواب دیا تھا کہ گھر کے پتے پر خط و کتابت کریں۔ پوسٹ کارڈ میں اس نے اپنے گھر کا پتا دیا تھا۔ پر میں اسے دفتر کے پتے پر ہی پوسٹ کارڈ ڈالتا ہوں۔ اس لیے جیسے ہی معلوم ہوتا ہے کہ کرائے دار سے ڈاکٹر صاحب کی جھنجھٹ ہوئی ہے تو فوراً اپنی وصولی کرتا ہوں۔ آپ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب سے آپ کی جھنجھٹ نہیں ہوئی، تو میں آپ کی بات پر یقین کر لیتا ہوں۔ ابھی تو ڈاکٹر صاحب کے پانچ میں سے چار کوارٹر خالی ہیں۔ وہ آدمی دیکھ کر مکان دیتے ہیں۔ آپ کو بھی دیکھ سن کر رکھا ہوگا؟''

''اگر میری بدلی ہوئی تو بھی میں آپ کا پیسہ پٹا کر جاؤں گا،'' میں نے کہا۔

''مٹی کے تیل کے چار ٹین دکان میں آگئے ہیں، اگر آپ کو ضرورت ہو تو تین چار بجے تک لے لیجیے گا۔ دوپہر سے شام تک میں دکان میں رہوں گا۔ دکان تب کھلی رہے گی۔ کسی اور سے مت بتائیے گا۔ ایک بوتل مٹی کا تیل ہی دے سکوں گا۔ ایک بات اور ہے، آپ جب بھی بیمار پڑیں، ڈاکٹر صاحب سے ہی علاج کروائیے۔ اگر آپ میرے کرائے دار ہوتے اور میری دکان سے سامان نہ خریدتے تو یہ شرافت نہ ہوتی۔''

''آپ کا کرائے دار نہیں، تب بھی آپ کی دکان سے سامان خریدتا ہوں۔''

''خریدتے کہاں ہیں، ادھار لیتے ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔''

میں نے بیوی سے پوچھا، ''گھر میں مٹی کا تیل ہے؟''

''کئی دنوں سے نہیں ہے،'' اس نے کہا۔

Scanned with CamScanner

''ٹین دے دو، جتنا ملے گا لے آؤں گا۔''

جب ماں گھر پر رہتیں، تب مٹی کے تیل کی کھپت زیادہ ہوتی۔ انھیں رات بھر اپنی چارپائی کے پاس جلتی ہوئی قندیل رکھنے کی عادت تھی۔ رات میں سونے کے پہلے قندیل کی بتی نیچے کر دیتیں۔ بیچ میں نیند کھلنے پر پہلے قندیل کی بتی تیز کرتیں، پھر اٹھتیں۔ مٹی کا تیل اسٹوو اور چولھا جلانے کے لیے بھی لگتا تھا۔ چائے ہمیشہ اسٹوو پر بنتی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی گپتا جی بہت خوش ہو گئے۔ دکان میں کوئی نہیں تھا۔ آدھی کھلی ہونے کے باوجود ظاہر ہوتا تھا کہ دکان بند ہے۔ دکان میں کرانے کی بو تھی۔ یہ دکانوں میں رکھی چیزیں سامان کی بو ہوگی، میں نے سوچا۔

''آیئے، مٹی کا تیل چیز ہی ایسی ہے کہ طبیعت ٹھیک کر دیتی ہے،'' گپتا جی نے کہا۔

''میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ میری طبیعت کچھ دنوں سے ٹھیک ہو گئی ہے اور میں دفتر بھی جانے لگا ہوں۔''

''مٹی کا تیل پانے سے کچھ اثر ضرور ہوگا،'' انھوں نے کہا۔

''آپ کی بات سے میں انکار نہیں کرتا۔''

''آپ پہلے آدمی ہیں لے جانے والے۔ مٹی کا تیل جیسی چیز میں آپ کو ادھاری دے رہا ہوں۔''

''پیسے ہوتے تو میں آپ کو ضرور دیتا۔''

''میری دکان سے خریدا ہے، یہ کسی سے کہیے گا نہیں۔''

''راستے میں مجھ سے کوئی پوچھے گا تو کہوں گا کہ مونگ پھلی کا تیل لے کر آ رہا ہوں۔''

''میرے جیسا آدمی مل گیا تو وہ سونگھ کر دیکھے گا۔''

مٹی کے تیل کی ادھاری پا کر میں بہت خوش تھا۔ صحیح معنوں میں سبھی خوش تھے۔ بھکاری کو بھیک مل جاتی تھی۔ بے ایمانی کے ساتھ ساتھ دھرم کے کام بھی بڑھتے تھے، کیونکہ بے ایمانی کی کمائی سے دھرم پنیہ کا کام ہوتا تھا۔ گھر میں مٹی کا تیل پہنچا کر میں باہر نکل آیا۔ میں نے اپنا مقصد طے کر لیا تھا۔

باہر اجنبی لوگوں میں سے مجھے آدمی چھانٹنے تھے۔ ٹھاکر کی پان کی دکان کے سامنے ایک مہذب سمجھ دار آدمی دکھائی دیا۔ وہ دبلا پتلا اور لمبوترے چہرے کا تھا۔ اس کے جوتے پر پالش تھی۔ ٹھاکر

کی دکان میں بیڑی سگریٹ جلانے کے لیے ہمیشہ ایک چمنی جلتی رہتی تھی۔ مٹی کے تیل کا یہ اہم استعمال نہیں تھا۔ مجھے ڈاکٹر کے کمپاؤنڈ کی دیر تک جلنے والی بتی سے بھی زیادہ، دن کے وقت سگریٹ جلانے کے لیے ڈھبری کا جلانا اکھرنے والی بات لگی۔

کھجوا موچی ہاتھ پیر کھجلاتے ہوئے نالی کے کنارے لکڑی کی پیٹی لے کر خالی بیٹھا تھا۔ جب اس کے پاس کام نہ ہوتا تو یہ ہاتھ پیر کھجلایا کرتا۔ اس کے ہاتھ پیروں میں گہرے گہرے ناخن کے نشان ہوتے۔ ان سے کبھی کبھی خون نکل آیا کرتا تھا۔ اس کا نام کھجوا موچی ہو گیا تھا۔ وہ ہر اس آدمی کو گالی دیتا تھا جو اس کے سامنے سے ننگے پیر نکل جاتا تھا۔ ننگے پیروں میں نال ٹھکوانے کا چلن کب ہوگا؟ یہ فیشن سے نہیں، مجبوری ہی میں کبھی ہو؟ وہ ان آدمیوں، بچوں کو بھی گندی گالیاں دیا کرتا تھا جو چپل جوتے پہنے ہوتے اور اس کے پاس سے بغیر رکے آگے بڑھ جاتے۔ اس عادت کے نتیجے میں پٹتا بھی تھا۔

میں اس کے پاس گیا۔ ''میری چپل میں پالش کر دو۔''

ہاتھ پیر کھجلانا چھوڑ کر وہ پالش کرنے لگا۔

''کھجوا، مٹی کا تیل چاہیے؟''

''چاہیے،'' اس نے کہا۔

''گپتا جی کی دکان میں ہے۔ گپتا جی کی دکان جانتے ہو؟''

''جانتا ہوں،'' اس نے کہا۔

کھجوا موچی کا دھندا بعد میں خراب ہو گیا تھا۔ ہاتھ پیروں میں بڑے بڑے زخموں والی بیماری ہو گئی تھی۔ بھیک مانگنے لگا تھا۔ تب وہ ہر اس آدمی کو جو اسے بھیک دیے بغیر آگے بڑھ جاتا تھا، گالیاں دیا کرتا تھا۔

میں ایک چھوٹی سی چائے کی دکان میں گھس گیا۔ دلّی کا ہندی اخبار یہی ہوٹل والا منگواتا تھا۔ چائے پینے کے بعد میں نے ہوٹل والے سے کہا، ''گپتا جی کی دکان میں مٹی کا تیل بک رہا ہے۔''

''آج تو اتوار ہے،'' ہوٹل والے نے کہا۔

''آدھی دکان کھول کر بکری کر رہا ہے۔''

جھوٹے کپ دھونے والی عورت نے پوچھا، ''گپتا جی کی دکان کہاں پر ہے؟''

Scanned with CamScanner

باہر نکل کر میں نے اسے سمجھایا، ''یہاں سے سیدھے تھوڑی دور پر گپتا جی کی دکان ہے۔'' اخبار بغیر پڑھے میں باہر نکل آیا۔

''سنتو!'' سمپت نے مجھے دیکھا۔ ''چلو گھومنے چلیں،'' اس نے کہا۔

''آج کام سے نکلا ہوں۔ تم کو مٹی کا تیل چاہیے تو گپتا جی کی دکان سے لے لو۔'' اس سے پیچھا چھڑا کر میں ٹکراپارا کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں پیدل چلتے چلتے تھک گیا تھا۔ پوری طرح صحت یاب نہیں ہوا تھا۔ تیس پیسے میں رکشا طے کیا۔ سڑک اونچائی پر گئی تھی۔ نیچے نالے کے کنارے کے پاس پاس سٹی ہوئی سرکنڈے کی جھونپڑیوں کا ڈھیر تھا۔ اگر کسی کی آنکھ تھوڑی سی کمزور ہوتی تو اتنی اونچائی سے یہ جھونپڑیاں میدان میں میونسپلٹی کے کچرے کی الگ الگ ڈھیریاں لگتیں۔ جھونپڑیوں کے اوپر پھٹے سڑے بورے اور پولی تھین کے چیتھڑے پھیلائے گئے تھے۔ ان کو پتھر کے ٹکڑوں سے دبا دیا گیا تھا۔ یہ کنارے کنارے لٹکے ہوئے جھالر کی طرح ہوا میں ہل رہے تھے۔ ہر جھونپڑی کے اندر سے گندے پانی کی ایک نالی نکلتی تھی۔ باہر ایک چھوٹا گڈھا بنا تھا جس میں یہ نالی جا کر ملتی تھی۔ گڈھے میں گندا بدبودار پانی بھرا ہوا تھا اور آس پاس اسی کی کیچڑ تھی۔ آنے جانے کے لیے جگہ جگہ پتھر رکھ دیے گئے تھے۔ ایک طرف جھونپڑیوں کے بیچ کا راستہ نالے کی طرح ہی ہو گیا تھا۔ اسی راستے میں جاتی ہوئی دو عورتیں اور ان کے پیچھے چار پانچ بچے تھے۔ ایک اونچی جگہ میں، جو ٹیلے کی طرح تھا، تین بچیاں اور ایک بچہ ٹٹی کر رہے تھے۔

زیادہ تر جھونپڑیاں خالی تھیں۔ یہیں سے ریجا[۵] قلی، مزدور صبح صبح گھر سے کمانے نکلتے تھے۔ سڑک کے کنارے لکڑی کے تختوں کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ شام کو لوٹتے وقت دس پیسے کی ہلدی، پانچ پیسے کا نمک، دس پیسے کی مرچ، پچیس پیسے کی پیاز، آدھا کلو یا ایک کلو گرمیا چاول اس دکان سے لوگوں کی خریداری ہوتی تھی۔ اس دکان میں مٹی کا تیل نہیں ہوگا۔ چونکہ تھوڑا پانی پہلے برس چکا تھا، اس لیے سڑک کے کنارے چھوٹے چھوٹے جوہڑوں کے پاس چروٹا اگ آیا تھا۔ لوٹتے وقت عورتیں چروٹے کی کومل پتیاں توڑ کر لے آتی تھیں۔ ان کی بھاجی بن جاتی۔

نالی پار کرنے کے بعد بالکل پاس کی جھونپڑی کی طرف میں بڑھا۔ باہر ایک ڈیڑھ دو سال کا لڑکا المونیم کے میلے پچکے خالی گلاس سے کھیل رہا تھا۔

---

۵ ریجا: مزدوری کرنے والی عورت۔

Scanned with CamScanner

''کوئی ہے؟ مٹی کا تیل چاہیے؟'' میں چلایا۔

لڑکا زور زور سے رونے لگا۔

میں کچھ اٹ پٹا سا محسوس کر رہا تھا۔ ایک بوڑھی عورت باہر نکلی، پھٹی گندی ساڑھی لپیٹے ہوئے۔ چھوٹے چھوٹے روکھے بال، گچھے گچھے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں گوبر لسیٹا ہوا تھا۔ شاید وہ پیچھے گوبر پاتھ رہی تھی۔

''سنو،'' اس بڑھیا سے میں نے کہا،'' میں چھوٹا پارا سے آیا ہوں۔ وہاں ایک گپتا جی کی کرانے کی دکان ہے۔ کسی سے بھی پوچھ لینا، بتلا دے گا۔ ان کی دکان میں مٹی کا تیل آ گیا ہے۔ لینا ہو تو جا کر لے آنا۔ سمجھ گئیں؟''

سمجھی ہو یا نہ سمجھی ہو، بڑھیا کی بوکھلاہٹ سے میں پریشان ہو گیا تھا۔ میرے چپ ہوتے ہی لڑکا چیخ کر پھر رونے لگا۔ میں جلدی سے وہاں سے لوٹ پڑا۔ دوسری جھونپڑیوں میں جانے کی میری خواہش ہی نہیں ہوئی۔ اندر گھسنے کے لیے کون سا راستہ ہے یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ جیسے ہی میں سڑک کے کنارے آ کر کھڑا ہوا، گہری گہری سانس لیتے ہوئے میں نے یہاں کی ہوا میں صاف فرق محسوس کیا۔ کتنا اچھا لگتا ہے ایسی ہوا میں سانس لینا۔

میں تختے والی دکان کے پاس، ایک پلیا کے اوپر بیٹھ گیا اور جھونپڑی والوں کے لوٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ ان کے لوٹنے کا وقت ہو رہا تھا۔ چھ بج رہے تھے۔

دور مجھے عورتوں کا ایک جھنڈ آتا ہوا دکھائی دیا۔ مل کر گانے کی دھیمی آواز سے میری نظر اُدھر گئی تھی۔ جب کوئی جھنڈ مل کر گانا گاتا تو گانے میں صاف صاف لوگ سنائی دیتے۔ گانے کی آواز جب دھیرے دھیرے پاس آنے لگتی تو ایسا لگتا، لوگ پاس آ رہے ہیں۔ گانے کی آواز بہت زور کی ہو جاتی تب جھنڈ بالکل پاس آ جاتا۔ میں گیت اور لوگوں کو ساتھ ساتھ آتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ اس سے میرے دل میں ایک خواہش بھر گئی۔ یہ خواہش لوگوں میں شامل ہو کر گانا گانے کی تھی۔

عورتوں کا جھنڈ آگے آگے تھا۔ رنگین ساڑھیوں میں لال، پیلے، ہرے، نیلے رنگوں کا جھنڈ لگتا تھا۔ حرکت کرتے ہوئے رنگ۔ ان کے پیچھے آدمیوں کا جھنڈ تھا۔ عورتوں میں جو بہت جوان لڑکیاں تھیں وہ ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے تھیں۔ ہنستی اور گاتی جا رہی تھیں۔ بہتوں کے

Scanned with CamScanner

کانوں میں ہری پتیاں سوکھی ہوئی تھیں۔ تبھی ایک لڑکی کھلکھلاتی دوڑتی ہوئی آگے آ گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے دو لڑکیاں اور دوڑنے لگیں۔ تینوں رک کر گروہ کا انتظار کرنے لگیں۔ انتظار کرتے ہوئے بیچ سڑک میں ان تینوں کے پیروں میں گانے کی دھن سے حرکت ہو رہی تھی۔ ان تینوں کا گانا بھی نہیں رکا تھا۔

یہ لوگ پاس آ گئے۔ سب کے چہرے پانی سے دھلے لگ رہے تھے۔ لڑکیوں کے پیر بالکل صاف اور مضبوط تھے۔ رنگ برنگی ساڑھیوں میں دھول تھی۔ میں کھڑا ہو کر ان کے پاس آنے کا انتظار کرنے لگا۔ میں اپنے میں طاقت بٹورتا ہوا کھڑا تھا۔ ان لوگوں کے پلیا کے پاس آتے ہی میں پھرتی سے پلیا کے اوپر کھڑا ہو گیا۔

''سنو۔''

دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے میں نے ان لوگوں کو روکا۔ دھیرے دھیرے عورتوں کے گھیرے کے بعد آدمیوں کا گھیرا میرے پاس سمٹ آیا۔

گیندے کا پھول کان میں کھونسے ایک بڑی سندر سانولی لڑکی سب سے آگے بڑھی تھی۔ وہ اپنے پاس والی لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہنا شروع کیا:

''دوستو! جو بات میں آپ سے کہوں گا اسے ٹھیک سے آپ کو سمجھا نہیں سکوں گا۔''

سامنے کھڑی سانولی سندر لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر بہت سی لڑکیاں اور آدمی ہنسنے لگے۔

میں کچھ جھینپ گیا۔ تب بھی میں نے کہنا شروع کیا:

''صبح سے آپ لوگ کام پر نکل جاتے ہیں۔ اتنی شام کو لوٹ رہے ہیں۔ پر آپ سب کے چہرے پر کوئی تھکان نہیں ہے۔ کون سی طاقت آپ کے پاس ہے جس سے آپ کام پورا کرنے کے بعد خوش ہو کر مسکرانے لگتے ہیں؟ اندھیرا ہونے والا ہے۔ بہتوں کے گھر میں قندیل اور چمنی کے لیے مٹی کا تیل نہیں ہوگا۔ تب آپ اندھیرے میں رہیں گے۔ اچھی زندگی آپ سمجھتے ہیں؟ جو روزی آپ کو ملتی ہے، جس طرح آپ کا رہنا ہے، وہ اچھی زندگی نہیں ہے۔ آپ اس پر سوچیے۔ میں چھوٹا پارا سے آیا ہوں۔ وہاں گپتا جی کی ایک کرانے کی دکان ہے۔ کسی سے بھی پوچھیں گے، اس دکان کا پتا آپ کو مل جائے گا۔ وہاں مٹی کا تیل دو روپے لیٹر بک رہا ہے، جبکہ سرکاری بھاؤ ایک روپیہ تیس پیسے ہے۔ آپ اتنے تھکے ہوئے ہوتے ہیں کہ رات میں آپ کو اجالے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ پیٹ بھر کر سونے کے

Scanned with CamScanner

لیے کھانا بنانے لائق اجالا آپ کو چاہیے۔ پڑھے لکھے ہوتے تو آپ اخبار یا کہانیاں پڑھتے۔ اتنا مہنگا مٹی کا تیل خرید کر جتنا چاول آپ روز خریدتے ہیں، اتنا چاول آپ اُس دن خرید نہیں پائیں گے۔"

دو تین جملے بولنے کے بعد ہی میرا گلا سوکھنے لگا تھا۔ میں اپنی بات کا سلسلہ بٹھا نہیں پایا تھا۔ بولتے ہوئے میں برابر محسوس کر رہا تھا کہ میں اوٹ پٹانگ بولتا جا رہا ہوں۔ لیکن شروعات کر کے جیسے میں پھنس گیا تھا اور ہمت سے بات ختم کرنا چاہتا تھا۔ بات ختم ہوتے ہی بس کچھ لمحے کا سناٹا رہا۔ میں نے دیکھا، گویا بات ختم کرنے کے بعد آنکھ کھولی۔ بھیڑ سے آگے تختے کی دکان کا دکاندار کب کا آ کر کھڑا ہو گیا تھا، یہ میں دیکھ نہیں پایا۔ اس نے کوئی بھدی مذاق والی بات کہی اور اس کے ساتھ ہی سب لوگ ہنسنے لگے۔ میں پلیا سے کود کر بوکھلایا ہوا ان لوگوں کے بیچ سے راستہ بناتا دور چلا آیا۔ پلٹ کر میں نے دیکھا، کچھ آدمیوں کی پیٹھ پر بورے کے تھیلے لٹکے ہوئے تھے۔ اس میں سے آری اور بسولے کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ بڑھئی ہوں گے۔ میری بات پر ان لوگوں نے بالکل دھیان نہیں دیا۔ میں بدھو سا بنا رہ گیا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اندھیرا ہونے لگا تھا۔ میں رکا تھا کہ دیکھ لوں کتنے جھونپڑوں میں ڈھبری جلتی ہے۔ کافی دیر تک کھڑے رہنے کے بعد بھی تین چار جھونپڑیوں میں اجالا ہوا دکھائی دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی بجھا دیا گیا۔ مٹی کا تیل خریدنے کے لیے بوتل لے کر نکلتا کوئی نہیں دکھا۔ تبھی کسی عورت کی زور زور سے رونے کی آواز آنے لگی۔ ساتھ ساتھ ایک آدمی چلاّتا جا رہا تھا۔ آدمی اس عورت کو پیٹ رہا ہوگا۔ لگا کہ ابھی تک میری طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی ہے۔ جھونپڑیوں کے بہت آگے ایک ریل گاڑی جاتی ہوئی دکھائی دی۔ ڈبے کی کھڑکیوں سے اجالا آ رہا تھا، جو گاڑی کے ساتھ ساتھ تھا اور زمین پر گھسٹتا جا رہا تھا۔

اگر ایک آدمی رات میں اندھیری سڑک سے جا رہا ہو تب دل ہی دل میں اسے لگتا ہوگا کہ اندھیرے میں چلنے میں کتنا خطرہ ہے۔ بہت پیچھے سے آتے ہوئے ٹرک سے دور سڑک پر اجالا پھیل جاتا تھا۔ تب وہ چاہتا ہوگا کہ آتا ہوا ٹرک ہمیشہ اس کے پیچھے رہے۔ ٹرک تیزی سے پاس آتا جاتا ہے۔ اجالا تیز ہوتا جاتا ہے اور ٹرک کے اجالے کا فائدہ اٹھاتا ہوا آدمی کنارے اتر کر بھی اچانک ٹرک سے کچلا جاتا ہے۔ یہ ممکن نہیں تھا۔

گھر کی طرف لوٹتے وقت سوچ رہا تھا کہ کیا میں نے آج چھٹی کے دن کا اچھا استعمال کیا

Scanned with CamScanner

ہے۔ شاید مٹی کا تیل لوگوں کے لیے بہت ضروری نہیں ہے۔ مجھے لوگوں کی صحیح ضرورت کو سمجھنا تھا۔

بڑے بھائی بتلاتے تھے کہ جب مہاتما گاندھی کا قتل ہوا تب وہ دس گیارہ سال کے تھے۔ ریڈیو میں خبر آتے ہی پورے شہر میں اندھیرا کر دیا گیا تھا۔ گھروں کی بتیاں بجھا دی گئی تھیں۔ قندیلوں، موم بتیوں کے اجالے میں لوگ ریڈیو سنتے بیٹھے تھے۔ تب تخت کے اوپر رکھے قندیل کے اجالے میں بڑے بھائی کو سڑک کے کنارے ایک روپے کا نوٹ دکھائی دیا۔ آس پاس کوئی آدمی نہیں تھا۔ نوٹ لے کر وہ اماں کے پاس گئے۔ انھوں نے اماں کو بتلایا تھا کہ سڑک پار نوٹ ملا ہے۔ اماں رو رہی تھیں۔ گاندھی جی کے مرنے پر، بہت لوگ رو رہے تھے۔ اماں نے کہا تھا کہ صبح ایک روپے کی ہری گھاس خرید کر راہ چلتی گایوں کے لیے سڑک پر رکھوا دیں گے۔ اس کے بعد انھیں پڑا ہوا ایک پیسہ بھی کبھی نہیں ملا۔ وہ کہہ نہیں سکتے تھے کہ روپے کا ملنا اور گاندھی جی کے قتل کا واقعہ انھیں کس طرح یاد تھا۔ ایک روپے کا نوٹ ملا تھا اس لیے گاندھی جی کے قتل کا واقعہ یاد تھا؟ یا گاندھی جی کے قتل کی وجہ سے انھیں ایک روپے کا ملنا یاد تھا؟ اس بارے میں وہ ٹھیک کچھ نہیں کہتے۔

انھیں سیاست سے نفرت تھی۔ وہ گھر کی حالت سدھارنے کے لیے تنخواہ سے پوری طرح مایوس ہو چکے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ تنخواہ سے گذارا کرنا، ''زندگی سانپ سیڑھی کا کھیل'' ہو چکی ہے۔ آمدنی کا ان کے پاس دوسرا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ دوسرے ذریعے کے لیے انھوں نے بہت اٹھا پٹخ کی، پر ان سے کچھ کرتے دھرتے نہیں بنا۔ اب اگر انھیں سڑک پر ایک روپے کا نوٹ مل جاتا تو وہ اماں سے نہ پوچھتے۔ اسے وہ اضافی آمدنی مان کر یا تو جمع کر لیتے یا اپنی سمجھ سے آزادی سے اسے خرچ کرتے۔ اماں کے کہنے کے بعد بھی، اب سڑک کی گایوں کے لیے گھاس ڈالنے کے بجائے اس روپے سے گھر کے لیے ہری سبزی خرید لیتے۔

مجھے ایک روپے کا نوٹ سڑک پر ملتا تو کسی بھوکے آدمی کو چار روٹی خرید کر دیتا۔ بڑے بھائی اور مجھ میں یہی فرق تھا۔ یہ فرق عمر کے باعث بھی ہو سکتا تھا۔ پہلے بیوی روز گائے کو دو روٹی دیتی تھی۔ وہ پہلی سِکی ہوئی دو روٹیاں گائے کے لیے نکال لیا کرتی تھی۔ فرصت پا کر احاطے میں گھومتی ہوئی گائے کو بلا کر روٹیاں دیتی۔ ایک دن گھورے پر میں نے ڈاکٹر کی گائے کو کاغذ کھاتے دیکھا۔ اس دن سے میں نے گائے کو روٹی دینا بند کروا دیا۔ گائے کاغذ کھا سکتی ہے، پر بھوکے آدمی کو کاغذ نہیں کھانا چاہیے۔ تب

Scanned with CamScanner

بھکاری کو روٹی دی جانے لگی۔ پہلے گھر میں بھولے بھٹکے کوئی بھکاری آتا تھا۔ جب روٹی دی جانے لگی تو بہت سے آنے لگے جن میں سے ایک دو کو چھوڑ کر باقی سب کو بھگا دیا جاتا۔

گھر کا خرچ کم نہیں ہوتا تھا۔ فالتو خرچ کیا ہے جس میں کٹوتی کی جائے، یہ بہت دنوں تک سمجھ میں نہیں آیا۔ بعد میں بھک منگوں کو روٹی دینا ایک فالتو خرچ سمجھ میں آ گیا۔ تب یہ روٹی گھر میں استعمال ہونے لگی۔ خرچ پورا نہ بیٹھنے کے کارن رحم دلی اور فیاضی کم ہو جاتی ہے، یہ بات سمجھ میں جلدی آتی تھی۔ فیاضی اور رحم دلی کا سیدھا تعلق روپے سے ہے۔ سر پر ہاتھ پھیر دینا نہ تو فیاضی ہوتی ہے، نہ رحم دلی، بس سر پر ہاتھ پھیرنا ہوتا ہے۔

مٹی کے تیل کے لیے کسی آدمی کو چھانٹنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ عام ضرورت کی چیز تھی، لیکن اس کے بغیر غریب آدمی کا بھی کام نہیں اٹکتا۔ زندہ رہنے کے لیے مٹی کا تیل ضروری نہیں ہے، مرنے کے لیے ہو جاتا تھا۔ کالج میں جنھوں نے مجھے ہندی ادب پڑھایا تھا، کچھ دنوں سے اس شہر میں دکھائی دینے لگے تھے۔ اگر وہ ابھی نظر آ جاتے تو میں ان سے ضرور پوچھتا، ''سر، مٹی کا تیل لیں گے؟''

آخر میں ان کا شاگرد تھا۔

تب وہ کہتے، ''نہیں۔''

میں ان سے درخواست کرتا، ''لے لیجیے سر! آج کل ملتا نہیں ہے۔''

وہ کہتے، ''میں مٹی کا تیل اپنے گھر نہیں رکھتا۔ تم کو معلوم ہے کہ میری پہلی بیوی مٹی کا تیل ڈال کر جل مری تھی۔ دوسری بیوی یہ کام کرے، یہ میں نہیں چاہتا۔ جن چیزوں سے خودکشی کی جا سکتی ہے میں ان چیزوں کو اپنے گھر میں نہیں رکھتا۔ داڑھی اب نائی کی دکان میں بنوانے لگا ہوں۔ بلیڈ سے خطرہ تھا۔ درانتی ہماری گرہستی میں نہیں ہے۔ سبزی کاٹنے کا چاقو بہت کند ہے، اس سے صرف ہری سبزی کٹ سکتی ہے۔ چولھے کے لیے زیادہ لکڑی اکٹھا نہیں کرتا۔ تھوڑی لکڑی سے بھی خطرہ ہے، پر میری مجبوری ہے، کھانا تو بنوانا ہی پڑے گا۔ ایک بار ٹنکچر آیوڈین بھولے سے کئی دنوں تک گھر پر رہ گیا تھا۔ بجلی کا استعمال تو کرنا ہی پڑے گا۔ گھر میں ایک بجلی کی استری ہے۔ گھر کے پاس کنواں اور تالاب نہیں ہے۔ میری پوری کوشش رہتی ہے کہ وہ چاہ کر بھی خودکشی نہ کر پائے۔ پہلی بیوی سے دو بچے ہیں۔ دوسری سے بھی دو بچے ہو گئے۔ میرا گھر اوپر کی منزل پر نہیں ہے۔ کودنا بھی چاہے تو وہ کھٹیا سے کود سکتی ہے۔''

Scanned with CamScanner

میں کہتا، ''سر! وہ ماچس کی ایک تیلی سے پورے گھر میں آگ لگا سکتی ہے۔ چادر، ساڑھی سے پھانسی لگا کر مر سکتی ہے۔''

تب وہ دکھی ہو کر کہتے، ''اتنا سب کرنے کے بعد بھی وہ پھانسی لگا کر مر سکتی ہے تو مر جائے۔ آخر کوئی کیا کرے؟''

میں کہتا، ''سر، آل پن سے بھی خطرہ ہے؟''

وہ کہتے، ''کانچ کی بوتل سے بھی خطرہ ہے۔''

میں کہتا، ''پانی سے بھری بالٹی سے بھی خطرہ ہے؟''

وہ کہتے، ''خالی بالٹی سے بھی خطرہ ہے۔''

اس کے بعد بھی وہ مٹی کا تیل لینے کے لیے تیار نہ ہوتے اور جینا مشکل ہو جاتا۔

نباتیات کے استاد کی بیوی نے بھی اسی سال خودکشی کی۔ نباتیات کے استاد کے چہرے پر چیچک کے بڑے داغ تھے۔ ان کے دو دانت ہونٹ دبانے کے بعد بھی باہر دکھائی دیتے تھے۔ طالب علموں میں ڈسپلن کے لیے مشہور تھے۔ کوئی طالب علم نقل کرے، یہ انھیں پسند نہیں تھا۔ کالج کے پاس ہی سرکاری کوارٹر میں رہتے تھے۔ ایک دن صبح طالب علم چائے پینے کے لیے ہوسٹل سے نکل کر ہوٹلوں کی طرف جا رہے تھے تب انھوں نے دیکھا کہ نباتیات کے استاد کی بیوی ساڑھی سنبھالتی، روتی چیختی سڑک پر نکل آئی۔ اس کے پیچھے پیچھے استاد نکلے۔ وہ عورت بھاگ کر پڑوس میں کیمسٹری کے استاد کے گھر میں گھس گئی تھی۔ نباتیات کے استاد کو سمجھایا بجھایا گیا۔ شام کو ان کی عورت کمرے میں بند ہو گئی اور اسٹوو کا تیل ڈال کر آگ لگا لی۔ جلتے ہوئے، درد سے چیختی وہ کمرے میں گول گول دوڑنے لگی تھی۔ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ کچھ طالب علموں نے دروازہ توڑنے کی کوشش کی، کچھ نے روشن دان سے دروازے کی چٹخنی کھولنے کی کوشش کی۔ وہ جل کر کمرے میں گر پڑی۔ چاروں طرف طالب علموں کی بھیڑ زیادہ تھی۔ روشن دان سے اس کے شوہر، کچھ طالب علموں اور کچھ اور لوگوں نے اس کی ننگی ران سے چربی پگھل کر جلتی، ٹپکتی ہوئی دیکھی۔

معاشیات کے استاد نے کچھ دنوں کے بعد ان کو سمجھایا ہوگا، ''تمھاری بیوی مر گئی۔ اس سے تمھیں بہت نقصان ہوا۔ اسکول میں ماسٹرنی تھی، دو سو روپے مہینہ کماتی تھی۔ گھر کا کھانا، دوسرے کام،

Scanned with CamScanner

بچوں کی دیکھ ریکھ، کپڑے دھونا، جھاڑو لگانا، بہت سے کام کرتی تھی۔ کوئی کام کرنے والی عورت ہوتی تو اتنے کام کے کم سے کم سو روپے لیتی اور رڈی کام کرتی۔ ایمانداری سے تمھاری گرہستی کی دیکھ ریکھ نہ کرتی۔ گندی ہوتی، اجڑ ہوتی، چور ہوتی۔ تمھاری بیوی تمھارے ساتھ بستر پر سوتی تھی۔ اب تمھارے بستر پر کوئی نہیں سوئے گا۔ اس کے لیے بازار میں تم کتنے بھی سستے سے کام چلاؤ، آدھے گھنٹے کے کم سے کم دو روپے لگ جائیں گے۔ وہ بستر کیسا ہوگا، اس کا اندازہ لگالو۔ بدنامی کا ڈر رہے گا۔ نوکری جانے کا بھی ڈر رہے گا — اب تم حساب کر کے بتلاؤ، ایک مہینے میں تمھیں کل کتنے روپے کا نقصان ہوا؟"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے دوسری شادی کر لی۔

سمپت کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ماں باپ کا اکلوتا لڑکا تھا۔ اس کا باپ بہت منحوس مانا جاتا تھا۔ محلے میں جب کسی کی موت ہوتی تو وہ اتنا زیادہ سرگرم ہو جاتا کہ کریا کرم کی ذمے داری اپنے آپ اس کے ہاتھ میں آ جاتی تھی۔ باپ کے اس کام سے سمپت بہت چڑتا تھا۔ اس کا باپ پانچ فٹ کا بھی نہیں ہوگا۔ گھٹے ہوے سر میں لمبی موٹی چوٹی ہوتی اور پورے ماتھے پر چندن کی، انگلیوں سے بنائی گئی، موٹی لکیریں ہوتیں۔

سمپت کی ماں کی پٹائی باپ بیٹا دونوں مل کر کرتے تھے۔ باپ ناراض ہو کر پیٹنے کے لیے تیار ہوتا۔ اگر اس کے پاس وقت نہ ہو، کسی کام سے جانا پڑ رہا ہو، تو وہ سمپت کو اس کی پٹائی کرنے کے لیے کہہ کر جاتا۔ اس طرح وہ ایک ساتھ دو کام نپٹاتا تھا۔

سمپت کی ماں کی عادت تھی کہ آٹا کم نہ پڑ جائے، اس ڈر سے آٹا زیادہ سان لیتی۔ پھر آٹا بچے گا تو مار پڑے گی، اس خیال سے فالتو آٹے کا گولا بنا کر چھپر کے اوپر یا پیٹی کے پیچھے یا گندی ساڑھی میں چھپا دیتی تھی۔ جب تک اس کی ساس زندہ رہی، جو روٹی بہو سے نہیں پھولتی تھی چولھے سے نکلی گرم گرم اسی روٹی کو اس کے چہرے پر پھرا دیتی تھی۔ اس لیے اب بھی اس کا چہرہ کھردرا اور ہمیشہ سوجا ہوا لگتا تھا۔ اس کا سامنے کا ایک دانت ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ دانت سمپت کی وجہ سے ٹوٹا تھا۔ اس کا باپ زور سے مارتا تھا، پر سنبھال کر۔ اماں کہتی تھیں کہ سمپت کی ماں بے چاری ہے اور باپ بیٹے دونوں راکھشس ہیں۔ میں سمپت کو بہت سمجھاتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اس کی یہ عادت بچپن سے پڑ گئی ہے، اب وہ اپنے کو روک نہیں پاتا۔ اس کی ماں کے ماتھے پر چوٹ کا نشان تھا، اس کے علاوہ آنکھ، ناک، کان پورے اور ٹھیک جگہوں

Scanned with CamScanner

پر تھے، لیکن اس طرح جیسے الگ الگ ڈر کر کسی جگہ چھپنے کو ہوں، اور ٹھیک اس وقت کسی جادوگر نے انھیں اپنی جگہ ساکت کر دیا ہو۔ اگر یہ جادو ٹوٹ جائے، تب؟

گھر کا کچھ سامان پانی سے بچانے کے لیے میں نے ماسٹر جی کے گھر رکھوا دیا تھا۔ ایک چارپائی اور ایک پرانی سائیکل سمیت ایک رکشہ بھر سامان تھا۔ پرانی سائیکل پر بہت خرچ تھا، اس لیے قسطوں پر ایک نئی سائیکل لے لی تھی۔ اتفاق سے اس دن ماسٹر جی گھر پر تھے اور پانی برسنے لگا تھا۔ ہماری حالت دیکھ کر انھوں نے کہا کہ تھوڑا بہت سامان وہ اپنے گھر میں رکھ لیں گے۔ میں ہچکچانے لگا تو انھیں دکھ ہوا۔ پرانی سائیکل کو زنگ لگنے سے بچانا تھا کیونکہ مجھے اس کو اچھی قیمت میں بیچنا تھا۔ اماں کے جانے کے بعد ایک چارپائی زیادہ ہو گئی تھی۔ ماسٹر جی سے میں نے کہا کہ وہ چارپائی استعمال کریں گے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

یکساں سطح کے آدمیوں کا سامان ایک جیسا ہوتا تھا۔ جو آئینہ میرے گھر میں تھا وہی آئینہ ماسٹر جی کے گھر تھا۔ میری جیسی چارپائی ان کے گھر کی بھی تھی۔ ایک سطح کے آدمی جس طرح کھپتے تھے، سامان بھی اسی طرح کھپ جاتا تھا۔

ماسٹر جی نے ایک دن کہا تھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ ان کا اور میرا چہرہ ملتا جلتا ہے۔ ان سے کئی لوگوں نے پوچھا تھا کہ کیا میں ان کا بھائی ہوں۔ مجھ سے کسی نے نہیں پوچھا تھا کہ کیا میں ماسٹر جی کا بھائی ہوں۔

ماسٹر جی کا آئینہ دیکھ کر مجھے یہ بات یاد آ گئی تھی۔ آئینہ دیکھ کر ہم لوگ اپنا چہرہ پہچانتے تھے۔ ایک جیسے آئینے کی وجہ سے ہمارا چہرہ ملتا ہوگا۔ سستا آئینہ چہرہ اتنا بگاڑ دیتا تھا کہ چہروں میں بہت فرق ظاہر نہیں ہوتا ہوگا۔ مگر لوگ ہمیں سیدھے سیدھے دیکھتے تھے، آئینے میں نہیں دیکھتے تھے۔ ہو سکتا ہے ہم دونوں کا چہرہ ملتا جلتا ہو۔

مجھے میاں بیوی کے چہرے بھی بھائی بہن کی طرح لگتے تھے۔ لگاتار ساتھ ساتھ دیکھے جانے کے نتیجے میں دیکھنے میں ایک توازن ہو جاتا ہوگا۔ اسی توازن کے باعث جوڑے بھائی بہن کی طرح دکھائی دیتے۔ ان کے برتاؤ سے پہچان میں آتا تھا کہ دونوں میاں بیوی ہوں گے۔

شادی کے فوراً بعد ہم دونوں نے جو تصویر کھنچوائی تھی، اس میں چہروں میں کوئی میل نہیں تھا۔ اس

کے سال بھر بعد جو فوٹو ہم دونوں نے کھنچوائی، اس میں چہروں کا میل دکھائی دینے لگا تھا، پھر بھی بیوی کا رنگ صاف تھا اور میرا سانولا ہی رہا۔ کسی دن بیوی کا رنگ بہت گورا لگتا۔ کچھ دنوں بعد دبا ہوا لگنے لگتا۔ ایسا گرمی اور جاڑے میں ہوتا تھا۔

جب لگنے لگا کہ پانی بہت دنوں تک نہیں برسے گا، تب گھر بھر میں بکھرے سامان کو جمانے میں ایک چھٹی کا دن چلا گیا۔

سل بٹے کو لات سے ٹھیلنے کی کوشش میں اور سمجھ میں نہ آنے والی پریشانی میں میں نے بیوی سے کہا، ''سل بٹا خریدنے کی ضرورت نہیں تھی۔''

''پیر سے مت چھوؤ،'' اس نے کہا۔ وہ جگہ جگہ بکھرے اخبار اور دوسرے کاغذوں کو اکٹھا کر رہی تھی۔

''ڈرم خریدنا بھی بے کار رہا۔'' ڈرم کو میں نے دھم دھم تھپتھپایا۔ پہلے آزو باز و، جیسے ڈھولک میں تھاپ دیتے ہیں، پھر اوپر ڈھکن میں۔ خالی ڈرم میں جیسے آواز ہوتی ہے ویسی ہی آواز ہوئی۔

''تم نے کہا تھا کہ سستے کے دنوں میں سال بھر کے لیے اناج خرید کر رکھنے کے لیے ایک ڈرم ہونا چاہیے،'' اس نے کہا۔

ڈرم کو کھول کر میں نے جھانکا، ''واہ! اناج تو ہے نہیں۔''

یہ سن کر وہ میرے پاس آئی اور پیپوں کی جانب اشارہ کیا، ''پیپوں میں ہے۔'' وہ اپنی گرہستی کو میرے مذاق سے بچا رہی تھی۔ ایک بالکل زنگ کھایا پیپا الگ تھلگ پڑا تھا۔ اس کے اوپر میں نے پیر رکھا۔ ''اس پیپے پر کھڑا ہو جاؤں گا تو ڈھکن سمیت میرا پیر اندر گھس جائے گا۔ اسے پھکوا دینا۔''

اناج کے خالی ڈرم کی بھی تو جگہ تھی۔ جب وہ اناج سے خالی ہے تو ہم لوگ اسے کس طرح استعمال کر سکتے تھے؟ دو ڈرم تھے، ایک چاول کا اور ایک گیہوں کا۔ دونوں پر میں نے نوے روپے خرچ کیے تھے۔ دال کی کھپت کم ہوتی تھی اس لیے دال کے لیے ڈرم نہیں لایا۔

''اب بارش زور سے آئے تو چاول کے ڈرم میں تم گھس جانا اور گیہوں کے ڈرم میں میں گھس جاؤں گا۔ اوپر سے ڈھکن جھکا لیں گے، سانس لینے کی جگہ ہونی چاہیے، نہیں تو سانس لے کر ڈرم میں بھری ہوا کو ختم کرنے کے بعد دم گھٹ جائے گا۔ تم ڈرم میں گھسو گی؟'' میں نے پوچھا۔

Scanned with CamScanner

''نہیں،'' اس نے کہا۔
''میں تمھاری مدد کروں گا،'' میں نے پیار سے کہا۔
''کتنا کام پڑا ہے!''
''آج تم کو جلدی نہیں ہے۔ دفتر کی آج چھٹی ہے۔ کھانا ابھی بنانا نہیں ہے۔''
''گھر کا سامان جمانا ہے۔''
''وہی تو کر رہے ہیں۔ اپنے کو بھی کہیں تندرست رکھنا ہے۔ پانی برسنے سے سامان کے ساتھ ساتھ کیا ہم دونوں بے ترتیب نہیں ہوئے ہیں؟''
بازو پکڑ کر میں نے اسے چاول کے ڈرم میں اتارنے میں مدد دی۔ وہ اسٹول رکھ کر کھڑی ہوگئی تھی۔
''اب اندر گھسو،'' میں نے کہا۔
ایک پیر ہی وہ اندر ڈال پائی تھی کہ اس کی ساڑھی پھٹ گئی۔
''میری ساڑھی پھٹ گئی،'' اس نے دکھی ہو کر کہا، اور اس طرح ہاتھ پیر پھٹکارے کہ بڑی مشکل سے سنبھال کر میں نے اسے نیچے اتارا۔ میں دکھی ہو گیا۔ ساڑھی کے پھٹنے کا اتنا دکھ نہیں تھا۔ دکھ اس کا تھا کہ وہ آخر میں میری ہر بات مان لیتی تھی۔
''پیپا کھول کر دیکھوں کہ اس میں اناج ہے یا نہیں!''
''دیکھ لینا۔ کچھ چھپا تھوڑے ہے۔''
ایک پیپا کھولا۔ اس میں دو تین کلو چاول تھا۔
''چاول ہے،'' میں نے کہا۔
آٹے کا پیپا دور سے پہچان میں آتا تھا۔ کل ہی تین کلو گیہوں پسوا کر لایا تھا۔
''گیہوں ابھی بچا ہے یا وہ بھی ختم ہو گیا؟''
''سات آٹھ کلو گیہوں ہے۔ بدلی چھائی تھی اس لیے زیادہ گیہوں دھوئے نہیں۔ اب روز دھوپ نکلتی ہے۔ کل پرسوں دھو کر ڈال دیتے۔ اس سال چاول بہت مہنگا ہوگا۔''
میری نظر الماری میں گئی۔ پلڑے کھلے تھے۔ الماری دیوار میں بنی تھی۔ الماری کا کھلا رہنا مجھے

Scanned with CamScanner

اچھا نہیں لگتا تھا۔

''اب الماری کے سامان کو بھی دیکھوں گا، کتنا فالتو اکٹھا کیا ہے۔ فالتو سامان سے نحوست بڑھتی ہے۔ جس کی ضرورت نہیں پڑتی اسے مت رکھو،'' میں نے کہا۔

الماری میں کھانسی کی دوا کی خالی شیشی دکھائی دی۔

''یہ کیا ہے؟''

شیشی بیوی کو دکھا کر میں نے کہا، ''قریب ایک مہینہ ہوگیا میری کھانسی ٹھیک ہوے۔ اب اس کھانسی کی شیشی کو دیکھ کر مجھے یاد آ گیا کہ میں بیمار تھا۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ دس منٹ بعد کھانسی ٹھیک ہوگئی تھی، پھر بھی پہلے بیماری تو یاد آ گئی۔''

''جب بیمار ہوے تھے تب جس بستر چارپائی پر لیٹتے تھے وہ بھی ہے۔ جو کپڑے پہنتے تھے وہ بھی پہنے ہو۔ بش شرٹ سے بیماری کیوں نہیں یاد آ گئی؟ میرا کوئی کام تم کو نہیں سہاتا،'' اس نے اداس ہو کر کہا۔

''بش شرٹ سے بیماری یاد آئے گی تو کیا میں بش شرٹ پھینک دوں گا؟ خالی شیشی پھینک سکتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے خالی شیشی ڈاکٹر کے کمپاؤنڈ میں پھینک دی۔

''چپل بھی وہی ہے،'' میں نے مسکراتے ہوے کہا، پر وہ اداس رہی۔ ''گھر بھی وہی ہے۔ کرایہ بھی وہی ہے۔ تم بھی وہی ہو۔ تم بیماری میں میرا کتنا خیال رکھتی تھیں۔ بخار میں بے دم ہوگیا تھا، تم رونے لگی تھیں،'' میں نے کہا۔ ''اب تمھارا موڈ ٹھیک ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

الماری میں رسالوں کے بیچ چھپا ہوا پلاسٹک کا پانی کا بیگ تھا۔ بالکل گندا ہو گیا تھا۔ بیگ کو نکال کر میں نے نیچے پھینکا تو وہ زمین پر پڑی طشتری کے اوپر آ کر پڑا۔ طشتری پھوٹتے پھوٹتے بچی۔

''کیوں پھینک رہے ہو؟ آنے جانے میں اس کی ضرورت پڑتی ہے۔''

''کہاں آتے جاتے ہیں؟ تم اپنے میکے جاؤ گی اور میں اپنے گھر۔ میرا وہ گھر بھی کرائے کا، پتا کے بعد جس کا کرایہ بڑے بھائی دیتے ہیں۔ بھابھی کی خواہش ہے کہ اس مکان کا آدھا کرایہ میں دیا کروں۔ وہاں پہلے میری جگہ طے تھی۔ شادی کے بعد طے نہیں ہے۔ ہر چیز کی جگہ طے ہونی چاہیے۔ اس گھر میں کتابیں رکھنے کی کون سی جگہ ہو، بستر کہاں رکھے جائیں، الماری میں کیا رکھا جائے، یہ ہم

لوگوں کو طے کرنا پڑے گا۔ واٹر بیگ اپنے پیروں سے کہیں نہیں جائے گا۔ اس کرائے کے مکان میں میں اپنے پیروں سے چل کر آیا، پر یہ جگہ میری حیثیت سے طے ہوئی۔ میں جہاں بھی جاؤں گا اپنی حیثیت سے جاؤں گا۔ حرکت کرتے ہوئے۔ پیر نہ ہوتے تو مجھے لڑھکایا جاتا۔ کہیں مجھے دھکا تو نہیں دیا جارہا ہے یا میں گھسیٹا تو نہیں جارہا ہوں۔"

واٹر بیگ اٹھا کر بیوی نے بے بس ہو کر پوچھا، "اسے اب کہاں رکھوں؟" جیسے یہ ایک کٹھن سوال ہے اور اسے صرف میں حل کر سکتا ہوں۔

"تم جانو، یہ تمھارا کام ہے،" میں نے کہا۔

"میرا کام ہے تو ٹوکا ٹاکی کیوں کرتے ہو؟"

"میں چاہتا ہوں تم گھر کو سنوار کر رکھو۔"

جو سامان تھا وہ اسی طرح ٹھیک تھا۔ پانی کا بیگ دھیرے دھیرے اخبار میں دب گیا ہوگا۔ اسے آڑ مل گئی۔ ہم لوگوں نے اسے کئی دنوں تک دیکھا۔ نہیں تھا۔ وہ اچانک نہیں دبا ہوگا۔ جب ضرورت ہوتی تب اسے ڈھونڈا جاتا۔

میرا کوئی سامان کھویا نہیں۔ جب بھی کوئی چیز کھوئی تو ڈھونڈنے سے مل گئی۔ تھیلا میں بہت بھولتا تھا۔ بھولتا بھی وہاں جہاں میں گیا ہوتا۔ لوٹ کر انھی جگہوں پر پوچھ تاچھ کرنے سے مل جاتا تھا۔ جب کبھی کھلے پیسے گرے تو مل گئے۔ سڑک کی نالی میں سائیکل کی چابی گر گئی تھی۔ دس پیسے لے کر ایک لڑکے نے اسے ڈھونڈ کر نکال دیا تھا۔

آٹا گوندھتے وقت بیوی انگوٹھی نکال کر پٹرے کے نیچے رکھ دیتی تھی، پھر سیندور کی ڈبیا میں، بعد میں پیٹی میں رکھنے لگی۔ گھر سے کبھی سامان چوری نہیں ہوا۔ چاند آسمان سے کہیں نہیں جا سکتا۔ جب وہ دکھائی نہیں دیتا تو بادلوں میں چھپا ہوگا۔ بعد میں نظر آجائے گا۔ چاند آسمان سے کھو کر آسمان میں ہی رہے گا۔ اگر وہ دکھائی نہ دے تو میں اس کے کھونے کی فکر نہیں کروں گا۔ اسی طرح کی بہت سی جھنجھٹوں سے میں آزاد تھا۔

چیزیں بے کار ہونے کے بعد بھی استعمال ہوتی تھیں۔ مستقبل میں کچھ کام آئے گا اس لیے کباڑ اور رڈی، پونجی کی طرح رکھی جاتی تھی۔ تلسی کا گملا پھوٹ گیا تھا، اس کی مٹی ہاتھ ٹمیانے کے لیے میں نے

رکھ لی تھی۔ ایک دن بیوی کو یاد آیا کہ میں تلسی کی مٹی سے ہاتھ مٹیا رہا ہوں۔ تب اس کے کہنے سے چھوٹے گملے کو نہر میں ڈال آیا اور لوٹتے وقت نہر سے ہاتھ مٹیانے کے لیے دوسری مٹی اٹھا لایا۔ دن گزرتا تھا۔

میں نے بیوی سے کہا، ''اگر ہم کباڑ اور خالی شیشیوں سے اپنا موہ کم کر دیں تو بہت صفائی ہو سکتی ہے۔''

''اچھا!'' اس نے کہا۔

اس کے تیار ہوتے ہی میں نے کہا، ''شروعات تمھاری پیٹی سے کرتے ہیں، جس میں تم تالا لگاتی ہو۔ میں گارنٹی سے کہتا ہوں کہ اس میں ایسا سامان ہوگا جو دو کوڑی کا بھی نہ ہوگا، جسے تالے میں سنبھال کر رکھنے کا کوئی مطلب نہیں ہے۔''

''نہیں نہیں، میں اپنی پیٹی نہیں دکھاؤں گی۔ تمھارا سامان تو میں پوچھتی بھی نہیں۔ ایک بھی کاغذ اِدھر اُدھر ہو جاتا ہے تو جان لینے کو کیسے تیار ہو جاتے ہو!''

''کیا ہوا، دیکھ لینے دو! چابی کہاں ہے؟''

''معلوم نہیں کہاں ہے،'' بیوی نے کہا۔ مگر چہرے پر التجا تھی کہ مجھے چھوڑ دو، چابی مت لو۔

مجھے معلوم تھا، اگر چابی کمر میں نہیں ہوگی تو گدے کے نیچے ہوگی۔ دوڑ کر اس کے پہنچنے سے پہلے، گدے کے نیچے میں نے چابی پا لی۔ چابی سے مایوس ہو کر وہ دوڑتی ہوئی اپنی پیٹی پر جم کر بیٹھ گئی، تب بھی اس کے چہرے پر تھا کہ وہ کچھ نہیں کر سکتی اور میں زبردستی کروں گا، جس سے وہ بچ نہیں سکتی۔ پیٹی بہت چھوٹی تھی۔ پیٹی کے لحاظ سے تالا بڑا تھا، پر اس کی خواہش کے مطابق تھا۔ پیٹی کے اوپر بیٹھے ہونے کی وجہ سے پیٹی ساڑھی سے چھپ گئی تھی۔

''پیٹی میں آخر کیا ہے جو تم چھپانا چاہتی ہو؟ ضرور کوئی خاص بات ہوگی۔ تمھارا چہرہ ایسا ہو گیا جیسے جان جا رہی ہو۔''

''ہاں جان جا رہی ہے۔ جان چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟''

''میں تمھاری جان لے رہا ہوں؟''

''تمھاری زبردستی اچھی نہیں لگتی،'' روہانسی ہو کر اس نے کہا۔

''میں زبردستی کر سکتا ہوں؟''

''ہاں!'' اس نے کہا۔

Scanned with CamScanner

''مجھے ہنسی آ گئی۔''ایک بار اور بولو، زبردستی۔''

''زبردستی،'' بھرے گلے سے اس نے کہا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر دکھ ہوا، مگر میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے اس کی آنکھوں میں آنسو آئیں۔

''رونا کیوں آ گیا؟'' میں نے کہا۔ غصہ مجھے اپنے اوپر تھا۔ موگرے کا پھول پودوں میں اچھا لگتا تھا، پر جب وہ ہاتھوں میں لگا لگا مرجھا گیا تو خیال آیا کہ اسے برتا نہ ہوتا۔ بیوی کا رشتہ پھول کو توڑ کر اپنے پاس رکھ لینے کا تھا۔ پیڑ میں کھلے پھول جیسا رشتہ کہیں نہیں دکھائی دیتا تھا۔ اگر پھول پاس میں رکھے رکھے مرجھا گیا تو پودے میں لگا لگا بھی تو مرجھا جاتا ہے، یہ دلیل تیار رہتی تھی۔

کچھ فیصلہ کرنے کے بعد وہ پیٹی سے اٹھ کر ایک طرف کھڑی ہو گئی اور بولی، ''لو، دیکھ لو۔''

کئی چابیاں تھیں۔ دو چابیاں نہیں لگیں۔ کب کے خراب، پھینکے گئے تالوں کی بچی ہوئی چابیاں گچھے میں اکٹھی ہو گئی تھیں۔

''لاؤ! میں چابی نکال دوں۔'' اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

''بے وقوف بنا کر تم چابیاں واپس لینا چاہتی ہو؟'' میں نے کہا۔

اس کا ہاتھ میری طرف گچھا لینے کے لیے بڑھا رہا۔ میں نے اسے چابیاں دے دیں۔

گھر تو بالکل کھلے پنجرے کی طرح تھا جس میں رہنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ چاند آسمان سے بھاگ کر جائے گا کہاں؟ آسمان سے بھاگ کر آسمان ہی میں رہے گا۔

''یہی چابی ہے،'' گچھے سے ایک چابی الگ نکال کر اس نے کہا۔

''یہی چابی ہے؟'' تب بھی میں نے پوچھا۔

''ہاں! یہی چابی ہے۔ ہٹو، میں کھولتی ہوں۔ پیٹی تم دیکھ لینا۔''

''تالا میں کھولوں گا،'' میں نے کہا۔

پیٹی کھولتے ہی، سب سے اوپر پٹھے میں چپکا لکشمی جی کا ایک فوٹو تھا۔ فوٹو کا ایک کونا نہیں تھا۔ یہ فوٹو گھر میں مجھے کبھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ اپنے ساتھ میکے سے لائی ہوگی۔ تالاب میں کمل کے اوپر کھڑی ہوئی لکشمی جی۔ دونوں طرف ہاتھی۔ ایک ہاتھی کے سونڈ میں پھول کی مالا، دوسرے کی سونڈ میں کمل کا

Scanned with CamScanner

پھول۔ لکشمی جی کے ایک ہاتھ سے چاندی کا گرتا ہوا روپیہ۔ بیوی کو امید ہوگی کہ روپے تصویر سے چھنک کر اس کی پیٹی میں بھرتے جائیں گے۔ اس طرح کے فوٹو میں بچپن سے دیکھتا آ رہا تھا۔ پہلے اس میں کوئی کمی نظر نہیں آتی تھی۔ اب لگتا تھا کہ فوٹو میں تالاب کے کنارے روپے نکالنے کے لیے، ڈبکی لگانے کو تیار ننگ دھڑنگ لڑکے بھی ہوں۔ تالاب میں ایک ڈوبتا ہوا لڑکا ہو، یا ہاتھی کی سونڈ میں ایک چھٹپٹاتا ہوا لڑکا ہو۔ ڈبکی مارنے والے لڑکوں سے ہاتھی ناراض ہو گیا ہوگا۔ اس ہاتھی میں ایک سونے کا ہودا ہونا چاہیے جس میں ایک راجا ہو۔

''لکشمی جی کی جے!'' ہاتھ جوڑ کر میں نے کہا۔ پاس بچھے بورے پر پیٹی سے ایک ایک سامان نکال کر رکھ رہا تھا۔ جو سامان یا کپڑا مجھ سے بے ترتیب ہو جاتا، بیوی اسے اٹھا کر دیتی تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل مجھ سے بالکل سٹی بیٹھی تھی۔ میں نے اپنا دایاں ہاتھ اس کے گلے میں ڈال دیا۔ ایک بنارسی لال ساڑھی تھی۔ دو نئی سوتی ساڑھیاں، شادی کے وقت کی تھیں۔ انھیں نکال کر میں نے کہا، ''ان کو پہننا شروع کرو۔'' ایک نئے کپڑے کی چندی سے بندھی ہوئی لاکھ کی کئی چوڑیاں تھیں۔ خوبصورت لال لال چوڑیاں۔ پیٹی میں نیپتھلین کی گولیوں کی بو تھی۔ لال رنگ کا، چکنا چمکتا ہوا ساٹن کا پیٹی کوٹ تھا۔ دو نئے سفید پیٹی کوٹ تھے۔ ایک میں ہلدی کا داغ تھا۔ کانچ کی چوڑیاں سُتلی میں بندھی تھیں۔ ٹوٹنے سے بچانے کے لیے انھیں پیٹی کے کونے میں کپڑوں سے لپیٹ کر رکھا گیا تھا۔

بیوی کے ہاتھ کی چوڑیاں کم ہو گئی تھیں۔ میں نے کہا، ''لاکھ کی چوڑیاں اور کانچ کی چوڑیاں پہن لینا۔'' ایک ٹین کا چپٹا ڈبا تھا، جب میں نے اسے کھولا تو اس کے اندر دس کے تین نوٹ تھے۔ ایک پانچ روپے کا نوٹ تھا۔ روپوں کو دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔ میری خوشی قریب قریب ویسی ہی تھی جیسی مفت کے روپے مل جانے پر ہوتی ہے۔

''تمھارے پاس بہت روپیہ ہے۔'' ڈبے میں میرا ایک فوٹو تھا۔ یہ فوٹو تین چار برس پہلے کا تھا۔ اس میں میں نے ایک چوخانے کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ کوٹ فوٹوگرافر کا تھا، جو صرف فوٹو کھنچوانے کے لیے اسٹوڈیو میں ٹنگا رہتا تھا۔ یہ فوٹو مجھے کبھی اچھا نہیں لگا۔ اس میں گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی لگتی تھیں، جس سے گال زیادہ پچکے لگتے تھے۔ گھر میں اور بھی اچھے فوٹو رکھے تھے۔ پر یہ فوٹو بیوی کو پتا نہیں کیوں پسند تھا۔ ڈبے میں ایک سونا بھری تانبے کی انگوٹھی اور چاندی کے چمکتے ہوئے بچھوے تھے۔

Scanned with CamScanner

کچھ چھوٹے چھوٹے نئے کپڑوں کے ٹکڑے تھے۔ یہ کپڑے بلاؤز کے لائق نہیں تھے۔ ایک بتے بھر لمبا اور چار انگل چوڑا کپڑا نکال کر میں نے کہا، ''ناک پونچھنے لائق بھی نہیں ہے۔''

بیوی کا چہرہ پھول گیا۔

میں نے اس سے کہا، ''غصہ مت ہونا۔ تم کو ایک قصہ سناؤں گا۔''

''کب؟''

''بعد میں سناؤں گا۔''

کچھ اور بھی چیزیں تھیں، جیسے لال بندیوں کی ایک شیشی، ایک کنگھا اور سیندور رکھنے کی ایک ڈبیا، کاجل کی ڈبیا۔ کاجل کی ڈبیا کو باہر نکال کر میں نے کہا، ''آج تم کاجل لگانا۔''

گھر کی صفائی کا کلیجہ میرے پاس نہیں تھا۔ میں تھک گیا۔ آخر میں سب کچھ میں نے بیوی کے اوپر چھوڑ دیا۔

''مجھ سے نہیں ہوتا،'' میں نے کہا۔

دھیرے دھیرے وہ سب ٹھیک ٹھاک کرتی رہی۔ پہلے اس نے اپنی پیٹی کو جمایا۔ تالا بند کرنے کے بعد اس نے مجھے کالی مخمل کا ایک بٹوا دکھایا۔ ''اس کے اندر کا سامان نہیں دیکھو گے؟''

''تم ہی دیکھ لو۔'' میں اوب گیا تھا۔

اس نے بٹوا اچھال کر میری طرف پھینکا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اسے جھونک لیا، پھر بغیر دیکھے اسٹول کے اوپر رکھ دیا۔

''قصہ نہیں سنانا ہے کیا؟'' چارپائی پر لیٹتے ہوئے میں نے پوچھا۔

''سننا ہے۔'' وہ آ کر میرے پاس بیٹھ گئی۔

''وہاں اپنے گھر کے پاس سکھ لال تیواری کا گھر ہے۔''

''جانتی ہوں۔''

''سکھ لال تیواری پیسے والے لوگ ہیں۔ تم ان کے گھر گئی ہو گی۔''

''اماں جانے کے لیے کہہ رہی تھیں، پھر موقع نہیں ملا۔''

''اس کی عورت ساس اور شوہر سے دکھی تھی۔ ایک دن گھر کے کنویں کی منڈیر پر بیٹھ کر اس نے

اپنی ساس سے پوچھا: 'کود جاؤں ؟' 'کود جاؤ' ساس نے کہا اور شوہر نے بھی کہا۔ عورت کنویں میں کود گئی تو شوہر تھوڑی دیر کے لیے بھونچکا رہ گیا۔ تب تک ساس پیپل کے پیڑ کے پاس سے ایک لمبا بانس اٹھا کر لائی۔ بانس کو کنویں میں ڈال کر وہ پانی کو گول گول ہلانے، کھنگالنے اور کوٹنے لگی تا کہ بہو کے اندر کچھ سانس باقی ہو تو وہ ختم ہو جائے۔''

بیوی کو لپٹا کر میں نے کہا، ''اب تم تصور کرو کہ بہو کنویں میں کود کر ڈوبی۔ مرنے کی تکلیف سے اس کا جی چاہا ہوگا کہ کسی طرح بچ جائے۔ اس نے بچنے کے لیے ہاتھ پیر پھٹکارے ہوں گے۔ سانس لینے کی کوشش میں پانی پی جاتی ہوگی۔ تبھی ساس کا ڈالا ہوا بانس ڈوبتے وقت اس کے ہاتھ کے پاس آیا ہوگا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ شوہر نے اسے بچانے کے لیے بانس ڈالا ہے۔ اگر وہ پکڑ لے تو اسے بانس سے اوپر کھینچ لیں گے۔ بانس پکڑنے کے لیے اس نے ہاتھ بڑھایا ہوگا اور بانس اوپر کھینچ لیا گیا ہوگا۔ اور تیزی سے اوپر سے آتا ہوا دوبارہ اس کے سر میں لگا ہوگا، سر میں نہیں تو چھاتی میں لگا ہوگا۔'' ہم دونوں تھوڑی دیر تک ایک دوسرے سے لپٹے پڑے رہے۔

''اب دوسرا قصہ سنو۔''

''اب نہیں سننا ہے۔''

''ایک اور سن لو، پھر نہیں سناؤں گا...

''رام بلی پانڈے کی بہو بہت خوبصورت تھی۔ سب لوگ اس کی خوبصورتی سے پریشان تھے۔ گھر بھر کو اس کا اٹھنا بیٹھنا، بولنا چالنا برا لگتا تھا۔ ایک دن اسے زہر دے کر مار ڈالا گیا۔ ان لوگوں نے پانی میں پتلا پتلا آٹا گھولا اور کمرے میں، آنگن میں، جگہ جگہ ڈال دیا۔ اس کے اوپر راکھ ڈال دی گئی، جیسے الٹی کے اوپر ڈال دی جاتی ہے۔ پھر ہلا مچایا کہ بہو ہیضے سے مرگئی۔''

''زہر کس نے دیا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''ساس، سسر یا شوہر۔ ان تینوں نے مل کر یا کسی ایک نے دیا ہوگا۔''

''خود بھی تو کھا سکتی تھی۔''

''ہاں،'' میں نے کہا۔

''شوہر نے زہر نہیں دیا ہوگا۔''

Scanned with CamScanner

''یہی سمجھتی رہو۔''

''شوہر کے زہر دینے کے پہلے وہ خود زہر کھا لے گی۔''

میں اٹھنے لگا تو اس نے مجھے اٹھنے نہیں دیا۔''تھوڑی دیر اور لیٹے رہو۔''

''وہ سندر تھی، اس لیے مجھے یقین ہے کہ اس کے شوہر نے اسے زہر نہیں دیا ہوگا۔''

میں نے بیوی سے کہا،''تم میری ہر بات مان لیتی ہو۔''

''تم غلطی نہیں کرتے۔''

''تو بھاڑ میں جاؤ،'' اسے ٹہل کر اٹھاتے ہوئے میں نے کہا۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں پھر لیٹ گیا۔ بیوی کی آنکھوں کو ہونٹوں سے چومتے ہوئے کہا، ''جو کچھ بھی میرے پاس سکھ ہے، وہ تم سے ہے۔ میں بیوی کے روپ میں تمھارے سوا کسی اور کا تصور نہیں کر سکتا۔ اگر جادو سے شادی کے پہلے کی صورت حال ہو جائے تب بھی میں تم کو پہچان لوں گا۔'' بچپن سے گائے کو گائے کہنا سیکھا تھا۔ شادی کے بعد پوری سمجھداری سے اسی طرح بیوی کو بیوی کہنا سیکھا۔

''میری ساس مجھے بہت پیار کرتی ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔ کیا میں تم کو پیار کرتا ہوں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''میں نہیں بتاؤں گی۔ تم بتاؤ پہلے۔''

''تم کو مجھ سے ڈر لگتا ہے؟''

''نہیں۔''

''کیا تمھیں ایسا لگتا ہے کہ میں تم کو زہر دے دوں گا؟''

''نہیں لگتا۔''

''میں تمھیں گھر سے نکال دوں گا؟''

''نہیں نکالو گے۔''

کسی دکھ کے نتیجے میں کوئی زہر نہیں کھا سکتا۔ یہ تو سازش ہوتی ہے۔ آدمی کو بری طرح ہرانے کے بعد زہر کی ترکیب سجھائی جاتی ہے۔ آدمی کو بھوکا رکھ کر زہر کھانے کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ بھوکا رکھنا کسی کو ہرانا نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہرانے کا کام آسان ہو جاتا۔

Scanned with CamScanner

میں نے کہا، ''گھومنے چلوگی؟ میں سوچتا ہوں جب بھی میں کچھ خرید نے بازار جاؤں، تمھیں بھی ساتھ لے چلوں۔ اس سے تم کو بازار کرنا آ جائے گا۔''

''تم چلے جاؤ۔ ہری سبزی لے آؤ گے تو رات کو بنالوں گی۔ نہیں تو آلو بنانا پڑے گا۔''

''شادی کے بعد ابھی تک ایسا موقع نہیں آیا ہے کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ باہر گھومیں۔ جب بھی میرا جی کرتا ہے تب تم کوئی اڑچن ڈال دیتی ہو۔''

''میں کیا کروں گی بازار جا کر؟ ساتھ میں جاؤں گی تو میرے کام کا ہرجا ہوگا،'' اس نے مضبوطی سے کہا۔

لیکن میں اس کے پیچھے پڑا رہا جب تک وہ ساتھ چلنے کے لیے راضی نہیں ہوگئی۔

بس اکا دکا معاملوں کو اپنی مرضی کے مطابق چلا کر وہ گھر کی رانی تھی۔ اس کا ذاتی سنسار بڑا نہیں تھا۔ وہاں تنہائی نہیں تھی۔ ہر جگہ میں موجود تھا۔ صرف دو آدمیوں کی دنیا۔

''ایک اچھی ساڑھی لینے کو جی کرتا ہے۔ چنری ساڑھی سے بھی اچھی، ہلکے رنگ کی، جس میں چھوٹے چھوٹے پرنٹ ہوں۔ تمھارے پاس بھی بڑے بڑے پرنٹ کی ساڑھیاں ہیں،'' میں نے کہا۔

''پہلے میں ایک بلاؤز بنواؤں گی۔''

''آج بازار جا کر بلاؤز کا کپڑا ہی خریدو گی۔ ساڑھی کے لائق پیسے تمھارے پاس نہیں ہوں گے،'' میں نے کہا۔

''میرے پاس تو بلاؤز کے لائق بھی پیسے نہیں ہیں۔''

''پیٹی کے ڈبے والے روپے نکال لو۔''

''وہ روپے!'' چونک کر وہ کھڑی ہوگئی۔ بازار سے کچھ خریداری کرنے کا اس کا سارا شوق مر گیا۔ پلٹ کر اس نے پیٹی کی طرف دیکھا جس کا تالا بند تھا۔ چابی اس کی کمر میں کھنسی تھی۔

مجھے اس پر ترس آیا۔ اس کے لیے کچھ خریدنے کے لیے بہت دنوں سے جی چاہ رہا تھا پر پیسے بچتے نہیں تھے۔ میرا کوئی فالتو خرچ نہیں تھا۔ سوائے دفتر یا کہیں اور ایک دو کپ چائے کے۔

''میرے پاس دو تین روپے ہوں گے،'' جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے میں نے کہا۔

Scanned with CamScanner

''مجھے بلاؤز کی جلدی نہیں ہے، رہنے دو۔ وہ روپے میں نے وقت ضرورت کے لیے بچا کر رکھے ہیں۔''

''بلاؤز نہیں بنوانا ہے، تب بھی بازار جا سکتے ہیں۔ پر سچ سچ بتلاؤ، بلاؤز کی ضرورت ہے یا نہیں؟''

''نہیں ہے۔ تم زور دے رہے تھے، تب میں نے ساڑھی کے بجائے کم خرچ کے لیے بلاؤز کی بات کی،'' اس نے سکون سے کہا۔

''وہ ضرورت کون سی ہے، جس پر تم جمع کیے ہوئے روپے خرچ کرو گی؟''

''میں نہیں جانتی۔''

''میں جانتا ہوں۔ اگر ہم لوگوں پر کوئی آفت آئی تو بچے ہوئے پندرہ بیس روپے سے وہ آفت دور ہو جائے گی۔''

''میں نہیں جانتی۔''

''تم نہیں جانتیں تو چلو بلاؤز بنوا لیتے ہیں۔''

مجھے چاند آسمان میں گول کٹی ہوئی کھڑکی کی طرح لگتا تھا جس سے آسمان کی آڑ میں چھپی ہوئی دنیا کا اجالا اندر آتا تھا۔ سورج کا بھی یہی حال تھا۔ فرق صرف دن اور رات کا تھا۔

''یہ روپے میں تمھیں خرچ کرنے نہیں دوں گی۔ یہ میرے روپے ہیں۔''

''تم تو کماتی نہیں ہو۔ تمھارے روپے کہاں سے ہوئے؟ میری جیب سے نکال کر یا میری تنخواہ سے بچا کر جمع کرتی ہوگی۔''

''کچھ پتا نے دیے تھے، کچھ بھیا نے، تھوڑے تمھاری جیب سے بچا کر رکھ دیے تھے۔ ابھی جاتے وقت اماں نے پانچ روپے دیے۔ میں لے نہیں رہی تھی۔ ان کو بھی ضرورت پڑتی ہے۔ زبردستی انھوں نے پکڑا دیے۔''

''جتنے روپے تم نے میری جیب سے نکال کر جمع کیے ہوں گے، وہ میرے ہیں۔ مجھے دے دو۔ میں اپنے لیے نہیں مانگ رہا ہوں، تمھارے بلاؤز کے لیے مانگ رہا ہوں۔''

''کپڑے دھوتے وقت تمھاری جیب سے کبھی پانچ پیسے یا دس پیسے، اس سے زیادہ کبھی نہیں

Scanned with CamScanner

ملتے۔''

''جو میرا نصیب ہے وہی تمھارا ہے۔ پھر بھی کتنے روپے اس طرح ہو گئے ہوں گے؟''

''مجھے یاد نہیں ہے۔''

''حساب کر لیتے ہیں۔ کچھ تو اندازہ ہو جائے گا۔ اس سے ایک روپیہ کم دے دینا۔ سسر جی نے کتنے روپے دیے تھے؟''

''آٹھ مہینے پہلے آئے تھے تب پانچ روپے دیے تھے۔ اس سے پہلے ایک بار دو روپے۔ پھر پانچ روپے، جب یہاں کسی کی بارات میں آئے تھے۔ پہلے کچھ خرچ بھی تو ہوئے ہیں۔''

''تم کو تو سب یاد ہے۔ تمھاری یادداشت بہت اچھی ہے۔ پانچ اور دو، سات، سات اور پانچ بارہ، اور اماں نے پانچ روپے دیے، ہو گئے سترہ۔ تمھارے بھیا نے کتنے روپے دیے تھے؟''

''سچ میں مجھے یاد نہیں ہے۔ تم سب روپے لے لو، پر میں بلاؤز نہیں بناؤں گی۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''ابھی تک ٹھیک چل رہا تھا۔ میں تو تمھارے بلاؤز کا جگاڑ کر رہا تھا۔''

''میری فکر مت کرو،'' اس نے کہا۔

''اپنی طرف سے میں یہی کوشش کرتا ہوں کہ تم کو میری کم سے کم فکر کرنی پڑے۔ کھانا تم صرف میرے لیے نہیں بناتیں، تم بھی کھاتی ہو۔ گھر میں جھاڑو لگاتی ہو تو جھاڑو لگے گھر میں تم بھی رہتی ہو۔ الگ سے تم میرے لیے کیا کرتی ہو؟''

''بھیا نے پانچ روپے دیے تھے،'' اس نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

''سترہ اور پانچ بائیس روپے ہوئے۔ تین روپے اور جوڑ لو، پچیس ہو گئے۔ تمھارے ڈبے میں پینتیس روپے ہیں۔ یعنی دس روپے میری جیب کے ہوئے۔ وہی مجھے دے دو۔''

''کچھ اور بھی ہیں، مجھے یاد نہیں آ رہا ہے۔''

''تین روپے میں اسے شامل کر لیا ہے۔''

وہ پیٹی سے روپے نکال لائی۔ دس روپے کا ایک نوٹ میں نے اس سے لے لیا۔

ہم لوگوں نے گھر سے نکلنے کی پوری تیاری کر لی۔ بیوی نے لاکھ کی دو دو چوڑیاں اور کانچ کی چار

چوڑیاں پہن لیں۔ ایک نئی ساڑھی، پیلے رنگ کی، جس میں بھورے رنگ کے بڑے بڑے پتوں کا ڈیزائن تھا۔ پتا نہیں کس کپڑے کے پتے تھے۔ وہ اس نے پہنی تھی۔

''کاجل لگاؤں؟'' اس نے پوچھا۔

''رات کو لگانا،'' میں نے کہا۔

گھر بند کرنے کے لیے تالا نہیں تھا۔

''اب؟'' میں نے کہا۔

''ایک تالا ہے، اس کی چابی کھو گئی تھی،'' اس نے کہا۔

''گچھے میں جتنی چابیاں ہیں، اتنے تالے نہیں ہیں،'' میں نے کہا۔

''دو تالے پیٹی میں بند ہیں۔''

دوسری پیٹی کا تالا بالکل بچکانہ تھا۔ اسے باہر لگانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ زنجیر اس تالے سے ٹلک کر نکل آتی۔ اسے توڑنے کی ضرورت بھی نہ پڑتی۔ بیوی کی پیٹی کا تالا مضبوط تھا۔

''گھر کو کھلا چھوڑ کر نہیں جا سکتے،'' بیوی نے کہا۔

''تم اپنی پیٹی کا تالا نکال لو، اسی کو باہر لگا دیں گے۔''

''میری پیٹی کھلی رہ جائے گی۔''

''بند گھر کے اندر پیٹی بند رہے یا کھلی رہے، کیا فرق پڑتا ہے؟''

''پیٹی میں جو کھم کا سامان ہے۔''

''کچھ نہیں ہے۔''

''سونے کی انگوٹھی ہے، آدھے تولے کی ہوگی۔''

''اس کو پہن لو۔''

''ڈھیلی آتی ہے۔ کسی انگلی میں ٹھیک نہیں ہوتی۔''

گھر سے باہر ساتھ ساتھ گھومنے یا بازار کرنے کا سکھ تھا۔ بیوی کی شروع سے باہر جانے کی خواہش نہیں تھی۔ بہت سے ساتھ کے سکھ ہم دونوں اٹھا نہیں پا رہے تھے۔ اگر آج کے دن تھوڑے اور پیسے ہوتے تو شاید بلاؤز خریدنے ہم دونوں جاتے۔

Scanned with CamScanner

آئندہ ہم لوگ گھر میں تالا بند کر باہر جاسکیں، اس کے لیے ایک تالا ہونا ضروری تھا۔ دس روپے میرے پاس تھے۔ میں بازار سے ایک مضبوط تالا سات روپے کا خرید کر لایا۔ باقی پیسے بیوی کو دے دیے۔ اب ہم لوگ باہر جاسکتے تھے۔ پر بغیر پیسے کے ساتھ ساتھ بازار گھومنے کا سکھ کس طرح اٹھایا جائے؟

میں نے تالا لے کر گھر بند کرنے کا ریہرسل کیا۔ بیوی گھر کے اندر رہی۔ وہ چاول نکالنے چلی گئی تھی۔ میں نے جلدی جلدی پیچھے کا دروازہ اور کھڑکیاں بند کیں اور سامنے کا دروازہ بند کر کے تالا لگایا۔ سامنے کا دروازہ بند کرنے کے لیے دونوں پلڑوں کو جما کر طاقت سے کھینچنا پڑتا تھا جس سے بھڑ سے آواز ہوتی تھی۔ جیسے ہی دروازہ بند کرنے کی آواز ہوئی، جو دروازہ بند ہونے کی جانی پہچانی آواز تھی، گھر کے اندر کوئی چیز جھنجھنا کر گری اور بیوی دوڑتی ہوئی آ کر باہر کے دروازے کو اندر سے زور زور سے بھڑ بھڑ پیٹنے لگی۔ جب تک میں کھولوں، تب تک اس نے ہلا مچا دیا۔ وہ لگاتار چیخ رہی تھی، ''دروازہ کھولو! دروازہ کھولو!'' وہ زور زور سے رو رہی تھی۔ جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا، اس نے مجھے قریب قریب ڈھکیلتے ہوئے زور سے پکڑ لیا۔ ''کیا ہو گیا؟'' گھبرا کر اسے سنبھالتے ہوئے میں نے کہا، ''چپ ہو جاؤ۔ میں تالا یوں ہی بند کر رہا تھا۔ دیکھو چپ ہو جاؤ، چپ ہو جاؤ، مجھ سے غلطی ہو گئی۔ تم مجھ پر بھروسا نہیں کرتیں۔ مجھ کو معاف کر دو۔ مت روؤ!'' میں لگاتار یہی بتلاتا رہا جب تک وہ چپ نہیں ہو گئی۔ کمرے کے اندر چاول کی تھالی دور پھکی پڑی تھی اور چاروں طرف چاول بکھر گئے تھے۔ چاول کھوندتے ہوئے ہم دونوں کمرے کے اندر گئے۔ کافی دیر تک وہ مجھے پکڑے رہی۔ میں نے اس سے کہا، ''اگر سامنے کا دروازہ باہر سے بند تھا تو پیچھے کا دروازہ تو اندر سے بند تھا۔ تم اسے کھول کر باہر آ سکتی تھیں۔''

سمپت نے اضافی آمدنی کے لیے جگاڑ شروع کر دیا تھا۔ گول بازار میں ایک ریڈیو اسکول تھا۔ اس میں ریڈیو بنانا سکھایا جاتا تھا۔ روز شام کو سات بجے وہ ایک گھنٹے کے لیے ریڈیو کا کام سیکھنے جاتا تھا۔ ہفتے بھر بعد ہی اس نے مجھ سے کہنا شروع کر دیا کہ پچھتر روپے میں ایک نیا ٹرانزسٹر خود جوڑ کر تیار کر لے گا۔ اچھی خاصی بات چیت میں وہ ریڈیو کی بات شروع کر دیتا، اس میں اتنا جوش آ گیا تھا۔

ایک دن میں نے سمپت سے کہا، ''دیکھو، ابھی میں تم سے ایک ضروری بات کہوں گا، تم بیچ میں ریڈیو سے متعلق مجھ سے کوئی بات نہیں کرو گے۔ تمھارے ہاتھ میں کیا ہے، نوٹ ہے؟'' میں نے

Scanned with CamScanner

پوچھا۔

اس نے مجھے مٹھی کھول کر دکھایا، اس کی مٹھی میں ٹرانزسٹر ریڈیو کے پرزے تھے۔ اس نے کئی رنگوں والے ایک ٹکڑے کو انگلی سے پکڑ کر اوپر کرتے ہوئے مجھ سے کہا، ''جانتے ہو یہ کیا ہے؟''

''تم بتاؤ۔''

''یہ ریزسٹنس ہے، رنگوں کی پٹی سے اس کی پہچان ہوتی ہے۔ ہر رنگ کا مطلب ہوتا ہے۔ یہ کنڈنسر ہے۔ یہ ٹرانزسٹر ہے۔ ٹرانزسٹر کے تین پیر ہیں۔ ان کے الگ الگ نام ہیں۔''

''مجھے تم سے کچھ ضرور بات کرنی ہے۔ چونکہ تم میرے بچپن کے دوست ہو اس لیے مدد کے لیے تمھارے پاس آیا ہوں۔''

''پہلے کام بتاؤ۔''

''مجھے پچیس روپے ادھار دے سکو گے؟''

''میں سمجھ گیا تھا کہ تم مجھ سے روپے مانگو گے،'' سمپت نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''تمھیں کیسے معلوم؟''

''میں نے تم میں ریزسٹنس کی طرح کی رنگت دیکھی تھی۔''

''ریڈیو کی بات مت کرو، مجھے روپے دو گے؟'' میں نے پوچھا۔

''سنو،'' اس نے بہت سنجیدگی سے کہا، ''ہفتے بھر پہلے میرے پاس روپے تھے۔ اب نہیں ہیں۔''

''بالکل نہیں ہیں دوست؟'' مایوس ہو کر میں نے پوچھا۔

''نہیں۔ ریڈیو والے کو سو روپے دیے۔ تیس روپے ہر مہینے کی فیس ہوگی۔ ساٹھ روپے پریکٹیکل کے دیے۔ دس روپے کی اس کی لکھی ایک کتاب خریدی۔''

''تم کچھ نہیں کر سکتے؟''

''کیا کر سکتا ہوں؟ اگر اسکول سے نام کٹوا دوں تب بھی روپے ڈوب جائیں گے۔''

''ہمیشہ تنگی رہتی ہے،'' میں نے اداس ہو کر کہا۔

''اسی لیے میں نے طے کیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ محنت کر کے میں اپنی حالت سدھار لوں۔''

حالت سدھارنے کے لیے زیادہ سے زیادہ محنت کرنے کے حل پر مجھے یقین نہیں تھا۔ کدال

چلانے والا مزدور دن رات کدال چلا کر بھی اپنی حالت سدھار نہیں سکتا تھا۔ سمپت کے خیال سے میں متفق نہیں ہو پاتا تھا۔ دراصل بازار میں محنت کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ آدمی کی زیادہ سے زیادہ آمدنی اور کم سے کم آمدنی میں بھیانک فرق تھا۔ اس کو دیکھ کر دہشت ہوتی تھی۔ تھکے ہارے قدم آگے بڑھانے کی کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ ایک قدم آگے بڑھانے سے سیدھے جان جانے کا ڈر تھا۔ اس فرق کے بیچ طرح طرح کی قلعہ بندی کی گئی تھی۔ اس وجہ سے لوگ غریبوں سے اچھا برتاؤ کرنے سے بھی کتراتے تھے۔ ان سے کہا جائے کہ امیر چور ہیں تو غریب ہنسنے لگیں گے۔ کہیں گے، ہمارے پاس کیا رکھا ہے! جومٹی کا گھڑا پہلے تھا، اب بھی ہے۔ بلکہ ہم ہی چور ہیں، ان کی چیزوں پر نیت لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا وہ چور ہوتے ہیں۔ جن کے پاس سب کچھ ہوتا ہے، وہ رحمدل ہو کر بھیک دیتے ہیں، کام دیتے ہیں، اور بخشش دیتے ہیں۔

ان سے کہا جائے کہ تم نے رئیسوں کو بہت معاف کیا ہے تو وہ کہیں گے، معاف کرنے کا کام ان لوگوں کا ہے۔

جس روشنی کی جھلک پھٹے ہوئے گول چھید سے، سورج اور چاند جان کر وہ دیکھتے ہیں، ان سے کہا جائے کہ سورج اور چاند کی کھڑکی سے کود کر چور کی طرح وہاں جانے کی بات سوچنے کے بجائے اگر پورے آسمان کو پھاڑ دیا جائے تو پورے آسمان جتنا بڑا سورج ہوگا اور چاند ہوگا۔ یہ بات سوچی جائے تو وہ کہیں گے، سورج کبھی ہمارے لیے روزی کا دن بھی لے آتا ہے اور چاند کبھی کبھی نیند کی رات۔ کچھ الٹا سیدھا ہو گیا تو ہم ملنے والا کام کا دن اور نیند کی رات بھی کھو بیٹھیں گے۔

سمپت کے ساتھ شام کو میں اس کے ریڈیو اسکول گیا۔ بہت ساری چھوٹی چھوٹی دکانوں کے بیچ سے اس کا راستہ تھا۔ موچی لائن سے زمین پر بیٹھے تھے۔ ایک جگہ چپل جوتوں کے ساتھ ایک عورت اپنے بچے کے ساتھ بیٹھی تھی۔ پھر کپڑوں کی ڈھیریوں کی دکانیں تھیں۔ ان کے بیچ سے درزیوں کی قطار تھی۔ ایک پرانی چال کے برآمدے میں لائن سے درزی بیٹھے تھے۔ دو درزیوں کی مشین کے بیچ سے ایک آدمی کے گزرنے لائق جگہ تھی، جس کے پیچھے "اگروال ریڈیو اسکول" لکھا تھا۔ دروازہ ادھ کھلا تھا۔ پورا دروازہ کھل نہیں سکتا تھا۔ پورا کھولنے سے اس درزی کو اڑچن ہوتی جس کا اوپری ہونٹ کٹا ہوا تھا۔ دروازے کے سامنے کا برآمدہ اسکول کے حصے میں تھا۔ اسکول کے مالک نے اس جگہ کرائے پر تین درزیوں کو بٹھا

Scanned with CamScanner

رکھا تھا۔ جب ہم دونوں دروازہ کھول کر اندر گھسنے لگے تو ہونٹ کٹے درزی نے سر اٹھا کر ناک ہی ناک میں ''ہوں ہوں'' کہا۔ ہونٹ کٹا ہونے سے دو دانت مسوڑے کی جڑ تک دکھائی دیتے تھے۔

ایک بڑا کمرہ تھا، جس کی چھت بہت نیچی تھی۔ چھت سے چپکے ہوئے پنکھے لگے تھے، پھر بھی اگر بھولے سے ہاتھ اٹھ جاتا تو پنکھے سے جا ٹکراتا۔ دس بارہ لوگوں کے لائق بیٹھنے کی جگہ تھی۔ سامنے چوڑی ٹیبلوں پر، کیڑے مکوڑوں کی سی لمبی ٹانگوں والے پرانے فالتو پرزے ٹین کے ڈبے میں جگہ جگہ رکھے تھے۔ ایک کونے میں ٹوٹے ریڈیوؤں کا ڈھیر تھا۔ رال کے جلنے کی بو آ رہی تھی۔ دیوار پر قطار میں پانچ بلب جل رہے تھے جن کے نیچے بیٹھے پانچ لوگ بجلی کی سلاخ کے پرزوں کو جوڑنے کا کام سیکھ رہے تھے۔ دیوار میں ایک کالا بورڈ تھا جس میں سرکٹ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ مجھے تعجب ہوا، ماسٹر جی بھی وہاں کام سیکھ رہے ہیں۔ ان کی پیٹھ میری طرف تھی۔ پچاس سال کی عمر میں انھیں یہ سب کرتے دیکھ میں نے سوچا، آنے والی بچی ہوئی زندگی کے لیے ان میں بہت ہمت ہے۔ دو بیوپاریوں کے لڑکے بیٹھے تھے۔ باقی ایسے ہی لوگ تھے۔ ان دو لڑکوں کو اسکول کا مالک اپنے پاس بٹھا کر بہت لگن سے پڑھا رہا تھا۔ اس کے پاس مٹھائی کا ڈبا رکھا تھا۔ سمپت سے میں نے کہا، ''اب تم پڑھو، میں جاتا ہوں۔''

باہر نکلتے وقت میں نے دروازہ کھولا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ دروازہ کھولنے کے لیے کتنا زور کا دھکا دینا چاہیے، دروازہ بھڑاک سے ہونٹ کٹے درزی کی سلائی مشین سے ٹکرایا۔ درزی اسٹول سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آنکھیں تریر کر غصے سے ناک ہی ناک میں اس نے ''ہوں ہوں'' کہا۔

''مجھ سے غلطی ہوئی، معلوم نہیں تھا۔'' کہتا ہوا میں نکل گیا۔ جوتے چپلوں کی دکانوں کی قطار سے نکلنے لگا تو میں نے دیکھا ایک لڑکا مجھے اشارے سے بلا رہا تھا، میری ہی عمر کا ہو گا یا مجھ سے ایک دو سال چھوٹا ہو۔

''کہیے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''آپ ریڈیو اسکول میں بھرتی ہو رہے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، میرا دوست سمپت بھرتی ہوا ہے۔ ابھی میرے پاس روپے نہیں ہیں۔ جب ہو جائیں گے تو میں بھی بھرتی ہو جاؤں گا۔''

''میں ہر نئے آدمی کو ٹوکتا رہتا ہوں۔ اسکول والے نے میرے ساتھ بے ایمانی کی ہے۔ میں

نے آپ کے دوست سمپت کو بھی ٹوکا ہوگا۔ کیا وہ سات آٹھ دن پہلے بھرتی ہوا تھا؟ چیچک کے داغ والا لڑکا؟''

''ہاں، وہی سمپت ہے۔''

''میں نے اسے بھی بتایا تھا۔ پر اسے میری بات سمجھ میں نہیں آئی۔''

''آپ کے ساتھ کیا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تین مہینے میں ریڈیو بنانا سیکھ جاؤں گا، یہ سوچ کر میں بھرتی ہوا تھا۔ آٹھ مہینے ہو گئے، ابھی تک مجھ میں وہ خود اعتمادی نہیں آئی کہ کسی کے بگڑے ریڈیو کو سدھار دوں۔ گھر کے بگڑے ریڈیو کو چھونے کی ہمت نہیں ہوتی کہ اور خراب ہو جائے گا۔ ایک گاؤں کا ماسٹر ہے، سال بھر سے زیادہ ہو گیا۔ ایک ایک گھنٹے کی یہاں پڑھائی ہوتی ہے۔ ایک گھنٹے بعد دوسرے لوگوں کا وقت آ جائے گا۔ صبح آٹھ بجے سے لے کر رات کے نو بجے تک یہاں پڑھائی ہوتی ہے۔ وہ پڑھاتا کیا ہے؟ تھوڑا سا بتا کر خود دیکھنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ کہیں چلا جائے گا، گھوم پھر کر آئے گا، تب کچھ اور بتا دے گا۔ اس کا ایک اور ساتھی ہے۔ وہ سامانوں کی دیکھ بھال کرتا ہے اور جو اس کی خوشامد کرتا ہے اسے تھوڑا بہت بتا دیتا ہے۔ یہاں سے سیکھ کر کوئی نہیں جاتا، سب چھوڑ کر جاتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ دکان کے اندر چلا گیا۔ وہ وہاں نوکر ہوگا۔

زندگی میں کچھ کرنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ ایسے لوگ بہت آسانی سے بے وقوف بنتے تھے۔ میں سمپت سے پوچھوں گا کہ اگر وہ کچھ سیکھ نہ پایا تو اپنی صورت حال کا تجزیہ کس طرح کرے گا۔

❁

غریب ایک سطح کے ہوتے ہوئے بھی ایک جیسے اکٹھے نہیں ہوتے
جیسے پچاس آدمیوں کو کاٹ کر پچاس آدمی بنا دینا۔
اگر پچاس ہیں تو اس کا مطلب صرف پچاس، ایک اور
پھر گنتی گنو اکیاون۔

Scanned with CamScanner

تعجب تھا کہ صاحب کو ایک نوکر کی ضرورت تھی۔ نوکر کی انھیں کمی نہیں تھی، پر بغیر کمی کے بھی ضرورت ہوتی رہتی تھی۔ جیسے بائی صاحب کے پاس پچاس ساڑھیاں ہیں، تو اس کا مطلب ہے کہ ان کے پاس پچپن ساڑھیاں نہیں ہیں۔ نمبر سے ضرورت کا حساب پورا نہیں ہوتا۔ نمبر سے ضرورت کا حساب کم پڑتا ہے۔ ایک اچھی چیز بھی جو ہوتی ہے وہ کسی ایک سے بڑھ کر ہوتی ہے اور ایک سے بڑھ کر ایک چیزیں ختم نہیں ہوتیں۔ نوکر اچھا ہو تو قیمتی ہو جاتا تھا۔ دوسروں کو رشک ہوتا تھا کہ وہ میرا نوکر نہیں ہے۔ اچھے نوکر کو صاحب لوگ بدلی ہو جانے پر اپنے ساتھ لے جانا پسند کرتے، پر اجنبی جگہ جا کر یا تو وہ بگڑ جاتے تھے یا بھاگ کر اپنی جگہ چلے جاتے۔ صاحب ایک بار گرمیوں میں نوکر کو نینی تال لے کر گئے۔ ہفتے بھر میں وہ پہاڑ جھیل سے گھبرا گیا اور کسی طرح بھاگ کر اپنے گھر آ گیا۔

یہ عام رواج تھا کہ بڑا آدمی اپنے اور دوسروں کے بیچ ایک سمجھ دار نوکر ضرور رکھے گا۔ بڑے آدمیوں کے محتاج رشتے داروں کے بیچ میں نوکر اہم تھے، جیسے ڈاکٹر کی بیوہ بہن اور ڈاکٹر کے بیچ چوکیدار اہم تھا۔ جب اسے کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو نوکر کے ذریعے بھی ڈاکٹرنی سے کہلانے کی اس کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ ڈاکٹر سے جو کچھ کہنا ہوتا تو وہ چوکیدار سے کہتی۔ چوکیدار بھول جاتا تو وہ اسے پھر یاد دلاتی۔ کبھی چوکیدار منع کر دیتا کہ صاحب غصے ہوں گے۔ جب ڈاکٹر کی بیوہ بہن کو روپے کی ضرورت ہوتی تو چوکیدار ڈاکٹر سے کہنے کے لیے ضرور منع کر دیتا تھا۔ تب وہ چوکیدار کی خوشامد کرتی پھرتی۔ آخر چوکیدار جا کر ڈاکٹر سے کہتا۔ جب بیس روپے کی ضرورت ہوتی تو کٹ کر پانچ روپے ہی ملتے۔ اس طرح بڑے لوگ محتاج رشتے داروں کے بیچ کبھی برے نہیں بنتے اور جھنجھٹ کو بیچ میں ہی نوکروں سے ختم کروا دیتے۔ مہربانی گھوم پھر کر دوہری ہوتی تھی، ایک یہ کہ جس پر صاحب مہربان ہوتے، ان کا نوکر بھی اس پر مہربان ہوتا۔ اور جس پر نوکر مہربان ہوتا، اس پر صاحب بھی مہربان ہوتے۔

صاحب کے گھر کے لیے مال جمعدار چھانٹ کر تین چپراسی بھیجتا تھا۔ بنگلے کے احاطے میں ساگ سبزی بوئی جاتی۔ پپیتے اور کیلے کے جھاڑ تھے۔ پچیس تیس مرغیاں تھیں۔ دو مُرا بھینسیں تھیں۔ ایک جرسی نسل کی گائے تھی۔ دودھ، ساگ، سبزی اتنی ہوتی تھی کہ چپراسی گھر گھر جا کر بیچتے تھے۔ پھر بھی صاحب کو ایک صاف ستھرے نوکر کی ضرورت تھی۔

ایک اچھا نوکر خاندان میں نوکر کی طرح شامل رہتا تھا۔ جیسے، خاندان میں کون ہے؟ تو، میاں

Scanned with CamScanner

بیوی، دولڑکے، ایک لڑکی اور ایک نوکر۔ یہ آئیڈیل خاندان تھا۔ صاحب کے بچے نہیں تھے اور ایک اچھا نوکر بھی نہیں تھا۔ دونوں کی کمی اور دونوں کا دکھ الگ الگ تھا۔

پہلے ایک لڑکا کام پر لگا تھا۔ کھلا رنگ ہونے کی وجہ سے صاف ستھرا اور بھلا لگتا تھا۔ جب وہ کام پر آیا تو کتھئی رنگ کی گندی پینٹ اور کسی لمبے چوڑے آدمی کی چھینٹ والی پھٹی بش شرٹ پہنے تھا۔ بش شرٹ اتنی لمبی تھی کہ اس کی پینٹ دکھائی نہیں دیتی تھی اور ایکبارگی دھوکا ہوتا تھا کہ وہ ننگا ہے۔ صاحب نے اس کے لیے موٹے سفید کپڑے کی ایک قمیض سلوادی۔

دوسرے دن قمیض گندی ہونے پر اسے بہت ڈانٹ پڑی۔ صاحب نے اسے فوراً نہانے اور قمیض دھونے کے لیے کہا۔ وہ کپڑے دھونے کا بوٹ چھاپ صابن لے کر بنگلے کے سامنے میونسپلٹی کے نل پر گیا۔ ایک پھٹا ہوا انگوچھا پہن کر پہلے اس نے قمیض اور پینٹ کو دھویا، پھر سوکھنے کے لیے انھیں نل سے تھوڑی دور زمین پر پھیلا دیا۔ اس کے بعد وہ خوب نہایا۔

وہ کچھ ہی دن میں سب کام سمجھ گیا، جس سے بائی صاحب کو آرام ملا۔ بائی صاحب اس سے خوش تھیں۔ پر قمیض تھوڑی سی بھی گندی ہونے پر اسے صاحب کی بہت ڈانٹ پڑتی تھی۔

ایک دن مالکن نے صاحب سے کہا، ”مجھے اس پر ترس آتا ہے۔ کام کرے گا تو اس کے کپڑے گندے ہوں گے ہی۔ اسے اتنا مت ڈانٹا کریے۔“

اپنی قمیض کے بارے میں وہ لاپروا نہیں تھا، پر قمیض بچا کر کام نہیں کر پاتا تھا، اس لیے بھینس گائے کا گوبر اٹھانے کے پہلے وہ قمیض اتار دیا کرتا تھا۔ اس کے باوجود قمیض گندی ہو جاتی تھی۔ صاحب کو صاف ستھرے نوکر کی سنک تھی۔ پر بائی صاحب خوش تھیں۔ ایک بار نوکر کی غلطی پر ناراض ہوئے دور کے رشتے داروں کی انھوں نے پروا نہیں کی۔ بائی صاحب جانتی تھیں کہ صاحب کا چچیرا بھائی ناراض ہو کر بھی چچیرا بھائی رہے گا، لیکن نوکر ناراض ہوا تو نوکری چھوڑ کر ان کا نوکر نہیں رہے گا۔ جہاں جہاں بائی صاحب نوکر کو ساتھ لے کر جاتیں، وہاں اس کی فکر کرتی تھیں، کہ اسے چائے ملی یا نہیں، کھانے کو کچھ ملا یا نہیں۔

بڑھیا کانچ کا گلاس اس سے گر کر ٹوٹ گیا۔ بائی صاحب نے اسے ڈانٹا۔ جلدی جلدی کانچ اٹھاتے وقت اس کی ایک انگلی کٹ گئی۔ گھبرا کر اس نے اپنی قمیض سے خون سے لت پت ہاتھ کو پونچھ لیا۔ کانچ پھینک کر جب وہ آیا تو بوند بوند خون صاف ستھرے چمکتے فرش پر ٹپکتا گیا۔ کھانا کھاتے کھاتے

Scanned with CamScanner

صاحب کی نظر اس کی قمیص پر پڑ گئی۔ صاحب نے اسے بہت ڈانٹا۔ بائی صاحب نے مٹی کے تیل میں انگلی ڈبو کر پٹی باندھ لینے کو کہا۔

دوسرے دن صبح وہ لڑکا نظر نہیں آیا۔ رات کو بھاگ گیا۔ لیکن قمیص چھوڑ گیا تھا۔ صاف ستھری دھلی ہوئی قمیص نوکر کھولی میں رکھ گیا تھا۔ قمیص گندی چھوڑ کر بھاگنے کی اس کی ہمت نہیں تھی۔ اس کا جرم اور بڑھ جاتا۔ دھلی ہوئی قمیص کو صاحب نے مہنگو سے ایک بار اور دھلوا کر رکھوا دیا۔

کچھ دنوں بعد کام کے لیے ایک لڑکا اور لگا۔ یہ لڑکا بڑی تمیز سے بات کرتا تھا۔ اچھے مہذب لوگوں کے یہاں کام کیا ہوا لگتا تھا۔ اس کے طور طریقے ٹھیک تھے۔ صاحب کے لیے اسے ایک بیوپاری ڈھونڈ کر لایا تھا۔ صاحب کی بیوی بہت خوش ہوئیں۔ انھوں نے صاحب سے کہا، ''بہت سمجھ دار نوکر ملا ہے، چاہیں تو آپ انٹرویو لے لیجیے۔''

صاحب نے کہا، ''انٹرویو لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ نوکروں سے پوچھنا کم چاہیے، بتانا زیادہ چاہیے۔ بتانے کے بعد پوچھ تاچھ ہونی چاہیے کہ جو بتایا گیا تھا، وہ ٹھیک سے پورا ہوا یا نہیں۔ لیکن مجھے نہیں لگتا کہ اسے نوکر کی قمیص فٹ ہوگی۔ اگر اسے قمیص فٹ نہیں ہوئی تو میں اسے نوکر نہیں رکھوں گا۔ اس کے پاس بھی بے ڈھنگے کپڑے ہیں۔ سب کے ناپ کی قمیص تو بنے گی نہیں۔ ایک اچھے نوکر کے ناپ کی قمیص بنوائی گئی ہے۔ اس میں دوسروں کو فٹ ہونا ہوگا۔ معلوم نہیں کس آدمی کا کپڑا پہنا ہوا ہے۔'' صاحب مسکرا رہے تھے۔

''اس کا کپڑا اچھا ہے۔ کسی اچھے آدمی کی قمیص ہے،'' صاحب کی بیوی نے کہا۔

''میں اپنی قمیص نوکر کو کبھی دینا نہیں چاہوں گا۔ جو میں پہنتا ہوں اسے نوکر پہنے، یہ مجھے پسند نہیں ہے۔ میں گھر کا بچا کھچا کھانا بھی نوکروں کو دینے کا حامی نہیں ہوں۔ جو سواد ہمیں معلوم ہے، ان کو کبھی نہیں معلوم ہونا چاہیے۔ اگر یہ ہوا تو ان میں بے اطمینانی پھیلے گی۔ بعد میں ہم لوگوں کی تکلیفیں بڑھ جائیں گی۔ کھانا ان کو ویسا ہی دو جیسا وہ کھاتے ہیں۔ جیسا ہم کھاتے ہیں ویسا بچا ہوا بھی مت دو۔ یہ پیٹ بھرتے ہیں، چاہے آدھا یا چوتھائی۔ سواد سے ان کو کوئی مطلب نہیں۔ سڑک کے کنارے چاٹ کھانے والے چاٹ کھا کر جو پھینکتے ہیں، یہ مجھے غصہ دلاتا ہے۔ اسی طرح آوارہ غریب لڑکے پتے چاٹ کر جادوئی سواد کا پتا لگا لیتے ہیں، جس سے چوری، غنڈا گردی اور حق مانگنے والی جھنجھٹیں بڑھتی ہیں۔

سواد،ہم لوگوں کو تسکین نہیں دے سکا تو ان کو کیا دے گا؟ اگر یہ سواد کے چکر میں پڑ گئے تو اپنی جان بچانی مشکل ہو گی۔''

''ایسا کوئی نہیں کرتا۔''

''تم نوکروں کو سر چڑھاتی ہو۔''

''اسے قمیض پہنا کر دیکھیں گے۔''

''ضرور دیکھیں گے۔''

''جانے دیجیے۔ مجھے اندازہ ہے، قمیض اسے بڑی ہو گی۔''

''بڑی ہو گی تو اسے مت رکھو۔ دفع کرو۔'' صاحب مسکرانے لگے۔

''آپ بھی کمال کرتے ہیں۔'' بائی صاحب بھی مسکرانے لگیں۔

''مہنگو! مہنگو!'' صاحب نے آواز دی۔

''جی صاحب۔'' مہنگو فوراً کہیں سے نکل کر سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''نوکر کی قمیض لے کر آؤ۔''

مہنگو قمیض لے کر آیا۔

''اس کو پہنا کر دیکھو،'' صاحب نے کہا۔

مہنگو لڑکے کو ہٹا کر آڑ میں لے گیا۔ لڑکے کو قمیض بڑی تھی۔

''میں نے کہا تھا کہ لڑکے کو قمیض بڑی ہو گی،'' لڑکے کو دیکھتے ہوئے بائی صاحب نے کہا۔ کچھ سوچ کر وہ ہنسنے لگیں۔ صاحب بھی ہنسنے لگے۔ مہنگو ویسے ہی رہا۔ لڑکا شرما گیا۔

''اچھا کھانا کھائے گا تو ماس چڑھ جائے گا،'' بائی صاحب نے کہا۔

''تم پھر غلط بولیں۔ اچھا کھانا نہیں، پیٹ بھر کھانا بولو۔''

کچھ دنوں صاحب نے پوچھا، ''کیسا ہے یہ نوکر؟''

''آپ نے ٹھیک کہا تھا۔ لگتا ہے قمیض اس کے فٹ نہیں آئی۔ کام سمجھتا ہے، پر گم سم رہتا ہے۔ شام کو سات بجے ہی گھر کے کسی کونے میں کھڑے کھڑے سو جاتا ہے۔ ایک بار میں بستر پر لیٹی تھی۔ میں

نے آواز لگائی۔ کئی بار آواز لگانے کے بعد میری نظر کمرے کے کونے میں گئی تو دیکھا، وہ کھڑے کھڑے سو رہا ہے۔ میں ڈر گئی۔ آپ دورے پر گئے ہوئے تھے۔ مہنگو اسے نوکر کی کھولی میں لے گیا۔ وہ بہت گہری نیند میں تھا۔ جب بھی اسے بلاؤ، وہ کونے سے ہی نکل کر آئے گا۔ کام ختم کرتا ہے اور ستانے کے لیے کونے میں جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔''

''لڑکے، لڑکے! ادھر آؤ،'' صاحب نے چلاّ کر کہا۔

صاحب ایک بار اور چلاّنا چاہتے تھے کہ انھوں نے دیکھا کہ لکڑی کی الماری کے پاس والا کونا ہلا۔ پھر کونا انھیں سرکتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ آ رہا تھا۔ صاحب ہکا بکا ہو گئے۔

''تم تو جادوئی لڑکے ہو۔ تمھاری بڑی خطرناک عادت ہے۔ کسی گول کمرے میں جس میں ایک کونا نہ ہو، تم کو بند کر دیا جائے تو معلوم نہیں کیسے آرام کرو گے، کیسے سوؤ گے؟ تمھاری عادت سدھارنے کے لیے بغیر کونوں والا مکان تو نہیں بنایا جا سکتا۔ جو قمیض بنائی گئی ہے وہ بہت ہے۔ ادب سے بات کرتے تھے، اس لیے اچھے لگتے تھے۔ جب کام نہ ہو تو سامنے کے پیڑ کے نیچے کھڑے ہو جاؤ، کہیں برآمدے میں بیٹھ جاؤ۔ کونے سے نکل کر آنے کا کیا مطلب ہوتا ہے؟''

''کسی جانور کی طرح کونے سے نکلتا ہے،'' بائی صاحب نے کہا۔

''نکلو یہاں سے، اب تمھاری ضرورت نہیں ہے،'' صاحب نے ڈپٹ کر کہا۔

لڑکا پہلے ہکا بکا کھڑا تھا، پھر سسکی لے کر رونے لگا۔ مہنگو اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گیا۔ ہاتھ پکڑے پکڑے وہ چوراہے تک گیا۔ وہاں اسے چھوڑ کر وہ واپس آیا۔ لڑکا مہنگو سے کا[illegible] تھا۔ مہنگو کو بھیا کہتا تھا۔ مہنگو بھی اس کا خیال رکھتا تھا۔

دفتر میں بابوؤں کے بیچ صاحب کے نوکر کو ڈھونڈنے کی دوڑ تھی — اس نوکر کو، جسے کوئی نہیں جانتا تھا، پر وہ کہیں تھا ضرور۔

''نوکر بھی اچھے ہوتے ہیں۔ اگر بدمعاش ہوئے تو ہماری غلطی ہے۔ لیکن صاحب نے نوکر کے لیے ایک قمیض بنوا کر رکھی ہے۔ جسے قمیض فٹ ہوا ایسا نوکر ڈھونڈنا ہے،'' بڑے بابو نے کہا۔

''بابو، اپنے دفتر میں قمیض کسی کو فٹ ہوتی ہے؟'' دیوانگن بابو نے پوچھا۔

بڑے بابو نے کہا، ''دیکھو، جس کو کہوں گا کہ فٹ ہوتی ہے وہی ناراض ہو جائے گا۔ اگر ہم لوگ

ایماندار ہیں تو چاہے میں موٹا ہوں یا دیوانگن بابو دبلے ہوں، قمیض اس کو فٹ ہوگی۔ بہت دنوں سے قمیض بے کار پڑی ہے۔ صاحب کی مذاق کرنے کی عادت ہے۔ کہیں گے، بڑے بابو، تم کو چھیل چھال کر دیکھیں تو قمیض تمھارے لائق ہے۔''

''کیسی قمیض ہے، میں نے تو نہیں دیکھی۔ آپ لوگوں نے دیکھی ہے؟''

''میں تو روز دیکھتا ہوں،'' بڑے بابو نے کہا۔

''میں نے ابھی حال میں نوکروں میں سے کسی کو سفید قمیض پہنے دیکھا ہے۔ شاید وہی قمیض ہو،'' دیوانگن بابو نے کہا۔

''گوراہا بابو، آپ کے پاس بھی سفید قمیض ہے۔ کہیں صاحب کے یہاں دیوانگن بابو نے آپ کو تو نہیں دیکھا؟'' بڑے بابو نے کہا۔

''دیوانگن بابو مجھ کو پہچانتے ہیں،'' گوراہا بابو نے کہا۔

''دور سے پہچان نہ پائے ہوں؟'' بڑے بابو نے کہا۔

''مجھے لگا ضرور تھا کہ گوراہا بابو ہیں، پر اس کا برتاؤ چپراسیوں سے بھی گیا گزرا تھا،'' دیوانگن بابو نے کہا۔

''کیا کر رہا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''لان کی گھاس چھیل رہا تھا،'' دیوانگن بابو بولے۔

''ہو سکتا ہے، ہو سکتا ہے،'' بڑے بابو بولے۔

''آپ لوگ بھونڈی بات کر رہے ہیں،'' گوراہا بابو نے کہا۔

''کون اس قمیض کو پہننا چاہتا ہے؟'' بڑے بابو نے پوچھا۔ ''اب کوئی نہیں بولے گا۔ سب لوگ کام میں لگ گئے۔ کسی کو زبردستی نہیں پہنائی جائے گی،'' انھوں نے کہا۔

''ہاں، کوئی کسی کو زبردستی پہنا کر نہیں دیکھ سکتا،'' میں نے کہا۔

''جلدی بتایئے،'' بڑے بابو بولے۔

سب چپ چاپ تھے۔ میں بھی چپ چاپ اپنے کام میں لگا رہا۔ دل میں تھوڑی دھکدھکی تھی کہ بڑے بابو یہ نہ کہیں، ''سنتو بابو، میں جانتا ہوں تم ایک اچھے لڑکے ہو، اچھے خاندان کے۔ میرے کہنے سے

تم ایک بار قمیض پہن کر دیکھ لو۔ کام تم ایمانداری سے کرتے ہو۔ صاحب تم سے خوش بھی ہیں۔"

بڑے بابو نے کہا، "دیوانگن بابو، تم پہن کر دیکھ لو۔ تم مجھے سب سے باہمت دکھائی دیتے ہو۔ سب کو بتلا دو کہ صاحب کی قمیض پہننے سے کوئی صاحب نہیں ہو جاتا۔ نوکر کی قمیض پہننے سے بھی کچھ نہیں ہوگا۔ اور ایک سمجھدار آدمی کو دقیانوسی اور اندھے اعتقاد والا نہیں ہونا چاہیے۔"

دیوانگن بابو مسکراتے ہوئے بولے، "بڑے بابو، میں آپ کی بات مانتا ہوں۔ آپ مجھے تین سال سے دیکھ رہے ہیں۔ میں ہمیشہ بش شرٹ پہنتا ہوں۔ کسی دن آپ نے مجھے قمیض پہنے دیکھا ہے؟"

"ہاں، آپ ہمیشہ بش شرٹ پہنتے ہیں،" بڑے بابو نے کہا۔

میں بھی بش شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ میں خوش ہوا۔ تب دیوانگن بابو اچانک سنجیدگی سے کہنے لگے، "بڑے بابو، قمیض کی جھنجھٹ ہی ختم ہونی چاہیے۔ آپ موٹے ہیں، آپ قمیض پہنیے۔ آپ کو فٹ ہوگی نہیں۔ پہننے کی بھرپور کوشش میں پکی بات ہے کہ قمیض تھوڑی بہت پھٹ جائے گی۔ باقی آپ زبردستی پھاڑ دیجیے گا۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا کہ آپ نے زبردستی قمیض پھاڑی ہے۔"

"تم میری نوکری کو خطرے میں ڈالنا چاہتے ہو؟ صاحب کی خوشامد ایسی ہونی چاہیے کہ پتا نہ چلے کہ خوشامد کر رہے ہیں، تب تو کمال ہے۔ ظاہری خوشامد بہت سے صاحب لوگوں کو غصہ دلا دیتی ہے۔ ارے! میں موٹا آدمی کسی نوکر لڑکے کی قمیض پہنوں گا تو یہ ننگ دھڑنگ دکھنے والی خوشامد ہوگی، ساتھ میں بدتمیزی بھی ہو جائے گی۔ بیس سال کی میری نوکری ہو گئی۔ نوکری نے مجھے کافی عقل دی ہے، اس لیے ٹھسے سے اپنی قمیض ہی پہنتا ہوں۔"

"آپ کی انھی حرکتوں سے صاحب آپ کو اچھی طرح پہچان گئے ہیں۔ مجھ کو دوش مت دینا۔ کسی دن پھنس جائیں گے۔ سیدھے سیدھے گورا بابو کو کیوں پھنساتے ہیں؟ کیا آپ صاحب کے گھر نہیں جاتے؟ صاحب کے بنگلے پر جانے کے لیے بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اتنا بڑا بنگلہ اور اتنا بڑا دفتر۔ کچھ نہ کچھ کام لگا رہتا ہے۔ آپ ہی جا کر قمیض چرا لائیے۔ میرا خیال ہے، مہنگو سے کرید کرید کر آپ بنگلے کی اندرونی خبریں لیتے ہیں۔"

"مہنگو تو خود گہرائی تک کھدا ہوا کوڑے کا گڈھا ہے۔ اب وہ اس حالت میں پہنچ گیا ہے کہ مرنے ہی والا ہے۔ صاحب لوگوں کی برسوں کی گندگی اس میں سڑ رہی ہے۔ وہ زیادہ دن نہیں جیے گا۔

پورا ابھرا کہ پورا مرا۔"

"کیسے نہیں جیے گا بھئی! اس غریب کو کیوں کوستے ہو؟ اس کی لمبی عمر ہے۔ نام لیتے ہی آ رہا ہے،" گورا بابابو نے کہا۔

"گورا بابابو، اس کو بلانا تو،" بڑے بابو بولے۔

"آپ ہی کی طرف آ رہا ہے۔ بنگلے سے صاحب کی کوئی خبر لایا ہوگا،" دیوانگن بابو نے کہا۔

کمرے میں گھستے ہی مہنگو نے سب سے پہلے بڑے بابو، پھر باری باری سے سب کو "رام رام صاحب! رام رام صاحب" کہا۔

بڑے بابو کو مہنگو نے ایک کاغذ پکڑا دیا۔ صاحب ہمیشہ پیلے رنگ کا کاغذ اپنے لیے استعمال کرتے تھے اور دستخط ہری سیاہی سے کرتے تھے۔ بہت چھوٹا دستخط۔ دوسروں کو پیلے کاغذ اور ہری سیاہی کے استعمال کی مناہی تھی۔

مہنگو بڑے بابو کے کان میں دھیرے سے پھسپھسایا۔

جواب میں بڑے بابو نے کہا،" شام کو لے کر آؤں گا۔"

مہنگو سر ہلا کر چلا گیا۔ مہنگو کی خاکی ٹوپی جب نیچے کھسکتی تھی تو بائیں طرف، بائیں آنکھ کے بالکل قریب آ کر ٹھہر جاتی تھی۔ اس کے داہنے کان میں پانچ پیسے، دس پیسے یا پچیس پیسے کا سکہ اس طرح کھنسا رہتا تھا کہ گرتا نہیں تھا اور داہنے کان کے اوپر ماچس کی دو چار تیلیاں اور بیڑی کھنسی رہتیں۔

"صاحب نے ہر حالت میں آج نوکر ڈھونڈ کر لانے کو کہا ہے۔ ایک بات ہے، صاحب مذاق کرتے ہیں تو لگتا ہے غصہ ہیں، غصہ کرتے ہیں تو لگتا ہے مذاق کر رہے ہیں،" بڑے بابو نے کہا۔

"مہنگو امر ہے،" دیوانگن بابو نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"جب وہ پیدا ہوا تھا، تب اس زمانے میں مہنگائی رہی ہوگی، اس لیے اس کا نام مہنگو پڑا۔ مہنگائی کبھی ختم نہیں ہوگی، اس لیے مرتے وقت بھی وہ ایسا لگے گا جیسے ابھی ابھی پیدا ہوا ہے،" دیوانگن بابو نے کہا۔

"مہنگائی ضرور ختم ہوگی۔ مہنگو بھی مرے گا،" میں نے کہا۔

"مہنگو مرے گا پر مہنگو کی جگہ کبھی نہیں مرے گی،" گورا بابابو بولے۔

''مہنگو کی خالی جگہ پر ڈکالو آئے گا، وہی دکالو، جب وہ پیدا ہوا تھا تب ڈکال[۶] تھا، اس لیے ماں باپ نے پیار سے نہیں، تکلیف سے اس کا نام دکالو رکھا۔''

دفتر کے بالکل پاس ایک کینٹین تھی۔ قریب ایک بجے کینٹین کا لڑکا باقاعدگی سے چائے لے کر آتا تھا۔ کینٹین کے لڑکے کی شکل گھن والی تھی۔ میل کی پرت اس کے چہرے پر صاف معلوم ہوتی تھی۔ اس کی پینٹ پیچھے سے ہمیشہ پانی سے گیلی رہتی تھی۔ جب وہ خالی کپ پلیٹ لے کر جانے لگا تو بڑے بابو نے ذرا رعب سے پوچھا، ''کتنے روپے ملتے ہیں ہوٹل میں؟''

''دو روپے مہینہ۔ صبح، دوپہر، شام چائے ناشتہ۔ دونوں ٹائم کا کھانا،'' لڑکے نے پھٹاک سے جواب دیا۔

''ارے واہ! کھانا کب کھاتا ہے؟''

''تین بجے اور رات کو گیارہ بجے۔''

''شام کو نہا دھو کر میرے پاس آنا اور کینٹین سے چھٹی لے لینا۔ تیرے مالک سے میں بات کر لوں گا۔ ہمارے صاحب کو نوکر کی ضرورت ہے۔ وہاں کام کرے گا؟''

''کروں گا،'' اس نے خوشی سے کہا۔

''پانچ بجے آنا۔ جاؤ۔''

لڑکے کے جانے کے بعد میں نے کہا، ''صاحب کے گھر کے لائق یہ لڑکا رتی بھر بھی نہیں ہے۔''

''میں جانتا ہوں، لیکن مجھ کو اپنی جان بچانی ہے۔ کہنے کو تو ہوگا کہ بڑے بابو کچھ کر رہے ہیں۔''

''سنتو بابو، تم بھی ساتھ ہی چلنا۔ لڑکا تمھاری سائیکل پر بیٹھ جائے گا۔ ڈبل چلاتے مجھ سے بنے گا نہیں۔ موٹا ہوں، ہائیڈروسل، ہرنیا سب کچھ ہے۔''

''ٹھیک ہے،'' میں نے سر ہلا کر کہا۔ لیکن صاحب کے گھر جانے کی میری خواہش نہیں تھی۔ میں نے دیکھا، میرے ''ٹھیک ہے'' کہتے ہی دیوانگن بابو کا چہرہ اتر گیا تھا اور گوراہا بابو قابلِ رحم اور اداس تھے۔

پانچ بجے ہی سب لوگ جلدی جلدی دفتر چھوڑ کر چلے گئے۔ روز میں دیوانگن بابو اور گوراہا بابو کے ساتھ گپ مارتا ہوا گھر لوٹتا تھا۔ راستے میں ایک ہوٹل میں آدھا آدھا کپ چائے ہم لوگ پیتے

---

[۶] ڈکال: برا وقت، نحس وقت۔

Scanned with CamScanner

تھے۔ باری باری سے اس کے پیسے دیتے تھے۔ دونوں کب نکل گئے، مجھے پتا نہیں لگا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ دیوانگن بابو کسی وجہ سے مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔

''بڑے بابو، کینٹین کا نوکرا بھی تک آیا نہیں؟''

''آئے گا۔ مہنگو گیا ہے۔ چائے لے کر آئے گا۔ چائے پی کر چلیں گے۔''

مہنگو دن بھر دفتر اور صاحب کے بنگلے کے کئی چکر لگا لیتا تھا۔ دفتر میں یہ کہا جاتا تھا کہ مہنگو دو ہیں، ایک ہی شکل کے۔ صاحب بھی دو ہیں، ایک ہی شکل کے، یہ بھی کہا جاتا تھا۔ صاحب کی شکل کے دوسرے صاحب کے کام کے لیے مہنگو کی شکل کا دوسرا مہنگو ضروری تھا۔

کینٹین کا لڑکا میری سائیکل کے کیریر پر بیٹھ گیا۔ میں عام قد کا تھا۔ سائیکل کچھ کم اونچی تھی، اس لیے سائیکل پر بیٹھے ہونے پر بھی میرے پیر زمین پر ٹک جاتے تھے۔ بڑے بابو کو سائیکل پر چڑھنے کے لیے اونچی جگہ کی ضرورت پڑتی تھی۔ برآمدے پر سائیکل ٹکا کر وہ برآمدے سے سیٹ پر بیٹھتے تھے۔ ان کی ڈھیلی پینٹ اور پٹھے کے ڈھیلے گوشت کے باعث سائیکل کی سیٹ نظر نہیں آتی تھی۔ لگتا تھا، بڑے بابو اُدھر میں بیٹھے بیٹھے سائیکل چلا رہے ہیں۔

جاتے ہوئے، راستے میں میونسپلٹی کے نیچے ایک لڑکا نہا رہا تھا۔

''نہانے والے لڑکے کو قمیض فٹ ہو جائے گی؛'' میں نے کہا۔

''ہو تو جائے گی،'' انھوں نے کہا۔

تھوڑی دور پر شیشم کے پیڑ کے نیچے آٹھ دس لڑکے کھیلتے دکھائی دیے۔ ان کی طرف اشارہ کر کے میں نے کہا،''ان سب کو بھی قمیض فٹ ہو جائے گی۔''

''ہاں!'' بڑے بابو نے کہا۔

مڈل اسکول کے بہت سے لڑکے اسکول سے گھر لوٹتے ہوئے نظر آئے۔ ان کی چھٹی ہو گئی تھی۔

''آہ! بہت سے لڑکے ہیں۔''

''تو صاحب کو ابھی تک نوکر کیوں نہیں ملا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نوکر ڈھونڈنے کا ہی کام تو نہیں کرتا، نوکری کرنے کا کام بھی کرتا ہوں۔ اچھا ہوا صاحب نے نوکرانی کے لیے ساڑھی بلاوز نہیں بنوائے۔''

Scanned with CamScanner

''بڑے بابو!'' اچانک، سائیکل دھیرے کرتے ہوے میں نے کہا،''صاحب کے پاس جانے کو میرا دل نہیں چاہ رہا ہے۔ یہاں سے صاحب کا گھر پاس ہوگا، آپ چلے جائیے۔''

''ارے ارے! یہ کیا کرتے ہو؟ تم تو چھٹی کروادو گے۔'' بڑے بابو گھبرا گئے۔ میں بھی اتر کر سڑک کے کنارے کھڑا ہوا گیا۔ لڑکا مجھ سے پہلے اتر گیا تھا۔

''دس منٹ کا کام ہے،'' بڑے بابو نے کہا۔

''دفتر سے میں سیدھے گھر جاتا ہوں۔ گھر پہنچنے میں دیر ہو رہی ہے۔''

''دفتر میں کیا کام نہیں رہتا؟ چھ ساڑھے چھ نہیں بجتے؟''

''بڑے بابو، میں تو جاؤں گا،'' میں نے فیصلہ کرتے ہوے کہا۔

''کیسے جاؤ گے؟'' میری سائیکل کا ہینڈل انھوں نے ایک ہاتھ سے پکڑ لیا تھا۔

''مجھے گھر میں کام ہے۔ جانے دیجیے،'' سائیکل اپنی طرف کھینچتے ہوے میں نے کہا۔

بڑے بابو مضبوطی سے میری سائیکل پکڑے ہوے تھے۔

''سچ سچ بتلائیے، کہیں آپ مجھے تو قمیض پہنانے نہیں جا رہے ہیں؟''

''قمیض سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ صاحب کی مذاق کرنے کی عادت ہے۔ اور تمھارا دماغ خراب ہے، اگر تم کو قمیض پہنانی ہوتی تو ہوٹل والے لڑکے کو کیوں لے جاتا؟ تم اطمینان سے رہو، سب میری ذمے داری ہے۔ اب تو تم لوٹ کر بھی نہیں جا سکتے۔ وہ دیکھو، صاحب برآمدے میں کھڑے ہیں۔ شاید ہم دونوں کو انھوں نے بہت دیر سے دیکھ لیا ہے۔''

کینٹین والا لڑکا کچھ گھبرایا سا لگ رہا تھا۔

''تیری جان کیوں سوکھ رہی ہے؟'' بڑے بابو نے کہا۔

''سائیکل سے ہی چلیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، اب پیدل چلو۔ اگر صاحب نے نہ دیکھا ہوتا تو سائیکل سے جاتے۔ راستے میں سائیکل سے اترنا مجھ کو بہت اکھرتا ہے۔ کوئی اونچی جگہ بھی آس پاس نہیں ہے۔ آس پاس سب بنگلے ہیں۔ سب کے احاطے ہیں۔ احاطے سے ہوتے ہوے کسی کے بنگلے اس لیے جانا ہوگا کہ بنگلے کے برآمدے سے سائیکل چڑھنی ہے اور کسی سے کوئی کام نہیں ہے۔ گیٹ پر کوئی پوچھے گا، کس سے ملنا ہے؟

تو جواب دوں گا، کسی سے نہیں ملنا، میں یہاں سائیکل پر چڑھنے آیا ہوں۔ یا بنگلے کے مالک سے اجازت لینی ہوگی، مہربانی کر کے مجھے اپنے برآمدے سے سائیکل پر چڑھنے دیجیے۔ میں بہت مجبور ہوں۔ اگر آپ منع کر دیں گے تو مجھے بازو والے بنگلے میں جانا ہوگا۔ ہو سکتا ہے اگر انھوں نے اجازت دے دی تو مجھے سائیکل پر چڑھتے ہوئے دیکھنے کے لیے بنگلے کے بچے بھی جمع ہو جائیں۔ اگر اجازت نہیں ملی تو ہاتھ میں سائیکل لیے لیے پیدل واپس ہونا ہوگا۔ لیکن مجھے یقین ہے، مجھے پیدل جاتا ہوا دیکھ کر انھیں رحم آ جائے گا۔ وہ مجھے بلائیں گے — آئیے، پر روز کا معمول مت بنائیے گا۔ میں خوش ہو کر لوٹ پڑوں گا۔ برآمدے سے سائیکل پر چڑھوں گا اور پیڈل مارتا ہوا چلا جاؤں گا،" بڑے بابو نے کہا۔

میں نے کہا، "آپ کی تو ہمت ہو جاتی ہے۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو مجھے پوچھنے میں ڈر لگتا۔ سیکڑوں میل تک بنگلے ہی بنگلے ہوتے تو مجھے ان سب سے دور اپنے گھر ہاتھ میں سائیکل لیے لیے جانا پڑتا۔ نہ معلوم کتنے دنوں بعد میں گھر پہنچتا۔"

"تمھارا سجاؤ اچھا ہے۔ سیدھے سادھے آدمی ہو،" بڑے بابو نے کہا۔

جب بنگلے کے اندر گھسنے لگے تو بڑے بابو نے دھیرے سے پوچھا، "کیوں رے، ڈر تو نہیں لگ رہا ہے؟"

"مجھے کیوں ڈر لگے گا؟" میں نے جواب دیا۔ یہ جواب بڑے بابو کو کم، اپنے کو زیادہ دیا گیا تھا۔ تھوڑی گھبراہٹ تو ہو رہی تھی۔

"آپ سے نہیں، کینٹین والے لڑکے سے کہہ رہا تھا۔ آپ کیوں ڈریں گے؟ آپ بہادر آدمی ہیں۔ مجھے تو صاحب سے ڈر لگتا ہے۔ کب کس بات پر ناراض ہو جائیں، معلوم نہیں۔"

صاحب کے پاس پہنچتے پہنچتے بڑے بابو نے ان کو نمسکار کیا۔ انھوں نے مجھے نمسکار کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، اس لیے میں نے دوبارہ نمسکار کیا۔ تب انھوں نے میرے نمسکار کا جواب دیا۔ ہم دونوں نے سائیکلیں احاطے کے پاس کھڑی کر دی تھیں۔ بڑے بابو مجھ سے آگے تھے۔ سب سے پیچھے کینٹین کا لڑکا تھا۔

"آؤ، بڑے بابو، آؤ۔ میں تمھاری راہ دیکھ رہا تھا۔ مجھے ابھی جلدی جانا ہے۔ کچھ دیر پہلے آنا تھا۔ مہنگو، نوکر کی قمیض لے کر آؤ۔"

صاحب برآمدے میں کرسی پر بیٹھ گئے۔ انگریزی کا اخبار اٹھا کر دیکھنے لگے۔

میں سوچ رہا تھا مہنگو کب، کدھر سے اتنی جلدی آ گیا؟ ہم لوگوں کو راستے میں دکھائی نہیں دیا تھا۔ نوکر کی قمیض ایک سانچا تھا، جس سے آدرش نوکر کی پہچان ہوتی۔

دونوں ہاتھوں میں قمیض رکھے مہنگو اس طرح میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا جیسے مجھے ہی قمیض پہننی ہو۔ میں چونک کر تھوڑا پیچھے ہٹ گیا۔

''نہیں، مجھے نہیں، کینٹین کے لڑکے کو قمیض پہننی ہے،'' میں نے سرگوشی میں مہنگو سے کہا اور کینٹین کے لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک طرف ہٹ گیا، جس سے کینٹین کا لڑکا سامنے آ گیا اور صاحب کی نظر اس پر پڑی۔

''بڑے بابو، یہ لڑکا تو بالکل بے کار ہے۔ کسے پکڑ لائے؟'' صاحب نے ماتھے پر بل لاتے ہوئے کہا، ''تمھاری عقل بھی موٹی ہے بڑے بابو۔ یہ کیا کام کرے گا؟ مجھے قاعدے والا لڑکا چاہیے۔ بھاگو یہاں سے!'' ڈانٹ کر صاحب نے کہا۔

''بھاگو، جلدی بھاگو!'' بڑے بابو نے بھی غصے سے کہا۔

لڑکا جیسے پہلے سے تیار تھا، سنتے ہی اتنی تیزی سے بھاگا کہ تھوڑی دیر میں چوراہے پر پہنچ گیا۔ چوراہے پر رکا، پلٹ کر بنگلے کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے بھاگا۔ مجھے لگا کہ پلٹ کر شاید اس نے ہم لوگوں کی طرف انگوٹھا دکھا کر کوئی گندا اشارہ کیا تھا۔ شاید نہ بھی کیا ہو۔

صاحب اس کی دوڑ دیکھ کر ہنسنے لگے تھے۔ مہنگو اسی طرح میرے سامنے کھڑا تھا۔ جب دوسری اجازت ملے گی تو اس میں جان آئے گی اور مہنگو حرکت کرے گا۔

میں نے صاحب اور بڑے بابو کا دھیان بٹا دیکھ کر چپکے سے مہنگو سے کہا، ''مہنگو قمیض اندر لے جاؤ۔'' مگر مہنگو پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میں نے دھیرے سے کہا تھا تب بھی بڑے بابو نے میری بات سن لی تھی۔

''صاحب، مہنگو سنتو بابو کے سامنے ایسے کھڑا ہے جیسے قمیض انھی کو پہننی ہے،'' بڑے بابو خوشامد کی ہنسی ہنستے ہوئے بولے۔

صاحب بھی مسکرائے۔ ''کیوں، کیا ہو گیا؟ سنتو بابو ہی قمیض پہن لیں۔ ان کو تو ٹھیک ہوگی۔''

''کہہ نہیں سکتا صاحب، شاید چھوٹی ہو۔''

''چھوٹی نہیں ہوگی۔'' پھر صاحب نے سنجیدہ ہو کر مہنگو سے کہا، ''تم دونوں قمیض پہننے میں سنتو کی مدد کرو۔''

''جی صاحب!'' بڑے بابو فوراً بولے۔

''سر، میں قمیض نہیں پہنوں گا۔ بش شرٹ تو میں پہنے ہوں۔'' بولتے بولتے میری زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ تب تک بڑے بابو نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ مہنگو چوکس ہو کر میرے پاس آ گیا۔

''سنتو بابو کا چہرہ کتنا لال ہو گیا ہے سر؟ ان کے ہاتھ پیر بھی کانپ رہے ہیں۔ پسینہ پسینہ ہو رہے ہیں،'' بڑے بابو نے کہا۔

''اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟'' صاحب نے حیرت سے کہا۔

کیا میں ڈر رہا تھا؟ میری ہتھیلیاں پسینے سے تر ہو گئی تھیں۔ ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ میں زور لگا کر کپکپاہٹ کو روکنا چاہتا تھا۔ کیا میں بچ نہیں سکتا تھا؟ میں نے سڑک کی طرف دیکھا۔ صرف اکا دکا لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ تبھی بڑے بابو نے اور مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ مجھے تلی کے تیل کی بو آئی۔ مہنگو کا تیل سے چپڑا سر میرے پاس آ گیا تھا۔ اگرچہ وہ میرے پیچھے کھڑا تھا، پر میں جانتا تھا کہ تھوڑا بھی میں ہلوں گا تو یہ سوچ کر کہ میں بھاگنے والا ہوں، وہ مجھے پوری طاقت سے جکڑ لے گا۔ بڑے بابو نے میرا ہاتھ نہ بھی پکڑا ہوتا تب بھی کینٹین کے لڑکے کی طرح بھاگنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ اس کا سبب یہ ہوگا کہ مجھ میں سمجھداری تھی۔ اس سمجھداری کی وجہ سے میں نے سوچ لیا تھا کہ میں بچ نہیں سکتا۔ سمجھداری سے خودسپردگی جیسی میری حالت ہو گئی تھی۔ ادب اور قاعدے آدمی کو بہت جلدی بزدل بنا دیتے ہیں۔ ایسا آدمی جھگڑا نہیں کرتا۔

پھر بھی، جب مہنگو اور بڑے بابو میری بش شرٹ اتارنے کی کوشش کرنے لگے تو میں انھیں پوری طاقت لگا کر روکنے لگا اور اس کوشش میں زمین پر بیٹھتا گیا۔ میرا ایک ہاتھ مہنگو نے پکڑ رکھا تھا اور دوسرا بڑے بابو نے۔

مجھے زور لگاتا دیکھ کر صاحب نے کہا، ''یہاں تماشا مت کرو، گیرج لے جاؤ۔'' وہ پھر اخبار پڑھنے لگے۔

دونوں مجھے دھکیلتے کھینچتے گیرج لے آئے۔ گیرج خالی تھا۔ ایک طرف دیوار کے کنارے لگی دو

Scanned with CamScanner

لوہے کی کرسیاں تھیں۔ گیرج میں تیل کے دو تین گول نشان پڑے تھے۔ اس پر بڑے بابو پھسلتے پھسلتے بچے۔ ایک موٹے آدمی اور ایک بوڑھے سے آدمی سے میں ہار رہا تھا۔ گیرج میں پہنچتے ہی بڑے بابو نے مجھے دبوچ لیا تھا۔ انھوں نے میرے دونوں ہاتھ موڑ کر پیچھے باندھ لیے تھے۔ مہنگو سامنے کھڑا ہو کر بش شرٹ کے بٹن کھولنے لگا۔ مہنگو کے پیٹ میں زور سے لات مار کر میں اسے گرا سکتا تھا۔ لیکن اسے لات مارنے کی میری خواہش نہیں ہوئی۔ اس کی خاکی ٹوپی کھسک کر اس کی بائیں آنکھ کو پورا ڈھانپ چکی تھی۔ اتنی دھکا مکی میں بھی مہنگو کے کان میں کھنسا ہوا دس پیسے کا سکہ نہیں گر رہا تھا۔ مجھے اس بات کا دھیان رہا۔ میں تھک گیا۔ میرا اسٹیمنا ختم ہو چکا تھا۔ مایوس ہو کر میں نے بڑے بابو کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔

بڑے بابو ہانپتے ہوئے ہنسنے لگے، ''اور دو گالیاں! ابھی بچے ہو۔ پر سمجھ تم کو بھی آ جائے گی۔''

لگتا تھا ان لوگوں کو صاحب کے لیے کسی کی قمیص اتار کر اسے نوکر کی قمیص پہنا دینے میں مہارت تھی۔ اسی مہارت سے مجھے قمیص پہنا دی گئی۔ مہنگو میری اتری ہوئی بش شرٹ کندھے پر ٹانگ کر بنگلے کے اندر لے جانے لگا۔ بش شرٹ کی جیب میں پچھتر پیسے تھے جو کندھے پر ٹانگنے سے گر کر بکھر گئے۔ جیب میں ایک پوسٹ کارڈ بھی تھا۔ میرے سالے نے دفتر کے پتے سے مجھے چٹھی لکھی تھی جبکہ میں نے اسے پچھلی چٹھی میں ہی لکھا تھا کہ جواب دفتر کے پتے سے نہیں، گھر کے پتے سے دینا۔ گھریلو چٹھیاں دفتر میں ملیں، یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ پوسٹ کارڈ میں اس نے بڑے بابو، گورا بابو، دیوانگن بابو کو نمسکار لکھا تھا۔ صرف بڑے بابو کو میں نے بتایا تھا کہ سالے نے نمسکار کہا ہے۔

جیسے ہی کھلے پیسے زمین پر گرے تو آواز سن کر مہنگو کا ہاتھ اپنے کان پر گیا تھا۔ اسے اپنے کان میں کھنسے سکے کے گرنے کا اندیشہ ہوا تھا۔ وہ نیچے بیٹھ کر اِدھر اُدھر پھیلے پیسوں کو بین کر، میری بش شرٹ کی جیب میں ڈال کر لے گیا۔

بڑے بابو نے کہا، ''گھبراؤ نہیں۔ زیادہ پیسے نہیں ہیں۔ مل جائیں گے۔''

''اس میں پوسٹ کارڈ بھی ہے،'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرے منھ سے نکلا۔ یہ کہا تو مجھے لگا کہ میرے منھ کا سواد بگڑ گیا ہے۔ وجہ، مجھے بولنے کے لیے منھ چلانا پڑا تھا۔

''وہ بھی مل جائے گا،'' بڑے بابو رومال سے اپنا پسینہ پونچھتے ہوئے بولے۔ انھوں نے مجھے

Scanned with CamScanner

چھوڑا نہیں تھا۔ رومال جیب میں ڈال کر ایک ہاتھ سے کھینچتے ہوئے صاحب کی طرف لے جانے لگے۔ میں اپنے ہاتھ پیر اکڑا کر آگے بڑھنے میں تھوڑی اڑچن ڈال رہا تھا، لیکن بڑے بابو آسانی سے مجھے کھینچتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ سامنے پورچ میں صاحب کھڑے تھے۔

مجھے نوکر کی قمیض پہنے دیکھ کر انھوں نے کہا، ''واہ! بہت اچھے سنتو بابو۔ تم بڑے اچھے لڑکے ہو۔ لیکن بہت دیر لگا دی۔ اب تم گھر جاؤ۔ تمھاری بش شرٹ ہمارے پاس محفوظ جمع رہے گی۔ اور کل صبح دفتر مت جانا، سیدھے یہیں آ جانا۔'' صاحب موٹر میں بیٹھ کر چلے گئے۔

ان کے سامنے میری گردن جھکی ہوئی تھی۔ میں سر اٹھا کر ان سے آنکھ نہیں ملا پا رہا تھا۔ شاید نفرت یا شرم یا توہین یا جھجک یا ادب کی وجہ سے۔ یا ان بھی وجہوں سے۔

صاحب کے جاتے ہی میں نے پوری نفرت سے کہا، ''بڑے بابو! میں تم کو دیکھ لوں گا! تم کو چھوڑوں گا نہیں! مجھے نوکری کی پروا نہیں اور نہ تمھارے صاحب کی پروا ہے۔'' اور میں نے کھنکھار کر بڑے بابو کے پاس تھوک دیا۔ اس تھوک میں میں نے دیکھا کہ لال لال ریشے تھے۔ میری سردی پک گئی تھی۔ میں نے یہ سب صاحب کے سامنے کیوں نہیں کیا؟ شاید قاعدے اور بھلمنساہٹ کی وجہ سے میں نے انجانے میں یہ دھیان رکھا ہو کہ تھوک بڑے بابو پر نہ پڑے، جبکہ مجھے ان کے چہرے پر تھوکنا چاہیے تھا۔

بڑے بابو تب بھی مسکرا رہے تھے۔ ''سنتو بابو، میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ صاحب کی مذاق کرنے کی عادت ہے۔ اگر ہمارے اس طرح کے کھیل سے صاحب کا جی بہلتا ہے تو کیا برا ہے؟ صاحب سے ہم لوگوں کو بہت کام ہوتے ہیں۔ جب ہم لوگ اپنا پھٹا پرانا کپڑا جمعدار یا کسی غریب کو دے دیتے ہیں، تو صاحب کے پرانے کپڑے اگر مجھے ملیں تو میں ضرور پہنوں گا۔ پرانے ہونے کے باوجود میرے کپڑوں سے تو وہ بڑھیا ہوں گے۔ ویسے صاحب کے کپڑوں کے لیے بھی میں موٹا ہوں گا۔ سب سے بڑی بات ہے، جب صاحب خوش رہتے ہیں تو جان بوجھ کر ہم لوگوں کی غلطی کو اَن دیکھا کر دیتے ہیں۔ ہمیشہ معاف کرتے رہتے ہیں۔ وہ ہم لوگوں کو بچاتے ہیں۔ میں موقع دیکھ کر صاحب سے ضرور کہوں گا کہ سنتو بابو سے اب ایسا مذاق نہ کریں، برا مان جاتے ہیں۔ تم مجھے کتنی گندی گندی گالیاں دے رہے تھے، لیکن میں نے برا نہیں مانا۔ میں صاحب کے لیے ایک ایسا کام کرنے کے لیے مجبور تھا جو تمھاری نظر میں اچھا نہیں تھا۔ میں تمھاری کیفیت سمجھتا ہوں اس لیے برا نہیں مانا۔ میں نے تمھیں گالیاں نہیں دیں۔

Scanned with CamScanner

چاہتا تو دو چار طمانچے بھی جڑ سکتا تھا۔ میں اس بات کی پوری کوشش کر رہا تھا کہ تم کو چوٹ نہ لگے۔ اوپر سے تم طاقت لگا رہے تھے۔ اگر مہنگو نہ ہوتا تو میں ہار جاتا۔ تم جوان لڑکے ہو، میں بوڑھا ہوتا ہوا موٹا آدمی ہوں۔ تمھاری کھینچا تانی سے میری آنتیں اوپر چڑھ آئی ہیں۔" بڑے بابو بش شرٹ کے نیچے ہاتھ ڈال کر اپنا پیٹ سہلا رہے تھے۔ انھوں نے کہا، "میں تو مر بھی سکتا تھا، میری جان نکل سکتی تھی۔"

پھر وہ اداس ہو گئے۔ ان سے اور بات کرنے کی میری خواہش نہیں تھی۔ میں زیادہ دیر تک نوکر کی قمیض پہنے نہیں رہ سکتا تھا۔ اس سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ قمیض سے مجھے پینٹ کی بو آ رہی تھی۔ صاحب کے بنگلے کی کھڑکی دروازوں پر ابھی حال ہی میں پینٹ کیا گیا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو سونگھ کر دیکھا، ان سے بھی نئے پینٹ کی بو آ رہی تھی۔ کیا مجھے بھی پینٹ کیا گیا ہے؟

سائیکل پر سکڑ کر اس طرح بیٹھا کہ قمیض مجھے کم سے کم چھوئے۔ لیکن ایسا کیسے ہو سکتا تھا جبکہ قمیض اور بھی چست ہو۔ پھر بھی قمیض کو پہنے جیسا نہیں تھا۔ میں اس میں گھسا، پھنسا، سمٹا ہوا تھا۔ میری بہت تذلیل ہوئی تھی۔ میرے ساتھ ایک گھناؤنا مذاق کیا گیا تھا۔ چاہتا تو قمیض کو اتار کر وہیں کہیں پھینک دیتا اور سائیکل لے کر گھر پہنچ جاتا۔ اندر اگر بنیان ہوتی تو ٹھیک رہتا۔ ہو سکتا ہے قمیض نہ پھینکتا، اسے اتار کر کیاریوں میں دبا دیتا۔ کیونکہ میں ایک ایماندار آدمی تھا، ان کی قمیض دے کر مجھے اپنی بش شرٹ، پیسے اور پوسٹ کارڈ واپس لینا تھا۔ ہر حالت میں حاصل کرنا تھا۔

گھر پہنچنے کے تھوڑی دیر پہلے میری ساری تیزی ختم ہو گئی۔ محلے کے سب لوگ مجھے گھورتے ہوئے لگے۔ ٹھاکر پان والے نے مجھے اشارہ کیا، پر میں رکا نہیں۔ ہوٹل کے برآمدے میں پانچ چھ لوگ کھڑے تھے، مجھے دیکھتے ہوئے۔ چھجوں سے عورتیں آدمی نیچے جھانک رہے تھے، مجھے جھانک رہے تھے۔ نائی استرے پر دھار رکھتا ہوا مجھے دیکھ رہا تھا۔ لگ رہا تھا گپتا جی مجھے نہیں دیکھیں گے۔ وہ چشمہ لگائے ایک گندی کاپی میں کچھ لکھ رہے تھے۔ پر ان کی نظر بھی میری طرف اٹھ گئی۔

کنڈی دھیرے دھیرے کھٹکھٹائی۔ بیوی کا دھیان کنڈی کی طرف تھا۔ مجھے دیر ہو گئی تھی اس لیے۔ وہ آکر دروازہ کھولنے لگی۔ میری عادت تھی کہ دفتر سے آنے کے بعد یا بہت دیر سے گھر لوٹنے کے بعد دروازہ کھلنے کے پہلے سے بیوی سے بات کرنا شروع کر دیتا تھا۔

"تم کچھ بول کیوں نہیں رہے ہو؟" کنڈی کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا۔

Scanned with CamScanner

میں چپ رہا۔

''تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' وہ کنڈی کھول نہیں پا رہی تھی۔ میں پھر بھی چپ رہا۔

''باہر سے دروازہ کھینچ کر رکھو، کنڈی مجھ سے کھل نہیں رہی ہے۔''

میں نے دروازہ کھینچا تو کنڈی ڈھیلی ہوگئی ہوگی۔ دروازہ کھلتے ہی بیوی کے بازو سے نکل کر میں غسل خانے میں گھس گیا۔ کپڑے اتار کر نہانے بیٹھ گیا۔ وہاں صابن نہیں تھا۔ صابن کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ دیر ہو رہی تھی۔ دو لوٹا پانی ڈالنے کے بعد میں نے بیوی سے صابن مانگا۔ صابن دے کر وہ غسل خانے کے پاس کھڑی ہوگئی۔ وہ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔

تولیہ لپیٹے لپیٹے میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ بیوی ڈبدھا میں میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے کہا، ''غسل خانے میں جو قمیض ٹنگی ہے، اسے چھونا مت۔''

''کون سی قمیض؟'' اس نے پوچھا۔

مجھے غصہ آیا۔ ''جو میں پہن کر آیا تھا۔''

''میں دیکھ نہیں پائی،'' اس نے کہا۔

''ساری دنیا دیکھ رہی تھی، تم نہیں دیکھ پائیں؟'' میں نے کہا۔ یہ سن کر وہ میرے پاس آ کر لیٹ گئی۔ میں نے اس طرح چادر اوڑھی کہ بیوی بھی چادر میں آ جائے۔ چادر چھوٹی تھی۔ چادر سے زیادہ میں نے بیوی کو ڈھانک لیا۔ پھر مجھے گہری نیند آنے لگی، بے ہوشی کی طرح۔

دوسرے دن صبح میں تر و تازہ تھا۔ سوچنے لگا کہ کل جو بات ہوئی تھی، کیا وہ اتنی ہی بری تھی جتنی بری مجھے لگ رہی تھی؟ یہ بھی خیال آ رہا تھا کہ بڑے بابو کو گالیاں نہیں دینی تھیں۔ تھوکنے جیسی حرکت اچھی نہیں تھی۔ گھر ایک ایسی جگہ تھی جہاں آدمی کے خیالات ایک دوسری سطح سے اٹھتے تھے۔ آدمی سے الگ ہو کر، گھر کے کونے سے خیالات اٹھتے تھے۔ رات کو میں نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ بھوک نہیں تھی اور نیند آ رہی تھی۔ اب زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ رات کا میرا بچا ہوا کھانا تھا۔ وہی میں نے کھایا۔

کپڑے پہن کر میں دفتر کے لیے تیار ہوا۔ قمیض کو اخبار میں لپیٹ کر میں نے تھیلے میں رکھ لیا تھا۔ یہ کام میں نے اٹھتے ہی کیا۔ بیوی کام میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے چھپا کر قمیض کو اخبار میں لپیٹا تھا۔ جب وہ کل نہیں دیکھ پائی تو اسے آج بھی نہیں دیکھنا چاہیے۔

Scanned with CamScanner

’’تمھاری بش شرٹ دھونی ہے۔ مجھے مل نہیں رہی ہے۔‘‘ قمیض کی بات وہ بھول گئی تھی۔

میں اسے کیا بتاتا کہ بش شرٹ کہاں ہے؟

’’ڈھونڈو، گھر میں ہی ہوگی۔ جائے گی کہاں؟‘‘

قمیض کے بنڈل کو میں نے تھیلے میں ڈال لیا۔ اسے لوٹا کر بش شرٹ لینی تھی۔ میں سیدھے صاحب کے بنگلے گیا۔ صاحب برآمدے میں اخبار پڑھ رہے تھے۔ میں جھجکا ہوا مہنگو کو دیکھنے لگا۔ میں فکر میں تھا کہ مجھے اپنا کام کس طرح شروع کرنا ہے۔

صاحب کو جیسے معلوم تھا کہ میں آؤں گا۔ مجھے دیکھتے ہی بولے، ’’سنتو بابو، سیدھے اندر چلے جاؤ۔ بائی صاحب تمھارا انتظار کر رہی ہیں۔ کل سے اور جلدی آجایا کرو۔ ان کو بازار جانا ہے۔‘‘ وہ اخبار پڑھنے لگے۔

’’جی‘‘ کہہ کر میں رکا رہا کہ صاحب کچھ اور بولیں گے۔ لمحہ بھر رک کر میں جھجکتے ہوئے اندر چلا گیا۔ اندر ایک کونے میں مہنگو صاحب اور بائی صاحب کے جوتوں چپلوں پر پالش کر رہا تھا۔ اس کے سامنے چمکتے ہوئے تین چار جوڑی جوتے تھے۔ چار پانچ جوڑی جوتے چپل اسے ابھی پالش کرنے تھے۔ میں نے اپنی چپل برآمدے کے نیچے اتار دی۔

بائی صاحب مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں صاحب کی گھڑی تھی۔ مجھے گھڑی دیتے ہوئے انھوں نے کہا، ’’یہ صاحب کو دے دیجیے۔‘‘

’’جی،‘‘ میں نے کہا اور گھڑی لے کر صاحب کے پاس پہنچا۔ صاحب اخبار پڑھنے میں مصروف تھے۔ ان کے پاس کی ٹیبل پر تین چار انگریزی کے اخبار تھے۔ ’’سر، آپ کی گھڑی،‘‘ میں نے کہا۔ انھوں نے نہیں سنا۔ میری آواز دھیمی، دبی ہوئی نکلی تھی۔ میں نے اسے پھر کہا، ’’سر، آپ کی گھڑی۔‘‘

’’ٹیبل پر رکھ دو۔‘‘

ٹیبل پر گھڑی رکھ کر میں پھر اندر آ گیا۔ بائی صاحب ریفریجریٹر کھول کر اس میں سے انڈے نکال کر لے جا رہی تھیں۔ انھوں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ’’یہاں بیٹھ جایئے سنتو بابو۔‘‘

مجھے اچھا لگا کہ مہنگو اور مجھ میں جو فرق تھا، وہ صاحب کے گھر میں بھی ویسا ہی رہا۔ وہ جوتے پر پالش کرے گا، میں گھڑی دینے جا سکتا ہوں۔ وہ زمین پر بیٹھے گا، میں کرسی پر بیٹھوں گا۔ جوتے لے کر

Scanned with CamScanner

مہنگو اندر گیا۔

تھوڑی دیر میں وہ میرے لیے چائے لے کر آیا۔ بہت خوبصورت صاف کپ میں۔ پتا نہیں کیوں، صاف چکنے خوبصورت کپ کو دیکھ کر مجھے سنگ مرمر کے چھوٹے سے تاج محل کی یاد آ گئی۔ چائے پیتے پیتے دھیان دیا کہ جس کرسی پر میں بیٹھا تھا وہ دوسری کرسیوں سے الگ رکھی تھی۔ چائے بہت اچھی بنی تھی۔ اس میں بہت اچھی خوشبو تھی۔ بھینس کا خالص دودھ ہوگا۔ جب بائی صاحب نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا تھا تب میرے جی میں یہ آیا تھا کہ گورا بابو بنگلے کی چائے کی بہت تعریف کرتے ہیں۔

موٹر کار میں پیچھے بائی صاحب بیٹھی تھیں۔ میں سامنے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ جب گاڑی گیٹ سے باہر نکلنے لگی تو میں اپنی سائیکل دیکھتا رہا، جس کے ہینڈل میں ٹنگا تھیلا محفوظ تھا۔ مہنگو کو بھی دیکھا جو پورچ میں کھڑا رہ گیا تھا۔ صاحب اندر چلے گئے تھے۔

بائی صاحب نے بہت خریداری کی۔ انھیں خریداری کا شوق تھا۔ کئی جگہ ان کے لیے میں نے مول بھاؤ بھی کیے۔ میں نے انھیں بتلایا کہ سبزی کدھر اچھی ملتی ہے۔ تب بائی صاحب نے پوچھا کہ میری شادی ہوگئی ہے یا نہیں۔ میں نے جھینپ کر ان سے کہا کہ ہوگئی ہے۔

میں ہی ان کے لیے سبزی خرید کر لایا۔ کیا کیا خریدنا ہے، یہ انھوں نے پہلے ہی بتلا دیا تھا۔ کافی سبزی ان کے گھر میں ہو جاتی تھی، پر ساری سبزی نہیں ہوتی تھی۔ روپے انھوں نے دے دیے تھے۔ بقایا پیسے انھیں لوٹانے لگا تو انھوں نے کہا، ''ابھی رکھو۔'' ایک دکان کے سامنے انھوں نے گاڑی کھڑی کروائی۔ اس دکان سے میں پریشر ککر کا ربڑ خرید کر لایا۔ وہ گاڑی میں بیٹھی رہیں۔

ایک اناج کے سیٹھ کے مکان کے سامنے انھوں نے گاڑی رکوائی۔ گاڑی سے اترتے اترتے انھوں نے مجھ سے کہا، ''آپ یہیں بیٹھے رہیے۔'' ڈرائیور بائی صاحب کے پیچھے پیچھے چلا گیا تھا۔ گاڑی میں اکیلا میں بیٹھا تھا۔ آتے جاتے لوگوں کو دیکھتے ہوئے میں سوچنے لگا کہ دفتر کے لوگ صاحب کی گاڑی پہچانتے ہیں۔ مجھے صاحب کی گاڑی میں بیٹھے دیکھ کر وہ کیا سوچیں گے؟ گاڑی سے اترنے کے پہلے ہی ڈرائیور نے ہارن بجا دیا تھا، جس سے سیٹھ بنگلے سے نکلے چلے آ رہے تھے۔ بائی صاحب کھڑے کھڑے ان سے بات چیت کرنے لگیں۔ ڈرائیور تین وزن دار بنڈل، جو خوبصورتی سے بندھے ہوئے تھے، ایک ایک کر کے، سیٹھ کے بنگلے کے اندر سے لا کر موٹر کی ڈگی میں رکھتا جا رہا تھا۔ ان

Scanned with CamScanner

بنڈلوں میں کیا ہوگا؟ جب سامان رکھا جا چکا تو بائی صاحب کار میں آ کر بیٹھ گئیں۔

موٹر کار بنگلے میں آ کر رکی تو میں بھی نیچے اتر آیا۔ اترتے ہی بائی صاحب نے مجھ سے پوچھا، ''آپ تو اب دفتر جائیں گے؟''

''جی ہاں،'' میں نے کہا۔

ڈرائیور ڈگی سے سامان نکال کر بنگلے کے اندر پہنچانے لگا تھا۔

''سنتو بابو، آپ بھی مدد کر دیجیے،'' بائی صاحب کے چلے جانے کے بعد ڈرائیور نے مجھ سے کہا۔ ڈگی سے ایک بنڈل میں نے اٹھایا۔ بہت وزنی بنڈل تھا۔ میں نے برآمدے میں رکھ دیا۔ ڈرائیور کی حرکت مجھے اچھی نہیں لگی تھی۔ ڈرائیور کے کپڑے مجھ سے بہت اچھے تھے۔ وہ مجھ سے زیادہ صاف ستھرا لگتا تھا۔ پھر بھی میری سماجی حالت اس سے اچھی تھی، ایسا میں سوچتا تھا۔ ایک بنڈل رکھنے کے بعد میں نے دوسرا بنڈل نہیں رکھا۔ اس کی پروا نہ کرتا ہوا میں اس سے الگ ہٹ گیا۔

''سنتو بابو، آپ گئے نہیں؟'' بائی صاحب نے مجھے کھڑے دیکھ کر پوچھا۔

''کچھ کھلے پیسے بچے ہیں، آپ کو لوٹانے ہیں۔''

''ڈرائیور کو دے دیجیے،'' انھوں نے کہا۔

آخر ہچکچاتے ہوئے میں نے کہا، ''میں اپنی بش شرٹ واپس لینے آیا ہوں۔ زیادہ کپڑے میرے پاس نہیں۔''

بائی صاحب سن کر مسکرانے لگیں۔ میں دل ہی دل میں اپنے اوپر غصہ ہوا کہ زیادہ کپڑے نہیں ہیں، یہ میں نے کیوں کہا۔ بات اچھی طرح رکھنے کے لیے میں یہ بول گیا تھا۔

''صاحب سے پوچھنا پڑے گا،'' انھوں نے کہا۔

''رہنے دیجیے، میں بعد میں لے لوں گا۔ میں قمیض لوٹانے آیا ہوں۔''

''کیوں؟'' انھیں بہت تعجب ہوا۔ کچھ لمحے وہ کھڑی رہیں۔ پھر وہ اندر چلی گئیں۔ شاید صاحب سے پوچھنے گئی ہوں۔

میں پریشان سا کھڑا رہا۔ کھڑے کھڑے بہت دیر ہوگئی۔ تب وہ باہر نکل کر آئیں۔ ''آپ کی بش شرٹ مہنگو لا رہا ہے۔ قمیض آپ اپنے پاس ہی رکھیے۔ زیادہ فکر مندمت ہوئیے۔ کل آپ آئیے۔''

Scanned with CamScanner

وہ کہہ کر چلی گئیں۔

اپنی بش شرٹ پا کر میں بہت خوش ہوا۔ بش شرٹ میں پوسٹ کارڈ تھا۔ کھلے پیسے اپنی مٹھی کھول کر مہنگو نے میرے ہاتھ میں رکھ دیے۔ پورے پچھتر پیسے تھے۔ ایک چونی اٹھا کر میں نے مہنگو کو دے دی۔ مہنگو خوش ہو گیا۔ کان سے دس پیسے کا سکہ نکال کر اس نے پہلے چونی کان میں کھونسی، پھر دس پیسے کھونس لیے۔

دفتر میں جیسے سب میرا انتظار کر رہے تھے۔

میں اس کے پہلے کبھی دیر سے دفتر نہیں پہنچا تھا۔ دیوانگن بابو مجھے اس طرح دیکھ رہے تھے کہ جیسے میں کوئی دوسرا ہوں۔ گورا بابا بو مایوس سے لگے۔ بڑے بابو میں کوئی فرق نہیں تھا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی بڑے بابو نے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا، ''دیر کیسے ہو گئی؟''

میں سمجھ گیا، بڑے بابو یہ سوال پوچھ کر مجھ سے سب کے سامنے قبولوانا چاہتے تھے کہ میں صاحب کے بنگلے سے ہوتا ہوا آ رہا ہوں۔

اچانک میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے ہاتھ میں اخبار میں لپٹی ہوئی قمیض تھی۔ ''دیوانگن بابو، گورا بابا بو، آپ لوگ میری بات سنیے۔ کل میرے ساتھ ایک بھدّا مذاق کیا گیا تھا۔ یہ سب بڑے بابو کی چالبازی تھی۔'' میں نے بڑے بابو کی طرف اشارہ کیا۔

سب میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ایسے برتاؤ کی کسی کو امید نہیں تھی۔ بڑے بابو کو تو بالکل نہیں ہو گی۔ تب بھی ان پر کوئی اثر معلوم نہ ہوا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے دھیرے دھیرے کہا، ''آپ کو معلوم ہے، کل میں بڑے بابو کے ساتھ صاحب کے بنگلے پر گیا تھا۔ آج صبح بھی گیا تھا، بائی صاحب کے ساتھ موٹر کار میں بازار جانا پڑا۔ وہاں میں نے پوری ایمانداری کے ساتھ بائی صاحب کا ساتھ دیا۔ جو کام کرنے کے لیے انھوں نے کہا، میں نے کیا۔ میری بش شرٹ انھوں نے واپس کر دی۔ انھوں نے نوکر کی قمیض اپنے پاس ہی رکھنے کے لیے کہا، تاکہ میں اسے پہنوں۔ ان کے پاس بے کار تھی۔ آج میں نے وہاں چائے پی تھی۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا، چائے مجھے بہت اچھی لگی۔ اگر آپ کو یقین نہیں تو گورا بابا بو سے پوچھ لیجیے۔''

''سب جانتے ہیں، کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے،'' بڑے بابو نے کہا۔

Scanned with CamScanner

''ہماری سمجھداری اور ادب قاعدے کو مہنگو کی وفاداری سے ملا کر وہ ہم سے ایک اچھے کام کی امید کرتے ہیں۔ میں نے قمیص پہننے سے انکار کیا تھا۔ مہنگو اور بڑے بابو نے مجھے پکڑ لیا۔ میں کچھ نہیں کر پایا۔ آپ کے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ کہیں آپ کے ساتھ بھی ایسا تو نہیں ہوا ہے؟ اگر ہوا ہے تو ضرور بتلائیے۔ مجھے یہ سب معلوم کرنا ہے،'' میں نے کہا۔

''میں صاحب کے گھر جب بھی گیا، کسی بھی طرح بچ نکلنے کی خود اعتمادی کے ساتھ گیا،'' بڑے بابو نے کہا۔

''گوراہا بابو، آپ کے ساتھ ایسا ہوا تھا؟''

گوراہا بابو آنکھیں چرا رہے تھے۔ وہ قابل رحم لگنے لگے۔ میری بات جتنی سنجیدہ تھی، اتنی سنجیدہ انھیں بھی لگی ہوگی۔

بڑے بابو ہنسنے لگے۔ ''سنتو بابو، آپ کو اتنا سمجھایا تب بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ دفتر میں یہ سب غلط ہے۔ میدان میں ٹھیک ہے۔ یہاں بھیڑ نہیں لگتی۔ میں بہت سیدھا آدمی ہوں اس لیے سب کی سن لیتا ہوں۔ تم لوگوں کو اپنا اپنا کام کرنا ہے۔ اُگھارے ہو کر کام کرو گے تو تنگی ہوگی۔ سپاہی لوگوں میں اچھا حساب ہے، گڑبڑ کی تو سب سے پہلے وردی اتروالی جاتی ہے۔ وردی اتروانے والی بات سب دفتروں میں ہونی چاہیے۔''

دوپہر کی چائے کا وقت گزر گیا تھا۔ کینٹین والا آ کر بولا، ''لڑکا کام چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ چائے کینٹین میں آ کر پینی پڑے گی۔''

شام کو دفتر کی چھٹی کے بعد دیوانگن بابو اور گوراہا بابو میرے ساتھ ہو لیے۔ ہم لوگ اور دنوں کی طرح چھ بجے کے آس پاس نکلے تھے۔ دوسرے سیکشنوں کے لوگ پونے پانچ ہی کام بند کر کے نکلنا شروع ہو جاتے تھے۔

''دیوانگن بابو، نوکر کی قمیص میرے پاس ہے،'' تھیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا۔ ''قمیص اخبار میں لپٹی اور دھاگے سے بندھی ہوئی ہے۔'' تھیلے سے قمیص کے بنڈل کو نکال کر دکھاتے ہوئے میں نے کہا، ''یہ آدرش نوکر کا سانچا ہے۔ آدرش ان کے بنائے ہوئے ہیں۔ اس جھنجھٹ کو ختم کر دیں۔''

Scanned with CamScanner

ہم دفتر کی بلڈنگ کے پیچھے والی بال کھیلنے کے میدان میں پہنچے۔ اس میں جالی بندھی ہوئی تھی۔ دیوانگن بابو، گوراہابابو اور میں نے سائیکلوں کو والی بال میدان کے باہر کھڑا کر دیا۔ ایک طرف میں ہو گیا اور دوسری طرف دونوں۔ میں نے نوکری کی قمیض کا بنڈل جالی کے اُس پار اچھالا تو دیوانگن بابو سے زیادہ پھرتی گوراہابابو نے دکھلائی اور اپنی پوری طاقت سے، نہیں، اپنی پوری نفرت سے، ہوا میں بنڈل کو مکا مارا تو اخبار پھٹ گیا۔ لیکن بنڈل جالی سے اس طرف آیا ہی نہیں۔

''ایک آدمی کی نفرت سے کام نہیں چلے گا،'' کہہ کر دوڑتا ہوا میں جالی کے نیچے سے سر جھکا کر ان کی طرف پہنچ گیا۔ دیوانگن بابو اور گوراہابابو میں بنڈل کو لے کر چھینا جھپٹی ہو رہی تھی۔

''رکو، رکو،'' میں انھیں روکتا رہا اور بنڈل خود چھیننے کی کوشش کرتا رہا۔ گوراہابابو بالکل قابل رحم نہیں لگ رہے تھے۔ دیوانگن بابو بہت خوش تھے۔

قمیض بہت مضبوط تھی۔ شاید چین کی تھی۔ چرر چرر کی آواز آئی اور قمیض کا ایک بڑا ٹکڑا دیوانگن بابو کے ہاتھ میں رہ گیا، دوسرا گوراہابابو کے ہاتھ میں۔ تب گوراہابابو اپنے کو سنبھال نہ سکنے کی وجہ سے گر پڑے۔ دیوانگن بابو کا دھیان میری طرف نہیں تھا۔ اس کا فائدہ اٹھا کر میں نے پھٹی قمیض کا ٹکڑا جھپٹ لیا اور فوراً اس کے دو ٹکڑے کیے۔ ایک ٹکڑے کو ہوا میں اچھالا اور دیوانگن بابو سے پہلے اسے جھونک لیا۔

دیوانگن بابو نے کہا،'' میرے پاس کچھ نہیں ہے۔''

''لو!'' میں نے ایک چھوٹا ٹکڑا، جس میں قمیض کی ایک آستین اور کالر تھا، ان کی طرف اچھال دیا۔ ''اس سے زیادہ میں آپ کو نہیں دے سکتا،'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اتنا بہت ہے،'' دیوانگن بابو ہنستے ہوئے بولے اور ایک ڈرامائی انداز اختیار کر کے انھوں نے اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔ اب ہم تینوں قمیض کے الگ الگ ٹکڑے کو پھاڑتے رہے۔

''باپ رے! اس سے زیادہ چھوٹے ٹکڑے مجھ سے نہیں ہو سکتے،'' میں نے کہا۔

دیوانگن بابو نے قمیض کے کالر کو پھاڑنے کی بہت کوشش کی اور جب ان سے کالر نہیں پھٹا تو انھوں نے پورے ثابت کالر کو پھینک دیا۔

''ارے! یہ کیا کرتے ہو؟ کیوں برباد کر رہے ہو؟'' کہہ کر میں کالر اٹھا لایا۔ جس لکڑی کے کھمبے میں جالی بندھی ہوئی تھی اس میں مجھے ایک کیل گڑی ہوئی دکھائی دی۔ میں نے اس کیل میں کالر کو پھنسا

Scanned with CamScanner

کر کھینچا تو وہ چرر سے پھٹ گیا۔ ''دیکھا!'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

گوراہا بابو نے کہا، ''بڑے بابو ہم لوگوں کو دیکھ رہے ہیں۔''

''کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''دیکھنے دو،'' دیوانگن بابو نے کہا۔

بڑے بابو دیوار کی آڑ سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی سائیکل کا اگلا پہیہ دیوار کی آڑ سے باہر نکلا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور وہ ہینڈل کا سہارا لیے ہوئے تھے۔

''کچھ نہیں ہوگا،'' میں نے کہا۔

''چلو،'' گوراہا بابو نے کہا۔

سائیکل لیے ہم لوگ پیدل چلنے لگے۔ جب کچھ دور نکل گئے تو دیوانگن بابو نے کہا، ''پیچھے مڑ کر دیکھو۔''

ہم دونوں نے پیچھے دیکھا، بڑے بابو والی بال کے میدان میں تھے۔ ان کی سائیکل ایک طرف کھڑی تھی اور وہ جھکے ہوئے قمیض کے ٹکڑوں کو بین رہے تھے۔

سن شائن لانڈری سے جب اپنی بش شرٹ لے کر گھر آیا تو بیوی سل پر مسالہ پیس رہی تھی۔

''تم میری بش شرٹ کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ دیکھو، یہ ہے میری بش شرٹ۔'' کاغذ کے بڑے لفافے سے نکال کر میں نے اس کی گود میں رکھ دی۔

''ارے اٹھاؤ، میرے ہاتھ میں مسالہ لگا ہے۔ ساڑھی بھی گندی ہے۔ بش شرٹ خراب ہو جائے گی۔ کتنی بڑھیا ڈھلی ہے!''

''اٹھاتا ہوں، تم اپنے ہاتھ الگ رکھنا،'' اور بش شرٹ اٹھاتے اٹھاتے میں نے اسے چوم لیا۔ اس کے چہرے سے مجھے گرم مسالے کی خوشبو آ رہی تھی۔ میں نے اسے ایک بار اور چوم لیا۔

دفتر جانے کے لیے میں خوشی سے تیار ہونے لگا۔ آج نہانا مجھے بہت اچھا نہیں لگا۔ کپڑے بدلتے وقت میں نے محسوس کیا کہ کسی گہری کھائی کے اوپر کھڑے ہو کر کپڑے بدل رہا ہوں اور کھڑے کھڑے پتلون کے اندر پیر ڈالتے ہوئے میرا توازن بگڑتے بگڑتے بچا ہے، نہیں تو میں کھائی کے نیچے

گر جاتا۔

''سنو،'' بیوی میری تھالی میں چھوڑا ہوا سنا بھات رکھ رہی تھی۔

''بائی صاحب نے دفتر جانے کے بجائے بنگلے میں آنے کے لیے کہا ہے۔ لیکن میری خواہش نہیں ہورہی ہے۔ بنگلے میں بڑا عجیب لگتا ہے۔''

''رہنے دو، مت جاؤ،'' اس نے کہا۔

''صاحب ناراض ہو سکتے ہیں۔''

''تو چلے جاؤ، صاحب کو ناراض مت کرو،'' پانی کا گلاس اٹھاتی ہوئی وہ بولی۔

''تم دونوں طرف بولتی ہو۔''

''دفتر کی باتیں مجھے سمجھ میں نہیں آتیں۔ تم کو جو اچھا لگے وہی کرو۔''

''اگر میری عقل ماری جائے گی تو نتیجہ تم کو بھی بھگتنا پڑے گا۔''

''بنگلے پر ہو آؤ، کچھ نہیں ہوگا۔''

''تم چائے خوب کھولایا کرو، اس سے چائے اچھی بنتی ہے،'' میں نے کہا۔

''فالتو چڑ جاتے ہو،'' کھانا کھا کر اٹھتے ہوئے اس نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے پھر پوچھا، ''صاحب کے بنگلے جاؤں یا نہ جاؤں؟''

''نہ جاؤ،'' اس نے کہا۔

''تمھارے جواب سے ایک بات یاد آئی۔ میری اسکول کی پڑھائی ایسی گزری تھی کہ جب امتحان دے کر لوٹتے تھے تو ٹاؤن ہال سے باہر سڑک کے کنارے گھورے کے اوپر ایک پاگل بیٹھا رہتا تھا۔ ہاتھوں سے گھورے کو کھود کھود کر کچھ ڈھونڈا کرتا۔ اسکول کے لڑکے اسے گھیر کر کھڑے ہو جاتے۔ ایک اس سے پوچھتا، اے بھیا، تو وہ جواب دیتا، ہاں بھیا۔ دوسرا پوچھتا، پاس ہوں گے کہ فیل؟ تو وہ جواب دیتا، فیل۔ تیسرا پوچھتا، فیل ہوں گے کہ پاس؟ تو وہ جواب دیتا، پاس۔ تب لڑکے بہت ہنستے۔ وہ آخر کے لفظ کو یاد رکھ کے، اسے دہرا کر جواب دیتا تھا۔ اگر میں اس سے پوچھتا کہ بچوں گا یا مر جاؤں گا، تو وہ جواب دیتا، مر جاؤں گا۔ اگر مجھے اس سے پوچھنا ہی ہوتا تو اس سے پوچھتا، مر جاؤں گا یا بچوں گا، تو وہ ضرور بولتا، بچوں گا۔''

Scanned with CamScanner

''میری بڑی بہن کا لڑکا بھی ایسا ہی ہے۔ اس سے میں پوچھتی، بتو کھانا کھائے گا کہ پانی پیے گا؟ تو وہ کہتا، پانی پیوں گا۔''

''ہوں۔ میں جب پوچھوں تو جو آخر میں ہو وہی جواب دینا۔ میں صاحب کے بنگلے جاؤں یا دفتر؟''

''دفتر جاؤ۔'' وہ مسکرائی۔

''دیکھو، یہ ہوئی بات۔ فیصلے پر پہنچنا اس طرح آسان ہو گیا۔''

میں گھر کے باہر نکلا تو دیوانگن بابو مجھے باہر کھڑے دکھائی دیے۔

''آپ اِدھر کیسے کھڑے ہیں، دفتر نہیں جانا ہے؟''

''میں آپ کو لوانے آیا ہوں۔''

''کیوں؟ کہاں جانا ہے؟''

''دفتر۔''

''دفتر ہی تو جا رہا ہوں۔ اور کہاں جاؤں گا؟''

''آپ کو سیدھے دفتر جانا چاہیے، صاحب کے بنگلے ہوتے ہوئے نہیں،'' دیوانگن بابو نے ہچکچاتے ہوئے، پر مضبوطی سے کہا۔

''فکر میں تو میں بھی تھا۔ آخر میں میں نے اور میری بیوی نے یہ طے کیا کہ مجھے دفتر جانا چاہیے، سیدھے دفتر۔ دیوانگن بابو، آپ مجھے لوانے آئے تھے یا میرا پیچھا کرنے؟''

''پیچھا کرنا بے کار تھا۔ اگر آپ دیر سے دفتر آتے تو ہم لوگ یہ سمجھ جاتے کہ آپ بنگلے سے ہو کر آ رہے ہیں۔''

''میں بہت صبح صاحب کے بنگلے چلا جاتا اور وہاں سے ٹھیک وقت پر دفتر پہنچتا، تب آپ یہی سمجھتے کہ میں سیدھے گھر سے آ رہا ہوں؟''

''ہاں، یہ تو ہو سکتا تھا۔''

''اگر میں ابھی صاحب کے بنگلے جاتا تو آپ کیا کرتے؟''

''آپ کو روکتا۔''

Scanned with CamScanner

"کیوں؟"

"صاحب کے بنگلے جانے سے ایک چکر چلتا ہے۔"

"آپ مجھے روک نہ پاتے اور آپ میرے ساتھ ہی جاتے۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ بنگلے جاتے۔"

"راستے میں گوراباابو ملتے تو وہ بھی ساتھ ہو جاتے۔"

"نہیں، تب تینوں کو ساتھ دیکھ کر صاحب ناراض ہوتے کہ دفتر کا کام کون دیکھے گا؟ اس لیے ہم لوگوں کو طے کرنا پڑتا کہ کسی ایک کو دفتر جانا ہوگا۔ میں آپ سے دفتر جانے کے لیے کہتا تو آپ ناراض ہو جاتے۔ گوراباابو سے کہتا تو وہ ناراض ہو جاتے۔"

"یعنی آپ بنگلے ضرور جاتے؟"

"کیوں نہ جاتا؟ میں گھر سے پہلے ہی سوچ کر نکلتا کہ بنگلے جانا ہے۔"

"ہو سکتا ہے، ہم دونوں بھی یہی سوچ کر نکلتے۔"

"آپ بتایئے، کدھر چلنا ہے؟"

"میں نہیں جانتا، آپ جدھر جانے کے لیے کہیں گے میں بھی چلوں گا۔ میں تو آپ کے پیچھے ہوں۔"

"میں بنگلے جاؤں گا۔"

"میں بھی جاؤں گا۔"

"میں دفتر جاؤں گا۔"

"میں بھی دفتر جاؤں گا۔"

نو دس بجے رات کا وقت تھا۔ سونے کی تیاری میں تھے۔

"صاحب! صاحب!" کوئی پکار رہا تھا۔

"کون ہے؟" بیوی نے پوچھا۔

"صاحب! صاحب!" کسی نے پکارا۔

Scanned with CamScanner

''یہ تو مہنگو کی آواز ہے۔ رات کو کیوں آیا ہے؟ تم مت جاؤ، میں دروازہ کھولتا ہوں۔'' دروازہ کھولا تو مہنگو ہی تھا۔

''کیا ہے مہنگو؟'' میں نے پوچھا۔

''رام رام صاحب!'' مہنگو نے اداسی سے کہا۔ وہ اندر آ گیا۔

بیوی نے اس سے پوچھا، ''کچھ کام ہے مہنگو؟''

''رام رام صاحب!'' مہنگو نے بیوی سے کہا۔

میں اس سے کچھ پوچھتا کہ وہ باہر نکل گیا۔ ''رکو مہنگو!'' میں نے پکارا۔ وہ رکا ضرور، پر وہیں سے پلٹ کر اس نے زور سے ''رام رام صاحب!'' کہا اور ہاتھ ہلاتا ہوا چلا گیا۔

''کیا ہو گیا ہے اس کو؟'' پریشان سی بیوی نے پوچھا۔

''معلوم نہیں،'' میں نے کہا۔

رات کو جب میری نیند کھلی تو مجھے لگا کہ کسی نے آواز دی ہے۔ اس طرف رات کو پہرا دینے کے لیے گورکھا نہیں آتا تھا۔ پچھواڑے کا دروازہ کھولو تو اس کی سیٹی کی آواز رات کو بہت دور سے آتی ہوئی سنائی دیتی تھی۔ اِدھر ''جاگتے رہو!'' کی آواز کوئی نہیں لگاتا تھا۔ البتہ دن کے وقت ایک بار باقاعدگی سے ایک بڑھئی ''کھٹیا بنوا لو!'' چلاّتا گزرتا تھا۔ جب نیند سی آنے لگی تو ''رام رام صاحب'' کی آواز سنائی دی جس سے میں ہوشیار ہو گیا۔ شاید پھر سنائی دے، یہ سوچ کر میں چوکنا تھا۔ بہت دیر تک کچھ بھی سنائی نہیں دیا۔ دوسرے شو کی نیوز ریل کب کی ختم ہو گئی تھی۔ آدھا کھیل ہونے کا وقت ابھی نہیں ہوا تھا۔ آدھا کھیل ہوتے ہی ٹھیلے خوانچے والوں کا شور بڑھ جاتا۔ تصور میں میں ایک نیوز ریل دیکھنے لگا۔ ایک نئی ریل گاڑی کے افتتاح کی تقریب ہے۔ ڈیزل انجن کو پھولوں سے سجایا گیا ہے۔ ریل گاڑی پر رنگین جھلی کاغذ کی جھنڈیاں بندھی ہیں۔ گاڑی کے دروازوں تک میں بہت بھیڑ ہے۔ انجن کا ڈرائیور، گارڈ، قلی، اسٹیشن ماسٹر اَور دنوں کی نسبت صاف ستھرے اور پھرتیلے ہیں۔ یہاں تک کہ پٹریوں کے بیچ میں پڑی ہوئی گٹیوں کو چونے سے پوت دیا گیا ہے۔ ریل گاڑی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ دیکھا، جھنڈیاں ہوا سے پھرپھرانے لگیں۔ پہلے ایک لال جھنڈی ہوا سے ٹوٹ کر اڑتی ہوئی پیچھے نکل گئی۔ پھر سب جھنڈیاں اور سب پھول ٹوٹ کر اڑتے ہوئے گر گئے۔ گاڑی کی آواز کو میں نے ''جبلپور کے چھ چھ

Scanned with CamScanner

پیسے، جبلپور کے چھ چھ پیسے'' کی لے سے باندھنا چاہا تو جما نہیں۔

''رام رام صاحب! رام رام صاحب!'' تیز بھاگتی گاڑی کی آواز کے ساتھ ساتھ ایک لے میں میں سنتا رہا۔ پھر میں سو گیا۔

اماں کی غیر حاضری میں جاگنے کی شروعات میں صبح کی کھٹ پٹ سے مجھے لگتا تھا کہ اماں اٹھ گئیں۔ بالکل بعد میں، یعنی جاگنے کی پوری حالت میں، اچانک یاد آتا تھا کہ اماں بڑے بھائی کے پاس ہیں۔ جب منھ ہاتھ دھو رہا تھا تو بیوی نے بتلایا کہ باہر کے دروازے کے پاس دس پیسے کا سکہ ملا ہے۔ ریزگاری کا سکہ دیکھتے ہی میرے منھ سے نکلا، ''ضرور مہنگو ہوگا۔'' مجھے پیسے گرنے کی آواز تو سنائی دی تھی، میں سوچنے لگا۔ سکے پر میل کی پرت تھی۔ تلی کے تیل کی بو آ رہی تھی۔ دیکھ کر لگتا تھا کہ مہنگو کے کان میں مہینوں سے کھنسا ہوا ہوگا۔ کان میں سکہ کھونسا اس کا بچت کا اپنا ڈھنگ تھا۔ کان میں کھونس کر وہ اسے بھول جاتا ہوگا۔ تین چار سکے ہوتے تو وردی کی جیب میں رکھ لیتا۔

بڑے بابو بہت اداس تھے۔ میں نے دیوانگن بابو سے پوچھا، ''بڑے بابو بہت اداس دکھائی دے رہے ہیں۔ ان کے لڑکے کی کوئی خبر ملی؟''

''ارے نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ مہنگو پاگل ہوگیا ہے۔ سب کو 'رام رام صاحب، رام رام صاحب' بولتا ہے۔ صاحب کے گھر رات کو دو بجے پہنچ گیا تھا۔ جب تک پورے بنگلے کی لائٹ جل نہیں گئی وہ دروازہ کھٹکھٹاتا رہا۔ برآمدے میں چپراسی سو رہا تھا، وہ بولتا رہا، 'رک جاؤ، دروازہ کھول رہا ہوں'؛ لیکن مہنگو لگاتار دروازہ پیٹتا رہا۔ جب دروازہ کھلا تو اس نے پہلے چپراسی کو 'رام رام صاحب' کہا۔ ہلا گلا سن کر صاحب اپنے کمرے سے باہر نکلے۔ اس کے تھوڑی دیر پہلے صاحب دیر سے لوٹ کر آئے تھے۔ صاحب جیسے ہی غصے سے باہر نکلے، مہنگو نے انھیں 'رام رام صاحب' کہا۔ صاحب کے غصے کا مہنگو پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ صاحب کے پیچھے بائی صاحب کھڑی تھیں۔ بائی صاحب کو بھی اس نے 'رام رام صاحب' کہا۔ چپراسی نے مہنگو کو زبردستی باہر نکالا۔ وہ 'رام رام صاحب، رام رام صاحب' لگاتار بولتا رہا ہے۔ بائی صاحب کو مہنگو کے ڈر سے رات بھر نیند نہیں آئی۔ وہ بڑے بابو کے گھر چار بجے پہنچا۔ پانچ بجے میرے گھر آیا۔ میرے لڑکے لڑکی تک کو 'رام رام صاحب' بولا۔''

''میرے گھر بھی آیا تھا،'' میں نے کہا۔

"میرے گھر بھی آیا تھا،" گورا بابا بو نے کہا۔

"مہنگو کے کان کا دس پیسے کا سکہ میرے گھر میں گر گیا تھا۔" میں نے جیب سے کاغذ کی پڑیا نکالی۔ دیوانگن بابو میرے پاس آ گئے۔ انھوں نے پڑیا کھولی۔ ہاتھ میں سکہ رکھ کر میں نے کہا،" اسے مہنگو کو دینا ہے۔"

بڑے بابو صاحب کی طرف گئے تھے۔ وہ مال جمعدار کے ساتھ نکلے تھے۔ ان کو گئے بہت دیر ہو گئی تھی۔

اب مہنگو "رام رام صاحب" کو چھوڑ کر گونگا اور بہرا تھا۔ اس کے سوا نہ تو وہ کچھ بولتا اور نہ سنتا تھا۔ کچھ دنوں تک وہ صاحب کے بنگلے کے ارد گرد گھومتا رہا۔ اس کی وجہ سے بائی صاحب اور صاحب بنگلے کے باہر باغیچے میں، برآمدے میں بیٹھ نہیں پاتے تھے۔ وہ احاطے کے بند دروازے کے پاس کھڑا رہتا تھا۔ جہاں کوئی نکلا اس نے "رام رام صاحب" کہا۔ صاحب کے گھر آنے جانے والے اس سے پریشان اور خوش تھے۔ ایک چپراسی احاطے کے دروازے کے پاس کھڑا رہتا تھا کیونکہ آنے جانے والوں کے لیے دروازہ کھلتا تو وہ اندر گھسنے کی کوشش کرتا۔ تب ایک دن پولیس والوں نے اسے ڈرایا دھمکایا، شاید مارا بھی، اور سول لائن کی طرف اس کا آنا بند ہو گیا۔ اس نے سب دفتر والوں کے گھر جانا بند کر دیا تھا۔ جہاں لوگوں کی بھیڑ رہتی وہیں گھومتا رہتا اور ایک ایک آدمی، عورت، بچے کو ہاتھ جوڑ کر" رام رام صاحب" بولتا۔ لوگ اس سے مزے لیتے تھے۔ جب سینما کا آدھا کھیل ہوتا یا کھیل چھوٹتا تو وہ ایک اونچی جگہ پر کھڑا ہو جاتا اور لوگ اس کو گھیر کر کھڑے ہو جاتے۔ ہاتھ جوڑے ہوئے وہ "رام رام صاحب" کہتا تو جواب میں بہت سے منچلے زور سے چلّاتے، "رام رام صاحب!" بعد میں لوگوں کو مہنگو کی عادت پڑ گئی۔ وہ پھٹی خاکی وردی میں بڑبڑاتا ہوا گزر جاتا اور کسی کا اس کی طرف دھیان نہیں جاتا تھا۔

ایک پہلوان پنڈت تھے۔ وہ "گنگے گرو" کہہ کر نمسکار کرتے تھے۔ مہنگو کو انھوں نے ایک دن صاحب کے بنگلے کے پاس پکڑا۔ پنڈت نے کہا، "مہنگو، گنگے گرو بولو۔ نہیں تو درست کر دوں گا۔"

مہنگو کیوں بولتا، "رام رام صاحب" بولا۔

"ابے گنگے گرو بول!" انھوں نے مہنگو کو ایک طمانچہ مارا۔ وہ "رام رام صاحب" ہی بولتا گیا۔ پنڈت نے اسے اٹھا کر پٹخ دیا۔ مہنگو زمین پر دھول میں پڑا پڑا، ہاتھوں سے اپنے سر کو مار سے بچاتے

Scanned with CamScanner

ہوے، ''رام رام صاحب'' بولتا ہوا پٹتا رہا۔ پنڈت جی تھک گئے۔ صبح لوگ بہت دیر بعد اکٹھے ہوتے تھے۔ ان کے آنے کے پہلے پنڈت چلے گئے۔ ویسے آس پاس کے لوگ باہر نکل کر مہنگو کو پٹتا دیکھ رہے تھے۔ پاس کے بنگلے کے لوگ کرسیاں باہر لا کر اس جگہ جا کر بیٹھ گئے تھے جہاں سے وہ اچھی طرح مہنگو اور پنڈت کو دیکھ سکیں۔ پنڈت نے جانے کے پہلے ان لوگوں سے کہا، ''بڑا بے شرم ہے، گنگے گر و نہیں بولتا۔''

ایک ادھیڑ عورت نے کہا، ''جاؤ پنڈت جی، پاگلوں کے منھ مت لگو۔ ابھی گالیاں بکنے لگے گا۔''

''وہ رام رام صاحب بولنے والا پاگل ہے،'' ڈاک بانٹنے والے پوسٹ مین نے کہا، ''یہ بے چارا کسی کو کیا گالیاں دے گا؟''

مہنگو کی خاکی وردی اتنی پھٹ گئی تھی کہ لگتا تھا اس نے چیتھڑے کو پہن رکھا ہے۔ رات کو دفتر کی کینٹین سے بچا کھچا کھانا پہلے مل جاتا تھا۔ صاحب کے ناراض ہونے کے بعد وہ بند ہو گیا۔ راستے میں وہ ہم لوگوں کو جہاں مل جاتا، ہم کچھ نہ کچھ دے دیا کرتے تھے۔ اس کا دس پیسے کا سکہ میں نے اسے لوٹا دیا۔ کان میں سکہ کھونسنے کی اس کی عادت چھوٹ گئی تھی۔ اس کی ٹوپی کسی لڑکے نے چھپا دی تھی، اس لیے وہ ٹوپی کے نام پر سر پر کچھ بھی رکھ لیا کرتا تھا۔ اس کی گھر والی اور لڑکا اس کی پروا نہیں کرتے تھے۔ پھر وہ مر گیا۔ مرنے کی خبر سن کر گوراہا بابو اور دیوانگن بابو کے ساتھ میں کندرا پارا میں اس کا گھر ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گیا۔ مہنگو کا گھر نہیں ملا۔ مال جمعدار سے ہم لوگوں نے ٹھیک ٹھیک پتا لیا تھا۔

''دیوانگن بابو، آپ تو کہہ رہے تھے کہ مہنگو امر ہے۔ وہ تو مر گیا،'' میں نے کہا۔

گوراہا بابو نے کہا، ''لیکن میں نے کہا تھا کہ اس کی جگہ کبھی نہیں مرے گی۔ اس کی جگہ اور کوئی آئے گا۔''

''مہنگو کی جگہ مہنگو کا لڑکا آئے گا،'' بڑے بابو نے کہا۔

''صاحب کے پاس اس کی بیوی، لڑکا لڑکی گئے تھے۔ ان کے گذارے کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ اس کا لڑکا ہی ایک روزی کا کمانے والا ہے۔ ہفتے میں صرف دو روز کا کام ملتا ہے۔ اب صاحب اسے مہنگو کی جگہ رکھ رہے ہیں۔''

''اس کا نام کیا ہے، بڑے بابو؟'' میں نے پوچھا۔

Scanned with CamScanner

''نام تو مجھے نہیں معلوم۔ مہنگو ہی کہیں گے، عادت پڑ گئی ہے۔''

''اگر قمیض آدرش نوکر کا سانچا تھی تو مہنگو نام بھی ایک اچھے نوکر کا سانچا ہے۔ کچھ تو اثر ہوتا ہوگا؟'' بڑے بابو سن نہ پائیں اتنے دھیرے سے، دیوانگن بابو کو سنانے کے لیے میں بڑبڑایا۔

''لڑکے کی عمر کیا ہوگی؟'' دیوانگن بابو نے پوچھا۔

''اٹھارہ بیس سال کا ہوگا، سنتو بابو سے دو ایک سال چھوٹا۔''

مہنگو کے مرنے کے بعد جب ہولی آئی تو میونسپل اسکول کے لڑکوں کا ایک جھنڈ ''رام رام صاحب'' بولتا ہوا پورے شہر میں رنگ کھیلتا رہا۔ اس دن لڑکوں کے لیے مہاویر خوانچے والا مونگ پھلی کے بجائے رنگ لایا تھا۔ لڑکوں کے ساتھ اکیلا وہی بوڑھا تھا۔ اس کے ماتھے میں گلال تھا اور اس کی رسولی کے چھوٹے سے ماتھے میں تلک لگا تھا۔ ایک نے اس کی رسولی میں آنکھ، ناک، کان پینٹ کر دیے تھے۔ مہاویر نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اس نے صرف کہا تھا کہ رسولی کا چہرہ ہنستا ہوا ہونا چاہیے۔ مہاویر کی گنجی کھوپڑی کے چاروں طرف کے بال بینگنی اور لال ہو گئے تھے۔ مہاویر کمر سے اوپر ننگا تھا، صرف پھٹی دھوتی پہنے تھا۔ آنکھ کان والی ہنستی ہوئی رسولی کے ساتھ رنگا ہوا مہاویر، بہت بدصورت لگ رہا تھا۔

میونسپل اسکول کا ہی ایک لڑکا سالانہ جشن میں فینسی ڈریس میں ''رام رام صاحب'' بولنے والا مہنگو بنا اور اس کا کام پسند نہیں کیا گیا۔ اس کا دھیان بار بار کان سے گر جانے والے سکے کی طرف جاتا تھا۔ ایک بار اسے دس پیسے کا سکہ ڈھونڈنے میں وقت لگ گیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی کہ اگر سکہ نہیں ملا تو سچ مچ کا نقصان ہو جائے گا۔ اسے صرف سکہ اٹھا کر کان میں کھونسنے کی نقل کر کے واپس آ جانا تھا۔ کسی دیکھنے والے نے کہا، ''نہیں مل رہا تو مجھ سے لے لو۔'' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہنگو کو سب لوگ بھول گئے۔

گرمیوں میں دفتر میں خس کی ٹٹی لگائی جاتی تھی اس لیے ان دنوں گھر سے زیادہ آرام دفتر میں معلوم ہوتا تھا۔ محلے کی ایک برتن مانجھنے والی نے کہا تھا کہ اسے خس کی ٹٹی میں پانی سینچنے کا کام مل جائے تو اچھا ہو۔ یہ کام آسان تھا اور اس میں اسے اڑھائی روپے کے حساب سے پیسے ملتے۔ جن لوگوں کے گھر وہ کام کرتی تھی، دھیرے دھیرے کام کرنے کی وجہ سے سب اسے چھوڑنے کی کوشش میں تھے۔ دس گھروں میں دن بھر کا اس کا کام تھا۔ کہیں چائے مل جاتی تھی، کہیں روٹی۔ یہی فائدہ تھا۔ پانچ چھ روپے ایک گھر پیچھے ملتا تھا۔

Scanned with CamScanner

بیوی نے کہا، ”روتا ئن کو خس کی ٹٹی سینچنے کے کام میں لگوا دو۔“

میں جانتا تھا کہ بڑے بابو میری بات نہیں مانیں گے۔ بڑے بابو اور مال جمعدار مل کر، اپنی مرضی سے چھانٹ کر ریجا چنتے تھے۔

شہر میں روزی میں کام کرنے کے لیے نوکرانی، نوکر، بڑھئی، کاریگر، مستری ایک مقررہ جگہ جمع ہوتے تھے۔ یہ نوکر بازار کہلاتا تھا۔ یہ لوگ سبزی بازار کے پاس سڑک کے دونوں کناروں پر کھڑے رہتے یا بیٹھے رہتے۔ دکانیں نو بجے کھلتی تھیں۔ ایک طرف عورتیں ہوتیں، دوسری طرف آدمی نوکر۔ سات آٹھ سال کے لڑکے مزدور روزی میں کام کرنے کے لیے اس بازار میں تیار رہتے تھے۔ کام کرنے والے مزدور اپنے لڑکوں کو مدد کے لیے اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کرتے۔ لیکن اگر کسی کی گود میں بچہ ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ بچہ بھی ایک بٹا بیس یا ایک بٹا پچیس روزی میں کام کرتا ہوگا۔ گود والی مزدورنیوں کو کام میں لے جانا کوئی پسند نہیں کرتا تھا۔ ان کے بچے گندگی کرتے اور بچوں کی وجہ سے ان کا کام میں جی نہیں لگتا تھا۔ چھوٹے بچوں والی مزدورنیں بے کار سمجھی جاتیں۔

ریجا مزدور چار بجی میں کام پر لیے جاتے۔ اس کا مطلب ہوتا تھا آٹھ بجے صبح سے چار بجے تک لگاتار کام۔ پسیا پیج کھا پی کر نکلتے تھے۔ چھ ساڑھے چھ بجے گھر سے نکل جاتے اور سات بجے سے نوکر بازار میں جمع ہونے لگتے۔ جمع ہونے میں یہ اس بات کا دھیان رکھتے تھے کہ کس طرف کھڑے رہنا ٹھیک ہوگا، جس سے ان کو روزی مل جائے۔ شہر کے کن حصوں میں کام ہوتا رہتا ہے یہ ان کو اندازہ رہتا تھا۔ اس حساب سے آنے والوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے یہ دائیں بائیں کھڑے رہتے۔ گاہکوں کے پیچھے پیچھے چلنا منع تھا۔ ان کے ارد گرد بھیڑ لگانا بھی منع تھا۔ یہ سب ان لوگوں نے طے کر لیا تھا۔ سبزیوں کی پہچان خریداروں کو اتنی اچھی نہیں تھی جتنی مزدوروں کی تھی۔ ان کو ہاتھ سے ٹٹولنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک نظر سے پچاسوں لوگوں کے بیچ یہ کام کا آدمی چھانٹ لیتے تھے۔

ڈھور بازار، نوکر بازار کی طرح روز پابندی سے نہیں بھرتا تھا۔ ڈھور بازار ہر بدھ کے دن بھرتا تھا۔ آس پاس کے گاؤں کے لوگ ڈھور بیچنے اور خریدنے یہاں آتے تھے۔ آٹھ بجے سے روزی شروع ہو جاتی تھی۔ اس لیے سائیکل والے اگر ایک مزدور ہوا تو اسے کیریر پر بٹھا کر لے جاتے تھے۔ چار پانچ مزدوروں کا کام ہے تو رکشے میں لے جانا فائدے میں سمجھا جاتا تھا۔ اگر آٹھ بجنے میں وقت ہو تو پیدل

لے جایا جاتا تھا۔ سیٹھوں، صاحب لوگوں کے کام کے لیے ڈرائیور موٹر میں آتا اور موٹر میں بٹھا کر لے جاتا تھا۔ ان لوگوں کے ڈرائیور اور نوکر روز چھانٹتے وقت کوشش کرتے کہ ریجائیں جوان اور اچھی ہوں۔ ان سے یہ لوگ روزی طے کرنے میں مذاق کرتے تھے، جیسے ''ایک روز کا کتنا لے گی، ایک رات کا کتنا لے گی، گھنٹے بھر کا کتنا، دس منٹ کا کتنا'' وغیرہ۔ اچھے خاندانی لوگ بھی بے شرمی سے جوان سندر لڑکیوں کو چھانٹ کر لے جاتے تھے۔ گھر میں ان کی بیوی پوچھتی، ''چھانٹ کر لائے ہوں گے؟''

تب جواب ہوتا، ''بازار میں یہی بچی تھی، کیا کرتے؟''

عزت بچانے کے لیے نوکر بازار کا قاعدہ تھا کہ ایک اکیلی ریجا کسی کے گھر کام کرنے نہیں جائے گی۔ کم سے کم دو ریجائیں کام پر جائیں گی، اس سے ایک دوسرے کی حفاظت ہوگی۔ مگر اس قاعدے کے لحاظ سے جو صحیح کام کروانا چاہتے، وہ دو ریجاؤں کے بدلے میں ایک قلی لے جانا پسند کرتے تھے۔ کئی بار کسی مجبوری میں چوری چھپے ایک اکیلی بھی چلی جایا کرتی تھی۔ ساتھی بنانے کے لیے ریجائیں جھگڑ پڑتی تھیں۔ جیسے کل تک بوٹو کے ساتھ منکتن رہی۔ کسی وجہ سے منکتن اس سے الگ ہو کر پھلیسر کا ساتھ ڈھونڈ لیتی ہے۔ بوٹو کے ساتھ کے لیے پاروتی اور پھلیسر کے بیچ جھگڑا ہو سکتا تھا۔ کبھی نئے موقعے میں کمانے کے لیے ساتھ جاتی ہوئی ایک اچانک بولے گی کہ نہیں جاتی۔ تب ساتھ والی دوسری کی بھی روزی ماری جاتی۔ جوڑے میں جانے کا کام ٹھیک سے نہیں ہو پاتا تھا۔

آٹھ بجے کے بعد بقایا مزدور مایوس ہو جاتے اور نو بجے دکانوں کے کھلنے کے پہلے کام کی تلاش میں پورے شہر میں پھیل جاتے۔ یہ لوگ سیمنٹ کے گوداموں کے پاس، آٹا مشین، لکڑی ٹال، پارسل آفس، لوہا بازار گنج، رائس مل اور اینٹوں کے بھٹے کی طرف نکل جاتے۔ ان جگہوں پر طے شدہ مزدور پہلے سے کام پر ہوتے۔ مشکل سے کچھ لوگ نوکر بازار سے آ کر کھپ پاتے تھے۔ دسہرے دیوالی میں بہتوں کو صفائی، رنگائی، پتائی کا کام مل جاتا تھا۔ برسات میں کھپریلیں چھانے کا۔ کرائے کی بیل گاڑی مٹی کھود کر بھر لیتے اور تین تین روپے میں ایک گاڑی سول لائن میں بک جاتی تھی۔ گملوں اور باغیچوں کے لیے کالی مٹی لگتی تھی۔ مرم[1] کی گاڑیاں بھی بکتی تھیں۔ آنے جانے والے راستے میں کیچڑ نہ ہو اس لیے مرم ڈلوائی جاتی تھی۔ مرمی بھاٹا زمینیں بہت تھیں، اس لیے مرم کی گاڑی سستے میں دو روپے میں بکتی تھی۔

---

[1] مرم: نالہ بجری۔

Scanned with CamScanner

میں نے بڑے بابو سے کہا: ”میرے محلے میں ایک نوکرانی ہے، خس کی ٹٹی کے کام کے لیے اس سال اسے رکھ لیجیے۔“

”اگر تمھارے کہنے سے میں اسے رکھ لوں تو وہ تمھارے گھر کا کام مفت میں کرے گی۔“

”نوکرانی ہم لوگوں نے نہیں رکھی ہے،“ میں نے کہا

”برتن کون مانجھتا ہے؟“

”میری بیوی،“ میں نے کہا۔

”مہنگو کی عورت کو بھی رکھ لیجیے،“ دیوانگن بابو نے کہا۔

”تمھارا دماغ خراب ہے۔ اگر مہنگو کا لڑکا دو سال کا ہوتا تو تم لوگ کہتے اس کو بھی چپراسی بنوا دیجیے۔“

”بڑے بابو، مہنگو کی ایک جوان لڑکی بھی ہے۔“

”معلوم ہے، دیکھ لیا ہے میں نے۔“

”سندر ہے۔ ہائیڈروسل سے آپ کو تکلیف تو نہیں ہوتی؟“

”دیوانگن بابو، بدتمیزی مجھے پسند نہیں ہے۔ دفتر میں زبان کو منھ میں نہیں، ٹیبل کی دراز میں رکھ کر کام کرنا پڑتا ہے۔“

”آپ کے پاس دو بڑے بڑے کدّو ہیں۔ ٹیبل کی دراز میں نہیں آئیں گے۔ انھیں لوہے کی الماری میں رکھ لیجیے۔“

بڑے بابو غصے میں تمتما گئے۔ ”تمھیں سبق نہ سکھایا تو نوکری چھوڑ دوں گا۔“

”اگر آپ آپریشن نہیں کرائیں گے تو ہاکی کی گیند کیا، فٹ بال ہو جائے گی۔“

بڑے بابو کرسی سے کھڑے ہو گئے۔ دیوانگن بابو کو انھوں نے ایک گالی دی، ”کل کے لونڈے۔“

ان کے ماتھے پر پسینہ پھوٹ آیا تھا۔ چہرہ لال ہو گیا تھا۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا، وہ دھڑام سے کرسی سے ٹکراتے ہوئے نیچے گر پڑے۔ کھڑے ہوتے وقت انھوں نے پیروں سے کرسی بہت پیچھے ٹھیل دی تھی۔ بیٹھتے وقت اس جگہ کرسی نہیں تھی، اس لیے دھڑام سے گر پڑے۔ دو تین فائلیں ان کے ہاتھ سے

Scanned with CamScanner

ٹکرا کر ٹیبل سے نیچے گر پڑیں۔

ہم سب لوگ ان کی طرف لپکے۔

مجھے ڈر لگا، کیونکہ بڑے بابو کہا کرتے تھے کہ ان کی جان نکلے گی تو دفتر میں نکلے گی۔

ان کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ وہ بے ہوش جیسے تھے۔

دیوانگن بابو نروس سے ہو گئے۔ وہ بڑے بابو کی ہتھیلی سے اپنی ہتھیلی رگڑنے لگے۔ ان کی دیکھا دیکھی میں بھی بڑے بابو کے دوسرے ہاتھ کو ملنے لگا تھا۔

گورا بابو دوڑتے ہوے کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

کچھ دیر میں آس پاس کے کمرے سے دوسرے سیکشن کے بابوؤں، چپراسیوں کی بھیڑ لگ گئی۔ ایک صاحب بابوؤں اور چپراسیوں کو اپنی اپنی جگہ جانے کے لیے کہہ رہے تھے۔ دھیرے دھیرے بلاّ ختم ہو گیا۔ سب اپنی اپنی جگہوں پر لوٹ گئے۔ ناظر آ گیا تھا۔ اس کے کہنے سے ہم لوگوں نے بڑے بابو کی ٹیبل خالی کر کے ان کو اس کے اوپر لٹا دیا۔ ٹیبل کے اوپر پنکھا لگا تھا۔ سب کمروں میں بہت ہی پرانے پنکھے لگے تھے اور سب میں دو دو بلیڈ تھے۔ کچھ میں لوہے کے بلیڈوں کی جگہ پلائی وڈ کے بلیڈ لگے تھے۔

دیوانگن بابو نے پوچھا، ''ان کی آنتیں تو اوپر نہیں چڑھ گئیں؟''

چڑھی کچھ نہیں ہیں، سب اتر گئی ہیں،'' ناظر نے دھیرے سے کہا۔

''ہوا لگنے دو،'' ناظر نے پھر کہا۔

میں بڑے بابو کی بش شرٹ کا بٹن کھولنے لگا تو مجھے یاد آیا کہ جب مہنگو میری بش شرٹ کے بٹن کھول رہا تھا اور انھوں نے میرے ہاتھوں کو پکڑ رکھا تھا تو آنتیں اوپر چڑھ آئی تھیں۔ میں نے ان کی آنتوں کو سہلا سہلا کر نیچے اتارا۔

''ناظر صاحب، کیا کیا جائے؟ ڈاکٹر صاحب کے پاس لے چلیں؟''

''نہیں، صاحب نے بھی کہا تھا کہ میں بڑے بابو کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں۔ میں ابھی دس منٹ میں ان کو ٹھیک کر دیتا ہوں،'' ناظر نے کہا۔

مال خانے کا مریل سا، بیمار لگنے والا کلرک آیا۔ یہ آدمی مجھے کبھی پسند نہیں آیا۔ دیکھ کر لگتا تھا کہ اسے ایک ساتھ گانجا، افیم، شراب، بھنگ، سب کا نشہ چڑھا ہے۔ اس کی آنکھیں چڑھی رہتی تھیں۔

Scanned with CamScanner

ناظر کی بھی ایک آنکھ نشے میں لگتی تھی۔ پتلون کی جیب سے اس نے کوئی چیز چھپا کر باہر نکالی اور ناظر کے بھورے رنگ کے پرانے سوتی کوٹ کی جیب میں ڈال دی۔ پھر تیزی سے کمرے کے باہر چلا گیا۔ سب کے بیچ ناظر کی موجودگی میں اس کے لیے صرف ناظر ہی موجود رہتا تھا، باقی لوگوں سے اسے کوئی مطلب نہیں رہتا تھا۔ ہم لوگ اسے گھنٹی کہتے تھے۔ وہ کسی سے گھلتا ملتا نہیں تھا۔ ہمیشہ اکیلا رہتا تھا۔ اس سے فالتو بات کرنے کی ناظر کی بھی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ یہ آدمی کسی کے لینے دینے میں نہیں رہتا تھا۔ پر بابو لوگ بتاتے تھے کہ اس کی بیوی پڑوسیوں سے ادھار مانگتی پھرتی تھی۔

تبھی بڑے بابو ہلکے سے کراہنے لگے۔ انھوں نے ناظر کو دیکھا۔ جواب میں ناظر نے کہا، ''لایا ہوں، تم لیٹے رہو۔ اچھا، آپ لوگ اپنی اپنی جگہ جائیے۔''

ہم لوگ کچھ کچھ سمجھ گئے تھے اس لیے چپ چاپ اپنی ٹیبلوں پر جا کر کام کرنے لگے۔ ناظر نے زمین پر پڑی فائلوں کو اٹھایا اور بڑے بابو کے سر کے نیچے رکھ دیا۔ فائلوں کا تکیہ لگائے وہ مجھے بہت آرام سے سوئے ہوئے لگے۔

ہم لوگوں کی طرف ناظر کی پیٹھ تھی۔ انھوں نے جیب سے بوتل نکالی۔ ''منھ کھولو،'' ناظر نے کہا۔ کہہ کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ہم لوگوں نے فائلوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ اس نے بوتل بڑے بابو کے منھ میں لگائی۔

آنکھیں موندے موندے بڑے بابو نے دو چار گھونٹ لینے کے بعد کہا، ''بس۔''

بڑے بابو خود اٹھ کر ٹیبل پر بیٹھ گئے۔

ناظر نے انھیں سہارا دے کر نیچے اتارا اور وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔

شراب کی ہلکی بو ابھی تک کمرے میں تھی۔

کرسی پر بیٹھتے ہی انھوں نے دیوانگن بابو کی طرف دیکھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ دیوانگن بابو مسکرا رہے تھے۔

بڑے بابو نے کہا، ''میں سمجھ لوں گا۔''

''وہ سب بعد میں، ابھی آرام کرو۔ میں چلتا ہوں۔ زیادہ دیر رکوں گا تو گڑبڑ ہو جائے گی،'' ناظر نے کہا۔

Scanned with CamScanner

''رکو!'' بڑے بابو نے کہا۔

''کیوں؟''

''بوتل یہیں چھوڑ دو۔''

''چپ رہو۔ دماغ خراب ہے؟ میرے پاس سیاہی کی بوتل ہے۔ سیاہی کی بوتل تو تمھارے پاس بھی ہوگی۔''

''مجھے کیا پلایا تھا؟''

''سیاہی،'' انھوں نے کہا، ''مال خانے میں وہ کلرک اکیلا چھوٹ گیا ہے۔ الماری کی چابی میں ٹیبل پر رکھ آیا ہوں۔ گورا بابو گھبرائے ہوئے میرے پاس آئے تھے۔''

''کون سا کلرک؟'' بڑے بابو نے پوچھا۔

''جو تمھارے لیے سیاہی کی بوتل لے کر آیا تھا۔''

بڑے بابو نے ایک کورے کاغذ کو زبان میں لگا کر دیکھا، کاغذ میں سیاہی نہیں آئی۔

''جھوٹ بولتے ہو؟''

''یار، تم نے کبھی میرا یقین کیا ہے!'' ناظر نے کہا اور اپنی جیب دبائے ہوئے چلا گیا۔

بنیان پہنے، دفتر کی کرسی پر بیٹھے ہوئے بڑے بابو عجیب لگ رہے تھے۔ ان کے کھچڑی بال تھے۔ آنکھیں ہلکی لال تھیں۔ داہنے بازو میں کالے دھاگے سے بندھا سونے کا ایک چھوٹا چپٹا تعویذ تھا۔ ایک تانبے کا تعویذ اور تھا۔ گلے میں چھوٹے چھوٹے رُدرکش کی چاندی میں پروئی ہوئی مالا تھی۔ اگر ان کی بش شرٹ نہ اترتی تو ہم سب یہ کہاں دیکھ پاتے۔

ناظر کے جانے کے بعد وہ آنکھیں موندے رہے۔ انھیں کھانسی آئی۔

''پانی پییں گے؟'' میں نے پوچھا۔

کھانستے کھانستے انھوں نے جواب دیا، ''نہیں۔''

''آپ رکشہ لے کر گھر چلے جائیں۔''

''نوکری دفتر میں کرو اور مرو گھر جا کر،'' بڑے بابو نے کہا۔

بڑے بابو کو میں ان کے کھانسنے کی آواز سے پہچان سکتا تھا۔ ایک بار سینما دیکھتے ہوئے میں نے

Scanned with CamScanner

پیچھے سے ان کے کھانسنے کی آواز سنی۔ سردی کا دن تھا اس لیے بہت سے سنیما دیکھنے والے کھانس رہے تھے۔ میری کھانسی کچھ دن پہلے ہی ٹھیک ہوئی تھی۔ بڑے بابو کے کھانسنے کی آواز سن کر میں نے سوچ لیا تھا کہ انھیں آدھے کھیل کے وقت ڈھونڈوں گا۔ آدھے کھیل کے وقت وہ نظر نہیں آئے۔ بہت بھیڑ تھی۔ پکچر ختم ہونے کے بعد بھی وہ مجھے دکھائی نہیں دیے۔ دوسرے دن دفتر میں میں نے ان سے پوچھا، ''آپ کل پکچر دیکھنے گئے تھے؟''

''ہاں،'' انھوں نے کہا۔

''میں بھی گیا تھا۔ میں نے آپ کو دیکھا نہیں تھا۔''

''تمھیں کس نے بتایا کہ میں پکچر دیکھنے گیا تھا؟''

''آپ کے کھانسنے کی آواز سے میں جان گیا تھا۔ اب کیسی ہے آپ کی کھانسی؟''

''ٹھیک ہے۔ پر کھانسنے کی آواز سن کر تم مجھے پہچان گئے؟'' بڑے بابو مسکراتے ہوئے بولے۔ ان کی مسکراہٹ میں شفقت تھی۔ تب وہ مجھے بہت بھلے آدمی لگے۔ ان کے دو لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ ایک لڑکا سال بھر ہوا، گھر سے بھاگ گیا تھا۔ بیوی تین چار سال سے نہیں تھی۔ انھیں اپنے لڑکے کے ملنے کی امید روز رہتی تھی۔ جب وہ بھیڑ میں ہوتے تو یہ امید بڑھ جاتی تھی۔ اس لیے جب سبزی خریدنے جاتے تو خریدتے خریدتے بھیڑ میں نظر سے اپنے لڑکے کو ڈھونڈتے۔ جب پکچر دیکھنے جاتے تو کھیل ختم ہونے کے بعد ایک طرف کھڑے ہو کر بھیڑ کی طرف دیکھتے رہتے۔ سڑک پر جہاں دس پندرہ آدمی دکھائی دیتے تو وہاں لڑکے کو ڈھونڈنے کو جی کرتا اور وہ ایک ڈھونڈتی نظر ڈال کر آگے بڑھ جاتے۔ آتے جاتے لوگوں پر بھی ان کی نگاہ ڈھونڈ لینے کی ہوتی۔ کسی واقف کار کو بھی دیکھیں گے، جیسے مجھے وہ ایک دم سے سنتو بابو کے طور پر نہیں دیکھیں گے، پہلے یہ دیکھیں گے کہ میں ان کا لڑکا نہیں ہوں، پھر مجھے سنتو بابو کے طور پر دیکھیں گے۔

''مہنگو نے میرے لڑکے کو بھی رام رام صاحب کہا ہوگا؟'' بڑے بابو نے مجھ سے پوچھا۔

''اگر مہنگو کو آپ کا لڑکا دکھا ہوگا تو کہا ہوگا۔ پر گھر سے بھاگ کر وہ اسی شہر میں کیوں رہے گا؟ کہیں دور چلا گیا ہوگا۔''

''مجھ سے چھپتے رہنے کی اس کی عادت ہے۔ گھر لوٹ کر وہ کب کا آ گیا ہوتا۔ مجھے دیکھتا ہے

Scanned with CamScanner

اس لیے گھر نہیں آتا۔ میرے اور بھی بچے ہیں، نہیں تو میں گھر چھوڑ کر دور چلا جاتا کہ وہ گھر آ جائے۔ ایک دن رات کو کچھ کھٹ پٹ سنائی دی۔ میری نیند کھل گئی۔ میں کھانسا تو مجھے بھاگنے کی آواز سنائی دی۔ گھر سے کوئی سامان چوری نہیں گیا سوائے ایک پتلون کے۔ کھونٹی میں اس کی پتلون ٹنگی رہتی تھی۔ اسے بعد میں میرا دوسرا لڑکا پہننے لگا تھا۔ وہ اپنی پتلون پہننے کے لیے لے گیا۔ میں زیادہ وقت گھر سے باہر رہتا ہوں۔ گھر میں رہوں گا تو چھپا رہوں گا۔ صبح اٹھتا ہوں تو بغیر آہٹ کیے دبی زبان میں بات کرتا ہوں۔ دفتر میں میری ٹیبل دیکھو۔ آڑ میں ہے۔ دروازے سے میں ایک دم نظر نہیں آتا۔"

"آپ کو دیکھتے ہی وہ بھاگ جائے گا؟"

"ہاں، اس لیے اس کے دیکھنے کے پہلے میں اسے دیکھ کر پکڑنا چاہتا ہوں۔ پکڑ لوں گا تو وہ بھاگ نہیں پائے گا۔ سمجھا بجھا کر ٹھیک کر لوں گا۔ نہیں مانے گا تو ہاتھ پیر باندھ کر کمرے میں ڈال دوں گا۔"

"مہنگو نے آپ کے لڑکے کو رام رام صاحب کہا ہوتا تب بھی کیا فائدہ تھا؟ آپ اس سے پوچھتے تو وہ رام رام صاحب ہی کہتا۔ اس سے آپ کے لڑکے کا پتا نہ ملتا۔"

"ہاں!" بڑے بابو نے اداس ہو کر کہا۔

"کیسا لگ رہا ہے آپ کو؟" میں نے پوچھا۔

گوراہا بابو بھی یہی پوچھنا چاہتے ہوں گے۔

"میں تو ٹھیک ہوں۔ پر آپ لوگوں کو ضرور لگ رہا ہوگا کہ بچ گیا۔"

"ایسا ہم لوگ نہیں سوچ رہے ہیں،" گوراہا بابو نے کہا۔

"جیسے صاحب کی مذاق کرنے کی عادت ہے، اسی طرح دیوانگن بابو کی بھی مذاق کرنے کی عادت ہے،" میں نے کہا۔

"آپ کی تو مذاق کرنے کی عادت نہیں ہے؟" بڑے بابو نے پوچھا۔

"میری مذاق کرنے کی عادت نہیں ہے۔ میں مذاق کرنے کی عادت ڈالنا چاہتا ہوں۔ بہت خواہش ہوتی ہے کہ میں بھی مذاق کروں، پر آتا نہیں۔"

"دیوانگن بابو کے ساتھ رہ کر جلدی سیکھ جاؤ گے،" بڑے بابو نے کہا۔

Scanned with CamScanner

''صاحب سے آپ نے مذاق کرنا کیوں نہیں سیکھا؟ آپ بہت سنجیدہ رہتے ہیں،'' میں نے کہا۔
''صاحب کی طرح اگر مذاق کرنے لگوں تو آپ لوگ دو دن بھی ٹک نہیں پائیں گے۔''
''دیوانگن بابو کو دکھ ہے، وہ آپ سے معافی مانگ لیں گے،'' گوراہا بابو نے کہا۔
''میں معافی مانگنے کے بجائے فٹ بال کھیلنا چاہتا ہوں،'' ناک پھلاتے ہوئے دیوانگن بابو نے کہا۔

اچانک بڑے بابو چلّانے لگے، ''پھر مذاق اڑا رہا ہے۔ گالیاں دے رہا ہے۔ کیا صاحب ہماری سنیں گے؟ میں نے بھیک نہیں منگوادی تم سے تو کہنا۔ جیل بھجوادوں گا۔ چماروں سے پٹواؤں گا۔''

ہم بھی سن رہ گئے۔ دیوانگن بابو تو گھبرا گئے۔ آس پاس کے کمروں میں بڑے بابو کی وجہ سے منٹ بھر کے لیے ہڑکمپ مچ گیا۔ پھر ایک دم سناٹا چھا گیا۔

صاحب کا ایک چپراسی گھنٹے بھر بعد تیزی سے، قریب قریب بھاگتے ہوئے، ڈاک بک لیے کمرے میں آیا۔ بالکل نیا چپراسی۔ ایک کاغذ دیوانگن بابو نے لیا، دوسرا بڑے بابو نے، تیسرا میں نے۔

''مجھے کیوں؟ میں نے کیا کیا ہے؟''

ڈاک بک میں اس نے ہم تینوں کے دستخط لیے اور اتنی ہی تیزی سے لوٹ گیا۔

گوراہا بابو نے سناٹا توڑا، ''جو ڈاک لے کر آیا تھا وہ مہنگو کا لڑکا تھا۔''

بالکل خاموش دفتر میں کچھ دیر تک چٹ چٹ اس کے ننگے پیر بھاگنے کی آواز آتی رہی۔ بنگلے کے پچھواڑے کمرے سے لگا جو فرش کا جافری سے ڈھکا رستہ تھا، اسی پر بھاگتا ہوا جا رہا ہوگا۔

دیوانگن بابو فائلیں پٹخ کر کھڑے ہوئے۔ ''صاحب نے مجھے بلایا ہے۔ آپ لوگ فٹ بال میچ دیکھنے ضرور آیئے۔'' وہ چلے گئے۔

یہ سن کر بڑے بابو کرسی کی پیٹھ سے ایک طرف پیچھے سر لٹکا کر پسر گئے۔ ہاتھ میں ٹائپ کیے ہوئے سفید کاغذ کو دوبارہ پڑھتے ہوئے میں نروس ہو رہا تھا۔ مجھے ٹھیک سے کام نہ کرنے کے باعث تنبیہ ملی تھی۔

❁

امرود کے ساتھ ایک ہری پتّی بھی ٹوٹ کر گرتی ہے تو امرود تازہ ہے۔
مالی کی محنت کے پھل کے ساتھ کیا ٹوٹ کر لگے گا! آم سے لدی امرائی بازار میں بکنے نہیں آتی۔ ٹوکری میں آم بکیں گے!

بہت پہلے سے دفتر نو بجے سے پانچ بجے تک کا ہو گیا تھا۔ میں کئی بار صبح کھانا کھا کر نہیں آ پاتا تھا۔ بیچ میں جب ایک گھنٹے کی چھٹی ہوتی تب میں کھانا کھانے گھر جاتا تھا۔ عام طور پر سب کھانا کھا کر دفتر آیا کرتے تھے اور ایک گھنٹے کی چھٹی میں دفتر کی کینٹین یا آس پاس بنے چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں میں چائے پینے چلے جاتے تھے۔ نہیں تو لوگ اپنی ٹیبل پر ہی چائے پیتے اور گپ مارتے۔

دفتر کے احاطے کے آم اور کٹھل جب پھلتے تھے تو ملازم لوگ ان پیڑوں کی طرف گھومنا پھرنا بند کر دیتے تھے۔ احاطے کے آم کی مٹھاس اور خوشبو کا ذکر سب کرتے تھے۔ جب ان سے پوچھا جاتا کہ آپ نے کھایا ہے یا سنی سنائی بات ہے، تو وہ کہتے کہ نہیں، سنی سنائی بات ہے۔

اتفاق سے دیوانگن بابو، گوراہا بابو اور میں جس پیڑ کے نیچے کھڑے تھے وہ کٹھل کا ہی پیڑ تھا۔ چھوٹے بڑے کٹھل پیڑ کے تنے سے پھلے تھے۔

گوراہا بابو کو اچانک کچھ یاد آیا۔ ''ہم لوگ کٹھل کے پیڑ کے نیچے کھڑے ہیں،'' انھوں نے چوکنا ہو کر کہا۔

''کتنا پھلا ہوا ہے!'' میں نے پیڑ کو نیچے سے اوپر تک دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہاں سے کھسک چلیں،'' دیوانگن بابو نے کہا۔

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''کسی کا دھیان نہیں ہے؟ چلو نکل چلیں،'' گوراہا بابو نے کہا۔

Scanned with CamScanner

''کیوں؟''میں نے پھر پوچھا۔

''کٹھل اور آم زیادہ تر چوری چلے جاتے ہیں۔ ان پیڑوں کے آس پاس جو دکھائی دیتا ہے، سب اسی پر شک کرتے ہیں۔''

''دفتر کی کھڑکی سے کٹھل کی طرف دیکھوں گا تب بھی شک کر سکتے ہیں؟''میں نے کہا۔

''پیڑ کو دیکھنا اور پیڑ کے نیچے کھڑے رہنا اور بات ہے،'' دیوانگن بابو نے کہا۔

''دیوانگن بابو، آپ تو بڑے بابو کی طرح بات کرتے ہیں۔ کٹھل کی بات کریں گے تب بھی شک ہوگا؟''میں نے کہا۔

''زبردستی کوئی مجھ پر چوری کا شک کرے، یہ میں نہیں چاہتا،'' دیوانگن بابو نے کہا۔

''کٹھل کے پیڑ سے دور رہا جائے، یہی ٹھیک ہے،'' گوراہا بابو نے کہا۔

''جب پیڑ میں پھل نہ رہیں تب ان کے آس پاس گھومیں اور پھل آجائیں تب دور رہیں!'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہر سال یہی ہوتا ہے اور ہر سال آم اور کٹھل پھلتے ہیں۔''

''سنیے، آپ دونوں۔ کٹھل بہت قیمتی چیز نہیں ہے۔ پچھلے سال پندرہ پیسے کلو تک بکا ہے۔''

''ابھی دو روپے کلو ہے،'' دونوں نے ایک ساتھ کہا۔

''یہ کٹھل کس کی ملکیت ہے؟''

''سرکار کی ملکیت ہے، ہماری آپ کی ملکیت،'' دونوں نے ایک ساتھ کہا۔

''کیا کٹھل بیچے جاتے ہیں، اور اگر بیچے جاتے ہیں تو اس کے پیسے خزانے میں جمع ہوتے ہوں گے؟''میں نے پوچھا۔

''اگر بیچے جائیں تو ضرور جمع ہوتے ہوں گے۔ پر ایسی نوبت نہیں آتی۔ سب چوری چلے جاتے ہیں۔ صاحب اس چور کا پتا لگانا چاہتے ہیں،'' دونوں نے ایک ساتھ کہا۔

''چوری ہو کر صاحب کے گھر پہنچ جاتے ہوں گے؟''

''صاحب کو کس بات کی کمی ہے؟ ان چیزوں پر ہم لوگوں کی ہی نیت خراب ہوتی ہے،'' گوراہا بابو نے کہا۔

Scanned with CamScanner

''مجھے تعجب ہے۔ دن رات سنتری رہتا ہے اور دن بھر ہم لوگ رہتے ہیں، کٹھل کب چوری چلا جاتا ہے؟''

''معلوم نہیں پڑتا۔ وہ جو بڑا سا کٹھل ہے، اسے پہچان لو، کل نہیں دِکھے گا،'' انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے گوراہا بابو نے کہا۔

دیوانگن بابو نے اشارے کے لیے اٹھے ہوئے گوراہا بابو کے ہاتھ کو اس طرح پکڑا کہ اشارے والی انگلی ان کی مٹھی میں چھپ گئی۔ ''اشارہ مت کرو،'' دیوانگن بابو نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا، ''مجھے بچپن کی ایک کہانی یاد آ رہی ہے۔ ایک راجا تھا۔ اس کا ایک سندر باغیچہ تھا۔ اس باغیچے میں سونے چاندی، ہیرے جواہرات، میٹھے، خوشبو والے، طرح طرح کے پھل لگے تھے۔ روز صبح معلوم ہوتا تھا باغیچے کے پھل چوری چلے گئے۔ راجا کے بڑے لڑکے نے پہرا دیا تب بھی پھل چوری گئے۔ راجا کے منجھلے لڑکے نے پہرا دیا، تب بھی چوری گئے۔''

''چھوٹا لڑکا چور کا پتا لگا لیتا ہے،'' گوراہا بابو نے کہا۔

''چور ایک سونے کا طوطا تھا،'' دیوانگن بابو نے کہا۔

''نہیں، ایسا نہیں ہے۔ چھوٹا لڑکا بھی پتا نہیں لگا پاتا،'' میں نے کہا۔ ''چور ایک مٹی کا طوطا تھا۔ مالی نے باغیچے کی گیلی مٹی سے اسے بنایا تھا۔''

''کہانی یوں نہیں تھی!'' دیوانگن بابو نے کہا۔

میں نے دھیان دیا کہ بات کرتے کرتے دونوں مجھے کٹھل کے پیڑ سے دور لے جا رہے تھے۔

''مالی کی خواہش ہوتی کہ وہ بھی پھل کو چکھے۔ پر راجا کے ڈر سے اس کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ مٹی کا طوطا مالی کے لیے پھل توڑ کر لانا چاہتا تھا کہ ایک رات وہ سچ مچ کا طوطا ہو گیا۔ جلدی جلدی پھل توڑ کر اس نے مالی کے سرہانے اکٹھا کر دیے۔ طوطا پھر مٹی کا ہو گیا۔ بہت صبح مالی کی نیند کھلی۔ سرہانے باغیچے کے پھلوں کو دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ اس نے سوچا کہ راجا اسے چور سمجھے گا۔ راجا کا اتنا اچھا انتظام تھا کہ اس نے کسی کے پاس چھپنے کی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔ صرف خیالوں کو چھپانے کی جگہ تک اس کی پہنچ نہیں ہوئی تھی۔ پھل کھانے کا جو خیال تھا اسے تو مالی نے راجا سے چھپا لیا تھا۔ اب پھل کہاں چھپائے، اس ڈر سے وہ سارے پھل کھا گیا۔ ڈر کے مارے پھل کا سواد نہیں آیا۔''

''اتنے کڑے پہرے میں بھی کوئی طوطے کو دیکھ نہیں پایا؟'' گورا ہا بابو نے پوچھا۔

''طوطا باغیچے کی مٹی کا بنا تھا۔ اس کا ہرا رنگ برسات کے بعد ہری ہونے والی پتیوں کا نہیں تھا۔ گرمیوں میں بالٹی بھر بھر کر مالی سنچائی کرتا تھا، اس سے ہری ہونے والی پتیوں کا ہرا رنگ تھا۔ اس لیے باغیچہ طوطے کو چھپا لیا کرتا تھا۔''

''پھر کیا ہوا؟'' دیوانگن بابو نے کہا۔

''روز طوطا اس کے لیے پھل توڑتا اور ڈرا ہوا مالی اس لیے انھیں کھا جاتا تھا کہ وہ ان کو کہیں چھپا نہیں سکتا تھا۔ کھا لینے کے بعد بھی ڈر کی وجہ سے اسے پھلوں کے سواد کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا اور نہ اس کا پیٹ بھرتا تھا۔ پہلے کی طرح دن بھر کام کرتے ہوئے وہ سوچتا کہ پھل بہت لذیذ ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہانی یہیں ختم ہونی چاہیے۔''

''یہاں نہیں، ابھی پتا کہاں چلا کہ راجا نے اسے پکڑا یا نہیں۔''

''چلو ہم لوگ مان لیں کہ راجا نے اسے پکڑ لیا اور اسے سزا ہو گئی۔''

''مان لو اور قصہ ختم کرو۔ یہاں سے چلو،'' دیوانگن بابو نے کہا۔

''اِدھر سے جانے کی بات کرو گے تو میں کہانی دل سے ماننے نہیں دوں گا۔''

وہ میری بات سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ''اگر تم دونوں پوری بات سنے بغیر چلے جاؤ گے تو زور سے چلاّ کر کہوں گا۔''

'سناؤ بھائی، پر جلدی سناؤ اور جلدی ختم کر دو،'' گورا ہا بابو نے کہا۔

''پھر کیا ہوا؟'' دیوانگن بابو نے کہا۔

''ایک رات طوطا پھل توڑ کر لایا۔ اس نے سوتے ہوئے مالی کو جگایا۔ مالی نے حیرت سے طوطے کو دیکھا۔ طوطا اس سے بات کرنے لگا۔ 'مالی، تم بہت محنت کرتے ہو۔ تم نے سنا ہوگا کہ محنت کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ کیا تم نے یہ سنا ہے؟' مالی نے کہا، 'ہاں۔' 'ذرا چکھ کر دیکھو، کیا یہ پھل میٹھا ہے؟' مالی نے پھل چکھا۔ اس نے ایک بہت بڑھیا سواد محسوس کیا۔ اس احساس سے اس کی آنکھ میں آنسو آ گئے۔ میرا خیال ہے، کہانی یہیں ختم ہونی چاہیے،'' میں نے کہا۔

''یہ تمھاری بچپن کی سنی ہوئی کہانی ہے؟'' گورا ہا بابو نے کہا۔

Scanned with CamScanner

"ہاں، ایسی کہانی ماں باپ یا دادی دادا نے نہیں سنائی تھی۔ یہ کہانی میں اپنے لڑکے کو سناؤں گا۔ تھوڑا اور بدل دوں گا۔"

"کس طرح بدلو گے؟" دیوانگن بابو نے کہا۔

"کب باپ بننے والے ہو؟" گوراہا بابو نے مسکراتے ہوے کہا۔

"یہ تو میں نے مستقبل کی بات کی تھی۔ ابھی میں اپنے خاندان میں ایک پیڑھی الگ ہونے کی جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتا۔ اگر جلدی نوکری ملتی تو میں پینتیس سال کی عمر میں شادی کرتا۔ شادی کے لیے جوانی عمر سے نہیں، نوکری سے ملتی ہے۔ میں اپنے لڑکے کو بتلاؤں گا کہ پیٹ بھوک چھپانے کی جگہ نہیں ہے۔ محنت کی کمائی سے پورا پیٹ بھرنا چاہیے اور سواد لے کر کھانا چاہیے۔"

یہ لوگ مجھے کٹھل کے پیڑ سے زیادہ دور نہیں لا پائے تھے کیونکہ میں جان بوجھ کر پیڑ کے اردگرد رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"چلو اب چلیں،" دیوانگن بابو نے کہا۔

"کبھی پھل کی چوری کا آپ پر شک ہوا تھا؟" میں نے دیوانگن بابو سے پوچھا۔

"چوری کا نہیں ہوا تھا۔ لیکن پچھلے سال پیڑ کے نیچے بیٹھنے والوں میں اور اس کے آس پاس گھومنے والوں میں میرا بھی نام تھا۔"

"آپ کا کچھ بگڑا؟"

"کچھ نہیں بگڑا۔"

"پھر ڈر کس بات کا؟ میں کٹھل کے پیڑ پر چڑھوں گا،" میں نے کہا۔

"ایسا مت کرنا،" انھوں نے کہا۔

"میں تو چڑھوں گا،" میں نے کہا اور کٹھل کے پیڑ کی طرف بڑھا تو روکتے ہوے دیوانگن بابو نے کہا، "لنچ کا ٹائم ختم ہو رہا ہے۔ لوٹ چلیں۔"

"ابھی پندرہ بیس منٹ ہوں گے۔ دیکھیے، لوگ کتنے بےفکر ہو کر ہوٹلوں میں گھسے ہوے ہیں۔ پانچ منٹ میں میں تین بار اس پیڑ پر چڑھ سکتا ہوں،" میں نے کہا۔

"آپ ہم لوگوں کی بات نہیں سمجھ پا رہے ہیں،" گوراہا بابو نے کہا۔

Scanned with CamScanner

''میں سمجھ رہا ہوں۔'' میں سدھے قدموں سے پیڑ کی طرف بڑھا۔
''سنتو بابو! تھوڑی دیر کے لیے رک جاؤ،'' گورا بابا بو نے کہا۔
''میں پیڑ پر چڑھ رہا ہوں۔'' میں پیڑ کی طرف بڑھتا رہا۔ پیڑ کے پاس پہنچ کر چڑھنے کے پہلے میں نے سوچا کہ ایک بار دونوں کو دیکھ لوں کہاں ہیں۔ دونوں غائب تھے۔
وہ دونوں اتنی جلدی کیسے غائب ہو گئے؟ سامنے آم کے پیڑوں کی آڑ میں چلے گئے ہوں گے۔ آم کے پیڑوں سے انھیں خطرہ نہیں تھا۔ آم پھلا نہیں تھا۔ آخر گئے کہاں؟ جانے دو۔ میں نے لٹکتے ہوے ایک بڑے کٹھل کو چھو کر دیکھا۔ ہرا ملائم کانٹوں والا لمس محسوس ہوا۔ برآمدے میں کینٹین، پان کی دکانوں کے سامنے کھڑے، اور مزار کی بنچوں پر بیٹھے ہوے اہلکاروں کی نظریں میری طرف ہو گئیں۔ لوگ میری حرکت سے حیران تھے۔ مجھے بے وقوف سمجھ رہے ہوں گے یا بالکل پاگل۔ مہنگو کے پاگل ہو جانے کے بعد کوئی بھی پاگل ہو سکتا تھا، دفتر میں یہ خیال عام تھا۔
دفتر کی کینٹین سے بڑے بابو نکل کر آئے۔ وہیں دور سے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلانے لگے۔ بڑے بابو کے بلانے کے باوجود میں ایک جھٹکے میں سرکس والوں کی طرح کٹھل کے پیڑ پر چڑھ گیا۔ ایک بڑا کٹھل مجھ سے ٹوٹ کر گر پڑا۔ میرا پیر اس پر پڑ گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کسی کے ہاتھوں پہلے سے تھوڑا ٹوٹا ہوا ہو؟ لوگ اپنا کام بھول کر مجھے دیکھ رہے تھے۔ بڑے بابو نے میری طرف دیکھ کر دو تین بار اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ انھیں دیکھ کر میں خوشی سے ہاتھ ہلانے لگا، اسی طرح جیسے اہم لوگ اڑتے وقت ہوائی جہاز کے دروازے پر کھڑے ہو کر لوگوں کی طرف ہاتھ ہلاتے ہیں۔ ہوا بہت اچھی چل رہی تھی۔ ایک چڑیا انجانے میں پیڑ پر بیٹھنے والی تھی، پر مجھے دیکھ کر چیں چیں کرتی ہوئی بھاگ گئی۔ اس کا دھوکا کھا جانا فطری تھا۔ اس پیڑ پر آدمیوں کا چڑھنا عام بات نہیں تھی۔ انہونا واقعہ تھا۔ پیڑ پر کبھی بہت پہلے کی جو پتنگ اٹکی تھی اس کا کاغذ تو تھا نہیں۔ کمانی بھر تھی۔ ڈور ڈالیوں میں اٹکی ہوئی تھی۔ پتنگ پھنسی ہو گی تب کسی لڑکے یا آدمی کی اسے نکالنے کی ہمت نہیں ہوئی ہو گی۔ خزانے کا سنتری آرام کی حالت میں مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ کیا کر سکتا تھا؟ میں نے جو کچھ بھی کیا، وہ اس میں کس طرح مداخلت کرے، یہ سنتری کی سمجھ میں نہیں آیا ہو گا۔
جب میں نے بڑے بابو کی طرف ہاتھ ہلایا تھا تو لوگ گھوم کر دیکھنے لگے تھے کہ وہ کون ہے جسے

Scanned with CamScanner

میں اشارہ کر رہا ہوں۔ کیا اس واقعے سے، اس سازش سے وہ آدمی بھی جڑا ہوا ہے؟ بڑے بابو یہ دیکھ کر کینٹین میں گھس گئے تھے۔

لنچ کا ٹائم ختم ہونے والا تھا۔ لوگ لوٹنے لگے اور جاتے جاتے مجھے دیکھتے، پر کنکھیوں سے، کیونکہ جو کوئی میری طرف دیکھتا تھا اس کی طرف دیکھ کر میں مسکرانے اور ہاتھ ہلانے لگتا۔ تب وہ سٹپٹا جاتے تھے۔ جب سب چلے گئے تب بھی مجھے اندازہ تھا کہ ابھی دفتر شروع ہونے کا وقت نہیں ہوا ہے۔ میں اکیلا پڑ جانے کی وجہ سے پیڑ سے نیچے اترا۔ کٹھل ٹوٹ کر لڑھکتا ہوا پیڑ سے چار قدم دور چلا گیا تھا۔ اسے میں نے اٹھایا۔ بہت وزنی تھا۔ میں اسے ایک ہاتھ میں لٹکا کر زیادہ دیر تک نہیں اٹھا سکتا تھا۔

کٹھل کندھے پر رکھ کر میں ہال میں گھسا۔ ہال میں ایک جگہ اکٹھے ہو کر سب میرا ذکر کر رہے تھے۔ میں نے ان لوگوں کی طرف دھیان نہیں دیا اور ہال سے ہو کر کمروں کو پار کرتا ہوا اپنے کمرے میں آیا۔ مجھے کٹھل لیے ہوئے دیکھ کر کئیوں نے سوچا ہوگا کہ میں کسی آدمی کا کٹا ہوا سر کندھے پر رکھ کر لے جا رہا ہوں، اور وہ سر میرا ہے۔

میں نے بڑے بابو کی ٹیبل پر دھیرے سے ایک ہاتھ سے فائلیں سرکا کر کٹھل رکھ دیا۔ کانچ نہ ٹوٹے اس بات کا مجھے دھیان تھا۔ بڑے بابو نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے ان کا سابقہ کسی ڈھیٹ مورکھ سے پڑا ہے۔ مورکھ اگر ڈھیٹ ہو تو اسے بات دوسری طرح سے بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

میں نے کہا، ''اسے جمع کر لیجیے۔ لنچ ٹائم میں میں کٹھل کے پیڑ پر چڑھا تھا۔ کھانا میں کھا کر آیا تھا۔ ہوٹل میں چائے ناشتے کے لیے میرے پاس ہمیشہ پیسے نہیں ہوتے۔ خالی وقت ہونے کی وجہ سے احاطے میں لگے ہوئے کٹھل کے پیڑ پر چڑھنے کو میرا جی چاہا۔ جب میں چڑھ رہا تھا تو یہ کٹھل اپنے آپ ٹوٹ کر گر پڑا۔ میں نے نہیں توڑا۔ اسے جمع کر لیجیے اور اس کی رسید دے دیجیے تاکہ میں اپنی ذمے داری نبھانے کے باوجود کسی دوسری جھنجھٹ میں نہ پھنس جاؤں۔ آپ چاہیں تو جو کچھ میں نے کہا ہے، اسے لکھ کر دینے کو بھی تیار ہوں۔''

بڑے بابو دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے میری بات سن رہے تھے۔ جب میری بات ختم ہو گئی تو سر اٹھا کر انھوں نے کہا، ''آپ اپنی ذمے داری ضرور پوری کیجیے۔ ذمے داری پوری کرنے سے کبھی آپ کو روکا ہے کیا؟ اب آپ جب بھی کٹھل کے پیڑ پر چڑھیں، کٹھل ٹوٹ کر گر جائے تب بھی آپ

مجھے مت بلوائیے۔ آپ آم کے پیڑ پر چڑھیے۔ تاڑ کا بھی پیڑ ہے۔ جی چاہے تو اس پر چڑھ جائیے۔ اس کے اوپر چڑھ کر آپ جو کچھ بھی دیکھیں، صاحب کا بنگلہ آپ کو ضرور دِکھے گا۔ دھیان سے دیکھیں گے تو آپ کا گھر بھی نظر آ جائے گا۔ یہ مت کجھیے کہ میں تاڑ کے پیڑ پر کبھی چڑھا تھا۔ سائیکل کے اوپر چڑھنے میں مجھے اونچی جگہ کی ضرورت ہوتی ہے تو تاڑ پر چڑھنے کے لیے بھی اونچی جگہ کی ضرورت ہوگی، جس پر سیڑھیاں ہونی چاہییں۔ خیر، اس کٹھل کی رسید میں آپ کو نہیں دے سکتا۔ آپ ناظر سے جا کر بات کر لیں۔" بڑے بابو نے کٹھل کی طرف ایک بار بھی نہیں دیکھا۔ انھیں ڈر ہوگا کہ کٹھل کی طرف دیکھتے ہی سب ذمے داری ان کی ہو جائے گی۔

"میں ناظر سے بات نہیں کروں گا۔ اس کا دفتر، مال خانہ، اس کے کلرک اور وہ خود مجھے پسند نہیں ہے۔ میں آپ کو کٹھل دے رہا ہوں۔ آپ وصولی کی رسید دے دیجیے۔ اس میں آپ کو کیا اڑچن ہے؟ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔"

"میں نے کہا نا کہ رسید دے کر میں جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا۔ کٹھل لے کر بیچنے میں بازار تو جاؤں گا نہیں۔ اس کی لکھا پڑھی یہاں کسی کاغذ رجسٹر پر نہیں ہوگی۔ رسید میں کیسے دے دوں؟ اسے تول کرا لائیے، پھر رسید کی بات کیجیے۔ اور اسے میرے سامنے تولیے۔ دو کلو کا کٹھل بعد میں دس کلو کا وہیں رکھے رکھے ہو جائے گا۔ بہت دقت ہے۔ یا شام کو دفتر بند ہونے کے بعد آپ دفتر کے لوگوں میں اس کی نیلامی کر دیجیے اور نیلامی سے جو پیسے ملیں، ناظر کے پاس جمع کر دیجیے۔ اضافی آمدنی کی مد میں ناظر اسے جمع کر لے گا۔ پر ناظر سے آپ بات ضرور کیجیے۔"

"ترازو کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اتنے دن ہو گئے آپ کو، کیا آپ نے مجھے ترازو لیے کبھی کچھ تولتے دیکھا ہے؟ آپ مال خانے جائیے، شاید وہاں ہو۔"

"ناظر کو بھی میں نے کچھ تولتے نہیں دیکھا۔"

"وہاں ترازو ہوگا۔ ایک سے زیادہ ترازو بھی ہو سکتے ہیں۔ کسی گاہک نے ترازو باٹ سے ڈنڈی مارنے والے بیوپاری کا خون کیا ہوگا تو ضبطی میں ترازو باٹ مال خانے میں آیا ہوگا۔"

"جیسا آپ کہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔"

Scanned with CamScanner

''ایسا کیجیے، آپ ایک بار اور پیڑ پر چڑھیے، اور کٹھل کو چار گواہوں کے سامنے اسی جگہ لگا دیجیے۔ آپ مجھ سے چھپ کر تو پہلے پیڑ پر نہیں چڑھے تھے؟''

''میں آپ سے صلاح مانگ رہا ہوں۔''

''میں ناظر کے پاس جانے کے لیے کہتا ہوں، آپ جاتے نہیں۔''

''ایک بار میں آپ کے کہنے سے ناظر کے پاس گیا تھا۔ ناظر مال خانے کا دروازہ اُڑکائے ایک پرانی چارپائی پر سو رہے تھے۔ ایکبارگی سمجھ نہیں پایا کہ ناظر سو رہے ہیں یا جاگ رہے ہیں۔ میں بھول گیا تھا کہ ان کی بائیں آنکھ نقلی ہے یا داہنی آنکھ۔ ان کی ایک آنکھ کھلی تھی اور ایک بند۔ سوتے میں ان کی اصلی آنکھ بند ہو جاتی ہوگی۔ میں نے انھیں جگایا۔ ایک اصلی آنکھ کھول کر وہ جاگے۔ میں نے ان سے کہا کہ بڑے بابو چائے کے لیے بلا رہے ہیں۔ 'بہت اچھی نیند تھی۔ تم نے جگا دیا،' انھوں نے کہا، 'جانتے ہو، اس چارپائی پر پنکاپارا گاؤں کی لڑکی کے ساتھ بلاتکار کیا گیا تھا۔ ٹرک میں تین سردار تھے۔ راستے میں مچان گاؤں کے پہلے ان لوگوں کو سر پر پیٹی رکھ کر جاتی ہوئی لڑکی دکھائی دی۔ اس کے پاس ٹرک روک کر ایک سردار نے پوچھا، 'کون سے گاؤں جانا ہے؟' اس نے کہا، 'پنکاپارا۔' 'ٹرک سے چلو گی؟' سردار نے پوچھا۔ وہ راضی ہو گئی۔ ایک سردار پیچھے چلا گیا۔ لڑکی سامنے دو سرداروں کے بیچ میں بیٹھ گئی۔ جب بیٹھ گئی تب عقل آئی، غلطی ہوئی۔ مچان گاؤں کے باہر ان کا گیرج تھا۔ اس گیرج میں یہ چارپائی تھی۔ اس پر مجھے اچھی نیند آتی ہے۔ ابھی بہت اچھا سپنا دیکھ رہا تھا۔ تم چھوٹے ہو، نہیں تو پورا سپنا بتاتا۔ ذرا دیکھنا تو میری داڑھی بڑھی ہے یا نہیں۔' میں نے دیکھا کہ ناظر کی کھچڑی داڑھی کافی بڑھی ہوئی تھی۔ ان کی داڑھی ہمیشہ بڑھی رہتی ہے۔ یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ان کی وجہ سے میری روز داڑھی بنانے کی عادت پڑ گئی ہے۔ کٹھل کی ترکاری مجھے اچھی نہیں لگتی۔ اس کے اوپر ہاتھ پھرا کر دیکھیے، دو تین دن کی بڑھی ہوئی ہری داڑھی کی طرح ہے،'' کٹھل پر ہاتھ لگا کر میں نے کہا۔

''آپ اسے ٹیبل کے اوپر سے ہٹائیے،'' بڑے بابو نے کچھ اس طرح کہا کہ میں نے فوراً کٹھل اٹھا کر نیچے رکھ دیا۔ اسے میں نے ٹیبل کے پائے سے ٹکا دیا۔ وہ تھوڑا لڑھکنے لگا تھا۔

''یہاں رکھے رکھے سڑ جائے گا۔ کہیں اور لے جائیے۔ مرضی ہو تو اپنے گھر لے جائیے۔ کم سے کم میں کچھ نہیں کہوں گا۔ دوسروں کی ذمے داری میں نہیں لیتا،'' بڑے بابو نے کہا۔

Scanned with CamScanner

''اچھی بات ہے۔ میں اسے اپنے گھر لے جاتا ہوں۔ امانت میں خیانت کا دوش تو نہیں منڈھیں گے؟''

''میں کسی پر دوش نہیں منڈھتا۔ لیکن جو کچھ بھی آپ کریں گے، اپنی مرضی سے کریں گے۔''

''میری نیت صاف ہے۔ آپ اسے جمع کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ کٹھل کی جو بھی قیمت آپ لگائیں گے، اتنی قیمت کے لیے میں ہمیشہ دین دار ہوں۔''

''جو دینا ہے ناظر کو دینا، مجھے نہیں۔ اب آپ کام کیجیے اور مجھے بھی کام کرنے دیجیے۔''

دیوانگن بابو اور گوراہا بابو سے میں نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ دونوں مجھ سے کٹ رہے تھے۔ اگر کٹھل دیوانگن بابو یا گوراہا بابو کی ٹیبل پر رکھ دوں تو؟ میں نے سوچا۔

کٹھل اٹھا کر میں نے دیوانگن بابو کی ٹیبل پر رکھ دیا۔

دیوانگن بابو یہ دیکھ کر، چپ چاپ اٹھ کر کمرے سے باہر ہو گئے۔ میں نے گوراہا بابو کی طرف دیکھا تو وہ بھی اٹھے اور کمرے سے باہر ہو گئے۔ ''مزہ آ گیا،'' میں بڑبڑایا۔

اتنا بڑا کٹھل دیکھ کر بیوی نے پوچھا: ''مفت ملا ہے؟''

''ہاں، فی الحال،'' میں نے کہا۔

''ادھاری لائے ہو؟''

''ہاں، فی الحال۔''

''ہم دونوں کے لیے پاؤ بھر کٹھل بہت ہے۔''

''یہ دفتر کا کٹھل ہے۔ پکانے کے لیے نہیں ہے۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ دفتر کے احاطے میں لگا ہوا تھا، مجھ سے ٹوٹ گیا۔''

''کیسے ٹوٹ گیا؟''

''پیڑ پر چڑھا تھا۔''

''کیوں؟''

''پیڑ پر چڑھنے کی مناہی تھی، اس لیے۔ اسے جمع کرنے کے لیے بڑے بابو تیار نہیں ہوئے،

Scanned with CamScanner

مجبوری میں اسے گھر لانا پڑا۔ کٹھل ٹوٹ جانے سے مسئلہ پیدا ہو گیا۔ گھر لے آنا ہی ایک حل بچا تھا۔ اور قاعدے کے مطابق بغیر خریدے اسے گھر نہیں لانا تھا۔ ایک گلاس پانی دو۔''

''اب کیا کرو گے؟''

''مجھے پھانسی لگ جائے گی۔ پینے کے لیے پانی مانگ رہا ہوں اور تم دے نہیں رہی ہو۔ میری فکر اور بڑھا دیتی ہو۔ کوئی بچاؤ نہیں دیتیں۔ تم سے بات بتاؤ تو تم اسے اس طرح کر دیتی ہو کہ فکر بڑھ جاتی ہے۔ دفتر سے گھر تک بے فکر آیا۔ دفتر میں مجھے کٹھل سے ڈر نہیں لگا۔ اندر گھستے ہی اس سے ڈر لگنے لگا ہے۔''

''اسے صاحب کے گھر نہیں دے سکتے؟'' اس نے پوچھا۔

یہ اچھا بچاؤ تھا اور میرا موڈ ٹھیک ہو گیا۔ چہرے سے یہ ظاہر ہو گیا ہو گا، کیونکہ مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ بھی کھل گیا تھا۔

''ابھی دے آؤں یا کل صبح؟ شام کو جانے سے صاحب ناراض ہو سکتے ہیں۔''

''رات بھر میں کوئی پریشانی تو نہیں ہو گی؟''

''کہہ نہیں سکتا۔ سب کچھ بڑے بابو کے اوپر ہے۔ مجھے تجربہ نہیں ہے۔ دفتر میں کوئی میری مدد کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔''

''رات بھر میں کٹھل خراب نہیں ہوتا۔''

''میری نیت خراب نہیں ہے، یہ سب کو معلوم ہے۔ اسے سنبھال کر رکھنا، چوہے اسے کاٹ نہ ڈالیں۔''

''اسے ٹیبل کے اوپر رکھ دوں؟''

ٹیبل کے اوپر بھی میں نے چوہے دیکھے ہیں۔ اور کوئی جگہ نہیں ہے؟ پیٹی میں بند کر کے رکھ نہیں سکتے۔ الماری میں سمائے گا نہیں، پلڑے بند نہیں ہوں گے۔ ٹیبل کے اوپر ہی رکھ دو، پر ٹیبل دیوار سے سٹا کر مت رکھنا۔''

''چوہوں نے گڑبڑ کی تو بازار سے دوسرا کٹھل نہیں لا سکتے؟''

''ارے واہ! بازار سے ضرور لا سکتے ہیں۔ دفتر کے کٹھل اور بازار کے کٹھل میں کوئی فرق نہیں کر

Scanned with CamScanner

سکتا، کبھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اتنا ہی بڑا ہونا چاہیے۔ کم زیادہ بھی ہوا تو کچھ نہیں ہوتا۔ میں تول کر نہیں لایا تھا۔"

"پڑوس والی کہہ رہی تھی کہ بازار میں کل بہت ٹماٹر آیا تھا، آج ایک بھی دیکھنے کو نہیں ملا۔ اسی طرح کل کٹھل نہ ملا تو؟"

"بس ہو گیا، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اس پر اب سوچ بچار مت کرنا۔ تم بات کو سنبھال کر پھر اس کی چھیچھالیدر کرتی ہو۔ کل صبح کٹھل صاحب کے گھر پہنچا دوں گا، اس سے زیادہ کچھ نہیں کرنا ہے۔"

شادی میں ایک بڑھیا گدا اور ایک بڑی رضائی ملی تھی۔ بڑے پلنگ کے لائق گدا تھا۔ اتنی بڑی چارپائی بھی نہیں تھی، اس لیے یہ گدا استعمال نہیں ہوتا تھا۔ جاڑا ختم ہونے کے بعد میں نے سوچا تھا کہ رضائی کو موڑ کر گدے کے طور پر استعمال کیا جائے۔ بیوی کا کہنا تھا کہ اس سے رضائی کی روئی دب کر جگہ جگہ سمٹ آئے گی، اور پھر رضائی کم گرمائے گی۔ اس لیے اس نے ایک پرانی سفید ساڑھی میں رضائی باندھ کر، دیوار کی کھونٹی پر ٹانگ دی تھی۔ سفید دیوار پر سفید گٹھری مجھے دیوار کی رسولی کی طرح لگی۔ بعد میں میں نے گٹھری نکال دی۔ گدے کو دوہرا کر کے لکڑی کی پیٹی کے اوپر رکھ دیا گیا۔ گدا بڑا ضرور تھا، پر موٹا نہیں تھا، اس لیے اچھی طرح دوہرا ہو گیا۔ گٹھری کو میں نے اس کے اوپر رکھ دیا تھا۔

بہت تڑکے میری نیند کھلی، گھر بھر میں روئی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا، بیوی فرش پر پھیلی ہوئی روئی اکٹھی کر کے ٹوکری میں رکھتی جا رہی تھی۔ کھلی کھڑکی سے اچھی ہوا آ رہی تھی۔ اس لیے روئی کے ریشے بہت اوپر تک کمرے میں اڑ رہے تھے۔ چادر میں روئی کے ریشے چپکے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں بھی چپکے ہوئے تھے۔ ایکبارگی مجھے لگا تھا کہ میں سپنا دیکھ رہا ہوں۔ چونکہ بیوی بہت اداس اور پریشان دکھائی دی، اس لیے میں سمجھ گیا کہ میں سپنا نہیں دیکھ رہا ہوں، کیونکہ کچھ دنوں سے میں خوش حالی کے سپنے دیکھنے لگا تھا۔

چوہوں نے گدے اور رضائی کو کتر ڈالا تھا۔ میں نے بیوی کو سمجھایا کہ صرف غلاف کا نقصان ہوا ہے۔ اس کے باوجود گدے کے پھٹے ہوئے غلاف سے تکیے کے غلاف بن سکتے تھے۔ روئی اکٹھی ہو گئی تھی۔ اسے گدے کے پھٹے ہوئے غلاف میں باندھ کر رکھ دیا گیا۔

Scanned with CamScanner

تین دن بعد روئی دھنوانے کے لیے جب گٹھری کھولی گئی تو اس کے اندر چوہے کے چھوٹے چھوٹے تین چار بچے دکھائی دیے۔ لال لال کلبلاتے بچے۔ ان کو میں اوپر کی روئی سمیت پھینکنے جا رہا تھا تو اماں نے منع کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ چوہے کے بچے بہت جلدی بڑے ہو جاتے ہیں۔ بڑے ہو کر خود باہر نکل جائیں گے۔ باہر ڈال دوں گا تو کوے اٹھا کر لے جائیں گے یا دھوپ سے مر جائیں گے۔ ابھی گدے کی ضرورت نہیں تھی۔ اماں جب آتی تھیں تو اپنے ساتھ بستر لے کر آتی تھیں۔

سمپت سے میں نے چوہے والی بات بتلائی۔ پوری بات سن کر اس نے کہا، ''چلو تجزیہ کر کے دیکھیں۔ تجزیہ کرنے کے بعد جیسا ہوگا، کیا جائے گا۔''

میں نے کہا، ''تجزیہ ہو چکا ہے کہ چوہے بڑے ہو کر اپنے آپ باہر نکل جائیں گے۔ اس کے بعد روئی دھنوا کر رضائی گدے بنوا لیے جائیں گے۔ میں اس کے لیے تیار بھی ہوں، کیونکہ میرے پاس ابھی پیسے نہیں ہیں۔ چھچھوندر کپڑوں کا نقصان نہیں کرتا۔''

''یہ تو ٹھیک ہے کہ چوہے بڑے ہو کر باہر نکل جائیں گے پر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے فوراً بعد دوسرے چوہے اور بچے دے دیں۔''

یہ سن کر میں فکر مند ہوا۔ ''تم نے مجھے پریشانی میں ڈال دیا۔ مجھے تجزیہ نہیں کروانا چاہیے تھا۔ ضروری نہیں ہے کہ دوسرے چوہے اسی جگہ آ کر بچے دیں۔''

''جو بات مجھے معلوم ہے اور جس سے تمھارا بھلا ہوتا ہے، میں تمھیں ضرور بتلاؤں گا۔ دوستی کا یہی مطلب ہے۔''

منھ بنا کر میں نے کہا، ''دوست! دوست!''

''تم لوگوں کو گھن آتی ہو تو میں پھینک دوں گا۔ پاپ مجھے لگے گا۔ تم لوگوں کو کچھ نہیں ہوگا۔''

دوست کو لے کر میں گھر آیا۔ ''اماں، سمپت آیا ہے،'' میں چلاّیا۔

دونوں کمرے میں اس جگہ گئے جہاں روئی کی گٹھری تھی۔ حیرت سے میں نے دیکھا کہ روئی کی کھلی گٹھری میں چوہے کے بچے کے اوپر ایک ٹوکری اوندھی کر رکھ دی گئی تھی۔ بلی ٹوکری کو کھسکا نہ پائے، اس لیے اس کے اوپر ایک اینٹ بھی رکھ دی گئی تھی۔

''ان کی مضبوط حفاظت کی گئی ہے،'' سمپت نے کہا۔

Scanned with CamScanner

''بلی گٹھری سونگھ رہی تھی،'' اماں نے کہا۔

''جب میں چھوٹا تھا تو مجھے بلی سے کیسے بچاتی ہوگی؟ میرے اوپر بھی ٹوکری رکھتی ہوگی اور ٹوکری کے اوپر اینٹ؟''

''اب اوٹ پٹانگ بولنا چھوڑ۔ شادی ہوگئی ہے۔ جلد ہی بال بچے والا بھی ہو جائے گا۔ آدمی کے بچوں کو بلی کا ڈر نہیں رہتا۔ گھر میں کوئی نہ کوئی تو رہتا تھا۔ تم لوگوں کو اکیلے کبھی نہیں چھوڑا۔''

''سمپت، تمھاری ماں تمھارے اوپر ٹوکری ضرور رکھتی ہوگی کیونکہ تم ماں باپ کے اکلوتے لڑکے ہو؟''

''میری ماں سنکی ہے۔ وہ بلی کو دیکھ کر ٹوکری ہٹا دیتی ہوگی۔ اور باپ ٹوکری کے اوپر رکھی اینٹ کو اٹھا کر میری چھاتی پر رکھ دیتا ہوگا۔ اب تم سوچو، ابھی چھاتی پر اینٹ رکھیں تو کتنا وزن محسوس ہوتا ہوگا۔ میں کتنا چھوٹا ہوں گا، لمبائی سے اینٹ رکھی جاتی ہوگی تو گلے سے پیٹ کے نیچے تک رکھی رہتی ہوگی۔''

ہم لوگوں کی باتیں سن کر اماں اٹھ کر چلی گئیں۔ بہت سے لوگ چھاتی کے بوجھ کو سمیٹے ہوئے سوچتے ہوں گے کہ اس سے حفاظت ہے۔ کم سے کم جان بچی ہوئی ہے۔ مرے نہیں۔

اماں چلاتی رہیں اور بیوی نے بھی منع کیا، اس کے باوجود سمپت میرے کہنے سے چوہوں کے بچوں کو روئی سے ایک ٹین کے ڈبے میں ڈال کر لے گیا۔ میں اس کے پیچھے جانے لگا تو بیوی نے دروازے کے پاس میری قمیض کو پیٹھ کی طرف سے پکڑ لیا۔ وہ کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے روکنا چاہتی ہوگی پر قمیض ہی پکڑ پائی۔

''کیا ہے؟'' میں نے جھلا کر کہا۔

''میرے پیٹ میں بچہ آ گیا ہے،'' دھیرے سے بیوی نے کہا۔

میں کچھ لمحے حیران سا کھڑا ہوا بہت دور دھندلکے میں اپنے آپ کو بہت خوش دیکھ رہا تھا اور خوشی سے اسی کھائی کے اوپر نیچے اچھل رہا تھا جس میں ایک بار کپڑا بدلتے وقت محسوس کیا تھا۔ پھر میں دھڑام سے پھسل کر کھائی کے نیچے جانے لگا اور فلم میں دیکھے گئے سین کی طرح کھائی کی دیوار پر اگے ہوئے کسی جنگلی پیڑ کی، برسات کے کٹاؤ کے باعث اوپر نکل آئی جڑ کو پکڑ کر نیچے جانے سے بچ گیا۔ تھوڑا اور اوپر چڑھا تو اسی پیڑ کی شاخ پکڑ میں آ گئی۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا کہ بہت اونچا چڑھنا ہے۔ دیوار کی

Scanned with CamScanner

طرح اونچائی ہے۔اوپر مجھے کوئی نہیں دکھائی دیا۔ میں نے سوچا کہ کیا میں بچاؤ،بچاؤ چلاؤں۔
سمپت آگے چلا گیا تھا۔ میں تیزی سے اس کے پیچھے نکلا۔ وہ سڑک کے کنارے نالی میں ڈبا خالی کر کے واپس آ رہا تھا۔

''میں نے ڈبا نہیں پھینکا،'' اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔ ڈبا مجھے دینے کے لیے اس نے ہاتھ آگے کیا۔
ڈبا لے کر میں نے کہا، ''دوست! دوست!'' ڈبا سڑک کے کنارے گھورے میں پھینک دیا۔
تب خالی ڈبا لے کر گھر لوٹنا ویسا ہی ہوتا جیسے گھر میں ایک بکری تھی، گھر والوں کے منع کرنے کے بعد بھی بکری قصائی کو بیچ دی گئی اور اس کے گلے میں بندھی رسی واپس لے آئے۔ یا گود میں بچہ لے کر ندی کے کنارے گھومنے گئے۔ بچہ ہاتھ سے چھوٹ کر ندی میں گر گیا۔ اس کا ایک جوتا ہاتھ میں رہ گیا۔ اسے لے کر گھر لوٹے۔ اگر میری ایک چپل ندی میں گر جاتی تو میں بچی ہوئی ایک چپل لے کر نہ لوٹتا۔ دوسری چپل بھی ندی میں ڈال دیتا۔ کسی کی سائیکل کے کیریر پر پیچھے بیٹھے رہنے سے کچھ دیر بعد ایک پیر سن ہو جائے اور پیر سے نکل کر چپل راستے میں گر جائے تو معلوم نہیں ہوتا۔ گھر لوٹ کر سائیکل سے اترتے، کچھ دیر بعد پیر ٹھیک ہوتا، تب معلوم ہوتا کہ ایک چپل کہیں گر گئی۔ ایسی صورت میں گھر کے اتنے پاس دوسری چپل لے کر گھر نہیں لوٹتا۔ باہر سڑک پر بیچ ایک چپل اتار کر گھر لوٹتا۔ وہ چپل کسی کے استعمال میں نہ آتی۔

صاحب کے بنگلے کے پاس پہنچنے پر خیال آیا کہ بڑے بابو نے نوکر کی قمیص پھاڑے جانے کی خبر پہنچا دی ہوگی۔ لیکن کٹھل ساتھ میں ہونے سے کچھ ہمت بندھی تھی۔ خطرے کے دور ہوتے ہی خطرے کا سامنا کرنے کی ہمت بڑھ جاتی ہے اور عین موقعے پر بچنے کی بات سوچنے لگتے ہیں۔
کئی دنوں سے صاحب کے بنگلے نہیں آیا تھا۔ مجھے بنگلہ بہت عالیشان لگا۔ ہوسکتا ہے صاحب کے ڈر سے لگا ہو۔ پورچ میں گاڑی نہیں تھی۔ صاحب گھر پر نہیں ہوں گے کیونکہ بائی صاحب باغیچے میں تھیں۔ صاحب سے سامنا نہیں ہوگا اس خیال سے بوجھ ہلکا ہو گیا۔ بائی صاحب شاندار لگ رہی تھیں۔ یا تو وہ کسی تقریب سے واپس آئی تھیں یا جانے والی تھیں۔ کٹھل لے کر اندر گھستے ہی یہ بھول گیا کہ جو ہلکی خوشبو آ رہی تھی وہ باغیچے کے پھولوں کی تھی یا بائی صاحب کے سینٹ کی۔

Scanned with CamScanner

''آپ کہاں بھاگ گئے تھے؟'' بائی صاحب نے پوچھا۔

''جی، میری بیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔''

''کٹھل کہاں سے لائے؟'' ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے کٹھل کو دیکھ کر انھوں نے کہا۔

''دفتر کے احاطے میں پھلا تھا۔ ٹوٹ کر گر گیا تھا،'' میں نے کہا۔

برآمدے میں کٹھل دیوار سے ٹکا کر رکھ آیا۔

''آپ تھوڑی دیر مالی کا کام دیکھیں گے،'' کہہ کر وہ اندر چلی گئیں۔

''جی!'' میں نے مستعدی سے کہا۔ وہی بوڑھا مالی جسے میں ڈاکٹر صاحب کے باغیچے میں کئی بار دیکھ چکا تھا، دھوتی کو لنگوٹ کی طرح جانگھ میں لپیٹے ہوئے، ایک بہت چھوٹی نکیلی چھڑ سے فالتو گھاس کو جڑ سمیت اکھاڑ رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے کام کر رہا تھا۔ کام میں محو تھا۔ جھکے ہوئے ہونے سے اس کی ریڑھ کی ہڈی پیٹھ میں کمان کی طرح ہو گئی تھی۔ ہمیشہ دھوپ میں چمکنے والی پیٹھ چمک رہی تھی۔

دس منٹ بعد میں اس سے اُوب گیا۔ بے ہوشی میں میں نے اسی مالی سے امید کی تھی کہ ڈاکٹر صاحب سے مجھے بچائے گا۔ مجھ سے کچھ زیادہ آزاد لگ رہا تھا۔ میں نے کہا، ''جلدی کرو۔ جلدی ہاتھ چلاؤ۔ فالتو وقت گزارنے سے کام نہیں چلے گا۔'' اس نے میری بات کی پروا نہیں کی۔ صاحب کے لیے میری ایمانداری بوڑھے مالی پر سخت ہونا چاہتی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا۔ اس کی داڑھی بہت بڑی تھی۔ داڑھی کے سفید بال چھدرے تھے۔ لگتا تھا جیسے سفید لکیریں کھینچی گئی ہیں۔

دور سے صاحب کی گاڑی آتی دکھائی دی۔ صاحب کی گاڑی کے آنے کی آواز سن کر میں چوکنا ہو گیا تھا۔ مالی پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ بنگلے سے نکل کر، دوڑتے ہوئے آکر مہنگو نے احاطے کا دروازہ کھولا۔ صاحب آ رہے ہیں۔ اس کے باوجود مالی اسی ڈھیلے پن سے کام کر رہا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ مجھے احاطے کے پاس جا کر کھڑا ہو جانا چاہیے یا پورچ کے پاس۔ صاحب گاڑی سے اتریں اور نمسکار کروں۔ گیٹ کے اندر گاڑی کے گھستے ہی معلوم نہیں مجھے کیا ہوا کہ بوڑھے مالی کے بازو میں بیٹھ کر، سر جھکائے اس کے ساتھ میں بھی ہاتھ سے گھاس اکھاڑنے لگا۔ ہاتھوں سے بھی جڑ سمیت گھاس نکل رہی تھی۔ زمین میں باغیچے کی نمی تھی۔ جیسے ہی میں گھاس اکھاڑنے لگا، مالی نے میری طرف دیکھا۔ جب کسی سے پوچھیں کہ کیا آپ کو معلوم ہے اور تب وہ اس طرح دیکھے کہ جیسے اسے سب معلوم ہے، بس

Scanned with CamScanner

اسی طرح مالی نے مجھے دیکھا تھا۔ میں سر جھکائے گھاس اکھاڑتا رہا۔

صاحب گاڑی سے اترے۔ انھوں نے ہم لوگوں کی طرف دیکھا۔ مالی کے ساتھ میں گھاس اکھاڑنے کے کام میں لگا ہوا تھا۔ ''کون ہے وہاں؟'' صاحب نے پوچھا۔

''جی، میں سنتو ہوں،'' اکھڑی گھاس ہاتھ میں لیے کھڑے ہو کر میں نے کہا۔

''اچھا اچھا، ٹھیک ہے،'' کہتے ہوے صاحب چلے گئے۔ کیا ٹھیک ہے؟ میں نے منھ بنا کر سوچا۔ میرا گھاس اکھاڑنا یا میرا سنتو بابو ہونا؟

بیٹھ کر پہلے کی طرح کام میں لگ گیا۔ باغیچے کی گھاس اکھاڑتے ہوے میں نے صاحب سے اپنے آپ کو بچالیا تھا۔ میں نے سوچا، صاحب قمیض پھاڑنے والی بات پر بہت سنجیدہ نہیں ہوں گے؟ ہو سکتا ہے بڑے بابو نے ان سے کچھ نہ کہا ہو؟ دس منٹ کے اندر ہی میں کام میں محو ہو گیا۔ تب مجھے افسوس ہوا کہ مجھے مالی سے کام کرنے کے لیے سختی سے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میں نے اس سے تیز ہاتھ چلانے کے لیے کہا تھا۔ میں اس کے مقابلے میں بہت سست لگ رہا تھا۔ میں اس کی برابری میں بیٹھ گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں زمین صاف کرتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ اس کے پیچھے بغیر گھاس کی صاف ستھری پڑی ہوئی زمین تھی۔

دھوپ تیز ہوگئی۔ زوروں کی پیاس لگ رہی تھی۔ اکھاڑی ہوئی گھاس مالی نے ایک جگہ اکٹھا کر دی تھی۔ اس کی ڈھیری کے پاس میں نے اپنی ڈھیری بنادی تھی۔ بہت چھوٹی ڈھیری۔ گھاس اتنی لگی ہوئی تھی کہ اگر گھاس اکھاڑنے کی پوری ذمے داری میری ہوتی تو ہفتہ بھر لگ جاتا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں شام تک یہی کام کروں گا؟ رات کو کھانا شاید نہ ملے۔ کیا نوکر کھولی میں مہنگو کے ساتھ اپنا کھانا بھی بنانا پڑے گا اور وہیں سو جاؤں گا؟ مہنگو کی طرح ہفتے ہفتے بھر تک اپنے گھر نہ جا سکوں گا؟ گھر پر کا چاول، گیہوں، تیل ایک دو دن میں ختم ہونے والا تھا۔ بیوی کو بازار کرنا بھی نہیں آتا۔ میری غیر حاضری میں وہ گپتا کی دکان کا پتا لگا سکتی تھی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ پچھلا ادھار چکائے بغیر وہ آگے بھی ادھار سامان دے گا۔ تھوڑے بہت پیسے اس کے پاس ہوں گے۔ گپتا کی دکان سے نقد لینے کا سوال نہیں اٹھتا تھا کیونکہ نقد خریداری کے روپے وہ رکھ لیتا اور کہتا، سامان تبھی ملے گا جب بقایا چکایا جائے۔ تب وہ ڈھونڈ کر کچھ بچے ہوے پیسے لے کر یا ماسٹر جی یا سمپت، کسی سے پیسے لے کر بازار کرنے نکلے گی۔ گھر سے

Scanned with CamScanner

نکلنے میں اسے ڈر لگتا تھا۔ بازار کس طرح گھومے گی؟ میری بہت خواہش تھی کہ وہ میرے ساتھ گھوم کر پورے بازار سے واقف ہو اور زندگی جینے کے لیے اس کی ہمت بندھے۔

دوپہر کا ایک بجا ہوگا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ بھوک سے زیادہ پیاس لگ رہی تھی۔ پیاس سے زیادہ چائے پینے کی خواہش ہو رہی تھی۔ صاحب کے گھر کی چائے۔ دفتر میں یہ چائے کا وقت تھا۔ چاہتا تو ابھی بنگلے کے باہر نکل جاتا۔ پر یہ نہیں چاہ پا رہا تھا۔ چہرے میں پسینہ پھوٹ آیا تھا، نہیں ڈبڈبا آیا تھا۔ قمیض گیلی ہو کر پیٹھ سے چپک گئی تھی۔ قمیض سے کام کرنے میں اڑچن ہو رہی تھی۔ ہاتھوں سے مٹی جھٹک کر میں نے قمیض اتار دی۔ بنیان اتار دی۔ سوکھنے کے لیے پھیلا کر کام میں جٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد پتلون سے بھی اڑچن ہونے لگی۔ مالی نے چونکہ اپنی دھوتی کو سمیٹ رکھا تھا، اس لیے وہ آرام سے محنت کر پا رہا تھا، آرام سے تھک رہا تھا۔ میں نے پتلون اتارنے کی بات یعنی نوکر کی اسٹریٹیجی سوچی۔ پر پتلون نہیں اتاری۔ پتلون بہت گندی ہو گئی تھی۔

ننگے بدن کام کرتے ہوئے مالی نے مجھے دیکھا۔ اس کی داڑھی کے بال واقعی چھدرے تھے۔ میں انھیں گن سکتا تھا۔ وہ اٹھا اور خاموشی سے بنگلے کے بازو جانے لگا۔ میں نے اس بیچ اس سے بات کرنے کی کوشش کی۔ وہ میری طرف بالکل دھیان نہیں دے رہا تھا۔ نل کی ٹونٹی کھول کر وہ اپنے ہاتھ پیر دھونے لگا۔ منھ دھویا اور چلّو سے غٹاغٹ پانی پینے لگا۔ پانی پینے کی غٹاغٹ کی آواز یہاں تک مجھے سنائی دی۔ گل مہر کے پیڑ کے نیچے وہ بیڑی پینے لگا۔

میں اٹھا اور غور سے سناٹا چھائے بنگلے کو دیکھا، سنا اور سب دھیان میں رکھتے ہوئے دھیرے دھیرے فلمی گانا گنگنانے لگا۔ ہلکے قدم سے میں بھی نل پر پہنچ گیا۔ اچھی طرح ہاتھ منھ دھویا۔ ربڑ کی چپل رگڑ رگڑ کر دھوئی۔ پھر نل کی ٹونٹی سے منھ لگا کر پانی پینے لگا۔ میں مالی سے کچھ الگ طرح کا کام کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پیاس مجھے بہت پہلے سے لگ رہی تھی۔ نل کہاں ہے یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ مالی کی وجہ سے گھاس اکھاڑنے کی حماقت چھوڑ کر میں بھی کھڑا ہوا تھا۔ اگر میں سگریٹ پیتا ہوتا تو گل مہر کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر میں بھی سگریٹ پیتا۔ اگر سگریٹ نہ ہوتی تو مالی سے بیڑی مانگ کر پیتا۔ مجھے اس کی عادت نہیں لگی تھی۔ چائے کی مجھے امید نہیں تھی۔

رومال سے منھ ہاتھ پونچھتے ہوئے، سوچ کر مالی سے دور اسی پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔ پیڑ

Scanned with CamScanner

زیادہ بڑا نہیں تھا۔ چھاؤں بھی بڑی نہیں تھی۔ اس لیے اس سے بہت دور نہیں جا پایا۔ وہ ہاتھ کا سرہانا بنا کر لیٹ گیا اور دو منٹ میں خراٹے لینے لگا۔ میری بھی لیٹنے کی خواہش ہونے لگی۔ اس طرح کے کام کی عادت نہیں تھی۔

میں لیٹنے کو ہی تھا کہ بنگلے کے اندر سے کھٹ پٹ کی آواز آئی۔ صاحب اور بائی صاحب کی بند کھڑکی کے پاس سے دھیرے دھیرے بات کرنے کی آواز سنائی دی۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ شاید کوئی باہر آئے۔ صاحب، بائی صاحب اور مہنگو، تب سے کوئی باہر نہیں آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ صاحب اور بائی صاحب چھپ کر مجھے دیکھ رہے ہوں گے۔ میرا شک بے کار تھا۔ مرغیوں کے دڑبے سے آواز آ رہی تھی۔ بھینس کا کچھ دن پہلے جما بچہ اچھلتا کودتا، دھلا ہوا سا، کالا، ہلکا چمکتا ہوا، ایسی چمک جس میں بال ہوں، گھاس کی طرف بڑھ آیا۔ میں دوڑا۔ اسے بھگانے لگا۔ وہ پھولوں کے پودوں کو کھوندنے والا تھا۔ تبھی اندر سے دوڑتا ہوا مہنگو آیا۔ ہم دونوں نے مل کر اسے پکڑ لیا۔ مہنگو اسے لے کر گیا ہی تھا کہ ایک سفید مرغی دڑبے سے باہر نکل آئی۔ میں اسے گھیر کر دڑبے کی طرف لے جانے لگا۔ میں مرغی کے پاس پہنچتا تو وہ اڑ کر دوسری طرف نکل جاتی۔ مرغی اڑتی ہوئی نہیں لگتی تھی۔ زمین سے تھوڑا اوپر اٹھ کر دونوں پیروں سے بھاگ رہی ہے، ایسا لگتا تھا۔ مہنگو پھر آیا۔ ہم دونوں نے مل کر اسے دڑبے میں ڈالا۔ جرسی گائے دوسری گایوں سے الگ رُنبھاتی تھی۔ اس کی آواز میں اور دیسی گائے کی آواز میں بہت فرق تھا۔ پہلی بار جب میں نے اس کا رُنبھانا سنا تھا تب مجھے شیر کی دہاڑ کی یاد آئی تھی۔ مہنگو کہتا تھا کہ اس کا دودھ ہلدی ڈالے دودھ کی طرح پیلا ہوتا ہے اور پیلے رنگ کی ملائی پڑتی ہے۔

مجھے جانا تھا۔ مالی کو جگانا چاہتا تھا، اس لیے اسے جگایا۔ اس سے کہا، ''میں نے تم سے اچھا برتاؤ نہیں کیا تھا، مجھے معاف کر دینا۔ تمھارے ساتھ مل کر میں نے کام کیا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ تمھارے کام کو بانٹ کر تمھاری محنت کم کی یا مجھ سے تمھاری کچھ گھنٹے کی روزی ماری گئی؟''

میری بات سننے کے بجائے وہ لوہے کی چھڑ لے کر گھاس نکالنے کی جگہ پہنچ گیا۔ وہ میری جگہ نہیں بیٹھا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اپنی جگہ آ کر میں بھی اپنا کام شروع کروں گا۔ میں اس کے پیچھے گیا اور چلّا کر کہا، ''تم بہرے تو نہیں ہو گئے؟''

اس نے کہا، ''نہیں۔'' اس کی آواز سامنے والے کو کم بولنے اور زیادہ سننے کی مجبوری پیدا کرتی

Scanned with CamScanner

تھی۔اس کی آواز صاحب کی آواز کے برابر بیٹھتی تھی۔

ایک پتھر پھنسا ہوا تھا۔لوہے کی بڑی چھڑ اس کے نیچے گھسا کر وہ اسے اکھاڑنا چاہتا تھا۔آخر بوڑھا تھا۔میں نے کہا،"مجھے کوشش کرنے دو۔"وہ ایک طرف ہٹ گیا۔دونوں ہاتھوں سے نیچے چھڑ کو دبایا تو پتھر زمین سے اٹھتا معلوم ہوا۔میں نے پتھر کے آس پاس کی مٹی چھڑ سے کھودی۔مالی کھدی ہوئی مٹی ہٹاتا گیا۔چھڑ کو نیچے دھنسا کر میں نے پھر دبایا تو پتھر اکھڑ کر اوپر آ گیا۔پتھر کو دونوں ہاتھوں سے میں نے اسی طرح پکڑا جیسے کٹھل کو پکڑا تھا۔میں نے اسے اچھال کر کنارے پھینک دیا۔

بنگلے سے میں سیدھے دفتر گیا۔بڑے بابو کے کچھ پوچھنے کے پہلے میں نے کہا،"میں صاحب کے گھر گیا تھا،اس لیے دفتر آنے میں دیر ہوئی۔"

تب بھی بڑے بابو نے پورے اختیار سے کہا،"آپ ابھی جا کر ناظر سے ملیے۔"

اگر میں نے بڑے بابو کو بتلا دیا ہوتا کہ کٹھل صاحب کے گھر پہنچ گیا ہے تو وہ مجھ سے ناظر کے پاس جانے کے لیے نہ کہتے۔صاحب کا نام لینے کے باوجود بڑے بابو کے تیور میں فرق نہیں آیا تھا۔سمپت سے اگر میں نے اس کا تجزیہ کرنے کو کہا ہوتا تو وہ اس کا سبب میرے گندے کپڑوں کو بتلاتا۔سمپت کے تجزیے پر مجھے زیادہ اعتبار نہیں تھا،تھوڑا اعتبار ضرور تھا۔میرے کپڑے بہت گندے تھے۔پہلی بار گندے کپڑوں میں دفتر آیا تھا۔صاحب کے بنگلے سے نکل کر کپڑے بدلنے کے لیے گھر جانا تھا،پر میں دھن میں دفتر آ گیا۔بہت سے لوگ دفتر میں مجھے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ان کا مطلب تھا کہ بڑے تاؤ سے کل کٹھل کے پیڑ پر چڑھے تھے اور ایک دن میں یہ حالت ہوگئی؟قمیض بھورے رنگ کی تھی، گرد خور،اس کے باوجود گندی لگ رہی تھی۔پتلون سفید تھی،اس میں مٹی اور ہری گھاس کے داغ بری طرح لگ گئے تھے۔

مال خانے کے اندر جو سامان تھا وہ کسی طریقے یا قاعدے سے نہیں آیا تھا۔زیادہ تر سامان ضبطی کا تھا۔کہیں بلوا ہوا ہوتا تو لاٹھیاں،سائیکل کی چین،سوڈے کی بوتلیں،چاقو،چھریاں بہت سی ایک بار میں آ جاتیں۔بلوے پہلے بہت ہوتے تھے،اب کئی برسوں سے نہیں ہو رہے تھے،پھر بھی لاٹھیوں، بلموں کی مال خانے میں کمی نہیں تھی۔سامان اتنا تھا کہ دونوں کلرک اور ناظر خود اپنی ٹیبل کرسیوں کے ساتھ ضبطی کے سامان کی طرح لگ رہے تھے۔دروازے کے آزو بازو ایک چارپائی کھڑی تھی۔ناظر

Scanned with CamScanner

کے پیچھے شنکر جی کی تصویر والا ایک پرانا کیلنڈر ٹنگا تھا۔ تصویر میں لال لال دھبے تھے۔ یہ خون کے دھبے تھے۔ جس کمرے میں قتل ہوا تھا، اس کمرے میں یہ کیلنڈر ٹنگا تھا۔ کیلنڈر کے پاس ایک زنگ لگی کلھاڑی ٹنگی تھی۔ قتل اسی کلھاڑی سے ہوا ہوگا۔ کمرے میں کچی شراب کی بو آ رہی تھی۔ ایک کونے میں ہاتھ بھٹی کا سامان پڑا ہوا تھا۔ یہ سامان کل میرے سامنے دفتر میں آیا تھا۔ پچھواڑے کی طرف کھڑکی سے ایک کھٹارا موٹر کار دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی چھت اکھڑی ہوئی تھی اور مہینوں سے کھڑی ہونے کی وجہ سے اس کے پہیے بیٹھ گئے تھے۔ سامنے کا کانچ ٹوٹا ہوا تھا۔ کسی نے گوبر پھینکا تھا، وہ سوکھا ہوا موٹر سے چپکا تھا۔ اندر کی سیٹ ادھیڑ دی گئی تھی۔ موٹر پر دھول کی اچھی موٹی پرت تھی۔ موٹر کار کی بدحالی کا یہ اچھا نمونہ تھا۔ چھ مہینے پہلے یہ ایک نئی کار تھی۔ دیوار سے سٹ کر چار پانچ نئی سائیکلیں کھڑی تھیں۔ پرانی بہت سی سائیکلیں ایک ساتھ زنجیر سے بندھی ہوئی پیچھے جھاڑ کے نیچے رکھی تھیں، زنگ کھاتی، خراب ہوتی۔ ان کی نیلامی کی بھی کوئی فکر نہیں کرتا تھا۔ کمرے میں تین کھڑکیاں تھیں۔ سامنے کی کھڑکی سے ہوا کا جھونکا آتا تو بھنگ کی خوشبو آتی تھی۔ اس کھڑکی کے نیچے چھوٹی چھوٹی سفید تھیلیوں میں بھنگ بھری تھی۔ یہ تھپیوں میں جما کر رکھی گئی تھیں۔ ویسے ہر کمرے کے پنکھے بھڑ بھٹ بھڑ بھٹ کی آواز کرتے تھے، پر مالک خانے کا پنکھا اور بھی آواز کرتا تھا۔ ناظر کے پاس والے کونے میں کچھ لاٹھیاں تھیں۔ ان میں سے ایک لاٹھی بہت خوبصورت تھی۔

میں ناظر کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ان کی نقلی آنکھ کی وجہ سے میں ان سے نظر ملانے میں ہچکچاتا تھا۔ اس لیے وہ مجھے بہت سیدھا سادھا لڑکا سمجھتے تھے۔

''ناظر صاحب، آپ نے مجھے بلایا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''فالتو آمدنی، کٹھل کا تم جو کچھ بھی سمجھتے ہو، جمع کرادو۔ بڑے بابو تم کو بہت چاہتے ہیں۔ تمھاری ابھی زیادہ عمر نہیں ہے۔ اپنے کھوئے ہوئے لڑکے کی وجہ سے تم کو کچھ نہیں کہتے۔ ان کا بہت سا دھیان دفتر میں نہیں رہتا ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو تم سب لوگوں کو بہت پریشان کرتا۔ دیوانگن بابو کی سنگت سے بچا کرو۔ خیر، اب وہ بھی راستے پر آ رہا ہے۔ انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کو پیڑ پر چڑھنے سے اس نے بہت روکا تھا۔ کیا یہ سچ ہے؟ کٹھل کا ابھی بازار بھاؤ کیا ہے؟ تم نے کھا پی کر برابر نہ کیا ہو تو مہربانی کر کے اسے یہاں لے آؤ۔ تولنا پڑے گا۔''

Scanned with CamScanner

''ڈیڑھ دوروپے کلو ہوگا، پر میں نے کٹھل صاحب کے بنگلے میں دے دیا ہے۔ ابھی میں وہیں سے آرہا ہوں۔ آپ میرے کپڑے نہیں دیکھ رہے ہیں؟ بڑے بابو سے میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ کٹھل جمع کر لیجیے اور مجھے رسید دے دیجیے۔ اب آپ بتائیے، میں کیا کروں،'' میں نے کچھ چڑ کر اور بہت بے فکری سے کہا۔

''تم نے کٹھل کو صاحب کے گھر پہنچا دیا، اب کرنے کو کیا بچا ہے؟ ایسا کرو، تم جب تب کٹھل توڑ توڑ کر صاحب کے گھر پہنچا دیا کرو، ہم لوگوں کی فکر دور ہوگی،'' ناظر نے کہا۔

''صاحب کے گھر کوئی پوچھے گا نہیں، اس لیے بھی صاحب کا نام لے کر کئی بار لوگ بچنے کی کوشش کرتے ہیں،'' اسی کلرک نے کہا جس سے مجھے بہت چڑ تھی۔

''اس بار صاحب سے ضرور پوچھ لینا،'' میں نے کہا۔ ''میں چلوں؟'' میں نے ناظر سے پوچھا۔

''اچھی بات ہے،'' ناظر نے کہا۔

صاحب کے بنگلے کی گھاس اکھاڑنے کا کام کرنے سے میں یہ محسوس کر رہا تھا، کہ مجھ میں ناظر، بڑے بابو، بہت سے لوگوں کا سامنا کرنے کی لامحدود طاقت آ گئی ہے۔ مہنگو کو ڈانٹنے کی، زور سے بولنے کی کسی کو ہمت نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ مہنگو بہت تھکے ہونے پر بابو لوگوں کو جھڑک دیا کرتا تھا۔ بڑے بابو کی حیثیت چھوٹے موٹے صاحب سے کم نہیں تھی۔ مال خانے اور نظارت سے متعلق ہونے کی وجہ سے ناظر کی بھی بہت چلتی تھی۔ آج میں پھولا نہیں سما رہا تھا۔

اپنی ٹیبل پر آ کر، مردم شماری کی فائل کھول کر میں اتھاہ آبادی میں ڈوب گیا۔

❁

گڈھے کے اندر بہت بڑا میدان ہے،
لگتا ہی نہیں کہ گڈھے کے اندر ہیں۔
گڈھے کے اندر کی جگہ میں بھی سب کی جگہ طے شدہ۔

گھمیلے میں مونگ پھلی بھوننے کے لیے کافی ریت لگتی ہے۔ مونگ پھلی کے ساتھ ساتھ ریت بھی بھنتی

Scanned with CamScanner

ہے۔ زیادہ بھنی ریت کالی ہو جاتی ہے۔ مہاویر کا رنگ کالی بھنی ہوئی ریت کی طرح تھا۔ ریت کی کوئی خاص قیمت نہیں تھی، جبکہ شہر کے بالکل پاس سے ایک ندی بہتی تھی۔ کارتک مہینے کی چودھویں کے دن اس ندی کے کنارے ایک بہت بڑا میلہ لگتا تھا۔ میلے میں دکان والے تین چار دن پہلے جا کر اپنی دکانیں جمانا شروع کر دیتے تھے۔ ندی کا نام مہارا تھا۔ یہیں پر نل گھر میں ندی کا پانی صاف ہوتا تھا۔

''مہاویر، تم میلے کیوں نہیں جاتے؟'' اگر کوئی پوچھے تو شاید وہ کہے گا، ''ایک پرات بھر مونگ پھلی لے کر پانچ کلومیٹر پیدل چلنا مجھ سے نہیں ہوتا۔ میں لگاتار گھنٹوں کھڑے کھڑے مونگ پھلی بیچ سکتا ہوں، چلتے چلتے مونگ پھلی بیچنے کی رتی بھر بھی عادت نہیں ہے۔ پھیرا لگا کر بیچنا اور بھی مجبوری ہے۔ راستہ چلتے ہوئے لوگ رک کر خریدتے خریدتے رہ جاتے ہیں۔ گھر میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو باخبر کرنے کے لیے میں چلا نہیں سکتا۔ چلاتے ہوئے کسی گھر سے سو قدم دور نکل آئے، تب باخبر ہوا کوئی بچہ، یا کوئی عورت، دروازہ کھول کر وہیں سے آواز دے گی۔ پھر لوٹ کر ان کے پاس جاؤ۔ مول بھاؤ ہوگا۔ زیادہ تر بھاؤ ان کو نہیں پٹتا کیونکہ عام خیال ہے کہ پھیری والے زیادہ منافع لیتے ہیں۔ اس لیے بغیر کچھ بیچے، ایک گزاری گئی دوری پھر سے چلو۔ گذارے کے لیے مجبوری سے میں بچنا چاہتا ہوں۔''

''مونگ پھلی مت بیچنا۔ ندی کے کنارے میلہ گھوم لینا،'' کوئی پوچھے گا۔

''میرے لیے ندی کے میلے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ میرے لیے ندی کا اتنا ہی مطلب ہے کہ اس ندی کے کنارے ریت ہے،'' شاید جواب ہو۔

''کتنے سال ہو گئے مونگ پھلی بھونتے؟'' میں نے پوچھا۔

''کئی سال ہو گئے۔''

''تم ندی کی ریت ختم نہیں کر پائے؟'' میں کہوں گا تو جواب ہوگا:

''پرات بھر مونگ پھلی ختم کر کے میں دن بھر میں تھک جاتا ہوں۔ اتنے سارے مکان اس ریت سے بن گئے تب بھی ندی کی ریت ختم نہیں ہوئی۔ شہر کے سب مکانوں میں ندی کی ریت جڑائی میں لگی ہے۔ پہلے چار گھروں کا یہاں دیہات تھا۔ دیہات مٹی سے بنتے ہیں۔ صرف برسات میں ندی میں اچھا پانی رہتا ہے۔ گرمیوں میں تو گھٹنوں گھٹنوں پانی رہتا ہے۔ ندی نے بہت کم لوگوں کو تیرنا سکھایا ہے۔ زیادہ تر لوگ تالاب سے سیکھتے ہیں۔''

Scanned with CamScanner

''تو مہاویر، شروع سے لے کر اب مرنے تک مونگ پھلی بیچو گے؟''

''ہاں۔''

''مہاویر، تم جہاں کے تہاں، تمھاری رسولی بھی جہاں کی تہاں۔''

''ہاں، یہ دیکھو۔'' وہ تھوڑا گھوم جائے گا۔

''کتنی بڑی ہے!'' میرے منھ سے نکلے گا۔ ''پہلے سے کچھ بڑی ہوئی ہے کیا؟'' میں پوچھوں گا۔

''اب نہیں بڑھ رہی ہے۔''

''تمھیں اس سے تکلیف ہوتی ہے؟''

''پہلے بھی نہیں ہوتی تھی، اب بھی نہیں ہوتی۔''

''رسولی تمھارا ٹریڈ مارک ہے۔ رسولی والے مہاویر، گرز والے مہاویر نہیں۔ اسے چھپا کر رکھو۔ کہیں گاہک بدک نہ جائیں۔''

''سچ میں یہ ٹریڈ مارک ہے۔ چھپا کر رکھوں گا تو لوگ پہچانیں گے کیسے؟ میں نے اپنی پہچان بہت مضبوط بنالی ہے، یعنی میونسپل اسکول کے باہر، نیم کے پیڑ کے نیچے مونگ پھلی بیچنے والا مہاویر، جس کے کندھے میں رسولی ہے۔''

''مجھے تو لگتا ہے کہ گردن میں ہے۔''

''بڑی ہے، اس لیے گردن اور کندھے دونوں میں ہی ہے۔ چہرے سے پہچاننے والے کم ہیں۔ رسولی سے بھی پہچان جاتے ہیں۔ اگر رسولی چھپا کر رکھوں تو گاہک ٹوٹ جائیں گے۔ ٹھنڈ کے دنوں میں گلے میں انگوچھا لپیٹوں تو رسولی چھپ جاتی ہے۔ ایک دن ایک آدمی آیا، اس نے مجھ سے پوچھا، یہاں نیم کے پیڑ کے نیچے ایک مہاویر خوانچے والا بھی بیٹھتا تھا، مر گیا؟ میں نے کہا، میں مہاویر ہوں۔ اس نے کہا، انگوچھے سے تمھاری رسولی چھپی ہوئی ہے۔ یہی بات ہے۔ میں پہچان نہیں پایا۔

''راون کے دس سر نہیں ہوں گے۔ اس کا ایک سر ہوگا اور نو رسولیاں ہوں گی۔ ماسٹروں اور اسکول کے لڑکوں کی سنگت سے میرا دماغ دگنا ہے۔ دوسرا دماغ رسولی میں ہے۔ دنیا بہت اچھی ہے۔ آنے والا وقت بہت اچھا ہے۔ خوشحالی کی بات سر کے دماغ سے سوچتا ہوں، پریشانی کی رسولی والے دماغ سے۔ اس لیے مستقبل مجھے اچھا لگتا ہے۔ میں اپنے آپ کو کیسا بے بس پاتا ہوں، بتلاؤں؟ میں

Scanned with CamScanner

ایک پہاڑی پر چڑھ رہا ہوں۔ نیچے ایک تالاب ہے۔ وہاں سے میں دیکھ رہا ہوں، ایک لڑکا تالاب میں ڈوب رہا ہے۔ دوڑ کر نیچے آتے آتے وہ لڑکا ڈوب جاتا ہے۔ خیر اب تو بوڑھا ہوں، جب جوان تھا تب بھی دوڑ کر آتے آتے لڑکا ڈوب جاتا تھا۔"

"مہاویر، اس پہاڑی پر تم اکیلے ہو یا کوئی اور بھی ہے؟ میں بھی ہوں کیا؟ تم نے مجھے وہاں کبھی نہیں دیکھا؟" میں پوچھوں گا۔

"وہاں بہت بھیڑ ہے۔ سب کا دھیان لڑکے کو بچانے میں رہتا ہے۔ سبھی لڑکے کو بچانے پہاڑی سے نیچے بھاگتے رہتے ہیں۔ بھگدڑ رہتی ہے۔ تم وہاں ہو یا نہیں، میں کیسے کہوں؟" وہ کہے گا۔

"میں اس بھیڑ میں نہیں ہوں۔ اگر ہوتا تو میں لڑکے کو بچانے تالاب میں کود جاتا، پھر میں بھی ڈوب جاتا کیونکہ مجھے تیرنا نہیں آتا ہے۔ تم نے اس ڈوبنے والے لڑکے کا چہرہ دیکھا ہے؟ اب کی بار دیکھنے کی کوشش کرنا۔ وہ میں ہوں گا۔ اسے بچانے کے لیے میں کودا ہوں گا۔ پہلے وہ ڈوب گیا، بعد میں میں ڈوبنے لگا۔ مہاویر، تم مجھ کو بچا لینا۔"

"کوشش کروں گا۔ تم تیرنا کیوں نہیں سیکھ لیتے؟"

"مجھ میں اتنی عقل کبھی نہیں آئی،" شاید میں کہوں گا اور ہنسوں گا۔

مہاویر بھی ہنسے گا۔

"میں کیسا بے بس ہوں، بتلاؤں؟" میں کہوں گا۔

"بتلاؤ،" وہ کہے گا۔

"میلوں لمبا چوڑا گڈھا ہے۔ نیچے بالکل ہموار ہے۔ یعنی نیچے میلوں لمبا چوڑا ہموار میدان ہے۔ گڈھے کے اندر میدان۔ گڈھے میں ہونے پر بھی مجھے نہیں لگتا کہ گڈھے میں ہوں۔"

"یہ بھی خوب رہی۔ میں پہاڑی کے اوپر بے بس اور تم گڈھے میں بے بس۔ عمر میں فرق ہونے سے اس طرح کا فرق آیا ہوگا۔ پیڑھی کا فرق، سیڑھی کا فرق۔"

"گڈھا کھودنے سے جو مٹی نکلی ہوگی اسی کی پہاڑی بنائی گئی ہے۔"

"ایسا نہیں ہے، جس تالاب میں لڑکا ڈوب رہا ہے اسے کھودنے سے جو مٹی نکلی ہے اس سے پہاڑی بنی ہے۔"

Scanned with CamScanner

''جو بھی ہو،''میں کہوں گا۔

''ایک آدمی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے اپنا بیوپار اب تک نہیں بڑھایا ہے، یہاں تک کہ پرات نہیں بدلی، ترازو نہیں بدلی۔ میں نے کہا تھا کہ سکّے بدل گئے، تولنے کا باٹ بدل گیا،'' وہ کہے گا۔

''اچھا جواب دیا،''میں کہوں گا۔

''وہ بولنے لگا کہ کہیں بہت سال پرانی مونگ پھلی تو نہیں بیچ رہے ہو؟ مونگ پھلی نہیں بدلی — ایک سال کے لیے مونگ پھلی نہیں خرید سکتا تو سالوں پرانی مونگ پھلی کا شک بے کار ہے۔ اس نے پچاس گرام مونگ پھلی خریدی۔ کھاتا رہا، بات کرتا رہا۔ جب مونگ پھلی ختم ہو گئی تو چونک کر کہتا ہے کہ اس کا سواد وہ نہیں ہے جو بہت سال پہلے تھا، پیسے نہیں دوں گا۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ میری مونگ پھلی کا سواد پہلے کیسا تھا۔ شاید اچھا رہا ہو۔ تم کو یاد ہے کیا؟''

''پانچ دس سال پہلے کی مونگ پھلی کے بارے میں شاید سوچ سکتا ہوں۔ پر وہ تمھاری مونگ پھلی نہیں ہوگی، کسی اور کی ہوگی۔ پہلی بار میں نے مونگ پھلی کب کھائی، کتنے کی کھائی، کس کے پاس سے خرید کر کھائی، یہ سب یاد رکھنا ضروری ہے؟''

''مونگ پھلی کے سواد کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا،'' وہ دکھی ہو کر کہے گا۔

''اس میں دکھی ہونے کی بات نہیں ہے۔ سواد تمھاری ذمے داری نہیں ہے اور سڑی ہوئی مونگ پھلی بھی تمھاری ذمے داری نہیں ہے۔ پچاس گرام مونگ پھلی مفت میں کھا گیا اور اوپر سے تم کو مایوس کر گیا۔ تم کو پیسے مانگ لینے تھے،''میں کہوں گا۔

''میں اس رسولی سے بیس سال میں اتنا پریشان نہیں ہوگا، جتنا بیس سال پہلے کے سواد کو لے کر پریشان ہوں۔ اس کوشش میں میری زبان لٹپٹا جاتی ہے۔ گلا سوکھ جاتا ہے۔ منہ میں اور گلے میں درد ہونے لگتا ہے۔''

''ارے نہیں، اس کی کوئی اور وجہ ہوگی۔ تم اپنی جانچ سرکاری اسپتال میں کراؤ،''میں کہوں گا۔

''جتنا پہلے ایماندار تھا، اتنا اب بھی ہوں۔ اسی انداز سے مونگ پھلی بھونتا ہوں جس انداز سے پہلے بھونتا تھا۔ بازار سے کبھی کبھی ایک آدھ ہفتے کے لیے دال چاول نہیں ملتا۔ دو چار دن مونگ پھلی نہیں ملتی۔ مونگ پھلی بھوننا چھوڑ کر چنا بھوننا مجھ سے نہیں ہوگا۔''

Scanned with CamScanner

''جب مونگ پھلی نہیں ملتی تو کیا کرتے ہو؟'' میں پوچھوں گا۔

''گھر میں خوانچہ رکھ دیتا ہوں۔ پوری تیاری سے نکلتا ہوں اور اسی جگہ نیم کے پیڑ کے نیچے جا کر خالی ہاتھ کھڑا ہو جاتا ہوں۔ جب تک گاہکی کا ٹائم رہے گا، ضرور کھڑا رہوں گا۔ مطلب، اسکول کی پانی پینے کی چھٹی میں، کھانے کی چھٹی میں، شام کو خیراگڑھ اور ناگپور جانے والی بس کے وقت۔'' شروع میں لڑکے آکر پوچھتے تھے، ''مہاویر، خوانچہ کہاں ہے؟''

''گھر چھوڑ آیا۔''

''کیوں؟''

''مونگ پھلی نہیں ملی۔''

''پیسے ہیں؟''

''ہاں۔''

''کیوں نہیں ملی؟''

''گجرات سے، اور بھی دوسری جگہ سے مونگ پھلی آتی ہے۔ وہاں سے بھیج نہیں پاتے ہوں گے، یہاں پہنچ نہیں پاتی ہوگی۔ یہاں آ گئی ہوگی تو باہر نکل نہیں پاتی ہوگی یا لوگ بلواتے نہیں ہوں گے۔ کئی کارن ہو سکتے ہیں،'' وہ کہے گا۔

''اسکول کے ماسٹر بازار کی گڑبڑ کا آپس میں ضرور ذکر کرتے ہیں، اخباروں میں بیوپار کی خبریں، بازار کے بھاؤ چھپتے ہیں۔ کوئی ماسٹر آکر مجھے بتا جائے گا کہ راجکوٹ میں فصل اچھی ہوئی۔ مونگ پھلی کے بھاؤ گریں گے۔ مونگ پھلی کی فصل جس سال مار کھا جائے گی تو ماسٹر مسکرا کر کہے گا، مہاویر، تم کیسے کرو گے؟ ہر حالت میں مجھے نیم کے پیڑ کے نیچے کھڑے رہنا ہے۔ ہمیشہ ایک ہی جگہ مقررہ وقت کی موجودگی سے اپنے آپ اور دوسروں کو اس کی عادت پڑ جاتی ہے۔ نہیں آؤں گا تو لوگ پہلے بیمار سمجھیں گے۔ پھر مر گیا سمجھیں گے۔ پہلے میری رسولی کو لوگ میرا بچہ سمجھتے تھے، اب بڑھاپے میں میرا ناتی سمجھتے ہیں،'' وہ کہے گا۔

''جب مونگ پھلی نہ ہو تو گھر میں آرام کیا کرو،'' میں کہوں گا۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ میری کھڑے رہنے کی عادت ہے۔ بستر پر لیٹ نہیں سکتا۔ گھر پر

کھڑے کھڑے کیا کروں گا؟ زیادہ چل پھر نہیں سکتا۔ بے حد کمزوری میں یا بیماری میں دو دن سے زیادہ بستر پر لیٹ نہیں سکتا۔ اٹھ کر کھڑا ہو جاؤں گا۔ ڈاکٹر سمجھے گا کہ دوائی سے ٹھیک ہو کر کھڑا ہو گیا۔ میرے مرنے کی حالت یہی ہوگی۔ میں کھڑے کھڑے مر جاؤں گا۔ نیند مجھے تین چار گھنٹے سے زیادہ نہیں آتی۔ ایک بار میں آٹھ روز تک بغیر خوانچے کے آیا تو لڑکوں کا دماغ خراب ہو گیا۔ دوپہر کی چھٹی کے بعد وہ اسکول نہیں گئے۔ ایک لڑکا جو میرے پڑوس میں رہتا تھا، کچھ ساتھیوں کو لے کر گھر سے خالی پرات، خوانچہ اٹھا کر لے آیا۔ میں ان کو سمجھاتے سمجھاتے ہار گیا۔ لڑکوں نے مجھے سامنے کھڑا کر دیا۔ مجھے کوئی پہچان نہ سکے اس لیے میں نے اپنے گلے میں انگوچھا لپیٹ لیا۔

''اسکول کے سامنے ایک لڑکا چلاّیا، 'مہاویر کو'، سب لڑکے کہتے 'مونگ پھلی دو'، میں ڈھیرے سے کہتا، 'مار ڈالو'۔ پھر کوئی چلاّتا، 'منافع خور'، تو سب کہتے 'ہائے ہائے!'، 'گوداموں کا منھ کھول دو!'' 'جمع خور بھاگ بھاگ!' چلاّتے رہے۔

''اس کے بعد ایک دن ہیڈ ماسٹر کو معلوم ہوا کہ میں بغیر خوانچے کے پھر آیا ہوں۔ انھوں نے چپراسی بھیج کر مجھے بلایا۔ 'مہاویر، بیٹھو۔' 'میں ٹھیک ہوں صاحب!' ہاتھ جوڑ کر میں نے کہا۔ 'مہاویر، جب تم خوانچہ نہیں لاتے تو یہاں مت آیا کرو۔' 'گھر میں کوئی نہیں ہے۔ اکیلے وہاں رہ کر کیا کروں گا؟' 'میرے گھر آ جایا کرو۔ گھوما پھرا کرو۔ مونگ پھلی کے بجائے دوسرا خوانچہ کیوں نہیں لگاتے؟ کسی دن تمھارے پاس خریدنے کے لیے پیسے نہیں رہتے ہوں گے تو اس میں بازار کا کیا دوش؟ جب تم بغیر خوانچے کے آتے ہو تو لڑکے بھڑک جاتے ہیں۔' 'میں انھیں سمجھاتا ہوں کہ پڑھائی لکھائی کرو۔ مونگ پھلی خریدنا ضروری نہیں ہے،' میں نے انھیں بتایا۔ 'بازار میں کوئی چیز نہیں مل رہی ہے، یہ صرف تم سے نہیں معلوم ہوتا۔ سو فیصد آدمی خریدار ہیں۔ ایک یہی اسکول خوانچہ لگانے کے لیے نہیں ہے۔ دوسری جگہ جاؤ۔ لڑکوں کو خریدنے کے لیے پیسے ان کا باپ دیتا ہے۔ خود لڑکے نہیں کماتے، ان کا باپ بازار جاتا ہے۔ کچھ خریدنے کے لیے ہی باپ پیسے دے گا۔ صرف مونگ پھلی خریدنے کے لیے نہیں۔'

''اس کے بعد مجھے ستایا گیا۔ لڑکوں نے میرا خوانچہ کئی بار الٹایا۔ پر دوسرے لڑکے مونگ پھلی بین کر پرات میں رکھ دیتے۔ مونگ پھلی کے دانے چھوٹی ڈبیوں میں بند جیسے ہوتے ہیں۔ گر جانے سے اندر کے دانے خراب نہیں ہوتے۔ پرات خالی ہو جانے کے بعد گھر لوٹنا اچھا لگتا ہے۔ اگر میری پرات

کی مونگ پھلی دس دن ختم نہ ہو تو میں دس دن گھر نہ لوٹوں۔''

''یہی میرا بھی حال ہے۔ چھٹی سے مجھے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ چھٹی مجھے ایک ایسی فرصت لگتی ہے جس میں آدمی اپنا ہی تماشا دیکھتا ہے۔''

''زیادہ تر ماسٹر میرے پاس مونگ پھلی نہیں خریدتے۔ انھیں لگتا ہے کہ ہیڈ ماسٹر ناراض ہو جائیں گے۔ ایک ماسٹر نے کہا کہ خوانچہ کھلے میں ہونے کی وجہ سے ماسٹر لوگ آ نہیں پاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے اسکول کے پیچھے دیوار کی آڑ میں خوانچہ لگاؤں تو ماسٹر لوگ خرید سکیں گے۔ ماسٹر چوری سے بہت بھروسے کے شاگردوں کو بھیج کر اپنے لیے مونگ پھلی منگوائیں گے۔ چپراسی پر ان کو بھروسا نہیں ہے۔ لڑکا ذرا ہوا آئے گا تو میں سمجھ جاؤں گا کہ ماسٹر نے چوری سے مونگ پھلی خریدنے کے لیے بھیجا ہے۔ ایسی گاہکی مجھے اچھی نہیں لگتی۔ اگر خریدنا ہے تو کھلے عام خریدو۔ کیا میں مونگ پھلی کے چھلکوں میں گانجا، افیم بیچتا ہوں؟ یا ان میں چھوٹے چھوٹے بم ہوتے ہیں جنھیں تیس پیسے کے پچاس گرام کے حساب سے بیچتا ہوں؟ جو نئے ماسٹر آتے ہیں ان سے لڑکے ضرور کہتے ہیں کہ مونگ پھلی اگر خریدنا ہے تو مہاویر سے خریدیں۔ پر جب انھیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ہیڈ ماسٹر میرے خوانچے کی مونگ پھلی خریدنے والوں پر ناراض ہوتے ہیں تو وہ خریدنا بند کر دیتے ہیں۔ تین تین مونگ پھلی بیچنے والے اور بیٹھنے لگے ہیں۔ سنتا ہوں کہ ہیڈ ماسٹر نے انھیں بلایا ہے۔ اس کے پہلے ایک سنیما کے پاس بیٹھتا تھا، دوسرا موٹر اسٹینڈ پر، اور تیسرا پھیری لگاتا تھا۔ میری جگہ نیم کے پیڑ کے نیچے طے ہو گئی ہے۔ اس لیے میں جہاں کا تہاں۔ موٹر اسٹینڈ یا ریلوے اسٹیشن نہیں جا سکتا۔''

''بڑے بابو، مہاویر نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ بہت بے بس ہے،'' میں نے کہا۔

''کیوں بے بس ہو گیا؟ نہیں ہونا تھا،'' انھوں نے کوئی اشتیاق نہ جتاتے ہوئے کہا۔

''کہہ رہا تھا کہ وہ اس طرح بے بس ہے کہ تالاب میں ایک لڑکا ڈوب رہا ہے، بچانے کے لیے وہ ایک پہاڑی سے بھاگتا ہوا نیچے اترتا ہے، پر تالاب تک پہنچتے ہی دیکھتا ہے کہ لڑکا کب کا ڈوب چکا ہے۔'' بڑے بابو بہت سنجیدہ ہو گئے۔ لڑکے کے ڈوب جانے سے انھیں دکھ ہوا ہوگا۔ دکھ والی بات تو تھی۔

''مہاویر نے اس لڑکے کا چہرہ دیکھا تھا؟'' بڑے بابو نے پوچھا۔

Scanned with CamScanner

''شاید نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو بار بار بے بس ہوتا ہے، شاید اب اس نے لڑکے کا چہرہ دیکھ لیا ہو۔ ڈوبنے والا ایک عام نارمل لڑکا ہوگا۔ آپس کی بات تھی،'' میں نے کہا۔

''کب کی بات ہے، کون سے تالاب کی بات ہے؟'' انھوں نے پوچھا۔

''کل ہی بات ہوئی تھی۔''

''تم کو کل ہی بتلانا تھا۔''

''شام کو دفتر سے لوٹتے وقت بات ہوئی تھی۔ راستے میں میونسپل اسکول کے پاس نیم کے پیڑ کے نیچے دکھ گیا تھا،'' میں نے کہا۔

فائلیں وغیرہ سرکا کر بڑے بابو کھڑے ہو گئے۔ ''میں آتا ہوں۔ کوئی پوچھے تو بتلا دینا، پندرہ منٹ میں لوٹ آؤں گا،'' انھوں نے دیوانگن بابو کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔

پیڈل مارتے ہوئے وہ مہاویر کے پاس پہنچے۔ مہاویر بڑے بابو کو دیکھ کر خوش ہوا۔ ''بہت دن میں مہاویر کی یاد آئی۔''

''مونگ پھلی کے لیے تمھاری یاد نہیں آئی،'' انھوں نے سائیکل کھڑی کر کے ستاتے ہوئے کہا۔ انھیں فوراً اپنی بات پر آنے کی بے صبری تھی۔ ''کل تمھاری سنتو بابو سے بات ہوئی تھی؟''

''ہاں، ہوئی تھی۔ کوئی خاص بات ہے؟'' مہاویر نے کہا۔

''کون سی بات ہوئی تھی؟''

''آپس کی بات تھی۔''

''تالاب میں لڑکے کے ڈوبنے والی بات نہیں تھی؟'' بڑے بابو جیسے الزام لگا رہے ہوں۔

''وہ تو مثال دے کر میں اپنی تکلیف بتلا رہا تھا۔''

''ڈوبنے والا لڑکا کون تھا؟''

''کوئی نہیں، کہنے بھر کی بات تھی،'' مہاویر نے پریشان ہو کر کہا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ کوئی گاہک آ جائے تو اسے بڑے بابو سے چھٹکارا ملے۔

''تالاب کہنے کی بات تھی؟''

''ہاں،'' مہاویر نے کہا۔

''مہاویر، میرا لڑکا بہت دنوں سے گھر سے بھاگا ہوا ہے۔ یہ تو تم جانتے ہو، میں اس کی تلاش میں ہوں۔ کون سا تالاب تھا؟''

''وہ لڑکا تو بہت اچھا اور سمجھدار ہے۔ اسے نہیں بھاگنا تھا۔''

اب بڑے بابو نے نارمل ہو کر مہاویر سے کہا، ''اس کے بھاگنے کی بات مجھے سمجھ میں نہیں آتی۔ میرا دوسرا لڑکا بھاگ جاتا تو اس کا بھاگنا میں سمجھ جاتا۔ میں نے بڑی لڑکی سے میٹھی آلو کی سبزی بنانے کے لیے کہا۔ بڑی لڑکی میٹھی آلو کی سبزی اچھی بناتی ہے۔ اس سے چھوٹی آلو بھرتا بہت اچھا بناتی ہے اور اس سے چھوٹی کھچڑی بہت اچھی بناتی ہے۔ جب میں کھانا کھانے کے لیے بیٹھا تو سبزی میرے لیے نہیں بچی تھی۔ میں نے پوچھا، 'میرے لیے نہیں ہے؟' اس نے کہا، 'تھی تو بہت۔' 'صرف ایک لڑکی نے کھانا کھایا تھا۔' 'تو کہاں گئی؟' میں نے اس سے پوچھا۔ پریشان وہ بھی تھی۔ آخر میں یہ طے کیا کہ جو لڑکا بھاگا تھا اس نے آنکھ بچا کر سبزی کھائی ہوگی۔ جب یہ بات میں نے لڑکے لڑکیوں سے کہی تو سب چلّانے لگے۔ ان کو میری بات پر یقین نہیں ہوا۔ تم بتاؤ، سبزی کے کم پڑنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟''

''آپ کی بات پر مجھے بھی یقین نہیں ہے،'' مہاویر نے کہا۔

''فطری بات ہے، تم لوگ نہ ملنے کی امید سے بات کرتے ہو اور میں ملنے کی امید سے۔ تالاب ندی میں کسی کے ڈوبنے کی خبر ملتی ہے تو ڈر لگتا ہے کہ میرا لڑکا تو نہیں ہے۔ سنتو بابو سے جب میں نے یہ سنا کہ تم ایسے بے بس ہو کہ ایک ڈوبتے ہوئے لڑکے کو بچا نہیں پاتے تو میں نے سوچا کہ تم سے مل کر پوری بات کا پتا لگاؤں گا۔''

''بڑے بابو، آپ کی بات پر مجھے یقین نہیں ہوتا۔ بلکہ لگتا ہے کہ آپ کی لڑکی نے سبزی کم بنائی ہوگی کیونکہ دوسرے بچوں کو وہ اچھی نہیں لگتی ہوگی، زیادہ بنانے سے برباد ہوتی۔ آپ ناراض نہ ہوں، اس لیے ترکاری کم ہونے کی صحیح وجہ آپ کو بتلائی نہیں اور آپ کچھ اور سمجھ گئے۔''

''میں پتا لگاؤں گا، کیونکہ جب بھی کوئی چیز بھگوڑے لڑکے کے نام سے زیادہ بنتی ہے، اپنے آپ کم ہو جاتی ہے، اور مجھے لگتا ہے کہ اس نے کھایا ہے۔ اب بہت ہو چکا، دفتر لوٹنا ہے۔ سو گرام مونگ پھلی دو۔''

''بھگوڑے لڑکے کے لیے تو نہیں خرید رہے ہیں؟ مونگ پھلی اسے اچھی لگتی ہے۔''

Scanned with CamScanner

''سب کے لیے خرید رہا ہوں، کھانا ہوا تو خود کھا لے گا، مجھے دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی،'' بڑے بابو نے کہا۔

پھر جیب میں ریزگاری ٹٹولنے لگے۔ اوپر کی جیب میں نہیں تھی۔ دائیں جیب میں نہیں، بائیں جیب میں نہیں۔ کہاں گئی؟ ایک اٹھنی تھی۔ اس بے بسی سے اٹھنی ڈھونڈ رہے تھے، جیسے اپنے لڑکے کو ڈھونڈتے ہیں۔

''میں کہوں گا تو تم پھر یقین نہیں کرو گے،'' بڑے بابو نے کہا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔''

''میں اس لڑکے کو روز ایک اٹھنی دیا کرتا تھا۔ اتنے دنوں بعد آج وہ نکال لے گیا۔''

''اٹھنی روز دینا تو اسے خرچیلا بنانا ہوا۔''

''پینتیس چالیس پیسے وہ بچا لیا کرتا تھا۔ کھلے پیسے تمھیں دینے کے لیے نہیں ہیں۔ میں بعد میں دوں گا تو چلے گا؟''

''پیسے کی کوئی بات نہیں ہے،'' مہاویر نے کہا۔

''دفتر سے بھجوا دوں گا۔''

بڑے بابو سائیکل پر چڑھنے کی جگہ دیکھنے لگے۔ ''مہاویر، سائیکل پر چڑھنے کے لیے کوئی جگہ نہیں دکھائی دے رہی۔'' ان کا سائیکل پر چڑھنے کا طریقہ بہت سے لوگوں کو معلوم تھا۔

''سائیکل پر چڑھنے لائق جگہ تو مجھے بھی نہیں دکھ رہی ہے۔''

''لگتا ہے مجھے اسکول جانا ہوگا۔ اس کے برآمدے سے کام چل جائے گا۔''

''میرے کندھے کا سہارا لے کر آپ نہیں چڑھ سکتے؟''

''نہیں بھائی، سائیکل چلاتے ہوئے تمھارا کندھا پکڑ کر رکا تو جا سکتا تھا۔ تب ٹھیک رہتا، میں اترتا ہی نہیں۔ پیدل چلنے کی عادت چھوٹ گئی ہے۔ خاص کر باہر۔ گھر کے اندر، دفتر میں پیدل چلنا ہوتا ہے۔''

''چائے کی دکان کے باہر رکھی اس بنچ پر پیر رکھ کر چڑھ سکیں گے؟''

''ہاں، یہ ہو سکتا ہے۔''

بنچ کافی نیچی تھی۔

Scanned with CamScanner

''بڑے بابو، آپ چھوٹی سائیکل رکھیے۔''

''بچوں کی سائیکل لگے گی۔''

''اسٹول پر پیر رکھ کر چڑھیں گے؟''

''ہاں۔''

مہاویر چائے کی دکان سے ایک اسٹول لے آیا۔ بڑے بابو اس پر کھڑے ہو گئے۔ اسٹول کے پاس مہاویر سائیکل لیے کھڑا تھا۔ دکان پر بیٹھے لوگ بڑے بابو کو دیکھ خوش ہو رہے تھے۔ دو چھوٹے چھوٹے لڑکے آ کر کھڑے ہو گئے کہ دیکھیں کیا ہو رہا ہے۔ ان کا موٹا جسم اسٹول پر مشکل سے متوازن ہوا۔ داہنا پیر اٹھا کر انھوں نے سائیکل پر چڑھنا چاہا، تب چائے والا بھی آ کر بڑے بابو کو سہارا دینے لگا۔ ہوٹل کے ندر بیٹھے ہوے لوگ باہر آ کر کھڑے ہو گئے۔ جب بڑے بابو سیٹ پر بیٹھ گئے تب ان کو خوشی ہوئی۔ وہ پسینے پسینے ہو گئے تھے۔

چائے والے نے پوچھا: ''بڑے بابو، پانی پئیں گے؟''

''ہاں، پلوا دو۔''

ہوٹل کا لڑکا کانچ کے گلاس میں پانی لے آیا۔ بڑے بابو کے ہاتھ میں مہاویر نے پانی کا گلاس پکڑوا دیا۔ سائیکل پر بیٹھے بیٹھے انھوں نے پانی پیا۔

''اب چائے پی لیجیے۔''

''سائیکل پر بیٹھے ہیں۔ نہیں، رہنے دو۔''

''ہم سب لوگ سائیکل پکڑے ہیں، آپ گریں گے نہیں۔''

''ارے نہیں،'' بڑے بابو ہنسنے لگے، ''لڑکوں کی چھٹی کا ٹائم ہو رہا ہوگا۔''

''چائے تو دو منٹ میں پی لیں گے،'' مہاویر نے کہا۔

''رہنے دو، چلوں گا۔'' بڑے بابو چلنے کو تیار دکھائی دیے تو چائے والے نے کہا، ''لڑکو، سامنے سے ہٹو۔''

مہاویر نے جیسے ہی ہینڈل چھوڑا، بڑے بابو ایک سدھے ہوے کھلاڑی کی طرح سرر سے نکل گئے۔ مہاویر اور اسٹول کے بیچ کی جگہ اچانک خالی ہو گئی جو سائیکل اور اس پر بیٹھے بڑے بابو نے بھری

ہوئی تھی۔ مہاویر خوانچے کے پاس نیم کے پیڑ کے نیچے کھڑا رہ گیا۔

❁

وقت کے گزرتے جانے کا مطلب، آنے والا وقت گزر جائے گا.
اگر کسی کے پاس گھڑی نہیں تو کیا ہوا!

فرصت سے گھر میں بیٹھا ہوا نہانے کی بات سوچ رہا تھا۔ بغیر نہائے کپڑے بدلنے کو جی نہیں کرتا۔ لوگوں میں نہانے اور کنگھی سے بال سنوارنے کا چلن تھا۔ صبح ٹھنڈ کے دنوں میں بھی ٹھٹھرتے ہوئے بچے کو اپنی ساڑھی سے ڈھانک کر عورتیں تالاب جاتی دکھائی دیتی تھیں۔ ایک ساڑھی ان کے پاس ہوتی تھی۔ آدھی ساڑھی لپیٹ کر، آدھی کھلی ساڑھی کو پچھک پچھک دھولیتیں۔ پھر دھلی ہوئی آدھی ساڑھی کو لپیٹ کر بچی ہوئی آدھی ساڑھی دھوتیں۔ نچوڑ کر اسی ساڑھی کو پہن لیتیں۔ بچوں کو ہاتھ سے رگڑ کر نہلایا جاتا۔ پہنے پہنے ان کی گیلی ساڑھی سوکھ جاتی اور دھوپ، ہوا سے، بغیر پونچھے بچوں کا پانی سوکھ جاتا۔

باہر کے سامنے کے دروازے میں مجھے کسی نے پکارا۔

''میں نہانے جا رہا ہوں، تم جا کر دیکھو کون ہے،'' میں نے چلّا کر بیوی سے کہا۔

دوبارہ پکار ہوئی، ''صاحب! صاحب!''

میں نے کہا، ''مہنگو ہے، اسے جانے مت دینا۔''

تبھی پیچھے سے بیوی کو پکارا گیا، ''بائی! بائی!''

بیوی نے کہا، ''چوکیدار ہے۔''

میں نے کہا، ''میں سامنے جاتا ہوں، تم چوکیدار سے بات کرو کیا بات ہے۔ دونوں ایک ساتھ ٹپک پڑے۔''

''جے رام جی کی صاحب!'' دروازہ کھلتے ہی مہنگو نے کہا۔

''کیسے مہنگو؟''

Scanned with CamScanner

''بائی صاحب نے بلایا ہے۔''

''بس ابھی چلتا ہوں۔ تمھاری تندرستی پہلے سے اچھی ہوگئی ہے۔ نوکری سے خوش تو ہو؟ باپ کی یاد آتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آتی ہے صاحب!'' مہنگو نے کہا۔

''تمھارا باپ 'رام رام صاحب' بولتا تھا، تم 'جے رام جی کی صاحب' بولتے ہو۔'' مجھے اس پر ترس آیا۔ ''چائے پیو گے؟''

''نہیں صاحب،'' اس نے کہا۔

اس کے باپ کو میں نے کبھی چائے کے لیے نہیں پوچھا تھا۔ اس نے پوچھنے کا کبھی موقع ہی نہیں دیا۔ اکثر دبے پاؤں، اچانک آتا تھا اور فوراً بھاگ جاتا تھا۔

''ارے، پی لو۔ تب تک میں تیار ہوتا ہوں۔''

مہنگو اندر آکر برآمدے میں بچھے ایک بورے پر بیٹھ گیا۔

بیوی نے کہا، ''ڈاکٹرنی نے بلایا ہے۔''

''کیوں؟''

''بتلایا نہیں، کچھ نہ کچھ کام ہوگا، گپ مارنے کے لیے مجھے نہیں بلائے گی۔''

''اور بائی صاحب نے مجھے بلایا ہے،'' میں نے کہا۔

''کیوں؟''

''کچھ نہ کچھ کام تو رہتا ہے۔''

''میں نے سنا ہے تم بائی صاحب کے لیے ساگ سبزی خریدنے بازار جاتے ہو؟''

''کبھی ایک بار گیا ہوں گا۔ وہ کہیں گی تو جانا پڑے گا۔ موٹر میں بیٹھ کر گیا تھا، موٹر سے لوٹ کر آیا تھا۔ اور کچھ تو نہیں سنا؟ کس نے کہا؟''

''یاد نہیں آ رہا ہے۔ بہت دن ہو گئے۔''

''کچھ برا کرتا ہوں؟''

''نہیں۔ نہا کر جانا۔''

Scanned with CamScanner

''اب نہانے کو جی نہیں چاہ رہا۔ صاحب نے کسی کام سے بلایا ہوگا، آ کر نہالوں گا۔ وہاں تو پسینے دھول سے چپچپاہٹ ہو جاتی ہے۔ دفتر کی بات الگ رہتی ہے۔ کرسی پر بیٹھے رہنا ہوتا ہے۔''

دوبارہ نہالینا۔ نہا کر جاؤ گے تو اچھا لگے گا۔''

''تب میری وجہ سے تم کو ایک بالٹی پانی اور لانا ہوگا۔ اب تم کو بالٹی نہیں اٹھانا چاہیے۔''

''چھوٹی بالٹی میں پانی لاتی ہوں۔''

''اگر نل پر عورتیں نہ ہوتیں تو میں پانی بھر دیا کرتا۔ ایسا کرتے ہیں، پانی بھر کر تم مجھے کچھ آگے آ کر بالٹی پکڑا دیا کرو۔ میں ڈرم میں پانی ڈال کر تمھیں خالی بالٹی دے دیا کروں گا۔''

''عورتوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔''

''ڈاکٹر کے گھر تمھارا بار بار جانا مجھے اب اکھرنے لگا ہے۔ پہلے نہیں اکھرتا تھا۔ پرسوں گئیں تو صبح کا کھانا نہیں بنا سکیں۔''

''اس لیے مجھے ڈاکٹرنی سے مانگ کر سبزی روٹی لینی پڑی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ آج گھر کا کھانا نہیں بن پائے گا، بہت دیر ہو گئی ہے۔ پورے حساب سے روٹی لائی تھی کہ دونوں کو پُر جائے۔ ڈاکٹرنی نے پوچھا تھا کہ تم کتنی روٹی کھاتے ہو۔ میں نے کہا آٹھ روٹی میں تمھارا پیٹ بھر جاتا ہے۔ دس روٹی میں کھاتی ہوں۔ اٹھارہ روٹی لائی تھی۔''

''تم مجھے بھوکا مارنا چاہتی تھیں۔ دس روٹی میں نے کھائی تھیں، تم نے آٹھ کھائی تھیں۔''

''تم روز کی خوراک سے زیادہ کھا گئے تھے۔ سبزی اچھی بنتی ہے تو تم ایک دو روٹی زیادہ کھا جاتے ہو۔''

''تم اور زیادہ روٹی لا سکتی تھیں۔ پارٹی میں بہت کھانا بچتا ہے۔ کرانے کی دکان والے گپتا جی کو بلا سکتے تھے تو مجھے بھی بلا سکتے تھے،'' میں نے چڑ کر کہا۔

''تم وہاں نہ جاؤ تو اچھا ہے،'' اس نے اداس ہو کر کہا۔

''کیوں؟''

''ایسے ہی، کسی کا احسان لینا ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''ڈاکٹرنی کے گھر جاؤ گی؟'' میں نے پوچھا۔

Scanned with CamScanner

''چوکیدار سے کہہ دیا ہے کہ ابھی آ رہی ہوں۔ جانا پڑے گا۔ نہیں جاؤں گی تو کہیں گے کہ بہانہ کر رہے ہیں۔''

''کیا ہم لوگ ان کے نوکر ہیں؟'' چلاّ کر میں نے کہا۔

میں اسی آدمی کی طرح چلاّیا جس کی پنجرے میں بند شیر کی دیکھ ریکھ کی ذمے داری تھی۔ ایک دن شیر نے پروسا گیا کھانا نہیں کھایا تھا، اس آدمی کو دیکھتا ہوا گزرتا تھا۔ وہ گھوم کر دوسری طرف چلا جاتا تو شیر بھی ادھر جا کر گزرتا تھا۔ پنجرے میں چاروں طرف لوہے کی سلاخیں لگی تھیں۔ وہ جس طرف گھومتا، شیر اسی طرف جا کر کھڑا ہو جاتا۔ اس کی خواہش ہوئی، اتنے دن ہو گئے شیر کی دیکھ ریکھ کرتے، دیکھیں کیا کرتا ہے! اور وہ چپکے سے پنجرے سے سٹ کر کھڑا ہو گیا۔ شیر تب کونے میں بیٹھا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ پنجرے کے پاس آیا ویسے ہی شیر اس کی طرف دہاڑ مار کر جھپٹا۔ اس کا ایک پنجہ پنجرے کے کافی باہر نکل آیا تھا، اس میں بڑے بڑے ناخن تھے۔ شیر اس کی طرف جھپٹا تو وہ گھبرا کر چلاّیا تھا۔

''اس میں نوکر ہونے کی کون سی بات ہے؟ ہم لوگ ان کا کام کر کے ان کا احسان تو اتار دیتے ہیں۔''

''ان کا احسان ہمیشہ بھاری رہے گا۔ کام کر کے احسان اتارا جاتا تو وہ لوگ قلیوں اور مزدوروں کے احسان مند ہو گئے ہوتے۔'' سیکنڈ کے کانٹے کے سرکنے سے ایک بوجھا سر پر آ کر سوار ہو جاتا ہے۔ اگر کسی کے پاس گھڑی نہیں ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

''چائے بنا دو۔ ایک کپ مہنگو کے لیے بھی بنا دو،'' میں نے کہا۔

''مہنگو،'' میں نے پکارا، ''چائے بن رہی ہے، پھر چلتے ہیں۔ تم تب تک میری سائیکل پونچھ دو۔ سیٹ کے نیچے کپڑا اکھنسا ہے۔ بائی سے پمپ لے کر دونوں پہیوں میں ہوا بھر دینا۔''

''جی صاحب!'' مہنگو نے کہا۔

مہنگو کے تیار ہو جانے کے بعد میں نے سوچا کہ میں نے اس پر ایک جانا پہچانا نسخہ آزمایا ہے۔ مہنگو کو بنا ایک کپ چائے پلائے بھی میں اس سے سائیکل پچھوا سکتا تھا۔ اور بیگار جو میری نظر میں دھیرے دھیرے ایک گری ہوئی حرکت بنتی جا رہی تھی، اسے کرانے کے لیے چائے کا ایک کپ مجھے تسکین دے رہا تھا جو میں مہنگو کو پلانے والا تھا۔ چوری کے پیسے سے بھیک دینے کی تسکین۔ اس برہمن

بیوپاری کی دلیل جس کی پانچ لڑکیاں تھیں اور اکیلا لڑکا تھا، کہ ایشور نے اسے پانچ لڑکیاں دی ہیں، ان کے جہیز کے لیے وہ بیوپار میں بے ایمانی کرتا ہے۔ اپنی بے ایمانی کے لیے اس نے ایک بہانہ ڈھونڈ لیا تھا۔ ہر بے ایمان آدمی اسی طرح کے بہانے ڈھونڈ کر بے فکری سے بے ایمانی کرتا تھا اور ایشور اس کی مدد کرتا تھا۔

بڑے بڑے بنگلوں کے سامنے راستہ چلتی گایوں کے پانی پینے کے لیے ایک ایک ٹنکی بنی تھی۔ گرمیوں میں سیٹھ مارواڑیوں کے لڑکے پیاؤ کھول کر بیٹھ جاتے تھے۔ ریلوے اسٹیشن میں یاتریوں کو ٹھنڈا پانی پلانے کے لیے ریل گاڑی کے وقت لڑکے موٹر کار میں بیٹھ کر آتے۔ یاتریوں کو پانی پلا کر پسینہ پونچھتے ہوئے گھر لوٹ جاتے تھے۔ دونوں ہاتھ ہلاتے چلتے تھے، ایک ہاتھ سے بے ایمانی اور دوسرے ہاتھ سے دھرم، سماج اور سیاست کے کام۔

کرشن بینکرز کے بنگلے کے سامنے ہر اتوار کو پہلے پچیس کلو چاول کا بھات بانٹا جاتا تھا۔ پچیس کلو چاول یعنی پینتیس روپے کا چاول۔ جب چاول مہنگا ہونے لگا تو چاول اتنا ہی بٹتا جتنا پینتیس روپے میں آتا۔ روپے طے تھے، چاول نہیں۔ کھاتے میں دھرم کے نام پر بس پینتیس روپے نکلتے تھے۔ یہ روپے تبھی بڑھتے جب اسی تناسب سے منافع بڑھتا۔

میں نے دیوانگن بابو سے یہ بات کہی تو انھوں نے کہا کہ اگر ان لوگوں پر اس طرح کی تنقید ہونے لگی تو جو کچھ بھی دھرم کے نام پر غریبوں کا بھلا ہوتا ہے وہ بھی نہیں ہوگا۔ اس سے غریبوں کا نقصان ہوگا۔

ایک کپ چائے کی بات کر کے میں نے مہنگو سے سائیکل پچھوانے کے کام کے لیے ہمت پیدا کی تھی۔ مجھ میں اور صاحب میں بہت فرق تھا۔ صاحب کی اونچائی کی طرف کی سڑک پر ایک قدم رکھ کر مہنگو گلے تک دھنس گیا تھا، دو قدم رکھ کر میں گیا تھا۔ ایسی صورت حال کا خاتمہ کرنے کے لیے مجھے قدیم زمانے کے پتھر کے ہتھیار ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے اسی تہذیب سے ہتھیار ڈھونڈنا تھا۔

مہنگو رگڑ کر سائیکل پونچھ رہا تھا۔

''مہنگو!'' میں نے پکارا۔ بہت خوب۔ یہ میری اصلی آواز تھی۔ ''رہنے دو، سائیکل میں خود صاف کرلوں گا۔''

''ہوا بھر دوں؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ بھی میں کرلوں گا۔''

بیوی چائے لے کر آئی۔ بیوی نے مجھے ویسا ہی کپ دیا جیسا مہنگو کا تھا۔ یہ دیکھ مجھے خوشی ہوئی۔ کپ لے کر وہ بورے پر بیٹھنے جا رہا تھا، تب میرے منھ سے نکلا، ''کرسی پر بیٹھ جاؤ مہنگو۔''

وہ ہچکچا رہا تھا، پھر بھی بیٹھ گیا۔ کمرے میں جا کر میں نے بیوی سے پوچھا، ''مہنگو کو میں نے کرسی پر بٹھایا ہے، اس سے تم کو تعجب تو نہیں ہوا؟''

''نہیں،'' بیوی نے کہا۔

''تم جانتی ہو، کرسی پر بیٹھے ہوئے مہنگو کی حالت وہ نہیں ہے جو صاحب کے بنگلے کی کرسی پر میری تھی۔''

بیوی کچھ سمجھ نہیں پائی۔ ''تمھاری کون سی حالت تھی؟'' اس نے پوچھا۔

''سمپت سے اس کا تجزیہ کرنے کے لیے کہوں گا،'' میں نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

''بائی! او بائی!'' چوکیدار پھر آ گیا تھا۔

''ڈاکٹرنی کو صبر نہیں ہے،'' میں نے کہا۔

''ضروری کام ہوگا،'' بیوی نے کہا۔

''مجھے بھی یہی لگتا ہے۔''

''میں جاؤں؟'' بیوی نے پوچھا۔

''گھر سے پہلے میں نکلوں گا۔''

''مہنگو پہلے بلانے آیا تھا، اس لیے کہہ رہے ہو؟'' بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں، مہنگو پہلے آیا تھا۔ اسے آئے دیر ہوگئی ہے۔ تم تالا بند کر لینا۔ ایک چابی میں اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔''

''تم کو تیار ہونے میں ابھی وقت لگے گا۔ کپڑے بدلو گے۔ میں تو تیار ہوں۔ تم بعد میں چلے جانا۔'' چوکے کی ساڑھی پہنے میں نے اسے تیار دیکھا۔

''ٹھیک ہے، تمھی پہلے چلی جاؤ۔ ایک چابی اپنے ساتھ رکھ لینا۔'' مہنگو سے میں نے کہا،

Scanned with CamScanner

''چوکیدار سے کہہ دو، بائی ابھی آتی ہیں۔''

''میں تو جا ہی رہی ہوں۔مہنگو کیا کہے گا؟''

''جاؤ،''میں نے کہا۔

بیوی کے جاتے ہی مجھے اور دیر ہو جانے کا احساس ہوا۔ میں جلدی جلدی کپڑے بدلنے لگا۔ مہنگو اپنے اور میرے جھوٹے کپ پلیٹ دھو رہا تھا۔ میں نے اس سے کھڑکی اور پیچھے کے دروازے کو بند کرنے کے لیے کہا۔ میں نے سوچا تھا کہ پیچھے کے دروازے میں تالا لگاؤں تا کہ ڈاکٹرنی کے گھر سے بیوی کو گھر آنے میں سہولت ہو۔ سامنے دروازے میں تالا لگانے سے اسے گھوم کر آنا پڑتا۔ اور مجھے امید تھی کہ اس کے پہلے میں گھر پہنچوں گا۔

مہنگو بھی سائیکل پر تھا۔ ہم دونوں برابری میں آ کر سائیکل چلا رہے تھے۔ وہ بہت خوش تھا۔ خوشی میں آ کر ایک دو تیز پیڈل مار کر مجھ سے آگے نکل جاتا، پھر پیڈل مارنا بند کر کے میری برابری میں آ جاتا۔ میں نے اس سے کہا،''دیر ہوگئی ہے۔ بائی صاحب ناراض ہوں گی۔''

''نہیں ہوں گی صاحب،''اس نے کہا۔

''تم یہ مت کہنا کہ چائے پینے لگ گئے تھے۔ کہنا کہ نہار ہا تھا۔''

''اچھا صاحب،''اس نے کہا۔

میں جلد بازی میں ہاتھ منھ بھی ٹھیک سے نہیں دھو پایا تھا۔

احاطے کا دروازہ موٹر کے نکلنے کے لیے کھول دیا گیا تھا۔ گاڑی پورچ میں تیار تھی۔ شہر کے کچھ بیوپاری صاحب سے ملنے کے لیے کھڑے تھے۔ ایک اور دو بیوپاریوں کے ساتھ ایک داروغہ باتیں کر رہا تھا۔ مہنگو سائیکل گیرج کے پاس کھڑی کر کے پیچھے کے دروازے سے اندر چلا گیا۔ میں نے اس کی سائیکل کے پاس اپنی سائیکل کھڑی کر دی۔

مہنگو پیچھے کے دروازے سے نکل کر آیا۔''بائی صاحب آ رہی ہیں۔ آپ کو پوچھ رہی تھیں کہ آئے یا نہیں۔''

میں موٹر کار کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ بہت نفاست سے سجی ہوئی بائی صاحب پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ میں سامنے بیٹھ گیا، ہمیشہ کی طرح۔ جب موٹر کار چلنے لگی تو ان لوگوں نے ہاتھ جوڑ کر بائی

Scanned with CamScanner

صاحب کو نمسکار کیا۔ داروغہ نے سلیوٹ مارا۔

بازار میں ایک بڑے پروویژن اسٹور کے سامنے موٹر آ کر رکی۔ بائی صاحب کے کام سے میں یہاں آ چکا تھا۔ کار سے باہر آیا تو بازار میں ڈاکٹر صاحب کی موٹر کار پہچان گیا۔ وہی کار تھی جس کے بمپر سے لوہے کی زنجیر برآمدے کے کھمبے میں کتے کی طرح باندھ دی جاتی تھی۔ زنجیر کے دونوں سروں میں ایک ایک بڑا تالا لگا رہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب آئے ہوں گے، میں نے سوچا۔ کار کے دروازے کے پاس ایک گندی گالی ابھی دھول پر لکھی تھی۔ لیکن حروف کی دھول صاف تھی۔ میں نے سوچا اچھا ہے۔ میں ان کی کار میں انگلی سے نشان بناتے ہوئے گزرا۔

بائی صاحب کے پیچھے میں دکان کے اندر گیا۔ سامان کی فہرست ڈرائیور نے مجھے دے دی تھی جسے میں نے دکاندار کو دے دیا۔ دکاندار ادب سے مسکراتے ہوئے بائی صاحب کے لیے ایک کرسی لے آیا تھا۔

وہ بیٹھیں نہیں۔ انھوں نے کہا، ''پندرہ بیس منٹ میں لوٹ کر آتی ہوں، آپ سامان تیار رکھیے۔'' موٹر میں بیٹھ کر وہ چلی گئیں۔

میں سامان بندھوانے لگا۔ سامان کے تول کو میں فہرست سے ملا کر دیکھتا جا رہا تھا۔ سامان اتنا تھا کہ کم سے کم آدھا گھنٹہ لگتا۔ تبھی میری نظر سڑک کی دوسری طرف ایک کپڑے کی دکان پر گئی۔ میں نے اس دکان میں اپنی بیوی کو ڈاکٹرنی کے ساتھ دیکھا۔ اوہ، میری بیوی ہی تھی۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ڈاکٹرنی کرسی پر بیٹھی تھی اور بیوی کے سامنے رکھے کپڑوں کو دیکھ رہی تھی۔ کیا وہ اپنے لیے بلاؤز کا کپڑا یا ساڑھی دیکھ رہی ہے؟ یا میرے لیے قمیض کا کوئی کپڑا؟ وہ ڈاکٹرنی کے لیے خریداری کر رہی ہے، ایسا معلوم ہوا۔ مقابلہ برابری سے تھا۔ تب جیسے میں کچھ دیر تک ایک گہرے گندے نالے کے اندر ڈوبا رہا، پھر ایسے باہر نکل آیا جیسے کچھ نہیں ہوا تھا۔ کپڑوں میں ایک چھوٹا داغ بھی نہیں تھا۔ آس پاس بدبو نہیں تھی۔ دکان میں لکشمی جی کی فوٹو کے سامنے دن رات جلنے والا ایک چھوٹا لال بلب تھا اور اگربتی جل رہی تھی، جس کی خوشبو تھی۔

بیوی اپنی بینگنی رنگ کی، نائیلون کے چمکدار دھاگوں سے کڑھی ہوئی ساڑھی پہنے تھی۔ مجھے تعجب یہ تھا کہ وہ مول بھاؤ کیسے کر رہی ہوگی۔ کیا وہ پہلے بھی ڈاکٹرنی کے ساتھ خریداری کے لیے بازار آ

Scanned with CamScanner

چکی تھی؟ میں اسے اپنی دکان کے سامنے اپنی ٹیبل میں سجائے ہوئے ڈبوں کی آڑ سے دیکھ رہا تھا۔ اور وہ کبھی کبھی ٹیبل پر اکٹھے ہو گئے کپڑوں کی آڑ میں ہو جاتی تھی۔ اسے کوئی کپڑا پسند نہیں آ رہا ہوگا۔ میں ایک کھمبے کی آڑ میں ہو گیا تا کہ وہاں سے اس کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔ بیوی کا یہ تماشا میرے لیے انوکھا تھا۔ سمجھ میں آیا کہ دن کے وقت بھی دکانوں کے اندر ٹیوب لائٹ کا جلنا کتنا ضروری ہوتا ہے۔ اس دکان کا نام فیشن ہاؤس تھا۔ اچھی اور بڑی دکانوں میں ایک تھی۔ کالج کے لڑکے لڑکیوں کی اس دکان میں بھیڑ رہتی تھی۔ دولڑکے اس دکان میں گھسے، پھر بھیڑ بڑھ گئی۔ اتنی دور سے دیکھنے سے لگتا تھا کہ بیوی لوگوں سے بالکل سٹ کر کھڑی ہے۔ اگر پاس جا کر دیکھتا تو بے شک بیوی لوگوں سے ایک فٹ کی دوری کا گھیرا بنائے کھڑی ہوگی۔ میں نے دل ہی دل میں اس سے کہا، ''جلدی خریداری کرو اور باہر نکلو۔''

ڈاکٹرنی باہر نکلی۔ اس کے پیچھے بیوی۔ اس کے داہنے ہاتھ میں سامان سے بھرا ہوا ایک تھیلا تھا۔ بائیں ہاتھ سے وہ ڈاکٹرنی کو آنے جانے والے لوگوں سے، سائیکلوں سے بچا کر سڑک پار کرا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک گھر گرہستی والی دبو عورت ہے۔ اس میں نوکری کرنے والی عورتوں کی سی خود اعتمادی اور ہمت تھی۔ نوکری کس کی؟ میری یا ڈاکٹرنی کی؟ اس کے علاوہ کوئی نوکری نہیں تھی۔

دونوں اسی دکان کی طرف آ رہی تھیں۔ میں بیوی سے بچنا چاہتا تھا۔ دونوں جب دکان کے اندر گھسیں تو میں باہر کی جانب کھسک کر دکان کے کھمبے کی آڑ میں ہو گیا۔ بیوی سے میں پوری طرح چھپا ہوا تھا۔ بائی صاحب کے لیے جو کرسی باہر نکالی گئی تھی اس پر ڈاکٹرنی بیٹھ گئی۔ اس کی نظر مجھ پر پڑ سکتی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ مجھے پہچانتی ہے یا نہیں۔ میرا اس سے کبھی آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹرنی کے کان کے چھید بھاری گہنوں کی وجہ سے بڑھ گئے تھے۔ اس کا کان لٹک آیا تھا۔ ایک تو وہ تھل تھل موٹی تھی، اوپر سے بڑی آنکھ اور موٹے ہونٹ تھے۔ وہ ایک بوڑھی، موٹی، طاقتور عورت تھی۔

بیوی مجھے بہت تندرست لگ رہی تھی۔ پیٹ میں بچہ آ جانے کے بعد ڈاکٹرنی نے ڈاکٹر سے اسے کئی طرح کی طاقت کی دوائیاں دلوا دی تھیں۔ طاقت کی دوائی اس پر جادو کی طرح اثر کرتی تھی۔ اس کا لمبوترا چہرہ بھرا ہوا اور گول لگ رہا تھا۔ میں اسے اسی طرح سندر دیکھ رہا تھا جیسے کسی دوسری عورت کو دیکھ رہا ہوں۔ اس کا پیٹ بڑھ گیا تھا، دھیان سے دیکھنے سے سمجھ میں آتا تھا۔ آنکھ کے نیچے کا کالا پن نہیں

تھا۔شاید اس نے ہلکا سا پاؤڈر بھی لگایا تھا۔ اگر اس نے پاؤڈر لگایا تھا تو بہت سمجھداری سے، کیونکہ اس کا چہرہ بہت سندر لگ رہا تھا۔ گھر میں پاؤڈر نہیں تھا۔ ڈاکٹرنی نے بھی ہلکا سا پاؤڈر لگایا تھا۔ شاید اسی نے بیوی کو پاؤڈر لگانے کے لیے زور دیا ہو۔ وزنی تھیلا اس نے نیچے رکھ دیا تھا۔

''آپ کے پاس میسور چندن کا سوپ ہے؟'' بیوی نے دکاندار سے پوچھا۔ ارے یہی بیوی کی آواز ہے؟ کتنی بدلی ہوئی! کتنی مہذب! کتنی میٹھی!

''کئی دنوں سے مال نہیں آ رہا ہے۔ یہ صابن آپ کو کہیں نہیں ملے گا۔ چندن کی خوشبو کے دوسرے صابن ہیں۔ آپ کہیں تو دکھلاؤں؟''

''نہیں، میسور چندن کا ہی صابن چاہیے۔ زیرہ بتلا دیجیے،'' اس نے کہا۔

ایک المونیم کی طشتری میں نوکر زیرہ لے کر آ گیا۔ بیوی نے انگلیوں سے پھیلا کر دیکھا۔ اس نے ڈاکٹرنی سے کہا، ''یہ اچھا ہے۔ لے لیتے ہیں۔'' ڈاکٹرنی نے سر ہلا کر ہاں کہا۔

شاباش! میں نے دل ہی دل میں اسے شاباشی دی۔ میں نے اس میں ایک اعتماد دیکھا۔ پر میں سوچ رہا تھا کہ اس نے زیرے کا بھاؤ کیوں نہیں پوچھا۔ پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ بھاؤ کی فہرست کالے تختے پر سفید سندر حرفوں میں لکھی گئی تھی۔ وہ ایک بڑے خاندان کی بہو لگ رہی تھی۔ دکاندار اس کے رعب میں تھا۔ میری نظر اس کے پیر پر پڑی۔ اس کا پیر صاف تھا لیکن ایڑی میں سوکھی کالی گہری دراریں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اگر اس کے پیر چکنے ہوتے تو لمحہ بھر کے لیے مجھے شک ہو جاتا کہ وہ میری بیوی ہے یا کوئی دوسری عورت۔ اتنی بدلی ہوئی تھی۔ بہت مہذب، بہت اچھی۔ شادی کے پہلے بھی وہ خریداری کرتی ہوگی؟ جب بھی میں نے اسے بازار جانے کے لیے کہا، کسی نہ کسی بہانے بات ٹال گئی۔ کیا وہ میرے ساتھ بازار جانے کا تک نہیں بٹھا پا رہی تھی؟ کیونکہ خریداری کے سارے ارمان مجھ سے اڑھائی تین روپے میں پورے ہو جاتے جبکہ بازار سب عورتوں میں ایک بری لت کی طرح پھیل گیا تھا۔ معمولی حیثیت کی عورتوں میں تو دس پیسے اور پانچ پیسے والے سٹے کی طرح ہو گیا تھا۔ میں کب سے اس میں دنیاداری کے لیے اعتماد اسی حق سے پیدا کرنا چاہتا تھا جس حق سے اس کے پیٹ سے میرا بچہ پیدا ہوتا۔ غریب سے غریب آدمی کے پاس بھی بیوی سے بچے پیدا کرنے کے لیے نہ معلوم کتنے ڈھیر سے موقعے تھے۔ پر بازار سے خریداری کے موقعے انوکھے واقعے کی طرح ہوتے یا برے واقعے کی طرح۔

’’چھین کی دو جھاڑو دے دیجیے،‘‘ بیوی نے کہا۔

جھاڑو کیوں؟ میں نے سوچا۔ کس کے لیے خرید رہی ہے؟ بے وقوف ہے۔ اصلیت جلدی نہیں کھلنی چاہیے۔ اگر وہ ڈاکٹرنی کے لیے جھاڑو خرید رہی تھی تو بھی بری بات تھی۔ دکاندار کو شک ہو جاتا کہ یہ اصلی خریدار نہیں ہے۔ اصلی خریدار تو وہ ہے جو کرسی پر بیٹھی ہے۔ دکاندار کو معلوم تھا کہ میں اصلی خریدار نہیں ہوں۔

ان کے نکلتے ہی میں دکان کے اندر آ گیا۔ وہ موٹر میں پیچھے ڈاکٹرنی کے ساتھ بیٹھی اور موٹر میں ہمیشہ بیٹھتے رہنے کی عادت سے بیٹھی۔ بس میں بیٹھنے سے موٹر میں بیٹھنا بھی آ جاتا ہوگا۔ ڈاکٹرنی کے ساتھ بازار کرنے وہ کئی بار آ چکی ہوگی۔ دونوں گھر جائیں گی۔

تصور میں میں نے گھر میں دو تالے لگے ہوئے دیکھے۔ پیچھے کے دروازے میں بیوی کا تالا ہے جس کی دونوں چابیاں بیوی کے پاس رہیں گی۔ مجھے اس چابی سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ سامنے کے دروازے میں تالا ہے جس کی چابی صرف میرے پاس رہے گی، اور اس سے بیوی کو کوئی مطلب نہیں ہوگا۔ ہم دونوں ایک ہی وزن اس طرح ڈھو رہے تھے جیسے دو الگ الگ وزن ہوں۔ جو کچھ میں اس کے مستقبل کے لیے کر رہا تھا، وہ میرے مستقبل کے لیے کر رہی تھی، جو وزن تھا۔ بہت کچھ پاتے ہوئے ہم دونوں کے بیچ ایک ایسی شفاف علیحدگی تیار ہوگئی تھی جس کے آر پار ہم لوگ آ جا سکتے تھے۔ ایک کمرے کے بعد دوسرے کمرے میں۔

گھر کا دروازہ کھولتے ہی میں نے گھر کو ایسے دیکھا جیسے کسی خالی ڈبے کے ڈھکن کو کھول کر اندر جھانک رہا ہوں۔ اگر خالی پن بھی کوئی چیز تھی تو اس سے گھر ٹھسا ٹھس بھرا ہوا تھا۔ اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ گھر کے اندر میں اسی طرح آیا جیسے ایک اور خالی پن اندر آیا ہو۔

کھانا نہیں بنا تھا۔ بھوک نہیں لگ رہی تھی۔ دوپہر کو کھانا کھانے کی عادت پڑ گئی تھی۔ صاحب کے گھر میرا آنا جانا بڑھ گیا تھا۔ دفتر اگر نہ بھی جاؤں تو بڑے بابو کی ٹوکنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ اس کے باوجود دیر سے دفتر جانے کا ڈر اندر ہی اندر بڑھتا رہتا۔ صاحب کے گھر جانے میں مجھے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ لیکن دفتر جاتے وقت گھٹن ہوتی تھی۔

میں نہا رہا تھا، تب مجھے بیوی کی آواز سنائی دی۔ آواز سامنے سے آ رہی تھی۔ میں بھاگتا، کمرے

Scanned with CamScanner

میں پانی ٹپکاتا دروازہ کھولنے آیا۔ میں نے رک کر پوچھا، ''میں نہا رہا تھا، تم تھوڑی دیر رک نہیں سکتیں؟''

''جب تم دروازے تک آ گئے ہو تو دروازہ کھول دو۔ کب سے کھڑی ہوں۔''

''میں بالکل گیلا آ گیا ہوں۔ پہلے پونچھ لوں۔''

''جب تم آ گئے ہو تو دروازہ کھولتے کیوں نہیں؟''

''کپڑے بدل لوں، تب کھولوں گا۔ ایسے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔''

''میں گھبرا رہی ہوں، دروازہ نہ کھولنے کے لیے تم بہانہ کر رہے ہو۔''

''تم کو میری بات پر یقین نہیں آتا۔ سچ مچ میں گیلا کھڑا ہوں۔ اچھا، تم دروازے کی درار سے دیکھ لو کہ میں گیلا ہوں یا نہیں۔''

اس نے دروازے کی درار سے دیکھا۔ ''دیکھ لیا، تم گیلے ہو۔ اب دروازہ کھول دو۔''

''اگر میں نہ کھولوں تو تم کیا کرو گی؟''

''کیوں نہیں کھولو گے، میں نے کیا کیا ہے؟ مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے؟''

''دروازہ نہیں کھولوں گا تو تم کہاں جاؤ گی؟''

''ڈاکٹرنی کے گھر چلی جاؤں گی، پر وہ بھی آرام کر رہی ہو گی۔ کھولو نا!''

''نہیں کھولتا۔ تم ڈاکٹرنی کے گھر چلی جاؤ۔''

''اچھا،'' اس نے اداس ہو کر کہا۔

بڑا پیٹ لے کر اس سے پیدل چلتے نہیں بنتا ہو گا۔ تھک گئی ہو گی۔ پھر گھوم کر ڈاکٹرنی کے گھر جائے گی اور تھک جائے گی۔

''رک جاؤ، کھولتا ہوں،'' میں نے کہا۔

''میں نے سوچا تھا کہ تم پیچھے کے دروازے سے آواز دو گی۔ سامنے کے دروازے سے کیوں آئیں؟''

''میں نے سوچا تھا، تم نے سامنے تالا لگایا ہو گا اور ابھی آئے نہیں ہو گے۔''

''تم نے یہ کیسے سوچ لیا؟'' میں نے دروازہ کھولا۔ اسے خالی ہاتھ اندر گھستے دیکھ میرے منھ سے نکلا، ''تم کہاں اتری تھیں؟'' دراصل میں پوچھنا چاہتا تھا کہ تمھاری جھاڑو کہاں گئی؟ وہ تھکی ہوئی تھی۔

Scanned with CamScanner

آ کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ میں کپڑے بدلنے لگا۔

''اسی لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ ڈاکٹرنی کا چکر چھوڑو۔ دیکھو کس بری طرح تھک گئی ہو۔''

''ڈاکٹرنی کی وجہ سے نہیں تھکی، دروازے کے سامنے جو اتنی دیر تک تم نے کھڑے رکھا تھا اس سے تھک گئی،'' اس نے آنکھ موندے ہوئے کہا۔

''کتنی اچھی ساڑھی پہنے تم لیٹ گئیں،'' میں نے کہا۔

''ارے!'' وہ اٹھ گئی۔

وہ اٹھی تو بنیان پہنے میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ بستر پر اس کی چوکے کی ساڑھی تھی، جو مجھ سے دب گئی تھی۔ دبی ساڑھی کھینچ کر اس نے نکالنے کی کوشش کی۔ طاقت سے کھینچتی تو ساڑھی پھٹ جاتی۔ ساڑھی کمزور ہو چکی تھی۔

''ذرا اٹھو،'' اس نے کہا۔

''میں ایک بے جان آدمی کی طرح پڑ جاتا ہوں۔ مجھے سرکا کر ساڑھی نکال لینا۔'' میری بات سن کر اسے دکھ ہوا ہوگا، پر اس نے ایسا کچھ کہا نہیں۔

''کھانا بنانا ہے۔ دفتر نہیں جاؤ گے؟''

''آج دفتر نہیں جاؤں گا'' کہہ کر میں آنکھ موندے پھر بے جان آدمی ہو گیا۔ کھٹیا کی پائینتی کی طرف جا کر اس نے دونوں پیر پکڑ کر بڑی مشکل سے مجھے سرکایا۔ میں ویسا ہی سرکا رہا۔ گھوم کر وہ سرہانے کی طرف آئی۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو پیچھے کر دیا اور اس نے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر مجھے پھر سرکایا۔ ساڑھی اب میرے نیچے دبی ہوئی نہیں تھی۔

ساڑھی اٹھا کر جاتے ہوئے اس نے ہنستے ہوئے کہا، ''صاحب ناراض ہوں گے اگر دفتر نہیں جاؤ گے۔''

''مجھے صاحب کی دھمکی دیتی ہو!'' تکیہ اس کی طرف پھینکتے ہوئے میں نے کہا، ''صاحب کے کام میں صبح سے لگا رہا۔ کچھ تو رعایت کریں گے۔'' صاحب کا نام سن کر میں اور بے جان آدمی نہیں بن پایا۔ ''تم مجھے چین سے نہیں رہنے دو گی۔ میں بھی تمھیں ڈاکٹرنی کی دھمکی دوں گا۔ اگر مجھے کام کے لیے مہنگو بلانے آتا ہے تو تمھیں کام کے لیے بلانے چوکیدار آتا ہے۔ جیسے تم ان کے گھر کی باورچن بن گئی

ہو۔ میں مروں گا تو تم کہو گی، ارے! مر رہے ہو، اچھا ہے اب میں بھی مر جاتی ہوں۔ یہ نہیں کہو گی کہ ہم دونوں کو جینا ہے۔ حد ہو گئی۔''

''مجھ میں بہت ہمت تھی۔ اب بھی ہمت ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے، اگر ہمت دکھلائی تو تم ساتھ چھوڑ دو گے اور مجھے دوش دو گے۔''

''اچھا ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ سب میری غلطی ہے۔''

جب وہ چوکے کی ساڑھی پہن کر تیار ہوئی تو میں نے اسے ایک نیا تالا دکھلایا۔ ''یہ تمھارا تالا ہے۔ تم پیچھے کے دروازے میں تالا لگا کر آیا جایا کرو۔ میں سامنے کے دروازے میں پرانا تالا لگایا کروں گا۔ نئے تالے کی دونوں چابیاں تم رکھو گی۔ پرانے تالے کی دونوں چابیاں میرے پاس رہیں گی۔ میں نے تصور میں گھر کے دونوں دروازوں میں تالے لگے دیکھے ہیں۔ ایک تالا پہلے سے ہے، دوسرا تالا اور خرید لایا۔ پہلے تم گھر سے باہر نہیں نکلتی تھیں۔ تب ایک بھی تالے کی ضرورت نہیں تھی۔ کبھی ہم دونوں ایک ساتھ باہر نکلیں گے، یہ سوچ کر تالا لایا تھا۔ ساتھ ساتھ تالا کھول کر اندر گھسیں گے۔ مگر اب ہم دونوں کو الگ الگ باہر رہنا پڑتا ہے، اس لیے دو تالے ضروری ہو گئے۔ ایک سے بھی کام چل جاتا، پر سوچو، تم کو دن میں چار بار آنا جانا پڑے تو گھوم کر جانے میں تکلیف ہو گی۔ تمھیں تکلیف ہو گی یا مجھے۔ دو تالے ہونے سے دونوں کو آرام رہے گا۔''

''سامنے کے دروازے سے میں اب نہیں آ سکتی۔ سامنے کے دروازے سے آنے جانے کا اب میرا حق نہیں رہا۔''

''اس میں حق کی کیا بات ہے؟ تمھاری خواہش ہے تو تمھی سامنے کے دروازے سے آ جاؤ۔ سامنے کے دروازے سے ڈاکٹر کا گھر دور پڑے گا، اور پیچھے کے دروازے سے میرا دفتر۔''

''تم باہر کا دروازہ بند کر کے چلے جاؤ گے تو میں نکل کر پانی کیسے بھروں گی؟ ہاں، بورنگ سے پانی لانے کی سہولت رہے گی۔ پر بورنگ سال کے زیادہ تر دنوں میں خراب رہتا ہے۔ پینے کا پانی تو نل سے لانا پڑتا ہے۔''

''ایسی صورت میں دو پتیلیاں ہونی چاہییں، ایک نل کا پانی بھرنے کے لیے اور ایک بورنگ کا پانی بھرنے کے لیے،'' میں نے اسے چڑاتے ہوئے کہا۔

''کبھی اماں آئیں تو باہر کا دروازہ بند دیکھ کر فکر میں پڑ جائیں گی کہ ہم دونوں کہاں چلے گئے، جبکہ ہو سکتا ہے کہ پیچھے کے دروازے سے آ کر میں گھر کے اندر ہوں،'' بیوی نے کہا۔

''کبھی کبھی مہنگو صاحب کی خبر لے کر پیچھے کے دروازے سے بھی آئے گا۔ پیچھے کے دروازے میں تالا بند دیکھ کر وہ لوٹ جائے گا کہ گھر پر کوئی نہیں ہے۔ اور لوگوں کو باہر کے دروازے کی عادت پڑ گئی ہے۔ ایک ہی دروازے میں تالا بند کر جانا ٹھیک رہے گا۔ گھر ایک ہے۔''

''ہم دونوں ایک نہیں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، ہم دونوں ایک ہیں،'' میں نے کہا۔

یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئی۔ میرا جی بھی ہلکا ہو گیا۔

❋

اپنی حفاظت کے لیے گھر کی چٹخنی لگا لی۔
دنیا کی حفاظت کے لیے کس جگہ چٹخنی لگے گی؟
گھڑی دیکھنا وقت دیکھنا نہیں ہوتا۔

جی چاہ رہا تھا کہ اب گھر بدل دینا چاہیے۔ ایک بار نوکری کھو دینے کو بھی جی چاہا۔ گھر بدلنے اور نوکری بدلنے کے بجائے خود کو بدلنا چاہیے۔ کس سے اپنے کو بدلوں؟ اندر ہی اندر میں اپنے کو بدلنے کی تیاری کرنے میں بہت دنوں سے جٹا ہوا تھا۔ اس میں مجھے بہت وقت لگ سکتا تھا۔ پہلے میرا اندر ٹوٹ پھوٹ کر بدصورت بھی ہو سکتا تھا، بعد میں ٹھیک۔ اماں کی کمی ہم دونوں کو بہت کھلنے لگی تھی۔ ہم دونوں کے بیچ میں اماں کا ہونا ضروری ہو گیا تھا۔ کچھ دنوں پہلے میں نے بڑے بھائی کو خط لکھا تھا کہ اماں کا اب یہاں ہونا ضروری ہے۔ اماں اچھی طرح جانتی ہیں کہ ان کی بہو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ جس دن ان کا آنے کو چاہے، میں چھٹی لے کر انھیں لینے کے لیے آ جاؤں گا۔ اگر انھیں آسانی سے چھٹی مل جائے تو بھابھی بچوں کو لے کر وہ بھی یہاں آ جائیں۔

بڑے بھائی کو چھٹی مشکل سے ملتی تھی۔ ان سے کام میں بہت غلطیاں ہوتی تھیں۔ ایک بار تو

اتنی بڑی غلطی ہوگئی کہ صاحب خود پھنس گئے تھے۔ بڑے بھائی کی نوکری جاسکتی تھی۔ وہ بچوں کے ساتھ صاحب کے پاس معافی مانگنے گئے۔ بھابھی کو بھی لے جانے والے تھے، پر کچھ سوچ کر کہ اس سے کچھ غلط اثر پڑ سکتا ہے، نہیں لے گئے۔

بچوں کے ساتھ ان کو دیکھتے ہی صاحب زور زور سے ڈانٹنے لگے تھے۔ سب سے چھوٹی تین سال کی کنّی اور اس سے بڑا چار سال کا کنّا، دونوں نے تب رونا شروع کر دیا تھا۔ بچوں کا رونا سن کر صاحب اور بھڑک گئے۔ دھکّے مار کر نکلوا نہیں سکتے تھے، نہیں تو نکلوا دیا ہوتا۔ بائی صاحب اندر سے یہ سب دیکھ رہی تھیں۔ وہ آئیں اور کنّا کنّی کو ایک ایک بسکٹ پکڑا دیا۔ چھ سال کے بڑے لڑکے گڈّن نے بسکٹ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ بائی صاحب نے بسکٹ اس کی جیب میں ڈال دیا۔ کنّا کنّی بعد میں نہیں روئے، بسکٹ کھانے میں لگے رہے، جبکہ بڑے بھائی کو صاحب نے اور ڈانٹا تھا۔

بڑے بھائی کہتے تھے کہ کنّا کنّی کی وجہ سے انھیں معافی ملی۔ وہ گڈّن کے اوپر غصہ تھے۔ صاحب کے گھر سے جب وہ باہر نکلے تو انھوں نے گڈّن سے کہا کہ جیب سے بسکٹ نکال کر کھالو، مگر اس نے بسکٹ سڑک پر پھینک دیا۔ انھوں نے گڈّن کے سر پر طمانچہ مارا۔ سڑک پر تھا، اس لیے گڈّن بالکل نہیں رویا۔ کنّی بسکٹ زمین سے اٹھا کر کھانے لگی۔

میں نے ان سے شادی کے لیے انکار کیا تھا۔ تب انھوں نے کہا تھا کہ تمھاری نوکری لگ گئی ہے، شادی کرنا اب ضروری ہوگیا ہے۔ شادی شدہ آدمی ایمانداری سے نوکری کرتا ہے۔ بچے ہو جانے کے بعد وہ اور بھی ایماندار ہو جاتا ہے۔

جب انھیں یہ معلوم ہوا ہوگا کہ کچھ مہینوں بعد میں باپ بنوں گا تو انھیں بہت خوشی ہوئی ہوگی۔ نوکری کے لیے میری ایمانداری کم ہوتی جارہی تھی، اور صاحب کے لیے بڑھتی جارہی تھی۔ کام میں اب بھی محنت سے کرتا تھا۔ مگر دفتر آنے جانے میں لاپروا ہو گیا تھا۔

بیوی پابندی سے ڈاکٹر کے گھر کا صبح کا کھانا بنانے لگی تھی۔ ڈاکٹر کی بیوہ بہن اس کے ساتھ ہوتی۔ وہاں سے لوٹ کر آنے کے بعد گھر کے لیے کھانا بناتی۔ روز ڈاکٹر کے گھر سے کچھ نہ کچھ لے آیا کرتی۔ چنری ساڑھی بہت پہلے چوکے کی ساڑھی ہو کر پھٹ چکی تھی۔ ڈاکٹرنی نے اسے چوکے کے کام

لیے ایک پرانی ساڑھی دی تھی، جو چوکے کے لحاظ سے بہت اچھی تھی۔ دھیرے دھیرے دن کا کھانا گھر میں بننا بند ہو گیا۔ اسے فرصت نہیں ملتی تھی۔ اسے رات کو دوسرے دن کے لیے پراٹھا سینکنا پڑتا۔ دفتر میں کام بہت بڑھ گیا تھا۔ بارش نہ ہونے کی وجہ سے گاؤں سے جتھے کے جتھے کسان، بیج، کنویں وغیرہ کے قرضوں کے لیے دفتر کے سامنے پیڑوں کے نیچے برآمدے میں بیٹھے رہتے۔ میں پراٹھے لے کر صبح آٹھ بجے گھر سے باہر نکل جاتا۔ صاحب کے بنگلے کا جھٹ پٹ کام کر کے دفتر چلا جاتا تھا۔ بائی صاحب کے ساتھ میرا بازار جانا زیادہ دن نہیں چلا۔ میں اکیلا جا کر سامان لے آتا تھا۔ بائی صاحب سماجی کاموں میں مصروف ہو گئی تھیں۔ کئی بار مجھے بنگلے کے گیرج میں کھانا کھانا پڑتا تھا۔ اس بیچ کمزوری کی وجہ سے میری بھی طبیعت خراب ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے بھی طاقت کی دوائیاں دی تھیں۔ چھت کی پریشانی نہیں تھی۔ پانی برسنا بند ہو چکا تھا۔ کبھی برستا تو پانچ دس منٹ کے لیے تھوڑی بوچھار ہوتی اور پھر بند ہو جاتی۔ ڈاکٹر صاحب کے بینک وغیرہ کے کام بھی میں کرنے لگا تھا۔

دفتر میں مجھے بھائی صاحب کا خط ملا کہ وہ بدھ کو اماں کو چھوڑنے آئے تھے، مگر گھر میں تالا بند تھا۔ پڑوس کے نائی اور کرانے کی دکان والے گپتا سے پوچھا تو دونوں نے بتایا کہ بہو ڈاکٹر کے بنگلے میں مل سکتی ہے۔ دوپہر کا وقت تھا، ڈاکٹر کے بنگلے میں باہر کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ انھوں نے گھنٹی بجائی۔ کچھ دیر بعد چوکیدار نکلا۔ اس نے انھیں اور اماں کو بیمار سمجھا۔ اس نے کہا کہ ابھی مریضوں کے دیکھنے کا وقت نہیں ہے۔ بھائی صاحب نے اپنا تعارف کرا کے بیوی اور میرے بارے میں پوچھا۔ چوکیدار نے انکار کر دیا، اسے کچھ نہیں معلوم تھا۔ ڈاکٹرنی گھر پر نہیں تھی، نہیں تو چوکیدار ڈاکٹرنی سے پوچھ کر بتلا دیتا۔ اس نے کہا کہ پہلے وہ میری بیوی کو کام کرنے کے لیے بلانے جایا کرتا تھا، پر آج کل وہ اپنے آپ ہی آیا جایا کرتی ہے۔ ہار کر دونوں تھکے ہارے دفتر گئے۔ راستے میں نل دیکھ کر اماں اور بڑے بھائی نے منھ ہاتھ دھویا۔ سامان زیادہ نہیں تھا۔ دو تھیلا سامان تھا۔ اماں بستر لانا بھول گئی تھیں۔ ایک چھوٹی بانس کی ڈولچی تھی۔ ڈولچی میں بھابھی نے گجھیا بنا کر بھیجا تھا۔ بھوک لگی تو وہیں کھڑے کھڑے ان دونوں نے گجھیا کھائی۔ اماں کا گجھیا کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ہم لوگوں کے نہ ملنے کی وجہ سے ان کا جی گھبرانے لگا تھا۔

بڑے بھائی نے اماں کو دفتر کے باہر چھوڑ دیا تھا۔ گورا بابو سے انھوں نے میرے بارے میں

پوچھا۔ گوراہابابو نے انھیں بتلایا کہ میں پانچ روز سے دفتر نہیں آ رہا ہوں۔ اماں سے جب بڑے بھائی نے گوراہابابو کی بات بتلائی تو وہ رونے لگیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ معلوم نہیں ہم دونوں کو کیا ہو گیا ہے۔ گوراہابابو نے مجھے صاحب کے بنگلے میں دیکھنے کے لیے کہا تھا۔ میری بیوی کے بارے میں گوراہابابو نے بتلایا کہ ڈاکٹر کے بنگلے میں مل سکے گی۔ میرے گھر سے وہ ہو کر آ گئے تھے۔ دوبارہ جانے کی ہمت نہیں ہوئی کہ جب اس بار بھی کوئی نہیں ملا تو اماں کو بہت دکھ ہو گا۔ صاحب کے بنگلے جانے کو جی نہیں چاہا، پتا نہیں صاحب ناراض ہو جاتے، کہہ دیتے، جا کر پولیس میں خبر کرو۔ گھر لوٹنے کے لیے گاڑی کا وقت ہو گیا تھا۔ یہ گاڑی چھوٹ جاتی تو دوسرے دن اسی میں جانا پڑتا۔ اور کوئی گاڑی نہیں تھی۔ انھیں چھٹی نہیں ملی تھی، اس لیے رک نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے اماں سے پوچھا کہ کیا کیا جائے، رات کو بھی ہم لوٹ پائیں گے، یہ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا، تب رات کو ٹھہرنے میں دقت ہوتی۔ ویسے پچھواڑے کی کھڑکی دو تین دھکے میں ٹوٹ جاتی۔ کھڑکی کے راستے گھر کے اندر گھس سکتے تھے۔ پر مکان مالک ناراض ہو جاتا۔ کوئی ان کو چور سمجھتا۔

اماں کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اماں پوچھ رہی تھیں کہ آخر میں اور بیوی کہاں ہو سکتے ہیں۔ میرے بارے میں پتا لگانے کے لیے کہہ رہی تھیں۔ اماں کو وہ کس کے بھروسے چھوڑ جاتے۔ اماں کا لوٹ کر جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اسٹیشن آ جانے کے بعد اماں کو یاد آیا کہ گجھیا کی ڈولچی دفتر میں کسی کو دے دیتے تو اچھا رہتا۔ خیر، دونوں واپس گھر چلے گئے۔

میں نے خط کو پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ بیوی اگر یہ سب پڑھ جاتی تو رونے لگتی۔ تب بھی مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے اسے بتلایا کہ اماں آئی تھیں، بڑے بھائی کے ساتھ، لیکن گھر میں ہم دونوں نہیں تھے۔ تالا بند دیکھ کر لوٹ گئیں۔

بیوی نے مایوس ہو کر کہا، ’’مجھے شک تھا کہ اماں تالا دیکھ کر لوٹ جائیں گی۔‘‘ یہ کہہ کر وہ ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگی۔ روتے روتے اس نے کہا، ’’کس نے تم سے تالا خریدنے کے لیے کہا تھا؟‘‘

’’سب میرا قصور ہے۔ جب گھر سے ہم دونوں کو باہر جانا تھا، بلاؤز کا کپڑا خریدنے، تب تالا نہ ہونے کی وجہ سے نکل نہیں پائے تھے۔‘‘

’’بلاؤز کا کپڑا خریدنے کبھی نہیں گئے۔ تالا خرید کر لے آئے۔‘‘

Scanned with CamScanner

''میں سوچ رہا تھا کہ دوسروں کی طرح ہم دونوں ساتھ ساتھ گھوم پھر کر خوشیاں منائیں۔''

''مجھے گھر کے اندر گھسے رہنے میں کوئی دکھ نہیں تھا۔ میں نے تم سے کبھی نہیں کہا کہ گھما کر لاؤ، سنیما دکھالاؤ۔''

''تو گڑبڑ کیا ہوئی؟ تمھاری سنیما دیکھنے کی خواہش نہیں ہوتی۔ جب بھی تم کو اپنے ساتھ باہر چلنے کے لیے کہا، تم نے انکار کردیا۔''

''تمھارے ساتھ جاتی تو بھی تالا بند کرنا پڑتا۔''

''وہی اچھا رہتا۔''

''چھت کے ٹپکنے کی بات چیت کے لیے تم نے مجھے ڈاکٹرنی کے پاس بھیجا تھا۔''

''میں ڈاکٹر سے بات نہیں کر پایا تھا۔ تم ڈاکٹر کی بیوہ بہن کے ساتھ ایک بار جا کر ڈاکٹرنی سے پہچان کر چکی تھیں۔ چھت ٹپکنے کی وجہ سے ہم دونوں کا رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ میں نے تمھیں ڈاکٹرنی کے پاس جانے کے لیے کہا تھا، وہاں جا کر چاول چننے اور چائے پینے کے لیے نہیں کہا تھا۔''

''تم بعد میں بیمار پڑ گئے تھے اور بیماری میں ڈاکٹر نے مفت میں علاج کیا تھا۔''

''میں نے ڈاکٹر کے پاس جانے سے انکار کیا تھا۔ سمپت مجھے زبردستی اٹھا کر لے گیا تھا۔''

''مجھے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔'' اسے چکر سا آ گیا۔

گہری چوٹ لگنے سے خون کا نکلنا بند نہیں ہوتا۔ اسے اماں کی بہت یاد آ رہی تھی۔ اس کا رونا دیکھ کر میں بھی گھبرا گیا۔ اسے ڈر لگ رہا تھا کہ آگے کیا ہوگا۔ بڑی مشکل سے اسے سمجھایا۔ جب اس سے کہا کہ میں کل ہی جا کر اماں کو لے آتا ہوں، تب اسے خوشی ہوئی اور وہ خوش ہو کر ہنسنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد بیوی نے کہا، ''آج کل مجھے بھوک بہت لگتی ہے۔ تھک بھی جلدی جاتی ہوں۔ رات کو نیند بہت آتی ہے۔ پر مجھے اس مکان مالک ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے مت کہنا۔ اب ڈاکٹرنی مجھے بلائیں گی تو بھی نہیں جاؤں گی۔ دوہرا کام ہو گیا ہے۔''

''اماں کو لینے جاؤں گا تو میری غیر حاضری میں تو کچھ نہیں ہوگا؟''

''کچھ نہیں ہوگا۔ میں محلے کی رو تائن سے بول دوں گی کہ وہ میری مدد کردے۔ اور ضرورت ہوئی تو میں اس کے ساتھ سرکاری اسپتال چلی جاؤں گی۔ مگر ابھی کئی دن ہیں اور اماں کو لینے تم کل جا رہے ہو۔''

Scanned with CamScanner

''اگر خطرے والی بات ہو تو تم ڈاکٹرنی کے پاس چلی جانا۔ کچھ دن اور سہہ لیں گے۔ ان سے دو دن بعد ہی چھٹکارا ہو جائے گا۔''

''آج سے چھٹکارا ہو گیا۔ میں ان کی خریدی نوکرانی نہیں ہوں۔ چوکیدار بلانے آئے گا تو انکار کر دوں گی۔''

''میں بھی دفتر کے وقت دفتر میں رہوں گا۔ صاحب کے بنگلے نہیں جاؤں گا۔ دفتر سے سیدھے گھر آ کر تمھارے پاس رہوں گا۔ اماں کو لا کر شام کو ہم تینوں گھر میں تالا لگا کر گھومنے کے لیے جائیں گے۔''

''تب اگر بڑے بھائی آ جائیں تو تالا لگا دیکھ کر لوٹ جائیں گے۔''

''نہیں لوٹیں گے، چابی نائی کو دے جائیں گے۔''

''نائی کو چابی دے کر ابھی گھومنے چلیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں'' میں نے خوش ہو کر کہا۔ تبھی مجھے یاد آیا کہ کل صبح کی گاڑی سے جانا ہے تو مجھے بڑے بابو کے گھر چھٹی کی درخواست لے کر جانا ہوگا۔ ''ابھی نہیں جا سکتے۔ کیونکہ کل صبح ایکسپریس سے نکلنا ہے، اس لیے بڑے بابو کو خبر کرنی ہوگی۔ ابھی ان کے گھر جا رہا ہوں۔''

''اچھا، لوٹ کر آؤ گے تب چلیں گے۔ اماں کا گھومنے کو بہت جی چاہتا ہے، پر ہچکچاہٹ کی وجہ سے کچھ نہیں بولتیں۔''

اماں کو لینے جانے کا مطلب پچیس روپے کا خرچ۔ روزمرہ کے خرچ سے الگ خرچ۔ بازار میں کئی چیزیں چوگنی قیمت کی ہو گئی تھیں۔ بارش نہ ہونے سے بچا کھچا چاول بھی بازار سے غائب ہو چکا تھا۔ کچھ دنوں سے لوگوں کو راشن کی دکان سے بہت راحت تھی۔ مگر راشن کی دکان سے ادھار سامان نہیں ملتا تھا۔ گپتا جی کی دکان کی ادھاری قریب چار سو روپے کی ہو گئی تھی۔ چار سو سے اوپر ادھاری کو نہ تو گپتا جی پہنچنے دے رہے تھے اور نہ میں چکا کر چار سو سے نیچے اتار پا رہا تھا۔ یعنی انھوں نے نقد خریدنے کے لیے کہا تھا۔ انھوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک ان کی ادھاری چک نہیں جاتی راشن کی دکان سے میں شکر، چاول، گیہوں نہیں خرید سکتا۔ انھوں نے میرا راشن کارڈ اپنے پاس جمع کر لیا تھا۔ بیوی کہتی تھی کہ چار سو روپے کی ادھاری ہو نہیں سکتی ہے۔ میں نے کہا کہ ادھار دینے والے کو ہم لوگ شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ میں نے حساب سمجھ لیا ہے، حساب ٹھیک ہے۔

Scanned with CamScanner

میں نے گپتا جی سے کہا، ''میرے نام کا راشن آپ اپنی دکان میں لاتے ہوں گے؟''

''ہاں، لاتے ہیں۔''

''شکر بھی لاتے ہیں، اور مجھے تگنی قیمت میں بیچتے ہیں۔''

''چار سو روپے کی ادھاری کے بجائے آپ سے وصول کرتا ہوں۔ چھوٹا موٹا بیوپاری ہوں۔ چار سو روپے میں میرا بہت کام نکلتا۔''

میں سوچ رہا تھا کہ راشن کارڈ کے کھو جانے کی درخواست دے کر دوسرا کارڈ بنوالوں۔ مگر گپتا جی کو معلوم ہو جاتا اور وہ ادھار چکانے کے لیے سر پر سوار ہو جاتے۔

مہنگائی کے بڑھتے رہنے کی وجہ سے لوگوں کی شکایت کرنے کی ہمت ٹوٹ گئی تھی۔ جھنڈ کے جھنڈ دیہاتی شہر کے الگ الگ حصوں میں گھستے۔ ان کے پاس جو کچھ بچا ہوتا، یعنی برتن، کمبل، لڑکیاں وغیرہ، شہر کی حد میں آتے ہی لوگ دام لگا کر خریدنے کی کوشش میں لگ جاتے تھے۔ شہر کے بیچ تک پہنچتے پہنچتے وہ لوگ کچھ بیچ باچ کر، کچھ لٹا کر چھٹکارا پاتے اور جیسے تیسے جان بچاتے ہوئے نوکر بازار میں اپنے پورے کنبے کے ساتھ کھڑے ہو جاتے۔ لوگوں کے پاس کام نہ بھی رہتا، تب بھی لڑکیوں کو کام کرانے لے جاتے۔ پہلے سے اچھی اچھی لڑکی چھانٹ لینے کی کوشش کرتے۔ نوکر بازار میں بڑھتی ہوئی بھیڑ سے اور کام ملنے کی امید میں لوگ آٹھ بجے کے بعد بھی دیر تک کھڑے رہتے۔ اس سے دکانداروں کو پریشانی ہونے لگی تھی۔ وہ ان کی بھیڑ کو اپنی دکان کے پٹرے سے کھدیڑنے کے بعد ہی دکان کھول پاتے تھے۔ گاہکوں کو ان کے بیچ سے دکان کے اندر داخل ہونے میں دقت ہوتی تھی۔ کئی بار دکانوں کے پٹرے یا برآمدے میں چھوٹے چھوٹے بچے ٹٹی پیشاب کر دیتے تھے۔ دکاندار دکان کھولتے وقت اس گندگی کو دیکھتا تو غصے سے آس پاس سب سے پہلے جس کسی کو چھوٹے بچے کے ساتھ دیکھتا اس کو پکڑ کر پوری گندگی صاف کرواتا۔ اس کے بچے کی گندگی نہ بھی ہوتی تو بھی دکاندار کے ڈر سے اسے صفائی کرنی پڑتی۔

نوکر بازار میں بھیڑ کے بڑھتے جانے سے مزدوری اتنی سستی ہو گئی تھی کہ پیسا پانچ کی روزی میں کوئی بھی کام کے لیے تیار ہو جاتا۔ بہت سے موچی بڑھئی، ھجوا موچی کی طرح، کام کھوجنے کے بجائے بھیک مانگنے لگے تھے، پر اچانک بھیک دینے کا رواج غائب ہو گیا تھا۔ مہنگو یا ڈکالو جب پیدا ہوا تھا، تب ایسی ہی حالت یا اس سے بھی خراب حالت رہی ہوگی۔ تو میرے بچے کے جنم کا وقت بھی اکال کا

وقت ہوگا، میں نے سوچا۔ اکالو اور مہنگو جیسے نام ٹو ٹکے کے لیے بھی رکھے جاتے تھے، تاکہ برا وقت اس پر اتنا برا اثر نہ ڈال پائے۔ مجھے اپنے بچے کا نام مہنگو یا ڈکالو رکھنا ہوگا۔ ہزاروں لاکھوں بچوں کے جنم کا وقت یہی ہوگا، مزدور کامگار کو بھکاری بھکارن بنانے والے وقت کی برائیوں سے بچانے کے لیے؟ اگر لڑکی ہوئی اس کا نام منگتی رکھنا ہوگا؟ یہ نام ٹھیک نہیں ہوگا۔ لڑکے کا نام ٹو ٹکے کے لیے۔ یتھارتھ[۸] بھی رکھا جاسکتا تھا۔ یتھارتھ اکال[۹] نہیں ہے۔ یتھارتھ ہرے بھرے کھیت ہیں۔ وچار لڑکے کا نام ہوسکتا تھا، لڑکی کا نام بنانے کے لیے مجھے وچار درشنی رکھنا ہوگا۔ لیکن ایک اچھا وچار اور ایک اچھی وچار درشنی۔

دوسرے دن سنیچر تھا۔ کل اگر اماں کو لینے جاتا تو کل ہی مجھے لوٹنا ہوتا۔ اس لیے بہت صبح اور گزرتی رات کی ایکسپریس گاڑی ٹھیک تھی۔ چھٹی کی درخواست کے ساتھ بڑے بابو سے ملنا ضروری تھا۔ بڑے بابو جہاں رہتے تھے وہاں ایک ہی طرح کے بہت سے سرکاری کوارٹر تھے۔ ایک ہی جیسے نوکروں کے کوارٹر ہونے کی وجہ سے وہ کسی کلرک کے لیے نکالے گئے کاربن کاغذ کی نقل سے تھے۔ کرائے کے مکان کے مقابلے میں بہت سہولت تھی۔ سب نوکری والوں کو یہاں اکٹھا دیکھ کر لگتا تھا کہ ان کے اوپر آسمان اتنا بڑا اور زیادہ ہے کہ یہ لوگ اب اسے اپنی اپنی طرح سوچنے کے لیے آزاد ہو گئے ہیں۔ اس یکسانی میں بڑے بابو کے گھر کی پہچان یہ تھی کہ انھوں نے اپنے گھر کے سامنے اینٹوں کا ایک چھوٹا چبوترا بنا رکھا تھا۔ یہ چبوترا ان کی سائیکل سواری کے لیے تھا۔ اگر ان کی سائیکل میں گھوڑے سے بھی کم سمجھ ہوتی تو بھی وہ ان کے باہر نکلنے کے وقت خود چل کر چبوترے کے پاس آکر کھڑی ہو جاتی۔ سائیکل سواری کا ان کا ایسا انتظام تھا۔

بڑے بابو نے مجھے دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ وہ دھوتی کو لنگی کی طرح لپیٹے ہوئے باہر ٹہل رہے تھے۔ "آؤ آؤ!" کہہ کر انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ مجھے گھر کے اندر لے جانے لگے۔ گھر کے اندر آتے ہی وہ سرگوشی میں بات کرنے لگے تھے۔ میں نے دھیان دیا تھا کہ وہ اس طرح آڑ میں بیٹھے تھے کہ باہر سے اندر گھسنے والا ان کو ایک دم سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ باہر بھی جب وہ ٹہل رہے تھے تو جب تک میں ان کے جھونپڑیوں کے چھوٹے احاطے کے اندر آ نہیں گیا تھا تب تک انھیں دیکھ نہیں پایا تھا۔ جیسے ہی میں

---

۸۔ یتھارتھ: حقیقت ۹۔ اکال: قحط

اندر گھسا، انھوں نے مجھے پکڑ لیا تھا۔ انھوں نے مجھے اس طرح دیکھا تھا جیسے میں ان کا لڑکا ہوں۔ بعد میں انھوں نے دیکھا کہ میں ان کا لڑکا نہیں، سنتو بابو ہوں۔ جب وہ گھر کے اندر لے جانے لگے تب میں نے کہا تھا: ''قمیض اتارنے کا تو خیال نہیں ہے بڑے بابو؟ آپ نے مجھے اچھا چکر میں ڈال دیا۔''

''کون سا چکر ہے بھائی؟ کوئی چکر نہیں ہے،'' انھوں نے کہا۔

''مجھے کل کی چھٹی چاہیے۔ اماں کو لینے جانا ہے۔''

''کیوں، کیا بات ہے؟''

''میری بیوی کو بچہ ہونے والا ہے۔ بیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی،'' میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔

''بہت خوب۔ بڑی خوشی کی بات ہے،'' انھوں نے بالکل دبی ہوئی آواز میں کہا، ''چائے پیو گے؟''

''میں شراب نہیں پیتا!'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بڑے بابو ایک خاموش زور کی ہنسی ہنسے۔

''سنتو بابو، میرا گھر بھی ایک چھوٹا موٹا مال خانہ ہے۔ تم جو کہو گے، مل جائے گا، آزما کر دیکھ لو۔ افیم کھاؤ گے؟''

''میں نشہ نہیں کرتا،'' میں نے کہا۔

بڑے بابو نے ہنستے ہوئے اپنی ڈھیلی ہوگئی لنگی کسی۔

''بڑے بابو، میرے دل میں ایک شک ہے۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو کہوں؟''

''برا کیوں مانوں گا؟ بولیے۔''

''آپ کے لڑکے کے سلسلے میں ہے۔''

''میں نے اپنے لڑکے کے بارے میں گندی سے گندی اور بری سے بری باتیں سنی ہیں۔ تم کہو۔''

''میں سوچتا ہوں، صاحب کو ابھی تک نوکر نہیں ملا اور آپ کو آپ کا لڑکا۔ آپ دونوں مل کر کسی ایک لڑکے کو تو نہیں ڈھونڈ رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تمھارے دل میں ایسا شک کیسے ہوا؟ میں نے اس طرح کبھی نہیں سوچا تھا۔'' وہ اداس ہو گئے۔

میں نے کہا، ''میں گھر میں آنے والے لڑکے کے لیے اپنے کو تیار نہیں کر پا رہا ہوں۔ گھر کا ماحول پہلے بہت اچھا تھا۔ پانی تو برستا نہیں، چھت کے ٹپکنے کی پریشانی نہیں ہے۔ مگر شروع میں جو زور

Scanned with CamScanner

کی بارش ہوئی تھی اس سے ابھی تک سیلن ہے۔ دوسری برسات کے پہلے مجھے اس مکان کو بدلنا ہے۔ نوکری سے خرچ پورا نہیں ہوتا۔ میں ریڈیو بنانے کا کام سیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر اس نوکری میں رہوں گا تو پندرہ بیس سال بعد میری بھی ترقی ہوگی۔ میں بڑا بابو ہو جاؤں گا اور تب کسی دن میرا لڑکا بھی بھاگ جائے گا۔ میں اپنے صاحب کے لیے نوکر اور اپنے لڑکے کو ساتھ ساتھ ڈھونڈوں گا، اور جب تب اپنے نئے ماتحت بابو کو نوکری کی قمیض پہنا کر صاحب کو خوش رکھوں گا۔ آپ کے پہلے جو بڑے بابو تھے، کیا ان کا لڑکا بھی بھاگ گیا تھا؟"

"نہیں، ان کا لڑکا نہیں بھاگا۔ ان کا لڑکا بہت بھلا ہے۔ اب تو وہ بھی کمانے لگا ہوگا۔ تمھاری طرح ہوگا۔"

"میرے ساتھ مجبوری کی عادت ہے۔ آپ کے ساتھ بھی یہی ہے۔ آپ مجبوری کی عادت کو صرف عادت کہتے ہیں۔"

"کام کو تم مجبوری کہتے ہو، اسے تم اپنا فرض سمجھ لو۔"

"کام کو فرض سے جوڑنے کے لیے کہتے ہیں، پر کام کو آپ آدمی سے نہیں جوڑتے۔ اگر میں روز صبح شام صاحب کے بنگلے کی گھاس اکھاڑتا رہوں تب بھی آپ مجھے بہت خوش ہو کر تنخواہ دیں گے۔ کام کا کوئی دباؤ نہیں ہے، صاحب کا دباؤ ہے، پر وہ بھی کام کے لیے نہیں ہے۔ معلوم نہیں کس کے لیے ہے۔ آپ لوگ صاحب کی خوشی کی فکر کرتے ہیں، کام کی فکر کس کو ہے؟ نوکری کا تجربہ، یعنی کام کو کیسے اٹکانا ہے۔ جب میں اچھی طرح کام کرتا ہوں تو نیا ملاّ کہلاتا ہوں۔ مجھے لوگ پیر کے کمرے میں بیٹھنے کے لیے کہتے ہیں، کبھی سیدھے مزار پر جا کر بیٹھنے کے لیے کہتے ہیں۔ میں خرانٹ پرانا نوکر ہونے کے پہلے ریڈیو مستری بننا چاہتا ہوں۔ بگڑا ہوا ریڈیو سدھار دوں اور اس سے گانے آنے لگیں، خبریں آنے لگیں تو مجھے لگے گا میں نے کچھ کیا ہے۔ یہاں اَن گنت فائلیں کھول کر آدمی کو بچانے کے لیے نہیں بیٹھے ہیں، فائلیں صاحب کو بچانے کے لیے ہیں۔ کاغذ میں ہمارے دستخط کو دیکھ کر صاحب دستخط کرتے ہیں، پر وہ ہمیں بھی دستخط کرنے کے لیے مجبور کر سکتے ہیں۔ ابھی تک جتنی بھی جھنجھٹیں ہوئی ہیں، صاحب ان میں کبھی نہیں پھنسے۔ ہم لوگ پھنستے ہیں۔ کاغذ پر لکھنے سے مجھے ڈر لگتا ہے کہ غلطی تو نہیں ہو رہی ہے۔ سالے یہ بڑے بھائی، کسی کو چٹھی لکھتا ہوں تو لال ڈبے میں ڈالنے کے پہلے دس بار پڑھتا ہوں کہ میں جو

Scanned with CamScanner

کہنا چاہتا ہوں وہی لکھا ہے یا نہیں۔ یہ تبھی تک ہے جب تک مجھ میں تھوڑی بہت ایمانداری باقی ہے۔ جب ایمانداری ختم ہو جائے گی تب مجھے فائلوں سے ڈر لگنا بند ہو جائے گا۔ پہلے مجھ میں ہمت تھی۔ اس کے پہلے کہ میں سب کی طرح بے ایمان ہو جاؤں، اس ادارے سے دور ہونا چاہوں گا۔ اس ادارے کو اکیلا میں نہیں بچا سکتا۔ کم سے کم اپنی ایمانداری تو بچا سکتا ہوں۔ آپ میرے بڑے بھائی کو جانتے ہی ہیں۔ وہ نوکری کے نام سے اس حد تک کما چکے ہیں کہ ان کا اٹھنا بیٹھنا صاحب کے لیے ہوتا ہے۔ انھوں نے چچیرے بڑے بھائی سے اس لیے گھریلو رشتے بھی توڑ لیے کہ چچیرے بھائی سے صاحب ناراض ہیں۔ دونوں ایک ہی دفتر میں کام کرتے ہیں۔ میں اپنے گھر کی حالت جانتا ہوں، اور کچھ بھی نہیں جانتا، جیسے، اپنے گھر میں اپنی برابری سے بٹھا کر مہنگو کو کھانا کھلانے کی خواہش ہوتی ہے لیکن میں ابھی تک یہ کر نہیں پایا۔ شروعات میری غلط ہوئی، میں اس دن کا انتظار کرنے لگا ہوں کہ بائی صاحب میرے گھر کے پٹرے پر بیٹھ کر کھانا کھائیں۔ اس وقت زور کا پانی برستا رہے تو مزہ آئے گا۔ جبکہ شروعات مہنگو سے کرنی چاہیے اور چھپّر کو سدھروا کر کرنی چاہیے تاکہ مہنگو کو کھانا کھاتے وقت تکلیف نہ ہو۔ مجھے اماں کی سخت ضرورت ہے۔"

میرے چپ ہوتے ہی بڑے بابو میری ہتھیلی دیکھنے لگے۔ انھوں نے کہا، "سنتو بیٹے، میں تمھارا مستقبل جانتا ہوں۔ نہ تو تم نوکری چھوڑو گے اور نہ ریڈیو کا کام سیکھ پاؤ گے۔ اس کے لیے تمھیں دفتر سے اجازت لینی ہوگی۔ اجازت تم کو نہیں ملے گی۔ گھر کا ماحول خراب ہے تو جس کی وجہ سے خراب ہے اسے چھوڑ دو۔ نوکری کیوں چھوڑو گے؟ گھر کا ماحول جتنا خراب ہو، اتنا دفتر کا کام اور دفتر کی ذمے داری بڑھا لینی چاہیے۔ مصروف رہنا چاہیے۔ اگر مجھے دفتر نہ جانا پڑے اور دھیان کھوئے ہوئے لڑکے کی طرف رہے تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ اگر بائی صاحب کو معلوم ہو جائے کہ تمھارے چوکے کے پٹرے پر بیٹھ کر کھانا کھالیں تو آپ ان کے غلام ہو جائیں گے تو گھن لگنے کے باوجود وہ ضرور کھائیں گی۔"

"یہ میری سنیچر کی چھٹی کی درخواست ہے۔"

"اور چھٹی نہ بڑھانا، سوموار کو آجانا،" بڑے بابو نے کہا۔

"نمسکار،" میں نے کہا۔

"نمسکار،" انھوں نے جواب دیا۔

صبح جلدی وقت پر اٹھنے کے لیے میں نے ماسٹر جی سے الارم گھڑی لی۔ ان سے کہا، ''بیوی کی طبیعت خراب رہتی ہے، مجھے اماں کو لینے جانا ہے۔''

''کیوں؟'' انھوں نے کہا، ''کیا بہت خراب ہے؟ تم نے مجھے بتایا نہیں۔''

''جی، میں باپ بننے والا ہوں،'' میں نے کہا۔

وہ بڑے بابو کی طرح خوش نہیں ہوئے۔ انھوں نے کہا، ''جب بھی ضرورت ہو، گھر پر خبر کر دینا۔ ہم لوگ فوراً آ جائیں گے۔''

انھوں نے بچہ ہونے کے پہلے کی اور بعد کی ہوشیاریاں مجھے بتلائیں۔

''خیر، آپ کے اور ڈاکٹر صاحب کے گھریلو تعلقات ہیں۔ آپ کو فکر نہیں کرنی پڑے گی۔''

''ایسی بات نہیں ہے ماسٹر جی۔''

''تمھارے علم میں میرے لائق کوئی ٹیوشن ہو تو بتلانا۔''

''ہاں،'' میں نے کہا۔ ''اچھا تو چلتا ہوں، سوموار کو گھڑی لوٹا دوں گا۔ کل بھی آپ بیوی سے گھڑی لے سکتے ہیں۔ میں بیوی سے کہہ دوں گا، وہ آپ کے گھر گھڑی پہنچا دے گی۔''

''ان کو تکلیف مت دو، میں خود لے لوں گا۔ پر آپ کی بیوی گھر پر ملیں گی؟ اس بیچ میں دو تین بار آپ کے گھر گیا تھا، گھر میں تالا لگا ملا۔''

''آپ بے وقت آئے ہوں گے۔ ایسے وقت آئیے جب ہم لوگ ہوں۔''

اگر ماسٹر جی پوچھتے کہ صحیح وقت کون سا ہے جب ہم دونوں گھر پر ملیں گے، تو میں صحیح وقت بتلا نہیں سکتا تھا۔ گھر میں رہنے اور باہر نکلنے کا پروگرام ہم لوگ نہیں طے کرتے تھے۔

جانے کے پہلے انھوں نے پھر بچہ ہونے کے پہلے اور بعد کی ہوشیاریاں بتلائیں۔ اس بار انھوں نے ایک بات اور جوڑ دی کہ میری بیوی کو زیادہ سے زیادہ وقت گھر میں یا گھر کے آس پاس ہی رہنا چاہیے۔ مجھے بھی زیادہ وقت تک گھر میں یا گھر کے آس پاس رہنا چاہیے۔ بار بار گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ جب دونوں گھومنے جائیں تو اسپتال کی طرف جائیں، اسپتال سے دور نہ جائیں۔ ایک تھیلے میں زچگی کے وقت کام آنے والے کپڑے ہمیشہ تیار رکھنا چاہیے۔ گھر سے باہر نکلوں تو کام نپٹا کر جلدی لوٹ آؤں، جیسے پان کھانے گئے تو پان کھا کر فوراً واپس آ جاؤں۔ کسی کے ساتھ گپ نہ ماروں۔ جب

گپ مارنا ہو تو دوست کو اپنے گھر لے آؤں، وغیرہ۔ میں نے انھیں یاد دلایا کہ مجھے اماں کو لینے جانا پڑے گا۔ وہ بھی گھر سے کئی میل دور، اور لوٹنے میں کچھ گھنٹے لگ جائیں گے۔ صبح سے شام تک میں گھر میں نہیں رہ پاؤں گا۔ تب انھوں نے بے فکر رہنے کے لیے کہا اور کہا کہ میری غیر حاضری میں وہ میرے گھر کے دو تین چکر لگالیں گے۔

''میں شام تک گھر لوٹ آؤں گا۔''

''تب ٹھیک ہے۔ آپ بے فکر رہیے، نہیں بھی آئیں گے تو میں اپنی بیوی کو آپ کو گھر بھیج دوں گا۔''

''میں شام تک ضرور لوٹ آؤں گا۔''

بیوی ڈرپوک تھی۔ جب گھر پر اکیلی ہوتی تو اپنے کو پورے گھر میں بند کر لیتی تھی۔ رات کو گھر پر اکیلے رہنا وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ پڑوسیوں سے اس کا زیادہ میل نہیں ہو پایا تھا۔ سہیلی کے نام پر شکن اس کی سہیلی تھی، جسے میں نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ بھیڑ میں یا اکیلے میں شکن کو دیکھ کر میں پہچان نہیں سکتا تھا کہ یہ میری بیوی کی سہیلی ہے۔

جوان عورتوں کو جان جانے سے زیادہ بلاتکار کا ڈر رہتا تھا۔ مگر بیوی کو جان جانے کا زیادہ ڈر تھا۔ میں سوچتا تھا کہ اسے بلاتکار کا ڈر زیادہ ہونا چاہیے۔ اگر اس کی جان چلی جائے تو مجھے بہت دکھ ہوگا، اتنا دکھ کہ اسے بھوگنے کے لیے مجھے پوری زندگی جینا ہوگا۔ خودکشی کو میں بے وقوفی سمجھتا تھا۔ تب بیوی کی جان جانے سے مجھے دکھ ہوتا، پر میری ذلت نہ ہوتی۔ بلاتکار ہونے پر لوگوں کی ہمدردی میرے ساتھ نہ ہوتی۔ لوگوں کے نقطۂ نظر سے سوچنے میں دھوکا ہوتا تھا۔ بلاتکار سے زیادہ بڑا حادثہ جان جانا ہے۔ مگر چلن ایسا نہیں تھا۔ دوسروں کی ہمدردی ہماری خودداری کا تعین کرتی تھی۔

تین دن کے بھوکے آدمی کو اگر سمجھداری سے گدگدایا جائے تو اسے بھی ہنسی آجائے گی، اس سمجھداری کے شکار کروڑوں آدمی تھے۔

میری جان پہچان ایک ایسے لڑکے سے تھی جو کالا اور بہت سے واقف کاروں کی طرح لمبا بھی تھا۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ وہ اس طرح جاتا تھا جیسے قدموں سے دوری ناپتا ہو۔ ایک دن جب وہ اپنے

گھر کی سمت سے اسٹیشن کے پاس والی چائے کی دکان پر میرے پاس آ کر رکا تو میں نے اس سے پوچھا، ''گھر سے یہاں میرے پاس تک کتنی دوری ہے؟'' اس کے بعد میں اس کے ساتھ چلنے لگا تھا۔

''اگر تم رکتے تو بتلاتا۔ ہم دونوں ساتھ چل رہے ہیں اور میرے گھر سے تمھاری دوری بڑھتی جا رہی ہے۔''

میرا موڈ خراب تھا۔ مجھے ایسے ہی دوست کی ضرورت تھی جو مجھے ہنسائے۔ چٹکلے سنانے کے لیے اس کے بہت سے دوست تھے۔ میں بھی اس کا اسی طرح کا دوست تھا۔ وہ بہت دنوں سے نوکری ڈھونڈ رہا تھا۔

وہ اخبار لیے، سر جھکائے، لمبے قدم رکھتا، جاتا ہوا دکھائی دیا۔

''ابھی کہاں سے قدم رکھتے ہوئے آ رہے ہو؟'' میں نے اسے پکارا۔ اس نے سن لیا تھا۔

رک کر اس نے کہا، ''موٹر اسٹینڈ سے۔''

''کہاں تک جاؤ گے؟''

''ریلوے اسٹیشن تک۔''

''دونوں کے بیچ کتنے قدم کی دوری ہوگی؟'' میں نے کہا۔

اس نے کہا، ''قدموں سے دوری ناپنا غلط کام ہے۔ پہلے زندگی کے لیے میرے دل میں حوصلہ تھا اس لیے لمبے قدم رکھتا تھا۔ اب حوصلہ کم ہو جانے کی وجہ سے چھوٹے قدم رکھنا پڑتا ہے۔ پہلے موٹر اسٹینڈ سے ریلوے اسٹیشن کم دور تھا۔ اب زیادہ دور ہو گیا ہے۔ میرے گھر سے تمھارا گھر بھی دور ہو گیا۔ پڑوسی، دوست، اسپتال، اسکول، گراؤنڈ پہلے سے دور ہو گئے ہیں۔ اپن دونوں کتنے دنوں بعد ملے ہیں۔ شراب بھٹی، ماتا کے مندر جیسی جگہوں میں نہ پہلے جاتا تھا نہ اب، اس لیے یہ اتنی ہی دور ہیں۔ جو اخبار مجھے موٹر اسٹینڈ میں نہیں ملا، سوچتا ہوں ریلوے اسٹیشن میں مل جائے گا، اس لیے ادھر جا رہا ہوں۔''

''حوصلہ کم ہو جانے سے امید کم نہیں ہوتی،'' میں کہا۔

''امید کی کمی نہیں ہے۔ سنیے، آدمی ہمیشہ لڑتا رہا اور ہمیشہ ہارتا رہا۔ آخری بار ہار کر جب وہ مرنے لگا تو لوگوں نے اس سے پوچھا، اب تو تم مر رہے ہو، کم سے کم ایک بار تو جیت جاتے۔ ہم لوگوں کو دکھ ہے کہ اب تم سے لڑائی نہیں ہوگی۔ تمھیں کتنی بار ہارنا ہے اس کی گنتی آج پوری ہو چکی ہے۔

''اس بھیڑ میں ہماری تمھاری عمر کے لڑکے بھی تھے۔ مرنے والے آدمی نے جواب میں مسکراتے ہوئے کہا، ادھر دیکھو، میں کتنی تیاری کے ساتھ چلا آرہا ہوں۔

''لوگ اُدھر دیکھنے لگے جدھر اس نے اشارہ کیا تھا۔ وہاں کچھ پیڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ان سب لوگوں کو بدھو بن جاتے دیکھ کر مرنے والے کا لڑکا، جو اداس کھڑا تھا، کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اپنے لڑکے کو ہنستا دیکھ کر آدمی مسکراتا ہوا مر گیا۔ تب اس کے لڑکے نے سوچا کہ اسے جلدی تیار ہو کر پیڑوں کی طرف سے آنا ہوگا۔''

جوں جوں زچگی کا دن نزدیک آنے لگا تھا، وہ میری فکر میں پریشان ہوتی جارہی تھی۔ میں بھی اس کی بہت فکر کرنے لگا تھا۔ ارہر کی گاڑھی دال اسے اچھی لگتی تھی۔ وہ یاد میں ان چیزوں کا سواد لیا کرتی تھی جنھیں وہ شادی کے پہلے اپنے باپ کے گھر کھاتی تھی۔ ارہر کی پھلی کا ہمونا[1] کھانے کی اس کو بہت خواہش تھی۔ کئی روز تک لگاتار سبزی بازار جانے پر بھی مجھے ارہر کی پھلی نہیں ملی۔ کھیت سوکھ گئے تو کھیت کی مینڈھ پر بوئی جانے والی ارہر سب سے پہلے سوکھی ہوگی۔

سبزی بازار میں بھیڑ بہت کم ہوگئی تھی۔ بازار میں جہاں کھڑے ہونے لائق جگہ نہیں بچتی تھی، وہاں لڑکے گولی کنچے کھیلتے دکھائی دیتے تھے۔ البتہ قصائی بازار میں بکرے بہت کٹنے لگے تھے۔ سبزی بازار سے لگا ہوا قصائی بازار تھا۔ وہاں کے کتے سبزی بازار تک دوڑتے بھونکتے لڑتے دکھائی دیتے تھے۔ جگہ جگہ گائیں بیٹھی دکھائی دیتیں۔ سبزی بازار میں لگا نل جس سے بڑے تڑکے سبزی دھونے کا کام لیا جاتا تھا، وہاں آس پاس کے لوگوں کی گنڈیوں، گھڑوں کی لائن لگی رہتی۔ ندی میں پانی نہیں بھرا تھا، اس لیے تین بار کھلنے والا نل صرف ایک بار صبح کھلتا تھا۔ جہاں ایک غصیل بوڑھی عورت ڈھیری سی سبزی لے کر بیٹھتی تھی، وہاں اس کا لڑکا منہاری کا سامان لے کر بیٹھنے لگا تھا۔ دیکھا دیکھی چھٹ پٹ ٹکولی، کنگھی، بندی، آئینے کی دکانیں کھل گئی تھیں۔ سبزی کے بجائے ٹکولی بندی خریدی جاسکتی ہوگی۔

رات کو میں نے بیوی سے کہا، ''جلدی اٹھنے کے لیے میں نے الارم لگالیا ہے۔ اگر میری آنکھ نہ کھلے تو تم جگا دینا۔'' رات کو سونے کے پہلے اس نے پٹی کوٹ کا ازار بند ڈھیلا کرلیا تھا۔ پٹی کوٹ کسا

---

[1] ارہر کی ہری پھلی کو آگ میں بھون کر اس کے دانے نکال کر کھاتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

ہونے سے اس کا دم گھٹتا تھا۔ کبھی چت لیٹنے پر کبھی کروٹ لینے پر اسے آرام ملتا تھا۔ زیادہ وقت تک آرام اسے پیر موڑ کر چت لیٹنے میں ملتا تھا۔

پیٹی کوٹ نیچے سرکا کر وہ اپنا پیٹ سہلا رہی تھی۔ اس کا پیٹ ریشمی، چمکدار اور تنا ہوا تھا۔ پیٹ کے اندر کا بچہ کیسا ہوگا، ذہن میں یہ ایک خیال تو آتا تھا، پر کسی بھی طرح کے خیال میں یہ ضرور شامل رہتا تھا کہ وہ اور بیوی صحت مند ہوں۔ باپ پن مجھ میں طاقت پیدا کرے گا، اس کا مجھے بھروسا تھا۔ اگر بچہ پیدا ہوتے ہی مر گیا تو باپ ہونے کے باوجود میں باپ نہیں رہوں گا۔ یہ کس طرح کا نقصان ہوگا اس کا اندازہ لگانے سے میں بچتا تھا۔

میں نے اس سے کہا، ''میں پیٹ سہلا کر دیکھوں؟''

اس نے پیٹی کوٹ کچھ اور نیچے سرکا دیا، جس سے پورا کا پورا پیٹ، نصف دائرے کی شکل کا، گورا نکل آیا۔ میں اس کے پیٹ کو سہلانے لگا۔

''کیسا لگ رہا ہے؟'' اسے آنکھ موندے دیکھ کر میں نے پوچھا۔

اسے اچھا لگ رہا تھا۔

''کچھ دیر پہلے گھبراہٹ ہو رہی تھی، اب اچھا لگ رہا ہے۔''

میں نے کہا، ''بچہ ہونا آسمان میں چاند نکل آنے کی طرح فطری ہے۔ غریب عورتیں بچے کو جن کر کھڑی ہو جاتی ہیں، جیسے انھوں نے چاند اور سورج کو جنم دیا ہے۔ جب بھی تم کو گھبراہٹ ہو، زور زور سے گہری سانس لیا کرو۔ ابھی گہری سانس لو۔ جیون دینے والی ہوا ڈھیر ساری اکٹھی کر لو۔ دھیرے دھیرے سانس لینے سے بھی گھٹن ہوتی ہے۔''

میں بستر پر اسے ہانپتا دیکھتا رہا۔ پھر گال سے گال سٹا کر اس طرح لیٹ گیا کہ اس کے پیٹ پر ذرا بھی دباؤ نہ پڑے۔ آنکھ موندے موندے، اس کی سانس سے سٹا ہوا، میں بھی سانس لینے لگا۔ ہم لوگ اپنے اپنے لیے الگ الگ جیون دینے والی ہوا اکٹھا کر رہے تھے، ایک دوسرے کے لیے اکٹھا کر رہے تھے۔

''جیسے ہی تمھارے پیٹ میں بچہ آیا، کیا ویسے ہی تم ماں ہو گئی ہو؟''

''مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔''

Scanned with CamScanner

''مجھے بھی لگتا ہے کہ میں باپ ہوں۔''

وہ تیزی سے لیٹے لیٹے کروٹ لے کر چارپائی سے نیچے جھک کر قے کرنے لگی۔ ارہر کی دال کی الٹی تھی۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میں اس کی ہمت بندھانے لگا۔ ہانپتے ہوئے وہ لیٹ گئی۔

''میں جانتی ہوں، کچھ نہیں ہوگا۔ تم بے کار گھبرا رہے تھے۔''

''مجھے لگ رہا تھا کہ تم گھبرا گئی ہو۔'' میں نے اسے پینے کے لیے پانی دیا۔ پانی پی کر تھوڑی دیر میں وہ سو گئی۔ میں نے اسے چادر اڑھا دی۔

میں نے فرش کی ساری گندگی صاف کی۔ صابن سے ہاتھ دھو کر اس کے پاس لیٹ گیا۔ بیچ بیچ میں اٹھ کر الارم گھڑی دیکھ لیا کرتا تھا۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ یہاں تک کہ بیوی کی سانس لینے کی آواز کی وجہ سے بھی نیند نہیں آتی تھی۔ ایک دو بار جھپکی لگی، پر آنکھ اس لیے کھل گئی کہ اس کی سانس لینے کی آواز کی طرف سے میرا دھیان ہٹ کیوں گیا۔

جب الارم بجنے میں پندرہ منٹ رہ گئے تب میں اٹھ گیا۔ الارم کو میں نے بند کر دیا، اس کی آواز کی مجھے ضرورت نہیں تھی۔ منھ ہاتھ دھو کر پندرہ منٹ میں تیار ہو گیا۔ بیوی کی نیند خراب کرنے کی خواہش نہیں ہو رہی تھی۔ اسے سوتا ہوا چھوڑ کر جانا چھپ کر جانا ہوتا، اور کھلے گھر میں اسے خبردار کیے بغیر چھوڑ کر جانا ہوتا۔ میں نے اسے جگایا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ سب سے پہلے اس کا دھیان اس بات پر گیا کہ فرش کی الٹی صاف ہو گئی ہے۔ اس نے کچھ کہا نہیں۔

''میں جا رہا ہوں۔ اندر سے دروازہ بند کر لینا۔''

''پہلے کیوں نہیں جگایا؟''

''ایسے ہی،'' میں نے کہا، ''شام کو لوٹ آؤں گا۔ اکیلی مت رہنا۔ ماسٹر کے گھر چلی جانا۔ نہیں تو کسی سے ان کے گھر خبر بھجوا دینا۔ ماسٹر جی اپنے آدمی ہیں۔ اپنا خیال رکھنا۔'' یہ کہہ کر میں بالکل خاموش ہو گیا۔ تھیلا بیوی نے رات کو تیار کر دیا تھا۔

''تالے کی ایک چابی اپنے پاس رکھ لو،'' بیوی نے کہا۔

''چابی کا کیا کروں گا۔ راستے میں کھو جائے گی۔ تم تو یہیں رہو گی؟''

''اگر گھر بند کر کے کہیں جانا پڑا تو تم کو تکلیف ہو جائے گی۔ مان لو اسپتال ہی جانا پڑا۔''

Scanned with CamScanner

''ابھی تو بہت دن ہیں، تم کہہ رہی تھیں۔''

''پھر بھی، خبرداری کے لیے چابی اپنے پاس رکھ لو۔''

'تم مجھے بار بار چابی کیوں دے رہی ہو؟''میں نے فکر مندی سے کہا۔

''تالا لگا دیکھ کر کہاں کہاں بھٹکو گے؟''

چابی لے کر میں باہر آ گیا۔ مجھے پیدل جانا تھا۔ سامان تھا نہیں۔ رکشے کی ضرورت نہیں تھی۔ باہر آ کر میں نے پلٹ کر دیکھا تو گھر کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ دروازہ کھلا ہوگا اور وہ مجھے جاتا ہوا دیکھتی رہے گی۔ جی چاہا ایک بار دروازہ کھلوا کر اسے دیکھ لوں۔ اس کے بعد میں تیزی سے پیدل چلنے لگا۔ جلدی اسٹیشن پہنچنا چاہتا تھا۔ سنیما کی طرف نہ جا کر بازار کے اندر جانے والی گلی میں مڑ گیا۔ گلی کے آخر میں اکیلے بجلی کے کھمبے کے سہارے گڈھا پار کر کے کم چوڑی سڑک پر آ گیا۔ دیسی شراب کی دکان بند تھی، پر اس کے اوپر جلنے والا تیز بلب جل رہا تھا۔ اتنے سناٹے میں شراب کی دکان کے اوپر ٹوٹی بوتلوں کے کانچ ٹکڑوں میں اِدھر اُدھر کی چمک میں کوئی آہٹ نہیں تھی۔ ہر چمک کے ساتھ آواز ہوتی تو اچھا لگتا، جیسے پٹاخے پھوٹتے ہی چمک ہوتی ہے۔ پٹاخوں کی لڑیعنی ایک کے بعد ایک کی چمک اور ایک کے بعد ایک کی آواز۔

ستنامی محلے کے بعد کے میدان سے کنارے کنارے عوامی بیت الخلا کے اوپر جانے والے بدبو دار اجالے کے سہارے میں بڑی سڑک پر آ گیا۔ چمک دار سڑک۔ نہیں، سڑک کے اوپر چکنی چمک کی پتلی پرت تھی۔

جب ٹکٹ کٹا کر فرصت سے گاڑی کا انتظار کرتے ہوئے پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا تب میں نے سوچا کہ میں تو دفتر کے راستے سے آیا تھا پر دفتر نہیں ملا۔ پرانے بنگلے کا دفتر، اس کے بعد نئی بلڈنگ کا مزار، اور ان میں ٹیوب لائٹ کا چمکدار اجالا، کچھ بھی نہیں ملا تھا، جیسے وہ وہاں نہیں تھا۔ کیوں نہیں تھا؟

جب گاڑی روانہ ہو کر تیز بھاگتی شہر سے باہر کئی میل دور نکل گئی تب آس پاس ہلکے اندھیرے کھیتوں میں مجھے لگا کہ وہ شہر کہیں نہیں ہے جہاں سے میں آیا تھا۔ فطری بات ہے کرائے کا مکان بھی تب نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ بس ایک جگہ مجھ سے چھوٹ گئی ہے، جہاں صرف میری بیوی ہے۔

❋

## کتنا سُکھ تھا!

سوچا تھا اُسی روز شام تک اماں کو لے کر لوٹ آؤں گا، پر ایسا نہیں ہوا۔ ایک دن پہلے بڑے بھائی کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ سائیکل کے پیچھے لکڑیوں کا گٹھر بندھوا کر لا رہے تھے۔ دھچکے لگنے سے گٹھر ڈھیلا پڑ گیا۔ ایک لکڑی سڑک پر گری۔ وہ پیچھے گھوم کر دیکھیں، تب تک چار پانچ لکڑیاں گر گئیں اور ان کا توازن بگڑ گیا۔ وہ گر پڑے۔ ہاتھ میں درد ہو رہا تھا، اٹھ نہیں پا رہے تھے۔ راہ چلتے کسی آدمی نے انھیں اٹھایا۔ پھر انھوں نے رکشہ کیا۔ رکشے والے کے ساتھ سڑک پر گری لکڑیاں اکٹھی کیں۔ لکڑیاں گھر میں پہنچانے کے بعد وہ اکیلے اسپتال گئے۔ دو اڑھائی گھنٹے کے بعد ایکسرے کے شعبے میں گئے۔ ہاتھ سوج گیا تھا۔ درد کے مارے چلّانے لگے تھے۔ ان کو آنے میں دیر ہوئی تو گھبرائی ہوئی بھابی بچوں کے ساتھ اسپتال پہنچیں۔ درد کم کرنے کے لیے سوئی لگا دی گئی تھی۔ جیسے تیسے بھابی گھر آئیں اور تھیلے میں دری، گلاس، تولیہ وغیرہ لے کر پھر اسپتال گئیں۔ بچے اماں کے پاس سونے کے لیے تیار نہیں ہوئے، اس لیے رات میں سونے کے لیے ان کو گھر آنا پڑا۔ اگر میں ہوتا تو اسپتال میں سو جاتا۔

قریب آٹھ بجے صبح میں گھر پہنچا۔ اماں اور کنّی گھر میں تھیں۔ گاڑی لیٹ ہو گئی تھی نہیں تو اور پہلے پہنچ جاتا۔ اماں صبح ہی بہت تھکی لگ رہی تھیں۔ کنّی "چاچا! چاچا!" کہتی ہوئی پیروں سے لپٹ گئی۔ میں نے اسے تھیلے میں سے میٹھی گولیاں دیں۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ میرے آنے کے پہلے وہ رو کر چپ ہوئی تھی، گالوں پر آنسو بہے تھے۔

"رو رہی تھیں؟" میں نے کنّی سے پوچھا۔

"اپنی ماں کے پاس جانے کے لیے رو رہی تھی،" اماں نے کہا۔

اماں نے سب حال بتایا۔ میں اسپتال جانے لگا تو انھوں نے کہا کہ کنّی کو بھی لے جاؤں۔ کنّی میری گود میں تھی۔ اسپتال میں صبح صبح کی صفائی ختم نہیں ہوئی تھی۔ برآمدے میں ایک لڑکا داتون بیچتا

گھوم رہا تھا۔ یہ لڑکا ایک بوڑھے آدمی سے بہت دکھی تھا۔ کچھ دنوں سے یہ آدمی بہت صبح کٹی ہوئی داتون اسپتال کے ہر بیمار اور ان کے ساتھ کے لوگوں کو دھرم کے نام پر ایک ایک مفت میں بانٹ آیا کرتا تھا۔ لڑکے سے کوئی خریدتا نہیں تھا، اس لیے باہر سے آنے والے نئے لوگوں سے اسے امید ہوتی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ تب بھی وہ میرے پیچھے لگ گیا۔

دوسرے گیٹ کے پاس اندر برآمدے میں گائے بیٹھی تھی۔ پونچھا لگانے والے نے گائے کو اٹھانے کی کوشش کی۔ گائے اٹھی نہیں۔ تب اس نے گائے کو بیٹھے رہنے دیا اور اس کے چاروں طرف سے پونچھا لگایا۔ جنرل وارڈ میں آخری بستر بڑے بھائی کا تھا۔ میں مریضوں کے بیچ سے ان کو ڈھونڈتا ہوا پہنچا۔ وارڈ میں ایک بھی نرس یا ڈاکٹر نہیں تھا۔ مریضوں کے بیچ سے سپاٹے سے نکلا تھا، مجھے یہ ماحول اچھا نہیں لگ رہا تھا، جبکہ کنّی کو میلے ٹھیلے کا مزہ آ رہا تھا۔ وہ خوش ہو کر تالی بجانے اور چلّانے لگی تھی۔ بڑے بھائی کو دیکھ کر "دادا! دادا!" چلّانے لگی۔ بڑے بھائی گہری نیند میں تھے۔ کنّی کی آواز سن کر باہر کی طرف سے کھڑکی سے بھابھی جھانکنے لگیں۔

"لالہ، تم کو کیسے خبر ہوئی؟"

"یہاں آنے پر معلوم ہوا۔ میں اماں کو لینے آیا تھا۔"

"دلہن کو کس کے بھروسے چھوڑ آئے؟"

"ایک ماسٹر جی ہیں۔ ان کی بیوی دیکھ سن لیں گی۔"

"مکان مالک ڈاکٹر سے تمھاری اچھی پہچان ہو گئی ہے؟"

"ہاں ہو گئی ہے۔"

"کب جاؤ گے؟"

"آج شام کو جانے کی سوچ رہا تھا،" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

جب میں آ گیا تھا تو مجھے بڑے بھائی کے لیے ایک دو دن تو رکنا تھا۔

"اماں جائیں گی؟"

"اماں کیسے جائیں گی؟ بڑے بھائی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کہوں گا، تب بھی نہیں جائیں گی۔"

"میرا کام تو جیسے تیسے نکل جائے گا۔ تم اماں کو لے جانا۔"

''بھابھی، میں کہوں گا تب بھی اماں نہیں جائیں گی،'' میں نے زور دے کر کہا۔

''اکیلے ٹوٹا ہوا ہاتھ لیے گھومتے رہے۔ خود اسپتال میں بھرتی ہوئے۔ ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ ابھی پلستر بندھے گا۔ اسپتال میں پلستر نہیں ہے۔ مجھ سے نرس نے پچاس روپے لیے ہیں۔ میرے پاس روپے نہیں تھے۔ جگاڑ کیا ہے۔ نرس مجھے اندر آنے کے لیے منع کر گئی ہے۔ ڈاکٹر کے گھومنے کا ٹائم ہوا ہے۔ تم بھی ادھر آ جاؤ۔ نرس دیکھے گی تو غصہ ہوگی۔ نیچے میں نے دری بچھالی ہے۔ تھوڑی دیر میں کھڑی ہو کر تمھارے بھائی کو دیکھ لیتی ہوں۔ ابھی نیند کی دوائی کے اثر میں سو رہے ہیں۔''

کنّی بار بار بھابھی کی طرف جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے نرس کی ایک جھلک دکھائی دی۔ وہ وارڈ میں گھومتے گھومتے باہر رک گئی تھی۔ میں نے کنّی کو کھڑکی کے راستے باہر کھڑی بھابھی کو دیا۔ کنّی لپک کر چلی گئی۔ میری طرف کسی کا دھیان نہیں تھا۔ بستر پر لیٹے مریضوں کا دھیان صبح صبح آج کے دن کی طرف تھا۔ دن یا رات کو دیکھنے کے لیے کسی ایک طرف نہیں دیکھنا پڑتا۔ اسے دکھانے کے لیے انگلی سے اشارہ نہیں کرنا پڑتا کہ وہ دیکھو دن کھڑا ہے۔ آنکھ کھلتے ہی دن دکھائی دیتا تھا، کسی کو بھی دیکھنے سے۔ اگر آج کوئی مریض اچھا ہو کر اسپتال چھوڑ جائے گا، اس کی طرف دیکھیں گے تو بھی دن دکھائی دے گا۔ بازو کا بیمار درد سے چیختا چلّاتا رہے گا، تب بھی دن دکھائی دے گا۔ یہ دن کیسا ہے؟ کھڑکی سے کود کر میں باہر آ گیا۔

بلڈنگ کے چاروں طرف دیوار سے لگا ہوا دو فٹ چوڑا سیمنٹ کا ڈھلواں فرش تھا۔ اسی پر دری کو موڑ کر بچھایا گیا تھا۔ اس کے بعد ایک نالی تھی۔ نالی میں اسپتال کی گندگی بہہ رہی تھی۔ یہ اسپتال کا پچھواڑے کا حصہ تھا، اس لیے سب جگہ گندگی تھی۔

کنّا دری پر سو رہا تھا۔ بہت صبح بھابھی یہاں آ گئی تھیں۔ گڈّن احاطے کی دیوار پر چڑھا ہوا بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کود کر میرے پاس آ گیا۔ اس کی میٹھی گولیاں گھر پر رہ گئی تھیں۔ سامنے ایک بڑا سا گھورا تھا۔ اسپتالی گھورا۔ اس کے اوپر بالکل چھوٹے بچے کے ہاتھ کا نکلا پلستر پڑا ہوا تھا۔ کلائی سے کہنی کے اوپر تک کا تھا، بالکل ہاتھ کی طرح۔ ہم لوگوں کے پاس ہی ایک آدمی احاطے کی دیوار کے رخ بیٹھ کر پیشاب کرنے لگا۔ میں نے بھابھی سے کہا، ''کچھ لانا ہو تو لے آؤں۔''

''بچوں کو گھر لے جا کر کھانا کھلا دینا۔ یہ سب اماں کے پاس رہنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔''

Scanned with CamScanner

''ابھی لے جاؤں؟ میں سوچ رہا تھا جب پلستر باندھا جائے گا تب میرا رہنا ضروری ہوگا۔''

''میں سنبھال لوں گی۔ تم فکر مت کرو۔ اماں بچوں کو نہلائیں گی۔ گڈن کو معلوم ہے بچوں کے کپڑے کہاں ہیں، وہ نکال دے گا۔''

''بھابھی، تمھی بچوں کو لے کر چلی جاؤ۔''

''میرا یہاں رہنا زیادہ ضروری ہے۔''

بچوں کو اماں کے پاس چھوڑ کر میں اسپتال آیا۔ بڑے بھائی کے ہاتھ میں پلستر چڑھا دیا گیا تھا۔ ابھی وہ بے ہوش پڑے تھے۔ ان کے پاس سے پلستر اور ایتھر کی خوشبو آ رہی تھی۔ اسپتال کی بو میں یہ بو پہلے نہیں تھی۔

خاموشی بڑے بھائی کے ساتھ اتنی جڑی ہوئی تھی کہ ان کی بے ہوشی بس تھوڑی سی اجنبی لگ رہی تھی۔ وہ ہمیشہ سر جھکائے دھیرے چلنے والے آدمی تھے۔ کوئی بھی کام اس طرح کریں گے کہ کم سے کم آواز ہو۔ کنگھی تیل کی عادت نہ ہونے کی وجہ سے بکھرے بکھرے بال بھی اپنی طرح جمے ہوئے لگتے تھے۔ وہ سب کام اطمینان سے کرنے کے عادی تھے، جبکہ ان میں ایک ایسی ہڑبڑی تھی جو جلدی کی مانگ نہیں کرتی تھی۔ گھر میں بھی چلتے ہوئے اتنے دھیمے قدم رکھتے تھے جیسے کیچڑ پر چل رہے ہیں۔ کھانا کھانے کے پہلے ہاتھ دھونے کے لیے تیل کی طرح پانی لے کر دونوں ہاتھوں میں چپڑ لیتے تھے۔ پکارنا وہ نہیں جانتے تھے۔ اگر وہ کھانا کھا رہے ہوں اور انھیں گھر میں گھستا ہوا کتا دکھائی دے تو بھابھی کو پکاریں گے نہیں، اٹھ کر بھابھی کے پاس جائیں گے، وہاں جا کر کہیں گے کہ گھر میں کتا گھسا ہے، اسے بھگا دو۔ اگر انھیں خود بھگانا ہوا تو اٹھ کر کتے کے پاس جا کر بھگائیں گے، وہیں سے بیٹھے بیٹھے نہیں بھگائیں گے۔ دیر رات تک گھر کے پاس کے ہوٹل میں بیٹھے رہنے کی ان کی عادت تھی۔ ایک ڈیڑھ بجے تک۔ جب ہوٹل بند ہوتا تب گھر آتے تھے۔ بیڑی پتے کا تمبا کو کھانے کی عادت تھی۔ ڈبیا سے ایک بار میں اپنے لیے تمبا کو نہیں نکالیں گے۔ دس پندرہ بار میں ایک ایک پتی کر کے چنیں گے۔ ان کی حرکت سے سلوموشن میں چلنے والی فلم کی یاد آتی تھی۔ مگر تناؤ سے بھرے سین سلوموشن میں نہیں دکھلائے جاتے۔ رومانٹک سین ہی سلوموشن میں دکھائے جاتے تھے۔ بڑے بھائی کا سلوموشن، یعنی ہوا میں ایک چھرا دھیرے دھیرے سرکتا ہوا ان کی چھاتی کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس کے باوجود اس کے راستے سے ہٹنے

Scanned with CamScanner

کی ان میں طاقت نہیں۔ جبکہ ان کے پاس سوچنے کے لیے اتنا وقت ہوتا کہ پیدل دفتر سے گھر آ سکتے تھے۔ شاید وہ زندگی کو ایک راستے کی دوری مانتے تھے۔ اگر تیزی سے دوڑیں گے تو زندگی جلدی ختم ہو جائے گی۔ دھیرے دھیرے رہیں گے تو بہت دنوں تک زندہ رہیں گے۔

کھڑکی کے پاس ایک نرس آئی۔ اس نے کہا، ''ہوش آنے پر پینے کو پانی ابھی نہیں دینا۔ بعد میں ایک ایک چمچ ٹھنڈا پانی دینا۔''

اس نے بھابھی کو اندر بڑے بھائی کے پاس رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ میں پیچھے کھڑکی کے باہر کھڑا تھا۔ بیماروں کے بیچ نرس کے سفید دیوار جیسے کپڑوں کی سفیدی کو اسپتال کی دیوار کی سفیدی کے ساتھ شامل کر دینے کے بعد وہ ٹکڑوں میں دکھتی تھی —— کالا چہرہ الگ، اور کہنی سے نیچے کالے دبلے دو ہاتھ الگ الگ تیرتے ہوئے۔ بس اتنا ہی بدن، جو ایک دوسرے سے جڑا ہوا نہیں تھا، ہوا میں تیرتا ہوا ایک مریض کے پاس رکتا، پھر تیرتا ہوا دوسرے مریض کے پاس۔ کبھی ہاتھ میں بخار کا چارٹ ہوتا، کبھی دوا کی شیشی۔

بھابھی اسٹول پر بیٹھی ہوئی بڑے بھائی کی آنکھ سے بہتا ہوا پانی کنی کی فراک سے پونچھ رہی تھیں۔ بڑے بھائی ہوش میں آنے لگے۔ آنکھیں بند تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں پانی مانگتے۔ بھابھی کہتیں کہ ڈاکٹر نے منع کیا ہے، تھوڑی دیر بعد دیں گے۔

''سنتو آیا ہے،'' بھابھی نے بڑے بھائی سے کہا۔

''مرنے پر آنا تھا۔ ابھی کیوں آ گیا؟ میں ابھی مرا نہیں ہوں۔ میں نے تم کو پڑھایا لکھایا۔ سالے سب مطلبی ہیں۔ کمانے لگا تو میں اس کا بڑا بھائی نہیں رہ گیا۔ اکیلا اپنی گرہستی کا ہو گیا۔ میرے مرنے کے بعد بچے یتیم ہو جائیں گے۔ کوئی ان کو نہیں پوچھے گا۔ بھیک مانگیں گے۔''

بیچ بیچ میں بھابھی بڑے بھائی کو ٹوک کر منع کرتی تھیں، ''ایسا مت کہو، بے چارا کیا سوچے گا۔ وہ ایسا نہیں ہے۔ سب اپنا اپنا نصیب لے کر آتے ہیں۔'' بھابھی اپنے آنسو پونچھنے لگیں۔

باہر کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا میں ایک ایک بات سن رہا تھا۔ میں اپنے کو بہت مجرم محسوس کر رہا تھا۔ شرمندہ ہوا کھڑا تھا —— کیا میں نے بڑے بھائی کو دھوکا دیا ہے؟ اگر انھوں نے مجھے پڑھایا ہے تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟ نہیں، میں نے بڑے بھائی کو دھوکا نہیں دیا۔ بڑے بھائی بے ہوشی میں بھی جھوٹ

بول رہے ہیں۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں بس نوکری کر سکتا ہوں۔ بابو جی بھی نوکر تھے۔ بڑے بھائی میٹرک تک بھی نہیں پہنچے تھے کہ بابو جی مر گئے۔ جس دفتر میں بابو جی کام کرتے تھے وہاں بڑے بھائی نوکر ہو گئے۔ انھوں نے بہت کیا۔ میں بھی سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ بڑے بھائی کا مقصد انھیں ہر مہینے کچھ روپے بھیجنے سے تھا۔ میرے پاس بچتا کیا ہے؟ ادھار لینے کا مطلب مستقبل تک بھگو ہو گئے۔ میں مستقبل تک بھگو ہوں۔

نوکری لگتے ہی گھر کے برتاؤ میں ایک تبدیلی آ گئی تھی اور شادی ہوتے ہی بھدا فرق۔

بیوی کو اپنے ساتھ لے جاتے وقت، جب سامان سمیٹا جا رہا تھا، تب بیوی کو میرے نام کی ایک تختی ملی تھی۔ بی اے پاس ہوتے ہی میں نے خوشی سے بنوائی تھی۔

''اس کو لے جانا ہے؟'' بیوی نے پوچھا تھا۔

اب وہ مجھ سے بغیر پوچھے کچھ بھی نہیں رکھ رہی تھی، کیونکہ جب وہ کالا کنگھا رکھ رہی تھی تب میں نے منع کیا تھا کہ یہ بھابھی کا ہے، اسے نہیں لے جانا ہے۔

''تختی ضرور لے جائیں گے۔ گھر کے سامنے کے دروازے میں ٹھونک دیں گے۔ پوسٹ مین اور دوسروں کو گھر پہچاننے میں سہولت ہوگی۔''

''یہاں کی پہچان کا کیا ہوگا؟'' اس نے پوچھا۔

''مطلب؟''

''اماں، بڑے بھائی، بھابھی، بچے، ہم لوگوں کو بھول جائیں گے۔''

''کیوں بھول جائیں گے؟''

''منجھی کہہ رہی ہیں کہ ہم لوگ جاتے ہی ان سب کو بھول جائیں گے تو وہ بھی ہمیں بھول سکتی ہیں۔''

''تب نام کی تختی یہیں رہنے دوں گا۔ کہاں لگاؤں گا؟'' میں نے کہا۔

''تم جو کچھ کرو گے اپنے دل سے کرو گے۔ مجھے دوش مت دینا۔''

چوکے کے اندر گھسنے والے دروازے میں میں نے اپنے نام کی تختی ٹھونک دی۔

سامان جماتے وقت بھابھی کسی نہ کسی بہانے چکر لگا جاتی تھیں۔ اماں نے کچھ برتن چھانٹ کر، جو بابو جی کے خریدے ہوئے تھے، مجھے دے دیے تھے۔ زیادہ تر برتن بڑے بھائی کے پاس گھر پر

Scanned with CamScanner

رہے۔ دھن تیرس[11] کے دن میں نے اپنی کمائی سے ایک لوٹا خرید اتھا۔ اس میں میں نے بڑے بھائی کا نام کھدوا دیا تھا۔ اس لوٹے کو میں نے چھوڑ دیا تھا، پر بڑے بھائی نے زبردستی میرے سامان میں رکھوا دیا تھا۔

''تمھارے نام کی تختی بھی بنوا کر یہاں لگوا دوں گا۔ مگر تم نئی ہو، تمھارے نام کی تختی سے کہیں یہ دھوکا نہ ہو کہ ہم لوگ یہاں اپنا حق قائم کر رہے ہیں۔''

''نہیں بابا۔ مجھے کوئی حق نہیں لینا ہے۔''

''حق،'' میں نے کہا،''حق میں کچھ نہیں ہے۔ جو تھوڑے برتن میرے حق کے تھے وہ تو اماں نے دے دیے ہیں۔ یہ گھر کرائے کا ہے۔ منگنے کا پیڑ اجیا نے لگایا تھا۔ اس سے ایک ڈال توڑ کر چاچا نے اپنے نئے گھر میں لگا لیا ہے۔ اگلے سال تک پھلنے لگے گا۔ جب بڑے بھائی کا گھر ہوگا تو ایک ڈال توڑ کر وہ بھی لگا لیں گے۔ پر ایسی نوبت نہیں آئے گی۔ جب میرا گھر ہوگا تب میں بھی یہی کروں گا۔ کیا ایسی نوبت آئے گی؟ چاچا نے منگنے کے پیڑ پر سے اپنا حق نہیں چھوڑا ہے، ایسا ہم لوگ سمجھتے ہیں۔ اس لیے جب بھی منگنے پکتے ہیں، حصہ لگا کر اماں چاچا کے گھر بھجوا دیتی ہیں۔ ہم لوگ بھی یہی کریں گے۔ جب مکان مالک گھر خالی کروائے گا تب میں اس پیڑ پر اپنا حق چھوڑ دوں گا۔ جو اکھاڑ کر رکھنا چاہے، رکھ لے۔ چاچا کے منگنے کے پیڑ سے منگنے لینے کے قانونی حقدار ہم لوگ نہیں ہیں۔ یہ ان کی کمائی ہوگی، باپ دادا کی نہیں۔''

''بڑے بھائی اور بچی ناراض نہ ہوں، یاد رکھیں، اس لیے تم مجھے یہیں رہنے دو،'' دکھی ہو کر بیوی نے کہا۔

''کتنے دنوں تک کے لیے؟''

''جب تک میں ان سب کو برداشت ہوتی رہوں۔''

''پھر؟''

''چونکہ میں یہاں رہوں گی، اس لیے یہاں کا آدھا خرچ تمھارے ذمے ہوگا۔''

''وہاں ہوٹل میں کھانا بہت مہنگا پڑے گا۔ میری تنخواہ بہت تھوڑی ہے۔''

---

[11] دیوالی سے دو دن پہلے کا تہوار جس میں لکشمی کا آشیرواد مانگا جاتا ہے۔

Scanned with CamScanner

''خود بنا کر کھا لینا۔'' دکھی ہو کر بیوی نے کہا۔

''پھر شادی کا مطلب کیا ہوا؟ تمھیں میرے ساتھ رہنا پڑے گا۔''

''شادی مجھ سے کھانا بنوانے کے لیے کی ہے؟'' بیوی نے اور بھی دکھی ہو کر کہا۔

''اماں تو یہی سمجھتی ہیں۔ جب وہ شادی کے لیے زور دیتی تھیں تو یہی کہتی تھیں کہ ہوٹل کا کھانا چھوٹ جائے گا، گھر کا کھانا ملے گا۔''

''میرا دوسروں کے لیے بھی کچھ فرض ہے۔ بچّی کی ناراضگی اس لیے ہے کہ تم مجھے اپنے ساتھ لے جا رہے ہو۔''

''اماں کی کیا خواہش ہے؟''

''اماں کہتی ہیں، سب کو اپنی لگ الگ گرہستی بنانی چاہیے۔''

''اماں ٹھیک کہتی ہیں۔''

''آپ کا بھائی کے لیے بھی کوئی فرض ہے؟''

''میرا فرض کیا ہے یہ میں جانتا ہوں۔''

''میں نے تمھیں کبھی اپنے ساتھ لے جانے کے لیے نہیں اکسایا، یہ تم جانتے ہو۔ جہاں رکھو گے وہیں رہوں گی۔ اگر نوکری یہیں کی ہوتی تو اسی مکان میں سب کے ساتھ رہنے میں مجھے خوشی ہوتی۔ اماں کے ساتھ رہنے میں مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ ان کا بہت سہارا ہے، ان کے ساتھ بے فکر رہوں گی۔ ان کو بھی ساتھ لے چلتے۔ گرہستی جماتے وقت اماں رہیں تو بہت اچھا ہو۔''

''اماں سے تم نے کہا نہیں؟''

''کہا تھا۔ مگر ان کو لگتا ہے کہ ابھی جانا ٹھیک نہیں ہے۔ گڈن کو بخار بھی ہے۔ میں سوچتی ہوں میرا جانا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ بخار کی حالت میں گڈن کو چھوڑ کر سب سامان سمیٹ کر چلے جانا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔''

''جانے کی بات تو بہت دنوں سے طے تھی۔ گڈن کو آج بخار آیا ہے، کل اتر جائے گا۔ مجھے نوکری پر پرسوں ضرور پہنچنا ہے۔ آج جائیں گے، کل گرہستی تھوڑی بہت جمے گی۔ پرسوں سوموار سے کام پر لگوں گا، تب تمھاری مدد نہیں کر پاؤں گا۔''

"گھر ٹھیک ہے نا؟"

"بہت اچھا ہے۔ شہر کے اندر ہے، پانی کی دو سہولتیں ہیں، نل ہے، بورنگ ہے۔ مکان مالک بہت بڑا ڈاکٹر ہے۔ دو کمرے ہیں، اسٹور ہے۔ اپنے گھر جانے کے نام سے بہت خوش لگ رہی ہو؟" وہ اپنی گرہستی، اپنے گھر کے لیے بہت پر جوش، بہت خوش تھی۔

"یہاں دو کیلنڈر ہیں، ایک اپنے ساتھ لے چلیں؟"

"دونوں بڑے بھائی لائے تھے۔ میری خواہش نہیں ہے۔ ان کو بھی کیلنڈر بہت مشکل سے ملا تھا۔ دو تین مہینے سے ایک دو لوگوں کو انھوں نے کہہ رکھا تھا۔ وہاں میں کوشش کروں گا نہیں تو خرید لیں گے۔"

"سنیما گھر کے بالکل پاس ہے؟"

"ہاں بالکل۔ اتنے پاس کہ رات کو دھیان سے سننے پر فلم کی ایک ایک بات سنائی دیتی ہے۔"

"کون سی فلم لگی ہے؟"

'یاد نہیں ہے۔ اپن ساتھ ساتھ پکچر دیکھنے چلیں گے۔"

"ابھی نہیں، پہلے گرہستی جما کر بے فکر ہو جاؤں تب گھومنے پھرنے کا کام ہوگا۔"

لوٹنے کے لیے آخری گاڑی رات آٹھ بجے کی اور آخری بس نو بجے کی تھی۔ لوٹنے کے لیے ماحول ابھی تک بن نہیں پایا تھا۔ بچوں کے ساتھ مجھے بار بار اسپتال آنا جانا پڑتا تھا۔ شام تک بڑے بھائی کچھ ٹھیک ہو گئے تھے۔ ہاتھ میں بہت درد تھا۔ پلستر کے نیچے کھجلی ہوتی تھی۔ اسے کوئی کھجلا نہیں پاتا تھا تو چڑچڑا جاتے تھے۔ سوجن کی وجہ سے انگلی تھوڑی بھی اندر نہیں جا سکتی تھی۔ پلستر کے اوپر کھجلانے سے کیا ہوتا؟

بیوی یہاں ہوتی تو اماں کو سہارا ہو جاتا۔ ابھی وہ وہاں کیا کر رہی ہوگی؟ تصور ایک زوردار چیز تھی۔ یاد کر رہے ہیں یا تصور کر رہے ہیں، اس میں فرق کر پانا مشکل کام تھا۔ یاد میں اصلیت ہوگی پر کبھی کبھی یاد سے بھی زیادہ اصلیت تصور میں ہو سکتی تھی۔ میں نے سوچا، ابھی شام سے وہ سو رہی ہوگی۔ 'سو رہی ہوگی' سوچنے کے بعد اس کے اٹھنے تک آگے سوچنا معطل نہیں ہوتا۔ گھر کے کھڑکی دروازے بند کر کے سو رہی ہوگی۔ تصور میں بیوی کو جگانے کے لیے کیا کروں؟ کیا کوئی چوہا اس پر کود پڑے؟

بھولے سے اگر کوئی کھڑکی کھلی رہ جاتی تو کوئی بھی کود سکتا تھا۔ اگر کھڑکی کھلی رہے تو کون کود سکتا ہے؟ چوکیدار کی ہمت نہیں ہونی چاہیے۔ ڈاکٹر کی گائے دوہنے والا راؤت۔ یہ بھی نہیں۔ بہت سے مریض اوران کے ناتے رشتے داروں میں سے کوئی ایک یا بھی؟ نہیں۔ سامنے کا دروازہ اگر کھلا رہ گیا تب تو پورا شہر گھر کے اندر کود سکتا تھا۔ اس سب کا امکان کم تھا۔ اس کی نیند تبھی کھل سکتی تھی جب کوئی دروازہ بھڑ بھڑائے اور زور زور سے چلّائے۔ چوکیدار اگر اسے آواز دے گا تو وہ جان بوجھ کر بہت دیر تک دروازہ نہیں کھولے گی، تاکہ وہ لوٹتا ہے تو لوٹ جائے۔ لیکن ڈاکٹرنی کا کام ضروری ہوگا۔ چوکیدار پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ وہ مکان سر پر اٹھالے گا، اور بیوی دروازہ کھولے گی۔

''کیا ہے؟'' غصے سے وہ کہے گی۔

''ڈاکٹرنی بائی نے بلایا ہے،'' چوکیدار حیرت سے کہے گا۔ بیوی کے غصے پر اسے تعجب ضرور ہوگا۔

''کون ڈاکٹرنی؟ میں کسی ڈاکٹرنی کو نہیں جانتی۔''

''جن کا یہ مکان ہے۔''

''کرایہ تو ہم لوگ ہر مہینے چکا دیتے ہیں۔ پھر کس بات کی ضرورت ہے؟''

''گھر میں کچھ مہمان آنے والے ہیں، ان کے لیے ناشتہ بنانا ہے، انتظام کرنا ہے۔''

''میں ان کی نوکرانی نہیں ہوں۔ ڈاکٹرنی سے کہنا اب وقت بدل گیا ہے۔''

چوکیدار پیر پٹختا ہوا ڈاکٹرنی کے پاس جائے گا۔ نمک مرچ لگا کر وہ بیوی کی بات بتائے گا۔ ڈاکٹرنی کو برا لگے گا۔ ڈاکٹر کے پاس بات جائے گی۔ ڈاکٹر کہے گا، ''جا کر ان کو یاد دلا دو کہ سنتو کلرک کی جان میں نے بچائی ہے۔ اور بھی بہت سے احسان ہیں۔''

''ہمارے گھر سے روز روٹی سبزی لے جاتی تھی،'' ڈاکٹرنی بولے گی۔

چوکیدار پھر آئے گا اور نئے سرے سے طاقت کے ساتھ دروازہ بھڑ بھڑائے گا۔ بیوی دروازہ فوراً کھولے گی۔ وہ جاگی ہوئی ہے۔

''تم پھر آ گئے؟'' تمتما کر بیوی کہے گی۔

''ڈاکٹر نے کہلوایا ہے کہ انھوں نے آپ کے اوپر بہت احسان کیے ہیں۔''

''جھوٹ بات ہے۔ جو احسان ہم لوگوں نے ان کے اوپر کیے ہیں ان کا حساب کبھی ہوگا؟''

Scanned with CamScanner

اور وہ بھڑ سے دروازہ بند کر لے گی۔

بیوی کو پھر نیند آ جائے گی۔ اب اسے مالی جگائے گا۔ دروازہ کھول کر وہ مالی کو پہچان جائے گی۔ مالی کا ذکر میں نے اس سے کئی بار کیا تھا۔ مالی کے ہاتھ میں ایک گلاب کا پودا ہوگا۔ اس میں ادھ کھلی لال گلاب کی کلی ہوگی۔

''اسے اپنے گھر میں لگاؤ۔'' پوپلے منھ سے وہ مسکرائے گا۔ باپ رے باپ! مالی کتنا بوڑھا لگے گا۔

''مجھ سے لگے گا نہیں۔ گلاب مر جائے گا۔ کتنا سندر پھول ہوگا یہ!''

''کہاں لگانا ہے، بتلا دو۔ میں لگا دیتا ہوں۔''

''بیوی بتلائے گی کہ پیچھے تو بے کار ہے۔ برسات میں اتنا پانی جمع ہوتا ہے کہ کچھ بچتا نہیں۔ احاطے کی ٹوٹی دیوار سے ڈاکٹر کے کمپاؤنڈ کا پانی جمع ہوتا ہے۔''

مالی کہے گا، ''اس کو بند کر دینا۔''

''ان کو آ جانے دو۔ دونوں مل کر اس کو بند کر دیں گے۔''

ایک محفوظ جگہ چن کر مالی بتلائے گا۔ بیوی مالی سے نکیلی چھڑ لے کر خود زمین کھودے گی اور اس میں گلاب کے پودے کو لگا دے گی۔

دفتر کا جب میں نے تصور کیا تو اسی سیٹ پر بیٹھا تھا جس پر ہمیشہ بیٹھتا رہا۔ اگر میں بڑے بابو کی سیٹ پر بیٹھ جاتا تو کیا ہوتا؟ صاحب کی سیٹ پر بھی بیٹھ سکتا تھا۔ تصور میں بھی صاحب کی سیٹ پر بیٹھنے کی خواہش نہیں ہوئی۔ میں نے دفتر کے کٹھل کے پیڑ سے ایک کٹھل توڑ کر ایک خالی بس میں پھینک دیا۔ تب کچھ نہیں ہوا۔ کچھ کرنے کے لیے ایمانداری کی کمائی سے پاؤ بھر کٹا چھلا کٹھل بم کی طرح اسی خالی بس میں پھینکا۔ دھڑام سے آواز ہوئی، بھگدڑ مچ گئی، پر کوئی نقصان نہیں ہوا۔ دھواں جب صاف ہوا تو مسافر اس میں بیٹھنے لگے۔ پوری بس بھری، تب روانہ ہوئی۔

گھر کے گھورے میں، جہاں بیوی کوڑا کرکٹ پھینکتی تھی، میں نے اپنے پورے ناپ کا، سر سے لے کر پیر تک کا نکلا ہوا پلستر پڑا دیکھا۔ دیکھا، آنکھوں کی جگہ، منھ کی جگہ، ناک سے سانس لینے کے لیے اس میں چھید تھے۔ ابھی ابھی جیسے مجھ پر چڑھے ہوئے پلستر کو نکال کر پھینکا گیا ہو۔ کبھی میں بری طرح ٹوٹ چکا تھا، اب صحت یاب ہو گیا ہوں، ایسا محسوس کر رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

اسپتال سے گھر کے چکر لگانے میں میں اتنا نہیں تھکا تھا جتنا لوٹ نہ پانے کی وجہ سے۔ رات کو میں نے اماں سے کہا کہ میں سوچ رہا تھا کہ آج لوٹ جاتا۔ بڑے بھائی کل اسپتال سے گھر آجائیں گے، ایسا نرس کہہ رہی تھی۔ پر بھابھی، بڑے بھائی ناراض ہو جائیں گے۔ ہمیشہ کے لیے کہنے کی ہو جائے گی۔ اماں چولھے میں انھی لکڑیوں کو جلا کر کھانا بنا رہی تھیں جن کی وجہ سے بڑے بھائی کا ہاتھ ٹوٹا تھا۔

''نہیں ناراض ہوں گے، میں سمجھا بجھا دوں گی۔ رات کو بہو کے پاس رہنا ضروری ہے۔ اکیلی ڈر جائے گی۔ جب تو ہونے والا تھا تب میں ایک رات کو تھوڑی دیر اکیلے رہنے سے ڈر گئی تھی۔''

''بڑے بھائی، بابو جی کہاں تھے؟''

''آدھے گھنٹے کے لیے کسی کام سے باہر چلے گئے تھے۔''

''بس آدھے گھنٹے کے لیے اکیلی رہیں تب بھی ڈر گئیں؟ اماں، تمھارے ڈرنے سے ضرور برا ہوا ہوگا۔ اس لیے میں کمزور نکلا، میں کسی کام کا نہیں ہوں۔''

''آدھے گھنٹے کے لیے اکیلے رہنے سے ڈری۔ باقی نو مہینے کے ہزاروں گھنٹے تک تو میں نہیں ڈری۔ تو ہمیشہ الٹی طرح سوچتا ہے۔ باقی لمبے وقت تک نہ ڈرنے کی وجہ سے تم میں بہت ہمت ہونی چاہیے۔ بیٹا، تجھ کو کس کا ڈر ہے؟'' اماں نے پوچھا۔

''ڈر کسی کا نہیں ہے۔ کسی نہ کسی کا بندھن ہو جاتا ہے۔ شہر سے باہر نکلو تو لوٹنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ چھٹی ہوتی نہیں۔''

''ہمت کیسے دکھائے گا؟ کسی سے جھگڑا ہوا ہے؟''

''نہیں اماں۔''

''کسی سے جھگڑا نہ کرنا، روکھے سوکھے میں سکھی رہو، نہ لینا ایک نہ دینا دو۔''

''بس روکھے سوکھے رہنے کا تم سے آشیرواد ملا ہے،'' میں نے کہا۔

''میرے آشیرواد دینے سے تو دنیا کا رئیس ہو جاتا تو میں آشیرواد دینے میں کنجوسی نہ کرتی۔ تم لوگ پڑھ لکھ گئے ہو۔ اور زیادہ بولوں گی تو تیرا دماغ خراب ہو جائے گا۔ گھنٹوں بعد ٹھیک ہوگا۔ بہو کے پاس جانا نہیں ہے، یہاں بات کو پکڑتا بیٹھا ہے۔''

''اب کیا کروں گا جا کر؟ گاڑی، بس کچھ نہیں ہے۔ کل ہی جا سکوں گا۔''

Scanned with CamScanner

"موٹر اسٹینڈ میں پتا لگالے، کوئی بس بچی ہوگی۔"

"نہیں ہے، مجھ کو معلوم ہے۔ آخری بس کو نکلے آدھا گھنٹہ ہو گیا ہوگا۔ شاید ناکے میں کوئی ٹرک والا مجھے بٹھالے۔"

"یہی ٹھیک ہے، تو ابھی چلا جا۔"

"بھابھی کو اسپتال جا کر بتلا دوں؟ وہ تو رات کو دس بجے تک گھر آئیں گی۔"

"وہاں جاؤ گے تو نکل نہیں پاؤ گے۔"

"اماں! میں جاتا ہوں۔" اچانک ملی خوشی سے میں بھر اٹھا۔ تھیلا اٹھا کر اماں کے پیر چھو کر میں روانہ ہو گیا۔ مجھ میں ساری امنگیں اور جلد بازی ہونے والے بچے کے لیے تھی اور سارا حوصلہ اور خوشی بیوی سے ملنے کے لیے۔ میری آرزو تندرست اور طاقتور بچے کی تھی۔

ناکے میں صرف ایک ٹپریا جیسے ہوٹل کے سامنے پڑی چارپائی پر کچھ لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ چارپائی کے سامنے بنچیں تھیں اور بنچوں پر تھالیاں رکھی گئی تھیں۔ یہ سب دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ میں بغیر کھائے آ گیا تھا۔ اماں کو یاد بھی نہیں رہا۔ بھٹی کے اوپر روٹیاں سینکی جا رہی تھیں۔ لائن سے چار ٹرک کھڑے تھے۔ تین جاتے ہوئے ٹرکوں میں جگہ پانے کی کوشش کی، کوئی لے جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ گھر کی طرف آتی ہوئی موٹر گاڑیوں کا اجالا دکھلائی دیتا تو میں چوکنا ہو جاتا۔

"آپ کو کدھر جانا ہے؟" ایک کالے، بدمعاش سے دکھائی دینے والے آدمی نے پوچھا۔ اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔

میں نے سڑک کے دائیں طرف اشارہ کیا، "اِدھر۔"

"میں آپ کو لے چلوں گا۔ مجھ کو تو کلکتے تک جانا ہے۔ راستے میں جہاں کہو گے، چھوڑ دوں گا۔ کلکتے تک چلنا ہے تو بھی چلو۔ میں اکیلا ہوں۔ میرا کلینر یہاں اتر کر بھاگ گیا ہے۔ آدھا گھنٹہ اور راستہ دیکھوں گا۔ یہاں سے تین چار میل دور گاؤں میں اس کا گھر ہے۔ سالا دھوکا دے گیا۔ میں بہت دیر سے آپ کو ٹرک کے لیے پریشان دیکھ رہا ہوں۔ اگر جلدی ہے تو پیدل روانہ ہو جاؤ۔ یہ لوگ رات بھر یہیں رکیں گے۔ راستے میں کوئی ٹرک ملے گا تو بیٹھ جانا۔ میرا ٹرک تو ضرور مل جائے گا۔"

مجھے روانہ ہونے کی جلدی تھی۔ روانہ ہونے کے لیے جو کچھ میرے بس میں تھا وہ پیدل چلنا

تھا۔ اگر پیدل چلتا تو یہ ضرور لگتا کہ میں نے پہنچنے کا کام شروع کر دیا ہے۔ ابھی تک تو رکا ہوا رہا۔ دو تین گھنٹے گزر گئے، آدھا گھنٹہ اور گزر جائے گا۔ پر یہ آدمی مہربان کیوں ہے؟ مجھے بطور کلینر کے اپنے ساتھ تو نہیں رکھنا چاہتا؟ روانہ ہونے کے پہلے تھیلا اندر رکھوا لے گا۔ پھر کہے گا، گاڑی پونچھو، پانی ڈالو۔ اور میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔

میں بہت شکی ہو گیا تھا۔ مجھ میں یہ شک گھر کر گیا تھا کہ دوسرے لوگ میرے گھر والوں کو کامیابی سے استعمال کر رہے ہیں۔ یہ وہم بڑھتا جا رہا تھا کہ میرا غلط استعمال کیا جا رہا ہے۔ جب کوئی آدمی اچھا برتاؤ کرتا ہے، میں سوچتا ہوں کہ اس کا کوئی بڑا فائدہ ہے، بے وقوف بنا رہا ہے۔ اچھا برتاؤ اور مدد کے لیے تیار ہونا، یعنی آدمی کو اس نقطے پر لانا جہاں سے اس پر اچوک نشانہ لگایا جا سکے۔

بعد میں میں نے سمپت سے کہا تھا، ''سمپت، میں شکی آدمی ہو گیا ہوں۔ مجھے وہم ہے کہ میرے خاندان کا استعمال کسی کے فائدے کے لیے ہو رہا ہے۔''

''یہ بھی کوئی شک یا وہم کا سبب ہے؟'' سمپت نے ناک بھوں سکوڑتے ہو کہا۔

''شک کا کون سا سبب ہونا چاہیے؟''

''میں تجزیہ کروں گا تو تم برا مان جاؤ گے۔''

''نہیں مانوں گا، تم کہو تو۔''

''میں تم سے کئی دنوں سے کہنا چاہتا تھا، پر کوئی موقع نہیں ملا۔ پچھلے دنوں تم بہت مصروف رہے۔ تم ملتے نہیں تھے۔ میں بھی مصروف رہا۔ دیکھو، شک کا سبب یہ ہونا چاہیے کہ تمھاری بیوی کسی اور کو تو نہیں چاہتی۔ اس کا بار بار ڈاکٹر کے گھر جانا، وہاں کسی دوسرے سے لگاؤ ہو گیا ہے، یہ شک کا سبب ہو سکتا ہے۔ تمھاری بیوی کے پیٹ میں جو بچہ ہے، کیا وہ تمھارا ہی بچہ ہے، یہ شک کا ایک بڑا سبب ہو سکتا ہے۔ اس طرح کا ذکر ہونے لگا ہے۔ لوگ تم سے نہیں کہیں گے۔ میں تمھارا دوست ہوں، جان بوجھ کر مجھ سے کہتے ہیں۔''

''دوست! دوست، تم ہمیشہ غلط طریقے سے تجزیہ کرتے ہو،'' میں نے زخمی ہو کر کہا، ''تم کچھ اس طرح بات کرتے ہو کہ اچانک اس پہاڑی راستے سے گرنے لگتا ہوں۔''

''تمھاری مدد کرنے کو میرا جی کرتا ہے۔ میں تم سے ایسا اوچھا ذکر کرنا پسند نہیں کرتا۔ لوگ

Scanned with CamScanner

تمھارے بارے میں ایسی ویسی باتیں کرتے ہیں تو میں انھیں ڈانٹ دیتا ہوں۔"

"مدد کرنی ہے تو اس پہاڑ میں ایک سوتا ڈھونڈنے میں مدد کیوں نہیں کرتے؟ گندگی، جس سے سب جوجھتے ہیں، اس کو تم گھر کی نالی کی گندگی سمجھتے ہو یا گلی پڑوس کی نالی کی؟ گندگی، جس کے اوپر سے کود کر، ناک پر ہاتھ رکھ کر دن میں کئی بار آتے جاتے ہیں۔ گندگی وہاں ہے جہاں صفائی اور کامیابی ہے، وہ احاطہ ہے جہاں سے پھولوں کی خوشبو آتی ہے اور گھاس پر بیٹھے ہوئے وہ لوگ ہیں جو فرصت سے بیٹھ گئے ہیں۔ کیا اسی لیے تم شادی نہیں کر رہے ہو؟ ریڈیو کی مرمت کرنا ابھی تک نہیں آیا، بولو کب تک سیکھ جاؤ گے؟"

"ایسی بات نہیں ہے، شادی میں اسی لیے نہیں کر رہا ہوں کہ اتنی کم آمدنی میں گذارا نہیں کر پاؤں گا۔"

"ہاں، اور آٹا کم نہ پڑے اس ڈر سے تمھاری بیوی تمھاری ماں کی طرح زیادہ آٹا گوندھ لے گی۔ پھر پٹائی نہ ہو اس لیے وہ آٹے کا گولا تمھارے تکیے کے نیچے یا پیٹی کے اندر چھپا دے گی۔ کسی دن اِدھر اُدھر تم کو یا تمھارے باپ کو سوکھے آٹے کے گولے ملیں گے۔ تم سمجھو گے کہ اماں نے چھپایا ہوگا، جو ہمیشہ سے کرتی آرہی ہے۔ لیکن باپ کو شک ہو جائے گا۔ وہ تمھاری اماں کے آٹے کے گولوں کو پہچانتا ہوگا۔ ہوگی کوئی پہچان۔ وہ کہے گا کہ نہیں، یہ سب بہو نے کیا ہے۔ تم اسے مارو گے۔ ایک گھونسے میں وہ سب قبول کر لے گی۔ ہوسکتا ہے تمھاری اماں کو عقل آجائے اور وہ اپنی غلطی کو چھپانے کے لیے تمھاری بیوی کا نام لے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تمھاری بیوی کی غلطی کو اپنی غلطی بتا کر خود مار کھا کر اسے بچالے۔ پر تم بہت چالاک ہو، جان جاؤ گے کہ اصلی قصوروار کون ہے۔ تم گذارے کی تکلیف کی وجہ سے شادی نہیں کر رہے ہو۔ اگر شادی کرو گے تو تمھارے مستقبل کا سارا پروگرام بیوی کو صرف اپنے لیے بنائے رکھنے پر رہے گا۔ شادی کے پہلے ریڈیو مستری بن جاؤ۔ شادی کے بعد بیوی کو سدھارنے کا کام شروع کر دینا۔"

سمپت کے ساتھ کرمچاری بھون کی چھت پر ایک بیٹھک میں گیا تھا۔ بلڈنگ بہت بڑی تھی۔ نیچے پندرہ بیس دکانیں تھیں۔ اسی میں ایک کمرہ کرمچاری بھون کہلاتا تھا۔ کھلے موسم میں بیٹھکیں چھت پر ہوتی تھیں۔ چھت پر دو دریاں بچھی تھیں۔ ایک لاؤڈ اسپیکر لگا تھا، سامنے مائیک تھا۔ میٹنگ شروع ہونے کو تھی کہ ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگیں اور زور کی ہوا چلنے لگی۔ سب فوراً بھاگ کر کمرے میں چلے گئے۔

Scanned with CamScanner

مائیک چالو تھا۔ میری چپل نہیں مل رہی تھی۔ چھت پر اکیلا میں اپنی چپل ڈھونڈ رہا تھا۔ اور مائیک کے چالو ہونے کی وجہ سے اسپیکر سے زور کی بھائیں بھائیں ہوا کی آواز آ رہی تھی۔ جیسے بھیانک آندھی طوفان کے وقت آتی ہوگی۔ مجھے ہوا کی معمولی آواز کو اسپیکر سے طوفان کی آواز کی طرح نکلنا بہت اچھا لگا۔ اکیلے بھیگتی دریاں سمیٹ کر میں کمرے میں لایا۔ دری کے نیچے مجھے چپل مل گئی تھی۔ اس کے بعد جب بھی تیز ہوا چلتی تو مجھے خیال آتا تھا کہ یہ وقت ہے جب میدان میں ایک مائیک چالو کر رکھ دیا جائے اور چاروں طرف بہت سے لاؤڈ اسپیکر لگا دیے جائیں۔ کم سے کم تھوڑا اندازہ تو ہو جائے کہ پیڑوں کو اکھاڑنے، مکانوں کی چھتوں کو اڑانے اور سمندر میں کئی منزل اونچی لہریں اٹھانے والے طوفان کی آواز کیسی ہوتی ہوگی۔ اگر یہ طوفان لگاتار رہے تو کیا کئی منزل اونچی لہر بھی لگاتار اٹھی رہے گی؟ تب سب سے اوپر کی منزل میں ایک کمرہ میرے لیے بھی ہونا چاہیے۔

راستے بھر ٹرک ڈرائیور سے بات چیت ہوتی رہی۔ سلسلہ وار بات چیت نہیں تھی۔ میں نے اس سے اپنا تعارف کرایا تھا۔ نام سنتو بابو بتلایا تھا۔ دفتر میں کام کرتا ہوں، یہ بھی بتلایا۔ ڈرائیور دلّی کے پاس کے کسی گاؤں کا تھا۔ اس دھندے میں وہ دنوں تک گھر نہیں پہنچ پاتا تھا۔ جب اس کا پہلا لڑکا پیدا ہوا تھا تب وہ اپنے گھر سے قریب آٹھ سو کلومیٹر دور تھا۔ جب دوسری لڑکی پیدا ہوئی تھی تب قریب تین سو کلومیٹر دور تھا۔ جب تیسری لڑکی پیدا ہوئی تھی تب صرف دس کلومیٹر دور تھا۔ پر ہر بار گھر کی طرف ہی لوٹ رہا تھا۔ گھر سے دور نہیں جا رہا تھا۔ آٹھ سو کلومیٹر دور تھا تب بھی گھر کی طرف لوٹ رہا تھا۔

دور دور مجھے اپنا شہر نہیں دکھائی دے رہا تھا، جبکہ اسے کبھی بھی دکھائی دے جانا تھا۔ اور ہوا بھی یہی، اچانک تھوڑی دیر میں مجھے بجلی سے جگمگاتا وہ دکھائی دے گیا۔ دور سے رات کے اندھیرے میں شہر نہیں دکھتا تھا، ایک چھوٹی سی جگہ میں رات کو بجلی کے بلبوں سے سجا دیا گیا ہے، یہی دکھائی دیا۔

اس نے مجھ سے پیسے نہیں لیے۔ سڑک پر کھڑے کھڑے مجھے اپنے ہی اجالے کا پیچھا کرتا ہوا ٹرک شاندار لگا۔ جاتے ہوئے ٹرک کے پیچھے کی دو لال بتیاں اندھیرے میں اڑتے ہوئے دو لال اجالے تھے۔

جب گھر پہنچا تب قریب وہی وقت تھا جب گھر سے باہر نکلا تھا۔ بیوی کو پکارتے ہوئے دروازہ

کھٹکھٹانے لگا۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ زور زور سے دروازے کو پیٹنے لگا۔ سناٹے میں دور تک دروازہ کھلوانے کی آواز پہنچ رہی تھی۔ گھر کے اندر سے ایک بچے کے رونے کی آواز آئی۔ پھر بیوی اسے پچکار کر چپ کرانے لگی۔ بچہ کون تھا؟ بچے کے ساتھ اس کے ماں باپ بھی گھر پر ہوں گے؟ کچھ دیر بعد یہ سب سنتے ہی میں نے پھر آواز دی۔

''آتی ہوں،'' بیوی کی آواز مجھے سنائی دی۔

دروازہ کھولنے کے لیے جب اس کی آہٹ پاس آئی تب میں نے پوچھا:''اندر کس کا بچہ رو رہا تھا؟ تمھاری طبیعت کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہوں۔''

''اتنی دیر کیسے لگ گئی؟ اماں کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''آخری بس تک میں جاگتی رہی، پتا نہیں کب آنکھ لگ گئی۔ اب تو صبح ہونے والی ہوگی؟''

اندر سے اس نے دروازے میں تالا لگا دیا تھا۔ اس سے چابی لگ نہیں رہی تھی، اسی لیے دیر ہو رہی تھی۔ دروازہ کھلا وہ ہاتھ میں قندیل لیے ہوئے تھی۔ وہ مجھے بالکل صحت مند لگی۔

دروازہ بند کرتے ہوئے میں نے اس سے کہا،''اماں کی قندیل لے کر چلنے کی عادت تم کو بھی لگ گئی؟''

''اماں نہیں آئیں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''بتاتا ہوں۔ ان کی طبیعت ٹھیک ہے، پر بڑے بھائی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

ماسٹر جی کی پانچ سال کی لڑکی چارپائی پر سو رہی تھی۔ اس کے پاس بیٹھ کر اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے کہا،''تم کو ڈر لگ رہا ہوگا؟'' وہ میرے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔ میں جانتا تھا اگر میں نے اس سے کچھ اور پوچھا تو وہ رونے لگے گی۔

میں خاموش رہا۔''گھر پہنچ گیا تو اچھا لگا،'' کچھ دیر بعد میں نے کہا۔

''اس بچی کا مجھے بہت سہارا تھا۔''

Scanned with CamScanner

"کوئی آیا تو نہیں تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ڈاکٹر کی بہن آئی تھی۔ پوچھ رہی تھی، اکیلے جی گھبرائے گا تو نہیں؟ میں نے کہہ دیا، نہیں گھبرائے گا۔"

"کچھ کھانے کو ہوگا؟"

"بھوک لگی ہے؟"

"ہاں، کھانے کا موقع ہی نہیں ملا۔"

"میں نے تمھارے لیے بنوا کر رکھا تھا۔ پورا کھانا ہے۔"

بڑے بابو کام سے فائل لے کر صاحب کی طرف نکلے تو دیوانگن بابو لپک کر میرے پاس آئے۔

"آؤ، ایک مزے دار چیز دکھلاؤں۔" دیوانگن بابو میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگے۔

گوراہا بابو نے کہا، "میں دروازے کے پاس کھڑے ہو کر دیکھ رہا ہوں کہ بڑے بابو آتے ہیں یا نہیں۔ آتے دیکھوں گا تو بتا دوں گا، تیار رہنا۔"

دیوانگن بابو مجھے پکڑ کر بڑے بابو کی ٹیبل کے پاس لے گئے۔ لوہے کی الماری میں تالا نہیں لگا تھا۔ دیوانگن بابو نے الماری کھولی۔ لوہے کی الماری کھلنے کی جو آواز ہوتی ہے، وہی آواز ہوئی۔ انھوں نے نچلے خانے سے کاغذ کا ایک بڑا لفافہ نکالا۔

"اس میں کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بتاتا ہوں،" دیوانگن بابو نے کہا۔ لفافہ لے کر دیوانگن بابو میری ٹیبل پر آئے۔

"کھول کر دیکھو،" انھوں نے کہا۔

میں نے لفافے میں دیکھا، نوکر کی قمیض کے وہی ٹکڑے تھے جنھیں بڑے بابو نے چن چن کر جمع کیا تھا۔

"بڑے بابو آ رہے ہیں،" گوراہا بابو نے کہا۔

لفافہ میں نے جیسے تیسے فائلوں کے بیچ چھپا لیا۔ دیوانگن بابو الماری کا پلڑا بند کرنا بھول گئے تھے۔ کھلے پلڑے کو دیکھ کر بڑے بابو نے کہا، "الماری کسی نے کھولی ہے؟" بڑے بابو نے میری طرف دیکھا۔

Scanned with CamScanner

''میں نہیں جانتا،'' میں نے کہا۔

دیوانگن بابو نے کہا، ''آپ الماری کھلی چھوڑ گئے تھے۔''

''الماری کھلی چھوڑ گیا تھا، پلڑے کھول کر نہیں گیا تھا۔ میں سب سمجھتا ہوں،'' بڑے بابو نے الماری کا تالا بند کر دیا۔

دفتر سے نکلنے کے بعد ہم لوگ والی بال کے میدان سے گزرتے ہوئے نئی بلڈنگ کے پچھواڑے آ گئے۔ پیچھے کوئی نہیں تھا۔ میں پیشاب کرنے لگا۔ میں نے دیکھا، دیوانگن بابو لفافہ لے کر زمین پر بیٹھ گئے۔

''رکو،'' جلدی میں ٹھیک سے پیشاب نہ کر کے میں دیوانگن بابو کے پاس گیا۔ ''دیوانگن بابو، آپ کو بہت جلدی رہتی ہے۔''

گوراہا بابو کے ہاتھ میں ماچس تھی۔ انھوں نے پیسے دے کر مہنگو سے منگوائی تھی۔ سگریٹ بیڑی کوئی نہیں پیتا تھا، نہیں تو پہلے سے ماچس ہوتی۔

''اپنے گروہ میں مجھ کو بھی شامل کرو،'' اچانک ہم لوگوں نے بالکل پاس سے بڑے بابو کی آواز سنی۔ میں تو ایک لمحے کے لیے ہکا بکا رہ گیا۔ گوراہا بابو گھبرا گئے تھے۔ دیوانگن بابو چونک گئے تھے۔ بڑے بابو بالکل دبے پاؤں آئے ہوں گے۔

''تم لوگ ہٹو۔''

ہم لوگوں نے بڑے بابو کے لیے جگہ بنائی۔ بڑے بابو سے نیچے بیٹھتے نہیں بن رہا تھا۔ انھوں نے پتلون کے گندے ہونے کی پروا نہیں کی۔ زمین پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے جیب سے ایک چھوٹی بوتل نکالی اور میری طرف بڑھائی۔

''بڑے بابو، میں نشہ نہیں کرتا،'' میں نے کہا۔

بڑے بابو زور سے ''ہو ہو ہو'' ہنس پڑے۔ دیوانگن بابو اور گوراہا بابو بھی ہنسنے لگے۔ بوتل سے قمیض کے ٹکڑوں پر شراب انڈیلنے لگا تو بڑے بابو نے کہا، ''بس بس، اتنی بہت ہے۔'' بوتل لے کر انھوں نے جیب میں رکھ لی۔ چرونٹے کے ایک سوکھے پودے پر ایک کاربن پیپر اڑتا ہوا آ کر اٹک گیا تھا۔ ہوا کے زور سے وہ بالکل چپکا ہوا تھا۔ ہوا سائیں سائیں کی آواز کرتی ہوئی چل رہی تھی۔ گوراہا بابو سے

Scanned with CamScanner

ماچس بار بار بجھ جاتی تھی۔ بڑے بابو نے گورا بابو سے ماچس لی اور انھوں نے ایک بار میں ہی قمیص کے ٹکڑوں کی ڈھیری میں آگ لگا دی۔ بھک سے لپٹ اٹھی۔ گورا بابو چونک کر پیچھے سرک گئے۔ ہوا تیز چل رہی تھی اس لیے ڈھیری سے الگ ہو کر ایک دو ٹکڑے باہر نکل آئے تھے۔ میں نے انھیں پھر آگ میں ڈال دیا۔

رات کو بادل گرجنے لگے تھے۔ بجلی بھی کڑکنے لگی تھی۔ پانی برسنے کا امکان تھا۔ ہوا تیز چل رہی تھی۔ بیوی نے کہا، ''پانی برسے گا۔''

''برسے گا تو اچھا،'' میں نے کہا۔ پانی برسنے کے خیال سے ہم لوگوں نے سامان سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔

میں نے بیوی سے کہا، ''تم چپ چاپ پڑی رہو۔ تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' پھر بھی وہ ہلکے ہلکے سامان کا دھرنا اٹھانا کر رہی تھی۔ ہوا جب تیز ہو گئی تو بیوی نے کہا، ''لگتا ہے آندھی آئے گی۔''

''آندھی ہی آ جائے۔ کم سے کم پوری چھت اڑ جائے۔ تب یا تو جھک مار کر ڈاکٹر اسے بنوائے گا یا اسے چھوڑ کر اپن کوئی دوسرا گھر لیں گے۔ ڈرنا بالکل نہیں۔ اس سے بچے پر اثر پڑے گا۔ گھبراہٹ ہو رہی ہو تو اور زور سے گہری سانس لو،'' میں نے کہا۔

ساڑھی اور پیٹی کوٹ ڈھیلا کر کے وہ زور زور سے سانس لینے لگی۔ وہ جیون دینے والی ہوا کو زیادہ سے زیادہ کھینچ رہی تھی۔ ہانپتے ہانپتے وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ جواب میں میں بھی مسکرایا۔

❋❋

Scanned with CamScanner

# شاعری

**آدمی کی زندگی**
فہمیدہ ریاض
Rs.70

**کلیاتِ اختر الایمان**
مرتبین: سلطانہ ایمان، بیدار بخت
Rs.350

**نیم تاریک محبت**
ذی شان ساحل
Rs.100

**گہر آلود آسمان کے ستارے**
ذی شان ساحل
Rs.60

**رات**
سعید الدین
Rs.50

**روکو کو اور دوسری دنیائیں**
افضال احمد سیّد
Rs.50

**ای میل**
اور دوسری نظمیں
ذی شان ساحل
Rs.150

**شب نامہ**
اور دوسری نظمیں
ذی شان ساحل
Rs.150

**کراچی**
اور دوسری نظمیں
ذی شان ساحل
Rs.100

**جنگ کے دنوں میں**
ذی شان ساحل
Rs.125

**سائے چراغ کے**
احمد عظیم
Rs.150

**مٹی کا مضمون**
فرخ یار
Rs.150

**On the Outside**
Zeeshan Sahil
Rs.150

**The Colour of Black Flowers**
Shams-ur-Rahman Faruqi
Rs.250

**پریم وانی**
(گیت، ترجمہ اور فرہنگ)
میرابائی
مرتبہ: سردار جعفری
(زیرِ طبع)

**کبیر بانی**
(گیت، ترجمہ اور حواشی)
کبیر
مرتبہ: سردار جعفری
(زیرِ طبع)

Scanned with CamScanner

# کہانیاں

عطرِ کافور
نیر مسعود
Rs.80

عاقبت کا توشہ
نکہت حسن
Rs.85

دور کی آواز
فیروز مکرجی
Rs.150

ایک اور آدمی
حسن منظر
Rs.85

صحرا کی شہزادی
سکینہ جلوانہ
Rs.120

خطِ مرموز
فہمیدہ ریاض
Rs.100

آئینۂ حیرت
اور دوسری تحریریں
سیّد رفیق حسین
Rs.375

سوار
اور دوسرے افسانے
شمس الرحمٰن فاروقی
Rs.240

نربدا
اور دوسری کہانیاں
اسد محمد خاں
Rs.180

عربی کہانیاں
انتخاب اور ترتیب
اجمل کمال
Rs.180

ایرانی کہانیاں
انتخاب اور ترجمہ
نیر مسعود
Rs.90

ہندی کہانیاں (۳ حصے)
انتخاب اور ترتیب
اجمل کمال
Rs.540 (Rs.180 فی حصہ)

لالٹین اور دوسری کہانیاں
محمد خالد اختر
(زیرِ طبع)

طاؤس چمن کی مینا
نیر مسعود
(زیرِ طبع)

غصے کی نئی فصل
اسد محمد خاں
(زیرِ طبع)

Scanned with CamScanner

# اردو کے ادبی رسائل وجرائد

سہ ماہی فنون لاہور
مدیر: احمد ندیم قاسمی

سویرا لاہور
ترتیب: محمد سلیم الرحمٰن / ریاض احمد

کتابی سلسلہ مکالمہ کراچی
مدیر: مبین مرزا

کتابی سلسلہ دنیازاد کراچی
مدیر: آصف فرخی

ماہنامہ آئندہ کراچی
مدیر: محمود واجد

ماہنامہ جریدہ کراچی
مدیر: خالد جامعی / عمر حمید ہاشمی

سہ ماہی بادبان کراچی
مدیر: ناصر بغدادی

سہ ماہی نیا ورق ممبئی
مدیر: ساجد رشید

سہ ماہی ذہن جدید نئی دہلی
مدیر: زبیر رضوی

ماہنامہ شاعر ممبئی
مدیر: افتخار امام صدیقی

دو ماہی اردو بک ریویو دہلی
مدیر: محمد عارف اقبال

سہ ماہی استعارہ دہلی
مدیر: صلاح الدین پرویز

شعر و حکمت حیدرآباد دکن
مدیر: شہریار، مغنی تبسم

ماہنامہ انگارے
مدیر: عامر سہیل

Scanned with CamScanner

## وینڈل اسٹیونسن

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

# مقدس جنگ کا قیدی

بغداد میں، ۲۰۰۳ء میں، میں ایران عراق جنگ کے کسی عراقی سابق جنگی قیدی کو ڈھونڈنے نکلی۔ اس آٹھ سال طویل جنگ میں دونوں طرف کے کوئی دس لاکھ لوگ ہلاک ہوئے تھے اور دسیوں ہزار کو قیدی بنایا گیا تھا، جن میں سے بہت سے ۱۹۸۸ء میں جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد بھی لمبے عرصے تک قید میں رہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں مارٹن گیر (Martin Guerre) یا رِپ وان وِنکل (Rip Van Winkle) جیسی کسی کہانی کی تلاش میں تھی۔

میں بہت سے سابق قیدیوں سے ملی۔ ان میں سے ایک، دیالہ کا رہنے والا ایک سنّی، جب لوٹا تو اس نے اپنے خاندان کو مفلسی کا شکار اور اپنے بھائی کو دولت مند پایا۔ ''میری غیر موجودگی میں میری بیوی بوڑھی ہوگئی۔ اس کے منھ میں ایک دانت بھی باقی نہیں رہا۔ میرے بھائی مجھ سے کہتے ہیں کہ مجھے دوسری عورت کر لینی چاہیے۔'' اس کی بیوی نے یہ بات سن کر کندھے اچکائے۔

دوسرا قیدی ایک کرد تھا جس نے بیس سال قید خانے میں یہ سوچتے ہوئے گزارے تھے کہ ایرانی اسے جو قصے سناتے رہے ہیں — کہ انفال کی مہم کے دوران کرد دیہات کو سفاکی سے مسمار کر دیا گیا، ۱۹۸۸ء میں حلبجا میں پانچ ہزار کردوں کو گیس سے ہلاک کر دیا گیا — محض پروپیگنڈا ہے جو اس کے عزم کو توڑنے اور روح کو زیر کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ گھر واپس پہنچ کر اس نے پایا کہ یہ سب باتیں سچ تھیں۔

ایک اور قیدی ۱۹۹۰ء کے عشرے کے وسط میں واپس وطن پہنچا تھا اور اسے حکومت کی طرف سے چالیس ہزار دینار پا کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ اتنا بڑا خزانہ! وہ اپنی واپسی کے بعد پہلے دن بغداد کے ایک ریستوراں میں گیا تا کہ ٹیکسی لے کر اپنے گھر، رمادی، جانے سے پہلے پیٹ بھر کر کھانا کھا لے۔ لیکن جب بل آیا تو اسے احساس ہوا کہ یہ رقم محض اس بل کو ادا کرنے کے لیے کافی ہوگی — افراط زر نے دینار کو بے قدر کر ڈالا تھا — اور اس کے بعد وہ گھر پہنچنے کے لیے بمشکل بس کا کرایہ ادا کر سکتا تھا۔

واپس آنے والے بعض قیدیوں نے گھر پہنچنے پر پایا کہ ان کی بیویوں نے انھیں بہت پہلے مردہ جان کر دوسری شادی کر لی ہے۔ کچھ کو معلوم ہوا کہ ان کا خاندان ملک چھوڑ گیا ہے۔ ان میں سے ایک شخص نے مجھے بتایا کہ واپس آ کر وہ اپنی گلی میں چلتا ہوا اپنے گھر تک پہنچا اور وہاں اپنی ماں کو جھک کر باغ میں سے سوکھے پتے سمیٹتے دیکھا۔ اس نے اپنی ماں کو آواز دی جس پر اس نے پلٹ کر دیکھا اور اسے وہاں سے بھاگ جانے کا اشارہ کیا؛ اسے بہت پہلے مردہ تصور کر لیا گیا تھا اور اس کی ماں اسے نہیں پہچانی تھی۔

ایک سابق جنگی قیدی نے مجھ سے بات کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ صرف چند ماہ پہلے گھر واپس پہنچا تو اس کے محلے میں امریکی ٹینک کھڑے تھے اور سب لوگ صدام کے بارے میں گستاخانہ باتیں کر رہے تھے۔ وہ ایران میں تیئیس برس قید رہا تھا۔ جب وہ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا تو نہایت خستہ حال، منتشر دماغ، تلخ اور پراگندہ ذہن تھا۔ اس نے میرے ترجمان کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلایا۔ ''میرا المیہ اس قدر بڑا ہے کہ اسے صرف ایک شخص سمجھ سکتا ہے۔ صدام۔ میں اس سے ملنا چاہتا تھا، لیکن یہ امید ناممکن ہوگئی۔ سب کچھ بدل گیا، یہاں تک کہ میرا خاندان بھی۔ ہر شخص میرا دشمن ہو چکا ہے۔ کوئی میری کسی طرح مدد نہیں کر سکتا۔ میرے لیے کسی صحافی سے ملنے کا کوئی فائدہ نہیں — کوئی شخص میری ابتلا کو نہیں سمجھ سکتا۔''

بہت سی کہانیاں تھیں، افسانوی، میلوڈرامائی، حقیقی۔ مجھے جو کہانی سب سے اچھی طرح یاد ہے وہ ثائر کی ہے۔ وہ مجھے ڈھونڈتا ہوا میرے ہوٹل آ نکلا تھا کیونکہ اسے معلوم ہوا تھا کہ ایک اخبار نویس جنگی قیدیوں سے دلچسپی رکھتی ہے۔ میں اسے استقبالیہ پر کھڑا ہوا یاد کر سکتی ہوں، دراز قد، خوش وضع، بالکل سیدھا۔ اس کے بال سلیقے سے کٹے ہوئے تھے، اور گھنی مونچھیں ترشی ہوئی تھیں۔ اس پہلے موقعے پر اس

نے عمدگی سے استری کیا ہوا سیاہ رسمی سوٹ پہن رکھا تھا؛ بعد میں وہ زیادہ عام قسم کے کپڑے پہنے ہوئے آنے لگا، لیکن وہ ہمیشہ بے عیب لباس میں ہوتا، کہ وہ ایک باوقار سنّی افسر تھا۔ اس کی پتلون کی چنٹیں بالکل سیدھی ہوتیں، قیصوں پر درست استری کی ہوئی ہوتی، جیکٹ اس کے چوڑے کندھوں پر بالکل ہموار طور سے لٹک رہی ہوتی۔ اس کا شیو ہمیشہ تازہ ہوتا۔

ہم چھ مہینے تک تقریباً ہر ہفتے ملتے اور بات کرتے رہے۔ اس کا بھائی بغداد میں کاریں فروخت کرتا تھا — عراق پر عائد پابندیوں کے طویل برسوں کے بعد سیکنڈ ہینڈ کاریں اُردن کی سرحد سے مسلسل بہاؤ کی شکل میں آ رہی تھیں۔ یہ ایک عمدہ بزنس تھا، اور ثائر اس کا ہاتھ بٹانے کے لیے اکثر سامرہ سے بغداد آیا کرتا تھا۔ ہم حمرا ہوٹل میں پول کے کنارے بیٹھ جاتے اور میں اس کی سب باتوں کو لکھتی رہتی۔ ثائر بیچ میں رک کر کنکریٹ کی اٹھارہ فٹ اونچی دیوار پر نگاہ ڈالتا جو ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔ ''میں کسی بھی دیوار کو دیکھتے ہوئے سوچتا ہوں: یہ کتنی اونچی ہے اور میں اسے کس طرح پھاند سکتا ہوں؟'' یا وہ پنیر کے چھوٹے سے مثلث ٹکڑے کو دیکھتا جسے میں اپنی کرواساں روٹی پر پھیلا رہی ہوتی۔ ''اتنا ہی تھوڑا سا پنیر تھا — بہت چھوٹا ٹکڑا۔'' یا وہ اوپر سورج اور آسمان کی طرف دیکھتا جو اب گرین زون کے کنارے پر بلیک ہاک ہیلی کاپٹروں کی پروازوں سے گونج رہا تھا۔ ''جب ہم باہر کھلے میں آتے تھے تو روشنی سے چندھیا کر ہماری آنکھیں اندھی ہو جاتی تھیں۔''

ثائر سامرہ شہر کے نواح میں واقع ایک گاؤں میں ۱۹۶۰ء میں پیدا ہوا تھا۔ یہ گاؤں مٹی اور گارے کے بنے پستہ قد مکانوں، کھونٹے سے بنی گایوں، مرغیوں، ایک ہینڈ پمپ اور چیتھڑے پہنے بچوں کا مجموعہ تھا۔ بجلی نہیں تھی۔ بارش میں کچے مکانوں کی چھتیں ٹپکتیں اور دروازوں کے پاکھوں کے درمیان گارا گرتا۔ ثائر کے مکان میں دو کمرے تھے، ایک رہنے کے لیے، جہاں لپٹے ہوئے بستر کونے میں رکھے ہوتے اور کھانا کھانے کے لیے چٹائی پر پلاسٹک کا دستر خوان بچھا ہوتا، اور دوسرا کمرہ مہمانوں کے لیے، جس کا صاف فرش سیمنٹ کا تھا اور دیواروں سے لگے ہوئے تکیے اور گدے رکھے ہوئے تھے۔ بچوں کو اس کمرے میں جانے کی قطعی ممانعت تھی۔ ثائر کا ایک بڑا بھائی تھا — چار اور بھائی شیر خوارگی کی عمر میں ہی مر گئے تھے — اور کئی بہنیں تھیں۔ ثائر کا باپ ریلوے میں کام کرتا تھا۔ وہ ایک سمجھدار آدمی تھا، لیکن

Scanned with CamScanner

ناخواندہ؛ وہ روایتی لمبا دشداشہ اور پیروں میں سینڈل پہنتا اور سر پر چارخانے والا لال اور سفید کفیہ باندھتا؛ اس نے ایک پرانی برطانوی رائفل شکار اور ''قبائلی مسائل'' سے نمٹنے کے لیے رکھ رکھی تھی۔

۱۹۶۸ء میں، جب ثائر آٹھ سال کا تھا، انقلاب برپا ہوا۔ اس نے اپنے پڑوسیوں کو جوش میں آ کر ہوا میں فائرنگ کرتے سنا۔ اس کا باپ بڑبڑاتا رہا اور جشن میں شامل نہ ہوا؛ وہ بعث پارٹی والوں کو زیادہ پسند نہ کرتا تھا۔ اسے پچھلے انقلاب، ۱۹۶۳ء، کے دنوں کا تشدد یاد تھا، اور پھر وہ لوگ سوشلسٹ تھے، جس کا مطلب تھا کہ اچھے مسلمان نہ تھے۔ لیکن کم از کم وہ غیر ملکی بے خدا کمیونسٹوں کی طرح ملحد نہ تھے۔ ''جب ماسکو میں بارش ہوتی ہے،'' وہ کہا کرتا تھا، ''تو عراقی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کو چھتریاں نکالنی پڑتی ہیں۔'' شاید بعث والے اتنے خراب ثابت نہ ہوں؛ ان کا رہنما، احمد حسن البکر، خاصا معمر اور دانشمند معلوم ہوتا تھا، ایک فوجی افسر جو عرب افتخار اور قوم پرستی کی بات کرتا تھا، جیسے جمال عبدالناصر مصر میں کرتا تھا۔

ثائر گاؤں کے اسکول میں داخل ہوا اور وہاں اس نے لکھنا پڑھنا سیکھا۔ اس کا باپ اسے شہر سے رسالے لا کر دیتا اور وہ انھیں شوق سے چاٹا کرتا؛ سب پر ظاہر تھا کہ اس میں تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت ہے۔ اس کا بڑا بھائی بارہ برس کی عمر میں باپ کے ساتھ جا کر ٹرینوں پر کام کرنے لگا تھا، لیکن ثائر کی تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ ہوا، اس لیے اس کا کنبہ زمین کا ایک قطعہ فروخت کر کے سامرہ شہر اٹھ آیا جہاں ثائر سیکنڈری اسکول میں داخل ہو سکتا تھا۔

سامرہ دریائے دجلہ کے کنارے واقع ایک گنجان آباد شہر تھا، علاقائی صدر مقام (چند برس بعد یہ اعزاز اس شہر سے لے کر قریب کے ایک اور شہر تکریت کو دے دیا گیا) جس کی اہم ترین عمارت سنہری گنبد والا ایک مزار تھا جہاں ایران سے زائر آیا کرتے، اور سیڑھیوں والا ایک مینار، جو اتنا مشہور تھا کہ اس کی تصویر نوٹوں پر چھاپی جاتی۔ گاؤں کی خاموش، بند زندگی کے بعد سامرہ ایک وفور کی طرح تھا۔ یہاں بہت سارے لوگ پتلون قمیص اور سامنے سے بند چمڑے کے جوتے پہنتے تھے، اور ثائر نے بھی یہی وضع اختیار کی۔ گاؤں میں اسکول کے بعد اسے بہت سے چھوٹے موٹے کام کرنے ہوتے تھے، لیکن یہاں شہر میں اسے چائے خانوں پر ٹھہر کر سیاست پر ہونے والی بحثوں کو سننا پسند تھا: کمیونسٹ، اسلام پسند، بعث والے، ناصر اور بریژنیف اور فلسطین۔ ثائر کے باپ کو اس کا یوں ان جگہوں پر آنا جانا پسند نہ تھا اور اس نے اس کی گھر واپسی کا وقت مقرر کر دیا۔ لیکن اس زمانے کی سیاست ایسی تھی کہ اسے

Scanned with CamScanner

نظر انداز کرنا ناممکن تھا۔ گلیوں میں مظاہرے ہوتے اور اسکول کے کھیل کے میدان میں جھگڑے۔ ایک بار پورے شہر نے متحد ہو کر کمیونسٹوں پر پابندی عائد کر دی: کوئی شخص ان کی دکانوں سے سامان نہ خریدتا، نہ انھیں کوئی جائیداد کرائے پر دیتا، نہ ان کے گھر ملنے جاتا۔ جب ثائر نے اپنے باپ سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ یہ لوگ ایمان والے نہیں ہوتے۔

نائب صدر، صدام حسین، چمکتی ہوئی سیاہ کاروں کے قافلے میں، جو ہر سال طویل ہوتا گیا، پورے ملک کے دورے کیا کرتا، اور جن گاؤوں سے خوش ہوتا انھیں رنگین ٹیلی وژن اور بجلی عطا کرتا، ڈاکٹروں اور استادوں میں طلائی گھڑیاں بانٹتا، اور طلبا کے سامنے، جو ''عراق کا مستقبل'' تھے، تقریریں کرتا۔ وہ دراز قد اور خوش شکل تھا، لڑکیاں اس کی تصویریں دیوار پر لگاتیں اور لڑکوں کے لیے وہ ستائش کا ایک ستون تھا۔ ۱۹۷۸ء میں اس نے سامرہ کا دورہ کیا اور اسکول کے بچوں نے اس کے گزرنے کے راستے پر دورویہ کھڑے ہو کر پھولوں اور جھنڈیوں سے اس کا استقبال کیا۔ وہ بہت قریب سے اس کی فراخ مسکراہٹ اور گھنی مونچھوں کو دیکھ سکتے تھے، اس کی توانائی کو محسوس کر سکتے تھے، اس کا اٹھا ہوا ہاتھ ان کی رہنمائی کرتا تھا۔ اس نے کہا کہ حکومت نئے اسپتال اور اسکول اور ٹیکنیکل کالج بنائے گی، کہ طلبا کو آگے بڑھ کر مغرب کے برابر پہنچنا چاہیے، کہ بیرون ملک تعلیم کے لیے وظیفے اور بوڑھوں اور بیماروں کے لیے پنشن جاری کی جائے گی۔ ۱۹۷۲ء میں عراق پٹرولیم کمپنی کے قومیائے جانے کے بعد تیل کی دولت کی ریل پیل ہو گئی تھی اور یہ تمام وعدے پورے ہوتے دکھائی دیتے تھے۔

ثائر بعث پارٹی کا پرستار تھا۔ تیرہ برس کی عمر میں وہ پارٹی کی ایک ذیلی تنظیم نوجوان طلبا برائے دفاع عراق میں شامل ہو گیا۔ اس نے فارم میں اپنا نام، عمر، باپ کا نام اور قبیلے کا نام لکھا، فوٹو لگایا اور اپنے ضامن کی طرف سے ایک رپورٹ منسلک کی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا باپ اس پر ناراض ہو گا، اس لیے اسے اطلاع نہ دی۔ رکنیت کی ماہانہ فیس پچاس فلس تھی ——— نہایت معمولی رقم ——— اور تنظیم کی میٹنگیں اسکول کا وقت ختم ہونے کے بعد کلاسوں میں، نیم رازدارانہ انداز میں منعقد کی جاتیں۔ لیکچروں اور پمفلٹوں کے ذریعے عرب اتحاد اور سماجی انصاف کا پرچار کیا جاتا: یہ عمدہ اصول تھے اور ثائر کے دل میں، جو گاؤں میں مفلسی کی حالت میں بڑا ہوا تھا اور شکایت کرنے والے کسانوں کے زمینداروں کے ہاتھوں گولی مار کر ہلاک کیے جانے کی کہانیاں سنتا آیا تھا، ان کی قدر تھی۔ اس کی رائیں اس کے دور کی مقبول

Scanned with CamScanner

رائیں تھیں۔ پارٹی مستقبل کا زینہ تھی، جس کے ذریعے آدمی سماجی رتبے اور روزگار تک پہنچ سکتا تھا۔

ثائر بعث طلبا یونین کے کارکنوں میں ممتاز ہوتا گیا۔ وہ اسکول کے بعد رائفل اٹھا کر ڈرل کرتا، ویٹ لفٹنگ کرتا، اس نے ایک ریڈیو کلب قائم کیا جو اسپتال میں داخل مریضوں کے لیے پروگرام نشر کرتا تھا۔ وہ تاریخ کی کتابیں پڑھا کرتا جن میں طاقتور لوگوں —— صلاح الدین، ہٹلر —— اور میسوپوٹیمیا کے شاندار ماضی کا ذکر تھا، باہر ملکوں میں قلمی دوستوں کو، خصوصاً لڑکیوں کو، خط لکھا کرتا اور پارٹی کے ارکان کے بارے میں، جیسا کہ ہدایت تھی، رپورٹیں تحریر کیا کرتا۔ وہ خود پر نازاں تھا، اس کا اعتماد جگمگاتا تھا، اور ہر چیز، یہاں تک کہ اس کے اردگرد کا عراق بھی، ایک خوشحال مستقبل کے لیے تیار دکھائی دیتی تھی۔ اس نے اپنے لیے ایک طلائی ڈیجیٹل گھڑی خریدی اور غسلخانے کے باہر بڑے کمرے میں لگے ہوے آئینے میں اپنے بالوں کو احتیاط سے سنوار کر چست ٹوپی کی شکل دینے اور ہیئر اسپرے سے چمکانے میں گھنٹوں گزارنے لگا۔ اس کا باپ اسے دیکھتا تو اس کی خودپسندی کا مذاق اڑاتا۔

''کیا تمھارے بال سونے کے بنے ہیں کہ تم ان کا اس قدر خیال رکھتے ہو؟''

۱۹۷۹ء میں حسن البکر کی صحت کے کمزور پڑ جانے کے ساتھ، صدام حسین نے اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور سزاے موت پانے، پارٹی سے نکالے جانے والوں کے نام ہر شام ٹیلی وژن پر پڑھ کر سنائے جانے لگے۔ شام کی خبریں ایرانیوں اور آیت اللہ خمینی کی مذمتوں سے بھری ہوتیں۔ خمینی نے کھلم کھلا صدام حسین کا تختہ الٹ دیے جانے کی بات کی تھی۔ پرانی عرب ایرانی رقابت پھر سے تازہ ہوگئی اور شط العرب کے قریب ایران اور عراق کا سرحدی تنازع چھڑ گیا۔ آتشیں خطابت نے ہوتے ہوتے سرحد پار گولہ باری کی شکل اختیار کر لی۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو عراق نے حملہ کر دیا۔

عراق میں رہنے والے ایرانیوں کو، جن میں سے بہت سے وہاں کئی نسلوں سے رہ رہے تھے اور بعض محض نسلاً ایرانی تھے، عراق سے جلاوطن کر دیا گیا۔ ان میں ذکیہ بھی تھی، ثائر کی محبوبہ (یا کم از کم محبوباؤں میں سے ایک)۔ اس کا خاندان ان پچاس ایرانی شیعہ خاندانوں میں شامل تھا جو سامرہ میں آباد تھے اور جن کا پیشہ زائرین کو خدمات مہیا کرنا تھا۔ ثائر نے حکام سے اس کی وکالت کی۔ ''اسے کیوں نکالا جا رہا ہے؟ یہ تو عراق ہی میں پیدا ہوئی تھی! یہ یہاں سے نہیں جانا چاہتی!''

افسر کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ ''تمھیں بھی اس کے ساتھ بھیج دیا جائے؟'' اس نے دھمکی دی۔

Scanned with CamScanner

اس نے ثائر کو ان فیصلوں پر اعتراض کرنے سے منع کیا، اور کہا کہ یہ سرکاری قانون ہے۔ ثائر ذکیہ کے جانے سے نہایت ناخوش تھا، لیکن جنگ اس سے کہیں زیادہ بڑی شے تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ذکیہ نے اپنے خاندان کے ساتھ بس میں سوار ہونے سے پہلے سامرہ کی خاک کو بوسہ دیا۔

جنگ شروع شروع میں بڑی جوش انگیز اور فاتحانہ تھی۔ عراقیوں نے محمرہ شہر پر (جسے ایران میں خرم شہر کہا جاتا تھا) قبضہ کرلیا، اور بغداد پر حملہ آور ہونے والے ایرانی جیٹ طیاروں کو مار گرایا۔ ثائر نے حِلّہ کے فوجی کالج میں داخلہ لے لیا اور توپ خانے کے افسر کے طور پر تربیت حاصل کرنے لگا۔ اس کے لیے یہ بالکل صاف اصول کا معاملہ تھا: خمینی عراق میں شیعہ انقلاب لانے کی دھمکی دے رہا تھا، اور اسے اپنے ملک کے دفاع کے لیے لڑنا تھا۔ وہ ایک نئی، استری کی ہوئی، گہری سبز وردی پہنتا جس کے کندھے پر زردھاگے سے کڑھا ہوا لیفٹیننٹ کے عہدے کا نشان، طلائی ستارہ، تھا، نہ کہ پیتل کا کھنکھناتا ہوا بلا جو روشنی پڑنے پر چمک کر دشمن کو اس کے محل وقوع کی خبر دے دیتا۔ اس کے سر پر نیلی ٹوپی ہوتی، جو اس بات کی علامت تھی کہ اس کا تعلق موٹر کمپنی سے ہے، کمر میں آسٹریائی پستول، جسے "طارق" کا نام دیا گیا تھا، اور پیروں میں امریکی فوجی بوٹ۔ اسے سب سے زیادہ خوف اس بات کا تھا کہ کہیں اس کے محاذ پر پہنچنے سے پہلے جنگ ختم نہ ہو جائے۔

اس دوران آخرِ ہفتہ کی چھٹیاں بغداد میں گزارنا، ان لڑکیوں کے ساتھ جو باہر نکلنے پر راضی ہوتیں پکنک منانا، قہوہ خانے اور ریستوران، اور چابیوں کے چھلّے خریدنے کا جنون جن پر نوعمر سپاہی اپنی محبوباؤں کے نام کھدوایا کرتے۔ رات کے وقت فوجی افسروں کو مے خانوں اور نائٹ کلبوں میں خوش آمدید کہا جاتا — ثائر کے کچھ دوست زوردار دھمک والی مغربی موسیقی اور درآمد شدہ فلپینو لڑکیوں اور وِسکی کے دیوانے تھے۔ ثائر بیئر پیتا تھا، لیکن اس نے وِسکی کبھی نہیں پی اور رَوک موسیقی کی اجنبی تال اس کی سمجھ میں نہ آئی۔

اس کے کچھ دوست فوج میں شامل ہو کر جنگ میں حصہ نہیں لینا چاہتے تھے۔ وہ جنگ ختم ہونے تک عراق چھوڑ کر چلے جانے کی باتیں کیا کرتے۔ وہ جنگ میں مارے جانے والے شناسا اور رشتہ دار عراقیوں کے جنازوں میں انھیں کناروں پر کھڑے دیکھتا۔ وہ خوفزدہ دکھائی دیتے۔ ٹیلی وژن پر صدام ان لوگوں پر سخت لعن طعن کرتا جو جنگ میں شامل نہیں ہونا چاہتے تھے: وہ بزدل ہیں، اپنی بیویوں سے

Scanned with CamScanner

کسی طرح بہتر نہیں، اور اگر انھوں نے بزدلوں جیسی باتیں کیں تو وہ ان کے چار ٹکڑے کر ڈالے گا۔ ثائر کو اس بات پر افسوس ہوتا کہ اس کے جاننے والوں میں ایسے بزدل لوگ بھی ہیں۔ وہ ان میں حب الوطنی کے فقدان پر ان سے بحث کرنے کی کوشش کرتا۔

جنوری ۱۹۸۲ء میں ثائر کو محاذ پر بھیجا گیا۔ ایرانی کچھ عرصے سے محمرہ کا قبضہ واپس لینے کی تیاریوں میں تھے اور بہار کا موسم آتے آتے معلوم ہونے لگا کہ وہ کسی بھی وقت حملہ کر دیں گے۔ عراقیوں نے خود کو اس حملے کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر لیا، ایک ایک رات تناؤ سے بھری گزرنے لگی، اور انتظار کا ہیجان رفتہ رفتہ تھکن، بے دلی اور تقدیر پرستی میں بدلتا گیا۔ خستہ اعصاب، تباہ حال نیندیں۔ مئی میں جب واقعی حملہ ہوا تو اس نے عراقیوں کے قدم اکھیڑ دیے۔ ہر طرف انتشار پھیل گیا اور خوفناک جانی نقصان ہوا؛ دسیوں ہزار عراقیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ عراقی اخبارات اور ریڈیو میں اس قسم کا احساس عام تھا کہ محمرہ کی لڑائی کا مطلب جنگ کا خاتمہ ہے۔ صدام نے اس محاذ کے کمان دار جنرل کو فائرنگ سے ہلاک کروا دیا۔

ثائر نے کئی ہفتے پسپا ہونے، جھڑپیں کرنے، گرنے، اٹھنے اور پھر لڑنے میں گزارے۔ اس سے جو کچھ کرنے کو کہا گیا وہ کرتا گیا۔ صفوں میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو نیم دلی سے لڑ رہے تھے، ان کے لیے، بصرہ کی سلامتی کی طرف پسپا ہوتے ہوئے، دشمن کو تعاقب سے باز رکھنے کے لیے اس کی سمت چند فائر کر دینا ہی بہت تھا۔ ان کے برعکس ثائر یقین کے ساتھ لڑا۔ اس کے باپ نے اس سے سر اونچا رکھنے کو کہا تھا۔ آخر سپاہی کا کام ہی موت کا سامنا کرنا ہے، اس کام سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے؟

کبھی وہ بوٹ پہنے پہنے سوتا، کبھی اسے سونے کا موقع ہی نہ ملتا۔ ایک صبح اس کی کمپنی نے ایرانیوں کے ایک دستے کو قیدی بنا لیا۔ وہ رضاکار تھے، سخت ڈرے ہوئے، اور ان کی عمریں باقاعدہ سپاہی بننے کے لحاظ سے یا تو بہت کم تھیں یا بہت زیادہ۔ انھوں نے سروں پر سبز اور سیاہ پٹیاں باندھ رکھی تھیں اور پتلے کپڑے کی وردیاں پہنے ہوئے تھے: ان کے جوتوں میں بے تحاشا سوراخ تھے اور پیروں میں چھالے ہی چھالے۔ وہ تھکن اور پیاس سے نڈھال تھے۔ وہ ''آب! آب!'' چلاتے رہے لیکن بہت دیر میں ثائر کی سمجھ میں آیا کہ وہ پانی مانگ رہے ہیں۔

صدام نے اعلان کیا کہ عراقی فوج عراق کی سرحد پر واپس لوٹ آئے گی۔ شاید اسے امید تھی کہ

Scanned with CamScanner

خمینی اس سے مطمئن ہو جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کے باوجود، عراقیوں نے صحرا میں خندقیں کھود کر اپنے قدم جما لیے اور ایک ناخوشی بھرے تعطل پر قانع ہو گئے۔ گرمیوں کا موسم تھا اور بے پناہ تپش تھی۔ عراقی زرد صحرا میں گڑھے اور خندقیں کھودتے رہے۔ توپوں کے گولے ان کے پیچھے گرنے لگے۔ گرد و غبار کا طوفان اس قدر شدید تھا کہ انھیں گاگلز پہننے پڑے۔ ریت ان کی جلد کے دانوں میں گھس گئی، جلد پھٹنے لگی اور سخت خارش شروع ہو گئی، جو لوگ سوتے وقت بوٹ نہیں اتارتے تھے ان کے پیروں میں گلنے کی بیماری ہو گئی۔ نہانے کا مطلب بھورے، کھاری پانی کی بالٹیوں کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

ثائر کو بصرہ کے مشرق میں واقع مخفار نامی مقام پر تعینات کیا گیا تھا۔ اس کے ارد گرد کی زمین خالی اور مجروح تھی، ہموار کیے ہوئے ریت کے ٹیلوں پر خندقیں کھدی ہوئی تھیں اور مواصلات کے تاروں، راستوں اور پگڈنڈیوں کا جال بچھا تھا۔ زیر و بم اتنے زیادہ تھے کہ راستہ چلتے ہوئے اگلے اُبھار یا ٹیلے کا اندازہ کرنا مشکل ہوتا تھا۔ اوپر صرف جلتا ہوا آسمان تھا، اور زمین پر اِدھر اُدھر گرتے ہوئے گولے، اور ایرانیوں کے ممکنہ حملے کی افواہیں۔

ثائر کا ایک دوست، عبداللہ رضا مانے، جو توپ خانے کا اس سے سینئر افسر تھا، بصرہ میں رہتا تھا۔ وہاں، فوجیوں کی بڑی تعداد میں آمد کے باوجود، زندگی معمول کے مطابق جاری تھی — حکومت نے شہریوں کے انخلا کی ممانعت کر دی تھی۔ ہفتے میں ایک بار ثائر کار چلا کر شہر جاتا، خریداری کرتا، عبداللہ کے گھر یا افسروں کے کلب میں ٹھہرتا، اور نہاتا دھوتا۔ وہ اور عبداللہ قریبی دوست بن گئے۔ وہ لڑائی سے پہلے کے برادر سپاہی ساتھی والے معمول کے عادی تھے، جس میں دوست ایک دوسرے سے قمیصوں کا تبادلہ کیا کرتے تاکہ ایک شخص دوسرے کے کپڑے پہنے شہید ہو۔ رمضان کا مہینہ تھا اور بیشتر جوان روزے سے تھے۔ ثائر روزے نہیں رکھتا تھا اور سحری کے لیے نہیں اٹھتا تھا۔ وہ اس وقت تک سویا رہتا جب تک اس کا نوکر، جو ایک غریب گھر کا آدمی تھا، اس کا ناشتہ لے کر نہ پہنچتا: چاول، شوربہ، پھل اور چائے۔ ثائر نے اپنے گھر خط لکھا کہ اسے امید ہے عید پر چھٹی ملے گی۔ اس نے اپنے والدین پر یہ ظاہر کیا کہ اس کی تعیناتی بصرہ میں ہوئی ہے، کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی ماں اس کے محاذِ جنگ پر ہونے کے بارے میں فکرمند ہو۔ اس نے ایک مراکشی لڑکی، فتیح مساوی، کو بھی خط لکھا جس سے وہ اس وقت ملا تھا جب وہ نوجوانوں کے ایک وفد میں شامل ہو کر مقدس مقامات کی زیارت کے لیے عراق آئی تھی۔ وہ

اسے اکثر خط لکھتا، اسے اپنی امیدوں میں شریک کرتا، اپنی روزمرہ زندگی کے بارے میں بتاتا اور یونیفارم میں کھینچی ہوئی اپنی تصویریں بھیجتا۔ وہ جواب میں عزم اور حب الوطنی کے پیغامات، اور رسالے اور کتابیں بھیجا کرتی۔

۱۳ جولائی کو ثائر کو ایک ٹائپ شدہ حکم نامہ ملا جس میں خبردار کیا گیا تھا کہ ایرانیوں کا حملہ نویں یونٹ پر متوقع ہے، جو ثائر کے پانچویں یونٹ کے قریب ہی تعینات تھا۔ ثائر نے اس کی وصولی کی رسید کے طور پر اس کے حاشیے پر دستخط کیے۔ اس حکم نامے میں ایرانی حملے کا امکانی وقت رات دس بجے اور مقام مچھلیوں والی جھیل بتایا گیا تھا جو دراصل صحرا میں سیم کا شکار ایک غلیظ دلدلی قطعہ تھا۔ فوجیوں کو انتہائی خبردار حالت میں رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ پھر مغرب کے بعد اس نے اپنی کمپنی کے جوانوں سے خطاب کیا۔ اس نے انھیں بتایا کہ وہ لڑائی میں شامل ہونے ہی والے ہیں۔ اس نے انھیں قدیم عرب قائدین اور بہادروں کی یاد دلائی، انھیں کعا کع کی یاد دلائی جس نے فارس کی سلطنت کو تباہ کر ڈالا تھا۔ ”ہم اپنی عورتوں کو پیچھے چھوڑ کر آئے ہیں۔ وہ ہم سے اپنے تحفظ کی توقع کرتی ہیں۔ ہمارے دشمن انھیں قبضے میں لینے اور ہمارے بچوں کو اغوا کرنے کے ارادے سے آرہے ہیں۔ تمھیں اس سرزمین کی حفاظت کرنی ہوگی جس میں تم نے جنم لیا اور جس میں تمھیں مرنا ہے۔“

وہ عبداللہ سے بغل گیر ہوا اور دونوں نے قمیصوں کا تبادلہ کیا۔ عبداللہ اس سے کم جسامت کا تھا اور اس کی قمیص ثائر کے سینے پر تنگ تھی۔ اس بار ثائر کو پہلے سے مختلف احساس ہوا، شاید اپنی تقدیر کی پیش آگہی، لیکن اس نے فوراً ہی اسے جھٹک دیا اور تنگ آستینوں میں اپنے بازو ڈال دیے۔ اندھیرے میں وہ اور عبداللہ الگ الگ جیپوں میں سوار ہوئے جن میں ایک ایک ڈرائیور، قاصد اور سارجنٹ بھی تھا، اور نشانے منتخب کرنے اور اپنی اپنی کمپنی کی گولہ باری کی سمت درست کرنے کی غرض سے روانہ ہوئے۔ ان کی ملاقات اپنے سینئر افسر نقیب سے ہوئی۔ اس نے ان سے جوش دلانے والی باتیں کیں اور یاد دلایا کہ اگر وہ پسپا ہوئے تو ان کا سامنا سزائے موت دینے والے یونٹ سے ہوگا۔

ثائر علی الصباح محاذِ جنگ پر بالکل سامنے واقع مشاہدے کی چوٹی پر پہنچا۔ آسمان اس وقت گلابی اور بالکل پُرسکون تھا۔ وہ دوربین لگائے کھڑا اپنے بائیں ہاتھ کی سمت دور دھماکوں سے اٹھتے ہوئے غبار کا جائزہ لے رہا تھا۔ شمال کی سمت توپوں کی گہری گرج سنائی دے رہی تھی۔

Scanned with CamScanner

تقریباً دس بجے ایرانیوں کی ایک پلٹن پہاڑی پر آ پہنچی اور انھیں قیدی بنالیا۔ حملہ آوروں کی تعداد بہت زیادہ تھی، وہ اچانک ان کے بالکل پاس نمودار ہوے، پھر سر پر آ پہنچے، اور ثائر کے ہاتھ خود بخود ہوا میں اٹھ گئے۔ فرار کی کوئی راہ نہ تھی۔

ایرانیوں نے ثائر کی وردی اتروائی۔ ان میں سے ایک شخص نے دو تین بار اسے سر کی پشت پر مارا۔ انھوں نے اس کی رقم اور طلائی ڈیجیٹل گھڑی چھین لی۔ اس کے پیروں کے پاس زمین پر گولیاں ماریں۔ وہ درد سے چور اور خراشوں سے اٹا ہوا وہاں کھڑا تھا، اس کی کلائی پر جہاں گھڑی بندھی ہوتی تھی وہاں ایک مدھم سا نشان تھا، اور عبداللہ کی بنیان پسینے سے کالی ہو رہی تھی۔

اسے ایک ٹرک کے عقبی حصے میں دھکیل کر سوار کیا گیا اور ایرانی ڈویژن ہیڈکوارٹر لے جایا گیا، جہاں عراقی فوجوں کے محل وقوع کے بارے میں اس سے پوچھ گچھ کی گئی۔ اس نے انھیں صرف اپنا نام اور یونٹ کا نمبر بتایا۔ اس نے سیدھے کھڑے ہونے کی کوشش کی، لیکن اسے پھر پیٹا گیا اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایک گاڑی کے پچھلے حصے میں ڈال دیا گیا۔

اس نے گاڑی کو حرکت کرتے محسوس کیا اور وہ کافی دیر چلتی رہی، پھر رکی اور اس کی آنکھوں پر سے پٹی کھولی گئی؛ اس کی آنکھوں کے سامنے چمکتی، چکاچوند کرتی دھوپ تھی۔ اس نے خود کو ایک عمارت کے سامنے پایا اور اپنے اردگرد خاموش عراقی قیدیوں کا ہجوم دیکھا جن میں سے کچھ صرف اپنے زیرجامے اور بنیان پہنے تھے، کچھ نے صرف وردی کی پتلونیں پہن رکھی تھیں اور ان کے بالائی بدن ننگے تھے۔ ایک ایرانی پروپیگنڈا افسر نے ان سے ریڈیو پر عراقی جارحیت کی مذمت نشر کرنے کو کہا۔ ثائر نے انکار کیا اور ایک بار پھر پیٹا گیا۔ سورج صحرا میں غروب ہو گیا۔ یہ ۱۴ جولائی ۱۹۸۲ء کا دن تھا۔ اس وقت ثائر کی عمر بائیس سال کی تھی۔

اپنا قصہ سناتے ہوے ثائر کبھی کبھی خود کو اپنی نوعمری کے دنوں میں پہنچا ہوا پاتا اور اس کے ذہن میں اُن دنوں کی رائیں اور مروج خیالات گونجنے لگتے۔ وہ سر کو دائیں بائیں ہلاتے ہوے لڑائی، ہلاکتوں اور سزاے موت کے ان مہینوں کو یاد کرتا جو اس نے قید کیے جانے سے پہلے بسر کیے تھے۔ ''اب مجھے ان سارے لوگوں کا مارا جانا بہت بڑا نقصان محسوس ہوتا ہے۔ ہم سب کچھ کھو بیٹھے۔'' یہ پوری جنگ ہی

درحقیقت بالکل بے مصرف تھی۔ ''ہر چیز ختم ہوگئی۔اس قدر خون بہا،اور ہماری قربانیوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔''

دو تین دن بعد قیدیوں کو ایک ٹرین میں سوار کرایا گیا۔کھڑکیوں میں سے وہ خشک، تپتا ہوا صحرا اور گرد آلود شہر گزرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ٹرین بہت آہستہ چل رہی تھی، اچانک جھونک کھا کر رک جاتی، اور پھر آگے بڑھنے لگتی۔ایک اور قیدی، سلیم نامی ایک کیپٹن، نے تجویز پیش کی کہ فرار ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔''یہ لوگ کچھ زیادہ دھیان نہیں دے رہے ہیں۔جب ٹرین آہستہ چل رہی ہو تو ہم غسلخانے جا کر وہاں کی کھڑکی سے کود سکتے ہیں۔یہ لوگ ہمیں نہیں روک سکیں گے۔''

ثائر اس پر رضامند نہ ہوا۔''اور کود کر پہنچیں گے کہاں؟ فارس کے ریگستان کے بیچوں بیچ؟ تمھیں کتنی فارسی آتی ہے؟''

''ہم کوشش تو کر سکتے ہیں،'' سلیم نے کہا۔

''ارے رہنے دو،'' ثائر بولا۔''ہماری ٹانگیں ٹوٹ جائیں گی۔اور یوں بھی جنگ چند ہفتوں میں ختم ہونے والی ہے۔صلح کے مذاکرات ہوں گے اور پھر ہم سب کو گھر واپس بھیج دیا جائے گا۔''

قید کے اوّلین ہفتے جیل اور بیرک کے معمول پر مشتمل تھے۔ایک ایک کوٹھری میں ٹھنسے ہوئے تین تین قیدی، خاردار تاروں کی باڑ، اور تقریریں۔بعض اوقات دن میں دو دو بار تقریریں سنوائی جاتیں۔ایرانی، انقلاب اور راستی سے سرشار، چھڑیاں لیے ہوئے، قیدیوں سے ان کی حکومت کی مذمت کرانے کے عزم پر پوری طرح کاربند دکھائی دیتے تھے۔انھوں نے دیواروں پر خمینی اور عراقی آیت اللہ صدر کی تصویریں لٹکا رکھی تھیں۔وہ عراقی شیعہ حزبِ اختلاف کے رہنماؤں کو لاتے کہ وہ قیدیوں سے ان کی اپنی عربی زبان میں بات کریں اور انھیں صدام کے جرائم، اس کی حکومت کے ہاتھوں کیے جانے والے تشدد اور جبر سے آگاہ کریں۔وہ سلائیڈیں اور بلیک بورڈ استعمال کرتے۔وہ جنوبی عراق کے غریب، خستہ حال شیعوں اور جبری بھرتی کے تحت آئے ہوئے گردوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔وہ ان سے نعرے لگواتے: ''اللہ اکبر! اللہ اکبر! امریکہ مردہ باد! اسرائیل مردہ باد! روس مردہ باد! صدام مردہ باد!''

ثائر اور دوسرے افسروں نے اس پورے عمل کو دشمن کا پروپیگنڈا کہہ کر رد کر دیا۔کچھ عراقی قیدی اس سے متاثر ہوئے، شیعوں میں سے کچھ لوگ، اور کچھ ایسے لوگ جو بہتر خوراک یا نگرانوں کی خوشنودی

حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مخبروں کو انعام دیے جاتے، مراعات ملتیں۔ پھوٹ پڑ گئی: ایک بار ثائر نے دیکھا کہ ایرانیوں سے جا ملنے والے ایک قیدی کو اس کی کوٹھری کے ساتھیوں نے پھانسی دے دی۔ اسے اس پر بہت تکلیف ہوئی، لیکن وہ ان کے احساسات کو سمجھتا تھا۔

قید خانے میں کئی ہزار قیدی تھے۔ انھیں چند ہفتوں میں رہائی نہیں ملی۔ جنگ جاری رہی۔ ایران نے حملہ کیا اور پھر عراق نے جوابی حملہ کیا، اور قیدی قیدی ہی رہے۔ تقریباً ایک سال بعد بہت سے قیدیوں نے بھوک ہڑتال کی اور مطالبہ کیا کہ انھیں ریڈ کراس تک رسائی دی جائے۔ ایرانی بہت غصے میں آ گئے۔ قیدیوں کے ایک گروپ کو جمع کر کے ان کے سر مونڈ دیے گئے اور انھیں ورزش کے میدان میں اس طرح بٹھایا گیا کہ ان کی بیرکوں کے قیدی کھڑکیوں سے انھیں دیکھ سکیں۔ نگرانوں نے بجلی کے موٹے تار لیے اور ان کے سروں پر برسانے لگے۔

''ریڈ کراس ایک غیر انسانی تنظیم ہے جو امریکہ سے مل کر کام کرتی ہے! تم لوگ بھوک ہڑتال ختم کرو گے! ورنہ ہم تمھیں ختم کر دیں گے!''

کھانے کی بڑی سی سینی لائی گئی جس میں چاول اور سالن تھا۔ ان بدقسمت لوگوں کو المونیم کے پیالے اور چمچے تھمائے گئے اور پھر پیٹا گیا۔ ان میں سے کچھ نے سر جھکا لیے اور چمچے سے کھانا شروع کر دیا۔ یہ منظر دیکھتے ہوئے قیدی نعرے لگانے لگے: ''ایران مردہ باد! عراق زندہ باد! نعم نعم نعم صدام!'' وہ نگرانوں پر ٹوٹ پڑے اور انھیں مار مار کر قید خانے سے باہر نکال دیا۔ ایرانی کمک لے کر آئے اور بندوقیں لے کر قید خانے کے باہر کھڑے ہو گئے۔

یہ صورت حال دو دن تک قائم رہی۔ تیسرے دن صبح کے وقت قید خانے کو ایرانی خصوصی دستوں کے سپاہیوں نے گھیر لیا جنھوں نے سروں پر چشموں والے ہیلمٹ پہن رکھے تھے۔ چیڑ کی لکڑی کے بنے ہوئے پندرہ تختے زمین پر قطار میں بچھا دیے گئے۔ میگا فون پر ناموں کی ایک فہرست پڑھی گئی، چون افسر اور چون سپاہی۔ قیدیوں کے ہجوم میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ انھیں خبردار کیا گیا کہ ہلنے جلنے کی صورت میں جواب گولیوں سے دیا جائے گا۔ جن قیدیوں کے نام فہرست میں شامل تھے، ثائر بھی ان میں سے ایک تھا، وہ نکل کر آگے بڑھے۔ انھیں زیر جاموں کے سوا تمام کپڑے اتارنے اور ٹولیوں میں جمع ہونے کا حکم ملا۔

Scanned with CamScanner

میگافون سے آواز بلند ہوئی، ''سو کوڑے!''

دو بڑے جثے والے ایرانی ہاتھ میں بجلی کے موٹے تار لیے، تختوں کے دونوں طرف کھڑے ہو گئے۔ ہر قیدی کو دو دو نگرانوں نے تخت پر اس طرح لٹایا کہ ایک نے اس کے پھیلے ہوئے بازو اور دوسرے نے ٹانگیں جکڑ رکھی تھیں۔ اس کے باوجود کوڑا پڑنے پر قیدی کا جسم جھٹکے سے خم کھا جاتا، یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو کر محض بے حرکت جسم رہ جاتا۔

ثائر دوسری ٹولی میں تھا۔ انھیں اسی کوڑوں کی سزا دی گئی۔ کوڑے بہت تیزی سے پڑنے لگے۔ دونوں طرف کھڑے آدمی یکساں حرکت کرتے ہوئے گردن، پیٹھ اور ٹانگوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔ انھوں نے تاروں کے سرے اپنے ہاتھوں میں لپیٹ رکھے تھے اور وہ بازو اوپر تک اٹھا کر، اپنے پورے بدن کی طاقت سے کوڑا مارتے تھے۔ ثائر نے درد کی شدت سے اپنے جسم کو دو ٹکڑے ہوتا محسوس کیا۔ وہ زور لگا کر اٹھ کھڑا ہوا اور بازو اور لاتیں چلانے لگا، اسے گھسیٹ کر واپس لایا گیا۔ تار کے پڑنے سے جسم پر ایک لمبا زخم پڑ جاتا؛ اذیت کی لہر بہت اچانک اور بے پناہ اٹھتی تھی۔ اس کی پسلیاں نیچے چیڑ کی لکڑی کے تختوں سے کچل کر چٹخی جا رہی تھیں اور خود وہ تختے بھی چرچرا رہے تھے۔ ثائر پچاس کوڑوں کے بعد بے ہوش ہو گیا؛ ایک اور قیدی پھر کبھی نہ اٹھ سکا۔

سزا کے بعد قیدیوں کے جسموں کو اوندھے منھ ٹائلوں کے فرش والی کوٹھری میں پھینک دیا گیا۔ ان لوگوں کو ایک دن وہیں پڑا رہنے دیا گیا، ان کے پیشاب سے خون آتا رہا اور وہ مل کر کراہتے اور درد کو قابو میں رکھنے کے لیے بے حرکت رہنے کی کوشش کرتے رہے۔ ثائر نے اپنے آس پاس اس تکلیف کا منظر دیکھا۔ اسے محسوس ہوا کہ خدا کے سوا کوئی طاقت ایسی نہیں جس سے وہ رجوع کر سکیں۔

چند روز بعد انھیں ایسے کمروں میں بھیج دیا گیا جہاں چارپائیاں بچھی تھیں، اور وہ صحت یاب ہونے لگے۔ قید خانے کے اس نئے حصے میں کچھ شدید زخمی عراقی قیدی بھی تھے جنھیں وطن واپس بھیجا جا رہا تھا۔ ان میں اس وقت کے نائب وزیر اعظم طارق عزیز کا بھانجا بھی تھا جو محاذِ جنگ پر بینائی سے محروم ہو کر تین دن پڑا رہا تھا، یہاں تک کہ ایرانیوں نے اسے قیدی بنا لیا۔ طارق عزیز کا بھانجا ناقابلِ یقین حافظے کا مالک تھا اور اس نے ڈھائی سو سے زیادہ جنگی قیدیوں کے نام یاد کر لیے تاکہ عراق واپس جا کر ان کے گھر والوں کو اطلاع دے سکے۔ ثائر نے اس سے اپنا نام یاد رکھنے کی درخواست کی لیکن کہا کہ وہ

Scanned with CamScanner

اس کے گھر والوں کو اس حالت سے ہرگز مطلع نہ کرے جو اس پر گزری ہے۔

اس کے کچھ عرصے بعد انھیں معجزاتی طور پر ایک اور قید خانے میں منتقل کر دیا گیا جہاں سفا کی نسبتاً کم تھی۔ انھیں اس کی وجہ معلوم نہ ہوئی۔ انھیں دو ہفتوں میں ایک بار خط لکھنے کی اجازت مل گئی، اور خط وصول کرنے کی بھی۔ تین مہینے بعد، ۱۵ جون ۱۹۸۳ء کو، ثائر کو ایک خط ملا جس کے لفافے پر اس کے بھائی کے ہاتھ کی تحریر تھی۔ وہ اس قدر خوش ہوا کہ اچھلنے لگا اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے خط کو کھولے بغیر اپنے سینے سے لگا کر رکھ لیا اور اسے فوری طور پر نہ پڑھنے اور بعد کے لیے محفوظ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ ثائر نے رو رو کر خدا کا شکر ادا کیا کہ اسے کوڑوں کی سزا ملی اور آخر کار اس جگہ بھیج دیا گیا۔ اس کے بھائی نے لکھا تھا کہ وہ ایک بیٹے کا باپ بن گیا ہے۔ خطوں کا سلسلہ قریب قریب سال بھر جاری رہا۔ پھر ثائر کو ایک اور قید خانے بھیج دیا گیا اور خط آنے بند ہو گئے۔

دوسرا سال گزرا، اور پھر تیسرا؛ مختلف قید خانے، ان کے مختلف معمولات؛ دن میں آدھ گھنٹہ ورزش، یا ہفتے میں ایک بار کوٹھری سے باہر نکالا جانا۔ ایک بیرک میں سو قیدی، یا تین سو، یا چالیس؛ نہانے کے لیے گرم پانی، یا ہفتے میں ایک بار ٹھنڈے پانی سے غسل۔ صابن بہت چھوٹا، غائب ہوتا ہوا، نادر؛ سونے کے لیے پتلی چٹائیاں یا لکڑی کے تخت، یا بعض اوقات ننگا فرش۔ چائے — چائے ہمیشہ ملتی تھی — شکر کبھی ہوتی کبھی نہ ہوتی، پتلا شوربہ؛ کالا، سڑا ہوا آدھا ابلا آلو، کبھی آلو غائب، پنیر کے بہت ذرا ذرا سے ٹکڑے، پھر کئی دن تک پنیر کا نام ونشان تک نہیں۔ ہر قیدی کے لیے ماہانہ ساٹھ سگریٹ، اور پھر سات سال تک کوئی سگریٹ نہیں۔ سات سال بعد انھیں ہفتے کے سات سگریٹ دیے گئے تو وہ اس نئی چیز سے اتنے خوش ہوے کہ فوراً سگریٹ نوشی شروع کر دی۔ انھوں نے ایک تار کی مدد سے ہر سگریٹ کو چار ٹکڑوں میں کاٹ لیا اور ہر چوتھائی ٹکڑا دو قیدی مل کر، احتیاط سے راکھ کو سگریٹ سے الگ کرتے ہوے، پینے لگے۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس ایک ایک کمبل تھا۔ انھوں نے کمبل کے دونوں کناروں کو لمبائی میں سی لیا تاکہ سلیپنگ بیگ کا زیادہ آرام دہ بندوبست ہو جائے۔ ثائر دراز قد تھا اس لیے اس کے پاؤں ہمیشہ کمبل سے باہر نکلے رہتے۔ انھوں نے تار کے ٹکڑوں کو پتھروں سے گھس گھس کر، ان کے سروں کو چپٹا کر کے اور ان میں کیل سے سوراخ کر کے اپنی سوئیاں بنالی تھیں۔ وہ چیتھڑوں اور پرانے بنیانوں میں سے دھاگے کھینچ نکالتے اور اپنے مسکے ہوے کپڑوں کو رفو کر لیتے۔ گھریلو کاموں کی

Scanned with CamScanner

جگاڑ بندی میں وہ سب انتہائی ماہر ہو گئے۔

انھوں نے ایک دوسرے کو زبانیں سکھائیں: فارسی، فرانسیسی، جرمن، انگریزی۔ وہ صابن کی بٹیوں پر حروف کھودتے، یا گہرے رنگ کا کپڑا لے کر اس پر صابن رگڑتے جس سے اس کی سطح پر سفید مومی سی تہہ جم جاتی جس پر وہ الفاظ کندہ کرتے۔ وہ کیروسین کی لالٹینوں کی چمنیوں میں جمنے والی کالک کو سر دھونے کے صابن میں ملا کر روشنائی تیار کرتے۔ پہلے انھوں نے سرکنڈے کو اس روشنائی میں ڈبو ڈبو کر لکھنا شروع کیا، لیکن یہ اکتا دینے والا طریقہ تھا۔ آخر انھوں نے انجکشن کی سرنج سے قلم بنا لیا اور اس کی سوئی کو چھیل کر اس سے نب کا کام لینے لگے۔ یہ قلم بالکل ٹھیک چلا۔

بہت سے قیدی بھوک یا خونی پیچش یا ہمت ہار جانے کے باعث ہلاک ہو گئے۔ وہ کہا کرتے کہ یہ بالکل کار کی ٹنکی میں ایندھن کی طرح ہے؛ جب ان میں سے کوئی شخص تھکن سے چور ہو کر مزید زندہ رہنے کے قابل نہیں رہتا تو گویا اس کا ایندھن ختم ہو جاتا ہے۔

بہت بار ثائر کے دوست اس کے بازوؤں میں ختم ہوئے۔ ایک دفعہ ان میں سے ایک سخت بیمار تھا اور کھانے کی کمی تھی۔ انھوں نے نگران کو راضی کر لیا کہ انھیں ورزش کے میدان میں جا کر اس کے لیے چھوٹے پرندوں کا شکار کرنے دے۔ انھوں نے زیر جاموں کی الاسٹک سے غلیل بنانے میں مہارت حاصل کر لی تھی اور چڑیوں کو آسانی سے مار لیتے تھے۔ انھیں دن بھر میں تین چڑیاں مارنے کی اجازت ملی لیکن بیمار قیدی جلد ہی چل بسا اور چڑیوں کے شکار کی رعایت واپس لے لی گئی۔

"یہ ایرانی چڑیاں ہیں،" انھیں بتایا گیا۔ "تم انھیں اتنی تعداد میں نہیں مار سکتے۔"

جب کوئی قیدی مرتا تو ایرانی اس کی لاش کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالتے، اس کی مردہ آنکھوں پر پٹی باندھ دیتے اور پھر اسے لے جاتے، گویا انھیں جتا رہے ہوں کہ موت کا مطلب بھی آزاد ہونا نہیں ہے۔

جنگ اگست ۱۹۸۸ء میں ختم ہوئی۔ بہت سے جنگی قیدیوں کو وطن واپس بھیج دیا گیا تھا لیکن چونکہ عراق نے قیدیوں کو رہا نہیں کیا اس لیے ایران نے بھی نہیں کیا۔ ثائر نے خود کو کئی سو دوسرے وفادار سپاہیوں کے ساتھ پایا۔

انھیں ۱۹۹۰ء میں عراق کے کویت پر حملے کے بارے میں نگرانوں کی آپسی بات چیت سے پتا

چلا۔ ایک اور جنگ! امریکیوں کے خلاف! ثائر اور دوسرے باقی ماندہ قیدیوں نے مایوسی میں سر جھکا لیے اور سمجھ لیا کہ وہ فراموش کیے جا چکے ہیں، گم ہو چکے ہیں۔ بہت کم لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اس جنگ کا نتیجہ عراق کے لیے سازگار ہوگا۔ اب تک ان کی رہائی اور وطن واپسی کے لیے مذاکرات ہوتے رہے تھے، اب یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

ایرانی اب بھی انھیں اپنی حکومت کی مذمت پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ثائر ثابت قدم رہا۔ وہ اپنے ملک سے، اپنے رہنما سے غداری نہیں کرے گا۔ اور کس لیے کرے؟ کہ اسے پیشاب کرنے کا وقفہ مل جائے؟ فاضل خوراک مل جائے، جبکہ اس کے برادر قیدی بھوکے ہوں؟ اپنی روٹی کسی برادر قیدی سے بانٹ کر کھاتے ہوئے، کسی روتے یا قے کرتے ہوئے ساتھی کا سر تھامتے ہوئے، ثائر کو احساس ہوتا کہ اس کی ابتلا کتنی بھی سخت کیوں نہ ہو، کوئی نہ کوئی ضرور اس سے بدتر حال میں ہوتا ہے۔ اس نے انسانیت کے چھوٹے چھوٹے موقعے دریافت کیے، خود کو خوشگوار موڈ میں رکھا، وہ ہنس بھی لیتا تھا۔ حب الوطنی اور بعث نظریے سے وابستگی ایک دوسرے سے پیوست رہیں؛ ایرانی ترغیب انھیں ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکی۔

باتیں ضرور ہوتی تھیں اور، بلاشبہ، بحث و تکرار بھی۔ کچھ لوگ صدام کی طاقت اور کویت کی کمزوری پر اصرار کرتے تھے، جبکہ بعض لوگ اس حملے کو ایک غلطی سمجھتے تھے۔ لیکن قیدی اسی طرح پارٹی کے رکن اور سپاہی رہے جیسے اپنے قید کیے جانے کے سال تھے۔ وہ صدام کی فوج کے افسر تھے اور ان پر اس عہدے اور اس ہستی کی عزت اور خدمت واجب تھی۔ اور خدا اور عزت مآب صدر کی عنایت سے جب وہ لوگ گھر واپس پہنچیں گے تو ان کے ساتھ سورماؤں جیسا سلوک ہوگا، انعامات دیے جائیں گے، ان کی قربانیوں کے صلے میں خطیر پنشن ملے گی، اور گاڑیاں، مکان، عہدے عطا ہوں گے۔ اچھے پارٹی ارکان کی طرح وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر انھوں نے ایرانی قید خانے میں اپنے صدر پر تنقید کی تو ان کی مخبری ضرور ہوگی۔ وہ وطن واپس پہنچنے پر ایک اور قید کی کوٹھری کو اپنا منتظر نہیں پانا چاہتے تھے۔

اس کے بعد زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ قیدیوں کو کاشان، اس قدیم قلعے میں منتقل کر دیا گیا جو ایران کے پاسدارانِ انقلاب کی تربیت کا مقام تھا۔ یہ شکستہ ہوتی ہوئی اینٹوں کا بنا ایک تاریک سیلن زدہ قید خانہ تھا جو آدھا زمین دوز تھا۔ کاشان کے قید خانے میں ہمیشہ ۵۹۸ قیدی رکھے جاتے تھے؛ جب ان

Scanned with CamScanner

میں سے کوئی مر جاتا تو اس کی جگہ لینے کے لیے ایک اور قیدی کو وہاں بھیجا جاتا۔ ثائر کو اس کا سبب کبھی معلوم نہ ہوا؛ ویسے ۵۹۸ اقوام متحدہ کی اس قرارداد کا نمبر تھا جس میں ایران اور عراق کے درمیان جنگ بندی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ شاید ایرانی اس طرح اپنا چھوٹا سا مذاق کرنا چاہتے تھے۔ بہر حال، کاشان کے نگران قیدیوں کی پٹائی کرنے سے کبھی نہ تھکتے تھے۔ وہ بعث نظریے کے عزم کو مٹا دینا، ان کی روح کو شل کر کے محکومیت پر آمادہ کرنا چاہتے تھے۔ پٹائی روز کا معمول تھی، بالکل اسی طرح جیسے کھانا۔ وہ قیدیوں کو رات کے وقت پیٹتے تاکہ ان کی چیخیں دوسرے قیدیوں کو سونے نہ دیں۔ وہ انھیں صدام کو گالیاں دینے پر مجبور کرتے۔ ''مرگ بر امریکہ! مرگ بر صدام!'' یہ کلمات ایران میں سلام کی طرح مروج تھے۔

ایک روز صبح کے وقت ثائر اور اس کے کوٹھری کے ساتھیوں کو — زرد رنگت، خراشوں بھرے جسم، ہمیشہ کی طرح بھوکے — تنگ زینے سے نیچے اتار کر ایک ایسی راہداری میں لے جایا گیا جو اس سے پہلے انھوں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ان ساتوں کو آٹھ فٹ ضرب پانچ فٹ کی ایک کوٹھری میں ٹھونس دیا گیا۔ اس کوٹھری میں کوئی کھڑکی نہ تھی اور گنبد نما چھت اتنی نیچی تھی کہ ثائر کا سر اس سے ٹکرا گیا۔ دیواریں مٹیالی زرد، جھڑتی ہوئی اینٹوں کی بنی تھیں، اور ان میں سے کسی تنگ مقبرے کی دم گھونٹ دینے والی بو اٹھ رہی تھی۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ کوٹھری کے فرش میں لاشیں دفن تھیں۔

گھپ اندھیرا تھا۔ ثائر نے اپنا ہاتھ آنکھوں کے سامنے لا کر دیکھا تب بھی اسے سجھائی نہ دیا۔ چند گھنٹوں میں ان پر غشی طاری ہونے لگی اور انھیں احساس ہوا کہ کوٹھری میں آکسیجن ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ان میں سے ایک کے پاس ماچس تھی۔ انھوں نے ماچس جلا کر ہوا کا کوئی رخنہ ڈھونڈنے کا فیصلہ کیا، لیکن کوٹھری میں آکسیجن اس قدر کم تھی کہ ماچس جل نہ پائی۔ وہ مجبور ہو کر دروازہ پیٹنے لگے، لیکن کسی نے نہ سنا، نہ کوئی وہاں آیا۔ اس وقت جب وہ سب گر پڑے تھے، اتفاق سے ایک نگران ان کا جائزہ لینے وہاں آ نکلا اور اس نے ان سب کو بے ہوش پایا۔ اس نے چلا کر دوسرے نگرانوں کو بلایا؛ انھیں باہر نکالا گیا اور آکسیجن دی گئی۔ ساتھ کی کوٹھریوں کے قیدی مر چکے تھے۔ ثائر کے دو ساتھی دل کے دورے اور کاربن مونو آکسائیڈ کے زہر کا شکار ہو گئے؛ ان کے جسموں میں سے سڑتی ہوئی گیس کی سڑاند اٹھ رہی تھی۔ ایک قیدی مکمل طور پر مفلوج ہو گیا: وہ سانس لینے کے سوا کسی کام کے قابل نہ رہا۔

ایرانیوں نے چمنی کو توڑ کر ہوا کے گزرنے کی جگہ بنائی اور ان میں سے چار کو واپس اس کوٹھری میں ڈال دیا۔ انھیں بہت لمبے عرصے تک وہاں پڑا رہنے دیا گیا۔

انھوں نے وہ سوئی نکالی جس سے وہ اپنے کپڑوں کی مرمت کیا کرتے تھے اور اس کا سوراخ والا حصہ توڑ دیا۔ اس کے سرے پر ایک لکڑی کا ٹکڑا لگا کر انھوں نے اسے برمے کی طرح گھمانے کی کوشش کی۔ انھیں دروازے میں ایک ننھا سا سوراخ کرنے میں ایک ہفتے کا وقت لگا جس میں سے وہ باہر راہداری میں جھانک سکتے تھے۔ جس وقت وہ اس سوراخ میں سے جھانک نہ رہے ہوتے، اسے صابن سے بند کر دیتے اور اس پر مٹی مل دیتے تاکہ سوراخ دکھائی نہ دے۔

ایک دن جب وہ اپنی رہائی کے لیے ہونے والے مذاکرات کی افواہیں دہرا دہرا کر تھک چکے تھے، ثائر نے تجویز پیش کی کہ ان میں سے ہر شخص ایک قصہ گھڑ کر اور اسے مبالغے سے بڑھا کر سنائے۔

اناد اٹھ بیٹھا۔ اس کے والدین دیہی زمیندار تھے اور اس نے فلم سازی کی تربیت حاصل کی تھی۔

"میری ماں کے پاس ایک مرغا ہے،" اس نے شروع کیا۔ اس کی ماں نے مرغے کو خاص طور پر سدھا رکھا تھا۔ وہ کھیت سے نکل کر کھجوروں کے باغ میں جاتی جہاں سے اسے جلانے کی لکڑی کاٹ کر لانی ہوتی تھی۔ لیکن وہ بوڑھی تھی، اور گھر تک کا فاصلہ خاصا زیادہ تھا، اس لیے لکڑیاں کاٹنے کے بعد وہ اسے مرغے کی پیٹھ پر رکھ دیتی اور وہ انھیں اس کے گھر تک پہنچاتا۔

وہ اس قصے پر کئی دن تک ہنستے رہے۔ وہ صبح اٹھتے تو ایک دوسرے سے پوچھتے، "ام اناد کا مرغا کیسا ہے؟" یہ ان کا صبح کے وقت کا مستقل مذاق بن گیا۔

مجید قوط میں پولیس کا سپاہی رہ چکا تھا اور اس نے ایک کھجور کے پیڑ کا قصہ سنایا۔

"ایک دن ہم نے کھجور کا پودا لگایا۔" کھجور کا پودا بہت چھوٹا تھا، لیکن جب مجید نے اسے خریدا تو اسے بتایا گیا کہ اس میں کچھ غیر معمولی خصوصیات ہیں۔ اس لیے وہ اسے خرید کر گھر لایا اور صحن میں لگا دیا۔ وہ مشکل سے اس کی ٹانگوں تک پہنچتا تھا، لیکن اس پر فوراً موٹی، زرد کھجوروں کے گچھے لٹکنے لگے۔ اس کا دو سالہ بیٹا احمد کھجور کے اس چھوٹے سے پیڑ کے نیچے کھڑا ہو کر آسانی سے کھجوریں توڑ توڑ کر کھایا کرتا۔

خالد نے، جو بغداد کا رہنے والا ایک فائٹر پائلٹ تھا، انھیں بتایا کہ کس طرح ایک روز وہ شکار کے لیے نکلا اور اسے آسمان میں ایک پرندہ دکھائی دیا۔ جب وہ پرندہ قریب آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ عقاب

تھا۔ عقاب بھیڑوں کے ایک گلے پر بہت نیچے منڈلا رہا تھا اور پھر گڈریے کی آنکھوں کے عین سامنے ان میں سے ایک بھیڑ کو اپنے پنجوں میں اٹھا کر لے اڑا۔ پہلے وہ بہت اوپر پرواز کرتا رہا، پھر کچھ نیچے آیا، اور پھر اڑتے ہوئے خالد کے پاس پہنچ کر بھیڑ کو اس کے قدموں میں ڈال دیا۔ اس تحفے کو پا کر خالد نے بھیڑ کو ذبح کیا اور مزے سے اس کا گوشت کھایا۔

خالد کی کہانی پر ثارؔ اتنی زور سے ہنسا کہ اس کا گلا بھر آیا اور وہ چلاّ کر بولا: ”بس بس! اب ہم اور نہیں ہنس سکتے۔ آکسیجن ختم ہو جائے گی۔“

جب باتیں ختم ہو جاتیں تو چاروں قیدی چیونٹیوں سے کھیلنے میں اپنا وقت گزارتے۔ ہر ایک کے پاس چیونٹیوں کا اپنا محلّہ تھا جسے وہ اپنا یونٹ کہتا تھا۔ چیونٹیوں کے یہ یونٹ دیوار کی مختلف دراڑوں میں رہتے تھے۔ کچھ عرصے بعد ان کے لیے ممکن ہو گیا کہ وہ یونٹ کی مختلف چیونٹیوں کو الگ الگ پہچان سکیں اور انھوں نے ان کے نام ان لڑکیوں کے ناموں پر رکھ دیے جن سے انھوں نے کبھی محبت کی تھی۔ وہ مکھیوں کو شکار کرتے اور انھیں نزع کے عالم میں فرش پر تڑپتا چھوڑ دیتے، اور پھر دیکھتے کہ کس طرح ایک چیونٹی، اسکاؤٹ، دراڑ میں سے باہر آتی۔ وہ زخمی مکھی یا روٹی کے ذرے کے اردگرد چکر لگاتی اور جائزہ لے کر دراڑ کے آدھے راستے میں کھڑی ایک اور چیونٹی کے پاس پہنچتی۔ اسکاؤٹ چیونٹی اور آدھے راستے والی چیونٹی ایک دوسرے سے ناک سے ناک ملا کر کھڑی ہوتیں جیسے اس بارے میں گفتگو کر رہی ہوں، اور پھر آدھے راستے والی چیونٹی مڑ کر محلے میں واپس چلی جاتی۔ چند سیکنڈ بعد چیونٹیوں کا ایک جلوس، بالکل کسی فوج کی طرح، مارچ کرتا ہوا برآمد ہوتا اور غذا کے اردگرد جمع ہو جاتا۔

مختلف چیونٹیوں کے اپنے اپنے کام تھے: کچھ غذا کو کاٹتیں، کچھ اسے کھینچتیں اور کچھ گھسیٹ کر لے جاتیں۔ بعض اوقات قیدی چیونٹیوں کو تنگ کرنے کے لیے مکھی یا روٹی کا ذرہ اس وقت ہٹا لیتے جب اسکاؤٹ چیونٹی اس کا جائزہ لے چکی ہوتی اور جلوس ابھی برآمد نہ ہوا ہوتا۔ تب جلوس میں شامل چیونٹیاں، یہ دیکھ کر کہ وہاں کھانے کو کچھ نہیں ہے، پیغام رساں اسکاؤٹ چیونٹی پر ہلاّ بول دیتیں۔ وہ اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے وہیں پڑا چھوڑ جاتیں۔

اگر مکھی نیم جان حالت میں ہوتی تو اس کے اور چیونٹیوں کے درمیان زبردست لڑائی ہوتی۔ چیونٹیاں اس کے جسم پر رینگتیں۔ مکھی اپنے دفاع میں اتنا ہی کر سکتی تھی کہ اڑنے کی کوشش کرے، لیکن

Scanned with CamScanner

چیونٹیوں نے اسے جکڑ کر فرش سے چپکا رکھا ہوتا۔ وہ جانتی تھیں کہ اسے گردن کے پاس کاٹنا کارآمد ہوگا۔ چیونٹیاں بہت چھوٹی تھیں لیکن ان میں ایک ذہین تنظیم کی پوری قوت موجود تھی۔

جب چیونٹیاں قیدیوں کو تنگ کرنے لگتیں تو وہ دیوار کی دراڑیں بند کر کے انھیں باہر آنے سے روک دیتے۔ لیکن جب وہ اکتائے ہوئے ہوتے اور انھیں چیونٹیاں یاد آنے لگتیں تو وہ چند چیونٹیوں کو کسی نئی دراڑ کے پاس لے جا کر چھوڑ دیتے، انھیں تھوڑی سی خوراک دیتے تاکہ وہ اپنا کام شروع کریں اور ایک نیا محلہ بسائیں۔ جب کسی ایک محلے کی چیونٹی کو دوسرے محلے کی چیونٹیوں کے درمیان رکھا جاتا تو وہ اس کا خیر مقدم نہ کرتیں؛ اجنبی چیونٹی مڑ کر وہاں سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگتی۔ اس لیے جب ثائر اور اس کے ساتھیوں کو کوئی ایسی چیونٹی دکھائی دیتی جو اپنے قبیلے سے بچھڑ گئی ہو تو وہ اسے ایک نئی جگہ دیتے، کچھ خوراک فراہم کرتے اور پھر دوسری چیونٹیوں کو ان سے آکر ملتے اور ایک نئی بستی بساتے دیکھا کرتے۔ انھیں اندر کھدائی کر کر کے مٹی کے باریک ذرے اٹھا کر باہر لاتے ہوئے دیکھا جا سکتا تھا۔

فائٹر پائلٹ خالد پاگل تھا۔ وہ بھیانک خوابوں سے ڈر کر جاگ اٹھتا اور اتنی زور زور سے چیختا کہ نگرانوں کو اندر آکر اسے جھنجھوڑنا پڑتا۔ وہ نگرانوں سے ہاتھا پائی کرتا اور خمینی کو گالیاں دیتا؛ اسے کچھ پروانہ ہوتی کہ اس کے منھ سے کیا نکل رہا ہے۔ اس کی زبان گالیوں میں رواں تھی اور اسے بغداد کی تمام روایتی گالیاں یاد تھیں۔ بے پناہ تشدد سے اس کا دماغ چل گیا تھا اور نگران اس کے چیخنے چلانے کے دوران بھی اس کی پٹائی کیا کرتے۔ جب وہ اسے پیٹتے پیٹتے تھک جاتے تو اسے سکون آور دوا کا انجکشن لگایا جاتا اور وہ غنودگی یا نیند میں چلا جاتا۔

لیکن جب خالد کا دماغ ٹھکانے پر ہوتا تو اس کی صحبت بڑی پُرلطف ہوتی۔ وہ پاکستان کا سفر کر چکا تھا، روانی سے انگریزی بولتا تھا اور تعلیم یافتہ شخص تھا۔ اس کا باپ شراب کی لت کا شکار ہو کر مرا تھا اور خالد نے صدام کے دیے ہوئے انعامات — زمین، دولت اور گاڑیوں — کی مدد سے اپنی خاندان کی پرورش کی تھی؛ فائٹر پائلٹوں کی عراق میں بڑی قدر کی جاتی تھی۔ غمناک لمحوں میں خالد خود کو یاد دلاتا کہ کم از کم اس کے کنبے کے پاس رہنے کو مکان ہے، اس کے گھر والے ٹھیک ٹھاک رہیں گے۔ خواہ اسے قید میں مصیبتیں جھیلنی پڑیں، لیکن انھیں عراق میں اعلیٰ مقام حاصل رہے گا، کیونکہ وہ یہاں بے جگری سے تمام اذیتوں کا سامنا کر رہا ہے۔

Scanned with CamScanner

لیکن پھر وہ اچانک بولنا بند کر دیتا اور خاموش ہو کر دیر تک دیوار کو گھورتا رہتا، اور وہ جان جاتے کہ اس پر دورہ پڑنے والا ہے۔ وہ سخت طیش میں آ جاتا اور طرح طرح کے وہم اسے گھیر لیتے۔ وہ بڑبڑا کر اپنے طیارے کی باتیں کرنے لگتا اور خیالی لیور، ڈائل، بٹن اور آلات پر ہاتھ مارنے لگتا؛ اس کے بازو یوں حرکت کرنے لگتے جیسے وہ خود طیارہ ہو اور اڑنے میں مصروف ہو۔ بعض اوقات وہ خیالی ٹیلیفونوں کے ریسیور اٹھاتا اور بغداد میں اپنی ماں سے فون پر بات کرنے لگتا؛ صدام سے اس کی لمبی گفتگوئیں ہوتیں، ''جی ہاں، جناب صدر، میں یہاں ثائر اور اناداور مجید کے ساتھ ہوں۔ ہم سب یہاں موجود ہیں اور آپ کے وفادار ہیں، جناب صدر!''

کاشان میں تین برس زمین کی سطح کے نیچے گزارنے کے بعد ثائر اور دوسرے قیدیوں کو ڈارمیٹریوں میں واپس جانے کی اجازت ملی۔ ۲۴ اگست ۲۰۰۰ء کو انھیں ایک اور قید خانے میں منتقل کیا گیا۔ ثائر کو اس منتقلی سے خوشی ہوئی۔ اسے معلوم تھا یہ وہی قید خانہ ہے جہاں سے قیدیوں کو رہا کیا گیا ہے؛ ان کا سفر پیچھے کی طرف نہیں، آگے کی طرف ہے۔

یہاں راشن بھی بہتر تھا: انھیں مرغی کا گوشت، ڈبوں میں بند سارڈین، چاول اور شوربہ دیا جاتا۔ وہ اپنی چائے خود بنا سکتے تھے اور شکر کافی مقدار میں مہیا تھی۔ انھیں کچھ اترن کے کپڑے بھی دیے گئے۔ وہ جب چاہتے کھلی ہوا میں جا سکتے اور اسفالٹ کی ٹوٹی ہوئی سڑک پر نشان لگا کر بنائے ہوئے کورٹ میں والی بال کھیل سکتے تھے۔ اور سب سے زیادہ غیر معمولی بات یہ تھی کہ اٹھارہ برس باہر کی دنیا سے کٹے رہنے کے بعد، وہ ٹیلی وژن دیکھ سکتے تھے۔

یہ ایک بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی تھا، جس کا ریسپشن اچھا نہیں تھا اور تصویر دھندلی ہوتی اور اکثر اسکرین پر کالی پٹیوں کے درمیان اٹک جاتی تھی۔ اس پر صرف ایرانی چینل دکھائے جاتے تھے، لیکن زیادہ تر قیدی اس وقت تک فارسی سیکھ چکے تھے اور وہ مل کر ٹی وی دیکھتے اور حیران ہوتے تھے۔ کئی ہفتے انھوں نے صرف ٹی وی دیکھ کر گزارے۔

سوویت یونین ختم ہو چکا تھا! عظیم اور طاقتور سوویت یونین اب بہت سے ملکوں میں بٹ چکا تھا، جارجیا اور آذربائیجان اور ازبکستان، اور ان میں سے بعض ملک مسلم تھے! یوگوسلاویا ٹکڑے ٹکڑے

ہو چکا تھا! وہاں مسلمانوں اور سربوں میں جنگ چھڑ گئی تھی۔ عرفات فلسطین پہنچ چکا تھا! جب انھیں آخری خبر ملی تھی تب تک وہ تیونس میں جلاوطنی کے دن گزار رہا تھا۔ ایسے ٹیلیفون ایجاد ہو چکے تھے جنھیں ٹرانزسٹر ریڈیو کی طرح کہیں بھی استعمال کیا جا سکتا تھا، ایسی کاریں بن گئی تھیں جو خم دار اور چھوٹے سائز کی تھیں، دل کی منتقلی کے آپریشن ہونے لگے تھے، کوئی انٹرنیٹ نام کی چیز ایجاد ہو گئی تھی جو کسی طرح ٹیلیفون کی لائنوں کے راستے کام کرتی تھی۔ انھوں نے امریکی اسٹیلتھ بمبار طیاروں کی تصویریں دیکھیں، وہ چمگادڑ کے پر کی طرح نفیس تھے اور انھیں دیکھ کر یقین نہ آتا تھا۔

پہلا عراقی جس کی شکل انھیں ٹی وی پر دکھائی دی وہ طہٰ یٰسین رمضان تھا، ایک حکومتی وزیر جو کسی بیرون ملک کے دورے پر تھا۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے کے آخر میں جب انھوں نے اسے دیکھا تھا تب وہ خاصا فربہ تھا؛ اب وہ دبلا، جھریاں پڑا دکھائی دیتا تھا اور عمر چھپانے کے لیے اس نے اپنے بال بالکل سیاہ رنگ رکھے تھے۔ قیدیوں کے درمیان اس بات پر گرما گرم بحث چھڑ گئی کہ یہ سچ مچ رمضان ہے یا نہیں؛ ہاں ہاں، وہی ہے، نہیں وہ نہیں ہو سکتا، یہ جعلی کلپ ہے، یہ ایرانیوں کا بنایا ہوا ہے، تمام ایرانی جھوٹے ہوتے ہیں۔ لیکن وہی وزیر بعد کے بلیٹنوں میں پھر نظر آیا اور انھوں نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ یہ وہی ہے۔ آخر کار انھوں نے صدام کو دیکھا: صدام تک بوڑھا ہو چکا تھا!

اسکرین پر ایک پوری دنیا جھلملا رہی تھی۔ وہ اس دنیا کی اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے؛ اور ثائر کو احساس ہوا کہ اس نے اب تک اس بات کو نوٹ نہیں کیا تھا کہ وہ بھی معمر ہو گیا ہے۔ اب جب وہ شیو کرنے کے لیے آئینہ دیکھتا تو اسے اپنے سر میں سفید بال دکھائی دیتے؛ سفید بالوں کی لٹیں اس کے کالے بالوں میں سے جھانک رہی ہوتیں۔ اس کے دوستوں کے حلق پر جھریاں پڑ گئی تھیں اور آنکھوں کے نیچے کی کھال لٹک گئی تھی، سر گنجے ہو گئے تھے اور دانت بیچ بیچ میں سے ٹوٹ گئے تھے۔ عراق کے مناظر دیکھ کر لگتا تھا یہ کوئی اور ملک ہے۔ گندم لے جاتی ہوئی گھوڑا گاڑیاں، گدھے، آبپاشی کی نہروں میں تیرتے ہوئے ننگے بچے، ملبے کا ڈھیر بنا بغداد، ٹوٹے ہوئے گٹر۔ ایرانی نیوز کا کیمرا شکست کے ان مناظر کو دیر تک دکھایا کرتا۔ نیوز ریڈر (تنگ اسکارف اور لپ اسٹک سے عاری چہرے والی عورت، لیکن تقریباً بیس برس میں انھیں دکھائی دینے والی پہلی عورت) مردہ پیدا ہونے والے بچوں، ٹی بی کے مریضوں اور موت کی شرح کے اعداد و شمار بیان کیا کرتی۔ قیدی ٹی وی کو تکتے رہتے اور انھیں اپنے دیکھے

پر یقین نہ آتا، وہ اس پر یقین نہیں کرنا چاہتے تھے، اور یہی کہتے کہ یہ سب ایرانی پروپیگنڈا ہے۔ یہ سچ نہیں ہو سکتا۔

ایک شام ایرانی ٹی وی پر "پاپیوں" (Papillon) نامی فلم دکھائی گئی جس میں اسٹیو میکوئن نے ایک ایسے شخص کا کردار ادا کیا ہے جسے گیانا کی ایک فرانسیسی پینل کالونی میں عمر قید گزارنے کی سزا دی گئی ہے۔ یہ منطقۂ حارہ کی اس ابتلا کے خلاف امید اور آزادی کی جنگ کی داستان ہے — پاپیوں تین بار فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے — اور قیدیوں میں سے ہر ایک کو، اسے اپنی زندگی سے ملا کر دیکھتے ہوئے، ایسا محسوس ہوا کہ فرنچ گیانا کی پینل کالونی اتنی بری جگہ نہ تھی، بلکہ درحقیقت خاصا رنگین مقام معلوم ہوتی تھی۔ انھوں نے اپنی قید کے دوران صرف خاک اور خاک کا رنگ دیکھا تھا، اور لکڑی اور کیلیں اور کنکریٹ۔ فلم کے انجام نے، جب اسٹیو میکوئن اور اس کا قیدی دوست ڈسٹن ہوفمین ڈیولز آئی لینڈ میں قید کر دیے جاتے ہیں، قیدیوں کو کچھ متاثر نہ کیا۔ جلاوطنی! اکا میچ! کھانے کے لیے مچھلیاں! باغیچے، دھوپ اور ہوا! — عراقی جنگی قیدی اپنی داڑھیاں کھجاتے ہوئے ڈیولز آئی لینڈ کو دیکھتے رہے اور تمنا کرتے رہے کہ وہ ایسی کسی جگہ رہ سکتے!

وہ اسٹیو میکوئن کو ہوا اور لہروں کو جانچتے اور چٹان کی کگر سے ناریلوں کی بوری پر سوار ہو کر سمندر میں اپنے آخری فرار پر نکلتے دیکھتے رہے۔ لیکن ایرانیوں نے سفاکانہ طور پر فلم کے آخری، ڈب کیے ہوئے مکالمے کو کاٹ دیا تھا، جو فلم کا اختتامیہ ہے: "پاپیوں آخرکار آزادی سے ہم کنار ہوا... اور اس کی زندگی کے باقی ماندہ سال آزاد انسان کے طور پر بسر ہوئے۔" چنانچہ انھیں پتا نہ چلا کہ اسے آزادی حاصل ہوئی تھی۔ شکستہ دل قیدی روتے اور ناامید ہوتے رہے، اور پاپیوں کے حوصلے، اس کو حاصل ہونے والے موقعوں، اس کے بنائے ہوئے منصوبوں کی باتیں کرتے رہے۔ "اسے ایسا کرنا چاہیے تھا..." "کاش اسے یہ بات معلوم ہو گئی ہوتی..."

۲۱ جنوری ۲۰۰۲ء کو کئی سو قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ ثائر ان میں شامل نہ تھا۔ یہ انتہائی دشوار موقع تھا: اس کے چاروں قریبی دوست اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ اس نے سرحد پر ان کی اپنے خاندانوں سے ملاقات کا منظر ٹی وی پر دیکھا، ٹی وی کیمرے، برسوں بعد ملاپ، تقریریں۔ جو لوگ قید خانے میں رہ گئے تھے انھیں بتایا گیا تھا: دس دن اور، پھر ان کو بھی گھر بھیج دیا جائے گا۔ مگر وہ کھڑکیوں سے جھانک

Scanned with CamScanner

جھانک کر بسوں کو ڈھونڈتے رہے، نگرانوں سے پوچھتے رہے کہ آیا انھیں کچھ معلوم ہے، لیکن نگرانوں نے کچھ نہیں بتایا۔ ان پر افسردگی چھا گئی؛ ثائر اب ٹی وی بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ انھیں کیوں پیچھے چھوڑ دیا گیا؟ دوسروں کو رہائی کے لیے کیوں چنا گیا؟

اسے رہا نہیں کیا گیا۔ ایک سال اور گزر گیا۔ عراق پر امریکی حملے کے منڈلاتے ہوئے خطرے کی خبریں بڑھتی گئیں، امریکیوں نے اپنی فوجیں ایک بار پھر کویت میں جمع کرنی شروع کر دی تھیں۔ مارچ ۲۰۰۳ء میں ایرانی ٹیلی وژن خبریں دے رہا تھا کہ عراقی لڑائی کے لیے تیار ہیں۔ ثائر کو اس پر یقین نہ تھا۔ اس نے دیکھا کہ عراق امریکہ کے ہر مطالبے کے سامنے ہتھیار ڈالتا چلا گیا تھا۔ اس نے خواب میں اپنے باپ کو دیکھا اور اسے اچھا شگون خیال کیا؛ شاید رہائی، جس کے قریب ہونے کی افواہیں پھیل رہی تھیں، سچ مچ آ جائے۔

۱۷ مارچ ۲۰۰۳ء ــــ امریکی حملے سے تین دن پہلے ــــ ثائر اور اس کے ساتھی جنگی قیدیوں کو رہا کر کے ایران سے عراق واپس بھیج دیا گیا۔ وہ تقریباً اکیس برس قید میں رہا۔

یہ وہ دن تھے جب سب کچھ رک گیا تھا اور ہر شخص کی نظریں ٹی وی پر جمی ہوئی تھیں۔ بلیئر اپنی بات پر اڑا ہوا تھا، بش نے الٹی میٹم دے دیا تھا، کولن پاول ثابت قدم تھا، اور عراقی وزیر اطلاعات ان سب کی مذمت کر رہا تھا۔ ایک ایک دن رک رک کر بیت رہا تھا: اقوام متحدہ، فرانس کا انکار، محمد البرادئی، ہانس بلکس؛ بش، بلیئر اور ازنار کیپ ویرڈ کے جزیرے میں، پریس کانفرنسیں، مائیکروفون اور پرچم۔ میں عراق کے شمالی حصے میں تھی، کردستان میں، جہاں کرد اپنا سامان ٹریکٹروں اور ٹیکسیوں میں لاد کر پہاڑوں کا رخ کر رہے تھے یا اپنے مکانوں کو گیس کے حملے سے محفوظ رکھنے کے لیے چادروں سے ڈھانک رہے تھے۔ قیدیوں کی واپسی کا واقعہ، اس وسیع تر بکھرے ہوئے لمحے میں کہیں کھو گیا، لیکن عراقی ذرائع ابلاغ کے لیے یہ خبر قابل ذکر تھی، اسی طرح جیسے اس سے پہلے کے قیدیوں کی واپسی، ایک عمدہ، حب الوطنی سے بھرپور، اسٹیج کیا ہوا واقعہ، چنانچہ کیمروں کو قیدیوں کا استقبال کرنے سرحد پر بھیجا گیا۔

عراقیوں نے رہا ہونے والے قیدیوں کے نام ٹیلی وژن پر نشر کر دیے تھے۔ ان کے خاندان والے سرحد پر پہنچے، اور ان کے ساتھ ان ہزاروں گمشدہ قیدیوں کے گھر والے بھی جن کے نام نشر نہیں

کیے گئے تھے۔ ثائر سرحد پار کرنے والے پہلے گروپ میں شامل تھا، اور آتے ہی اسے لوگوں نے گھیر لیا اور اس سے اپنے عزیزوں کے نام لینے اور اسے ان کی تصویریں دکھانے لگے۔ ان میں سے کچھ ایسے تھے جن کو ثائر یہ کہہ کر تسلی دے سکتا تھا کہ فکر مت کیجیے، یہ شخص اگلی بس میں سوار ہے، لیکن بہت سے ایسے تھے جن سے وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کے منھ کے سامنے ایک مائیکروفون لایا گیا اور آنے والے امریکی حملے کے بارے میں اس کی رائے پوچھی گئی۔

ثائر کو عراقی سرزمین پر قدم رکھے ابھی صرف چند لمحے ہوے تھے، وہ حب الوطنی سے بھرا ہوا تھا۔ وہ گنجان ہجوم میں اپنے بھائی کو تلاش کرنے لگا (یقیناً اس کا بھائی اسے لینے آیا ہوگا، شاید اس کے بھتیجے کو ساتھ لے کر جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا)۔ ثائر مسکرایا، اس نے اپنے بھائی کو دیکھ لیا تھا — اس کا خیال تھا کہ یہ وہی ہے — اس نے اسے سلام کرنے کے لیے ہوا میں ہاتھ بلند کیا۔ ''ہم سب اپنے ملک کی خاطر دوبارہ لڑنے اور جان دینے کو تیار ہیں!''

ثائر زور لگا کر مائیکروفونوں کے پاس سے آگے نکلا، اپنے بھائی کے پاس پہنچا اور وہ بغلگیر ہوے، جلدی جلدی کہے ہوے چند الفاظ اور آنسو۔ ہجوم نے ان رہا ہونے والے قیدیوں کے استقبال میں گرم جوش آوازیں بلند کی تھیں، لیکن ثائر نے محسوس کیا کہ ان کے خیر مقدم کے لیے آنے والے جنرل کے انداز میں کچھ خاص گرمی نہیں تھی۔ ان کے لیے ہار یا مصافحے نہیں تھے، ٹینک یا توپوں کی سلامیاں نہیں تھیں، پریڈ یا گارڈ آف آنر نہیں تھا۔ جنرل نے ان کی گنتی کی، ثائر کے خیال میں مویشیوں کی طرح، اور منھ سے کچھ نہ کہا۔

سابق جنگی قیدیوں کو جلاولا کے آرمی بیس میں پہنچایا گیا جہاں انھیں گھر بھیجے جانے کی کارروائی ہونی تھی۔ فارم پُر کیے گئے: نام، خاندان، عہدہ، یونٹ، قید ہونے کی تاریخ، صحت کی کیفیت۔ ثائر نے اپنے اردگرد نظر ڈالی۔ یہ ایک وسیع کمرہ تھا، گردوغبار اور غلاظت سے اٹا ہوا۔ وہاں ٹوٹی کرسیوں کے سوا کوئی فرنیچر نہ تھا؛ ملٹری انٹیلی جنس کے ایجنٹ دیواروں کے پاس کھڑے تھے۔ سابق جنگی قیدیوں کو، جو اب یونیفارم میں تھے، تقریباً سرگوشیوں میں بتایا گیا کہ اب وقت بدل چکا ہے اور انھیں چیزوں کو اس حال میں دیکھنے کی توقع نہیں کرنی چاہیے جیسی وہ انھیں یاد ہیں۔ انھیں پہننے کے لیے نئی وردیاں دی گئی تھیں لیکن ثائر کا قد لمبا تھا اور کوئی پتلون اس کے ناپ کی نہ تھی۔ رہا ہونے والے کچھ قیدیوں نے

کھڑے ہو کر ٹی وی کے کیمروں کے سامنے حب الوطنی سے بھرپور تقریریں کیں اور صدام کی مدح میں نظمیں پڑھیں۔ ثائر اپنے قید خانے کے کپڑے پہنے، ایک ہاتھ میں اپنے کاغذات اور دوسرے ہاتھ میں وہ جانماز اور قرآن تھامے کھڑا رہا جو ایرانیوں کی طرف سے ان کو دیا جانے والا الوداعی تحفہ تھا۔ اسے آزادی میں کوئی خوشی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس خوشی کا گلا اس کمرے کی غلاظت اور ٹوٹی ہوئی کرسیوں کے منظر نے گھونٹ ڈالا تھا: کیا یہ لوگ اسی سلوک کے قابل تھے؟ چند سپاہی ثائر کے پاس آئے اور اس سے جانماز یا قرآن میں سے ایک چیز ان کے حوالے کرنے کو کہا۔

''یہ ایرانی چیزیں؟ کیوں؟'' ثائر کو اب یہ احساس ہوا کہ وہ ان چیزوں کو اب تک تھامے ہوئے ہے۔ اس نے ان سپاہیوں کے بوٹوں کے پھٹے ہوئے چمڑے کو دیکھا؛ ان کے پاس ڈھنگ کے فوجی بوٹ تک نہ تھے۔ اس نے دیکھا کہ فوج بھوکی ہے، اور سوچا کہ اگر فوج بھوکی ہے تو پھر... اسے اچانک یہ بھی احساس ہوا کہ ان لوگوں کو ٹوٹی کرسیوں والے اس کمرے میں آئے کئی گھنٹے ہو چکے ہیں اور ان کو اب تک کھانے پینے کو نہیں پوچھا گیا، چائے تک پیش نہیں کی گئی۔

اس کا بھائی اسے گاڑی میں سامرہ لایا؛ اس کے دو بھتیجے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ثائر نے ہر وہ سوال پوچھا جو اس کے ذہن میں آ سکتا تھا۔ سب لوگ کیسے ہیں؟ اس کا روزگار کیسا ہے؟ وہ کیا کام کرتا ہے؟ حالات کیسے ہیں؟ اس کے بھائی نے کچھ سوالوں کا جواب دیا — وہ لوگ ایک دوسرے مکان میں منتقل ہو گئے، خاندان کے افراد بڑھ گئے تھے اور پھر اس کا باپ اس مکان میں نہیں رہنا چاہتا تھا جہاں ثائر ان سے جدا ہوا تھا، لوگ ٹھیک ہیں، دوستوں کی شادیاں ہو گئیں، بچے، عم زاد، بھتیجیاں۔

ثائر نے گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سڑکوں کے کناروں کی بجری بکھر رہی تھی، جگہ جگہ چیک پوسٹیں تھیں۔ وہ اُتھلی خندقوں میں کھڑے، پتلے ہیلمٹ پہنے سپاہیوں کے پاس سے گزرے۔ کاریں زیادہ نہیں دکھائی دیں؛ سڑک کے کنارے بنے ہوئے مکان خستہ حال نظر آئے۔

''اور ہمارا ملک؟ ہمارا ملک کیسا ہے؟''

اس کے بھائی نے ذرا توقف کیا۔

''اب اس بات کو چھوڑو... تم ہم سے اتنے عرصے تک جدا رہے، اس وقت اپنے ملک کی بات

نہ کریں تو بہتر ہے۔"

مکان شہر کے ایسے علاقے میں تھا جو ثائر کو مضافات کی غیر آباد زمین کے طور پر یاد تھا۔ ثائر وہاں کی کسی چیز کو نہ پہچان سکا؛ گلیاں سامرہ کی مانوس گلیوں جیسی دکھائی دیتی تھیں، لیکن ہر چیز غلط سمت میں چل رہی تھی۔ اس کا مکان اس کا نہیں تھا، اور وہاں سیکڑوں ایسے لوگ جمع تھے جن کو وہ نہیں پہچانتا تھا: چچے تائے، عم زاد اور بچے، بیسیوں کی تعداد میں اسے عقیدت سے دیکھتے ہوئے؛ ہر شخص مسکرا کر اس کی پیٹھ تھپتھپا رہا تھا اور اپنی خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ عورتیں گھر کے اندر کسی الگ جگہ تھیں۔ وہ اپنی ماں کے پاس پہنچا، اس کے سامنے گر پڑا، اسے قدموں سے لے کر پیشانی تک چوما۔ وہ اسے بہت بوڑھی اور تھکی ہوئی دکھائی دی؛ وہ اس کی گود میں سر رکھ کر رونے لگا۔

"ابا کہاں ہیں؟" اس نے پوچھا، اور اسے بتایا گیا کہ اس کا باپ مر چکا ہے۔

اس نے صدام کی شبیہہ والے چکنے پندرہ لاکھ دیناروں میں سے، جو اسے حکومت کی طرف سے دیے گئے تھے، ایک حصہ دو بھیڑیں خرید کر مہمانوں کی ضیافت کرنے میں خرچ کیا۔ وہ خود کو لکھ پتی کے روپ میں متصور نہیں کر سکتا تھا، پیسہ عجیب تھا اور لوگوں کی باتیں عجیب تھیں، سب کچھ دھندلا دھندلا تھا۔ امریکی آنے کو تھے، ہر شخص صدام کو کوس رہا تھا۔ اس پر ثائر نے لوگوں کو شرم دلائی اور انھوں نے جواباً وحشت اور اداسی سے اس کی طرف دیکھا۔

"تمھیں معلوم نہیں کہ یہاں کیا کچھ ہوتا رہا ہے۔ ہر چیز بدل چکی ہے، اور خدا جانتا ہے کہ اگر امریکی آئے تو میں انھیں اپنے ہاتھ سے ہلاک کروں گا۔ لیکن اگر میرے بس میں ہوتا تو اُس حرام زادے کو بھی ٹھکانے لگا دیتا۔"

ثائر کو اس قسم کی گفتگو سن کر دھکا لگا۔ اس نے پیسے کی بے قدری، مہنگائی، کرپشن، دم بدم بڑھتا ہوا خوف، باہر جانے کے ویزا حاصل کرنے کے لیے لگی ہوئی لمبی قطاریں، کچھ نہیں دیکھا تھا۔ ایک شخص جو جنگی قیدی رہ چکا تھا اور اب پھر فوج میں تھا، بولا، "ہر چیز بدتر ہو چکی ہے۔ میری صاف ستھری یونیفارم بھی ایک دھوکا ہے۔ اصل میں ہم لوگ بڑی اذیت اٹھا رہے ہیں۔"

دوسرے لوگوں نے کہا، "ہم جانتے ہیں کہ تم نے بہت مصیبتیں سہی ہیں، لیکن ہمارا حال بھی بہت دشوار رہا ہے، شاید تم سے زیادہ دشوار۔" انھوں نے تیل کے بدلے آنے والی خوراک کے راشن،

Scanned with CamScanner

ناقص آئے اور شہر میں گداگروں کی کثرت کی شکایت کی۔ لوگ بیمار تھے اور اسپتالوں کے پاس دوائیں نہیں تھیں۔ وہ لوگ سزائے موت پانے والوں کو شمار کرنے لگے، پہلے فلاں مارا گیا اور اس کے بعد فلاں کو سزائے موت دی گئی۔

''علی اسیان؟'' اس نے ایک پڑوسی، دوست اور پارٹی کے وفادار رکن کے بارے میں پوچھا۔

''مارا گیا۔''

ثائر نے سوچا، اگر علی اسیان مارا جا چکا ہے تو واقعی حالات بہت خراب ہیں۔

ایک ریٹائرڈ افسر نے اسے بتایا، ''یہ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں سب سچ ہے۔ جن لوگوں نے تکلیفیں اٹھائی ہیں ان کو شکایت کرنے کا حق ہے، اور جو لوگ اچھی اچھی باتیں کر رہے ہیں وہ ہیں جنھوں نے فائدے اٹھائے ہیں، اس لیے دونوں کی باتیں سنو، کیونکہ دونوں کی باتیں سچ ہیں۔''

ثائر نے اپنے بھائی کو ان خطوں کے بارے میں بتایا جو اسے ۱۹۸۳ء میں ملے تھے اور جن کو اس نے کھولنے سے پہلے کئی دن تک اپنے دل سے لگا کر رکھا تھا۔ ثائر کے بھائی نے ان خطوں کو یاد کر کے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

''اور اماں... تمھیں پتا ہے، تمھاری خاطر ہم جا کر صدام سے بھی ملے تھے!''

اس کی ماں نے ہوا میں ہاتھ اٹھایا، جیسے مذاق میں اپنے اس فعل کا عذر پیش کر رہی ہو۔

معلوم ہوا کہ طارق عزیز کا نابینا بھتیجا بیس سال پہلے جب عراق لوٹا تو اس نے ریڈیو پر ان تمام قیدیوں کے نام نشر کیے جو اس نے یاد کر رکھے تھے، اور ان کا حال سنایا۔ ثائر کے والدین کو خود صدر کی طرف سے ایک دعوت نامہ موصول ہوا، کہ وہ ان کے بیٹے کی قربانیوں کا قوم کی طرف سے شکریہ ادا کرے گا۔ ثائر کے باپ نے جانے سے انکار کر دیا، اس لیے ثائر کا بھائی ماں کو لے کر پہنچا۔ ان کی ملاقات سخت تناؤ اور اذیت کے ماحول میں ہوئی۔ صدام اس بات پر ناخوش تھا کہ باپ، کنبے کا سربراہ ملاقات کے لیے نہیں آیا؛ یہ ایک گستاخی تھی، خواہ وہ اس کا کچھ بھی جواز پیش کریں۔ ثائر کی ماں بلک بلک کر روتی رہی اور اپنے بیٹے کی ستائش میں کہے گئے لفظوں پر مسکرانے کا حوصلہ نہ کر سکی۔ پروٹوکول کا افسر آس پاس منڈلاتا رہا، فوٹو گرافر نے اس موقعے کی تصویریں لیں۔ گھر واپس پہنچ کر ثائر کی ماں نے ساری سرکاری تصویریں پھاڑ کر پھینک دیں اور صدام کو کوسنے دیے جو اس جنگ کا اور اس کے بیٹے کی قید

Scanned with CamScanner

کا ذمے دار تھا۔ اس کے شوہر نے اسے پاگل قرار دیا اور اس بات پر فکرمند ہوا کہ کہیں کسی نے اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھ نہ لیا ہو، لیکن وہ واویلا کرتی رہی۔ اس نے صدام کو بددعائیں دیں، چیخ چیخ کر روئی اور چلّا کر بولی، ''میں صدام کا خون پینا چاہتی ہوں!''

ثائر ششدر رہ گیا۔

''واقعی،'' اس کے بھائی نے ہنستے ہوئے کہا، ''انھوں نے یہی کہا تھا!''

امریکی آئے اور بغداد کسی مزاحمت کے بغیر زیر ہوگیا؛ سامرہ کے شیخوں نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ ثائر اپنے اندر ڈھیر ہوگیا، اس نے خود کو کمرے میں بند کرلیا اور روتا اور سوتا رہا۔ تین مہینے تک وہ کہیں جانے کی ہمت نہ کر پایا۔ ہر چیز ناقابلِ توضیح تھی؛ ہر چیز بدتر ہوتی جارہی تھی۔

۲۰۰۴ء کے موسم بہار تک بغاوت پورے ملک میں پھیل چکی تھی۔ فلوجہ میں امریکی فوج کے چار ٹھیکیداروں کی لاشیں برآمد ہوئی تھیں، بغداد میں شدت پسند شیعہ اپنے راکٹ لانچر امریکیوں کی طرف تانے ہوئے تھے، سامرہ میں بعث پارٹی کے سابق ہیڈکوارٹر پر قابض امریکی گیریزن پر ہر رات فائرنگ ہوتی تھی۔ پورے ملک میں کار بموں کے دھماکے، صبح چار بجے کی خانہ تلاشیاں اور گرفتاریاں، قید اور قتل کی وارداتیں ہو رہی تھیں۔ ثائر ان تمام واقعات سے نہایت رنجیدہ تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اپنی واپسی کے بعد سے وہ دوسروں کی تکلیفوں کے بارے میں بہت زیادہ حساس ہوگیا ہے۔ وہ لوگوں کو کام کی تلاش میں مارے مارے پھرتے دیکھتا تا کہ اپنے گھر والوں کا پیٹ بھر سکیں، اور اس پر اذیت محسوس کرتا۔ وہ خوش قسمت تھا کہ اس کے بھائی کا اپنا کاروبار تھا اور وہ اس کی مدد کر رہا تھا۔ اس کا ایک دوست، ایک سابق جنگی قیدی، اپنی نئی بیوی اور کمسن بیٹے کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ ٹیکسی چلاتا تھا لیکن ٹیکسی چوری ہوگئی اور وہ روزنداری پر بھاری تعمیراتی کام کرنے والے مزدوروں میں شامل ہونے پر مجبور ہوگیا، اور ہمہ وقت اپنے کنبے کو روٹی کا نوالہ فراہم کرنے کی فکر میں گھلنے لگا۔ اس سارے عمل کی ناشائستگی نے ثائر کو رونے پر مجبور کر دیا۔ لیکن پورے ملک کا یہی حال تھا: اب روزگار کس کے پاس تھا؟ ایران کے قید خانے کا ایک ساتھی اب تکریت میں پولیس کا سپاہی تھا۔ ''ہاہ! امریکیوں کے لیے کام کر رہا ہے!'' ثائر نے آنکھوں کی جنبش سے افسوس ظاہر کیا۔

Scanned with CamScanner

ایک روز ثائر انٹرویو دینے کے لیے میرے پاس پہنچا تو بیک وقت فخر اور شرمندگی کی حالت میں تھا۔اس کے بال سیاہ رنگے ہوئے تھے۔اس نے منھ بنایا۔

''یہ میری ماں کا اصرار تھا،'' اس نے کہا۔

میں جانتی تھی کہ ان تمام برسوں کے بعد وہ اپنی ماں کی کوئی خواہش رد نہیں کر سکتا۔اور پھر اس کا چہرہ دمکنے لگا۔''اس نے میری لیے بیوی بھی تلاش کر لی ہے!'' اس نے مجھے ایک فوٹو دکھایا۔ایک بھرے بھرے بدن والی لمبی عورت، چہرے پر نیم مسکراہٹ لیے، کیمرے کے پیچھے ثائر کے بھائی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''اوہ! یہ تو بہت خوبصورت ہے!'' میں نے اسے مبارکباد دی۔

اس نے ہلکی سی آہ بھری۔ ہاں، لمبی ہے، اور اچھی ہے۔لیکن اتنی پڑھی لکھی نہیں۔اسے ہمیشہ سے پڑھی لکھی بیوی کی آرزو تھی۔اس کا ایک عزیز ایک چھوٹا موٹا شیخ تھا جس کی چھ بیٹیاں تھیں اور وہ ان میں سے ایک سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

''لیکن وہ سب برسوں پہلے بیاہی جا چکی ہیں۔''

ثائر نے مجھے اپنی منگنی کی رسم کے بارے میں بتایا جو دلہن کے گھر پر صرف عورتوں کی موجودگی میں منعقد ہوئی تھی۔دلہن کا باپ اور بھائی باغیچے میں یا گھر کے کسی کمرے میں جا چھپے، لیکن اس سے پہلے یہ اطمینان کر لیا کہ مہمانوں کے لیے پیپسی، اورنج جوس، چاکلیٹ کریم کیک، کھجور کی پیسٹریاں اور پتی میں لپٹی ہوئی مٹھائیاں کافی مقدار میں موجود ہوں۔انھیں منگنی کی رسم میں شامل ہونے کی اجازت نہ تھی۔اس رسم میں صرف ایک مرد شریک ہوتا ہے، دولھا، جو اپنی منگیتر کے برابر میں شرمایا ہوا بیٹھا رہتا ہے، اور منگیتر کو خود بدن سمیٹ کر، آنکھیں جھکا کر بیٹھنا ہوتا ہے اور اپنی عم زادوں اور دوستوں کے سلام کا جواب نہایت شرمیلے انداز میں دینا ہوتا ہے۔ثائر نے اپنی دلہن کو طلائی زیوروں کا رسمی تحفہ دیا (جو اس کے بھائی نے خریدا تھا) جس میں اللہ لکھے ہوئے معلق حصے والا سونے کا ہار، چار چوڑیاں اور دو انگوٹھیاں شامل تھیں۔عورتوں نے خوشی میں ٹافیاں نچھاور کیں، گیت گائے اور اعرابی پاپ موسیقی کی دھنوں پر رقص کیا اور اپنے دوپٹوں کو سروں پر سے ڈھلک جانے دیا اور اپنے اونچی ایڑی کے چمکیلے جوتوں کی نمائش کی۔

Scanned with CamScanner

ثائر اس تمام کارروائی کے دوران وہاں بیٹھا رہا، وہ خوش بھی تھا اور عجیب سا بھی محسوس کر رہا تھا۔ وہ اس سے پہلے اپنی منگیتر سے کبھی نہیں ملا تھا اور اس نے اسے تھوڑی بہت بات چیت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اسے چھیڑا اور کہا کہ وہ ہلکے نارنجی رنگ کے بیل لگے لباس میں کتنی حسین دکھائی دے رہی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنی منگیتر کے کندھوں کے گرد بازو رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کسمسا گئی۔

''میرے بھائی تمھیں مار ڈالیں گے!'' وہ ثائر سے بولی۔ لیکن جس وقت وہ دونوں مل کر کیک کاٹ رہے تھے، وہ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھنے میں کامیاب رہا۔

تقریب ٹھیک طرح مکمل ہوئی اور گھر واپس پہنچ کر اس نے سارا احوال اپنے بھائی کو اور اپنی ماں کو سنایا جو بیماری اور کمزوری کے باعث اس میں شریک نہیں ہو سکی تھی۔ وہ باورچی خانے کی میز پر بیٹھے چائے پیتے اور باتیں کرتے رہے، یہاں تک کہ ثائر کے ایک بھتیجے نے آ کر اطلاع دی کہ اس نے باغیچے میں امریکی فوج کی روشنی کرنے والی سبز ڈنڈی پڑی ہوئی دیکھی ہے۔ سب لوگ سراسیمہ ہو گئے۔

ثائر یہ کہانی سناتے ہوئے ہنس رہا تھا، لیکن سنجیدہ تھا۔

اس کی ماں کو فوراً فکر لاحق ہو گئی۔ اس چمکدار سبز ڈنڈی کے ان کے باغیچے میں پڑا ہونے کا کیا مطلب ہے؟ یہ ڈنڈی امریکی استعمال کرتے ہیں، وہ ضرور کسی چیز کی نشان دہی کر رہے ہوں گے۔ انھوں نے ان کے مکان کو نشان زد کر لیا ہے!

''یا اللہ! اب وہ آ کر سب کو پکڑ لیں گے۔ رات بھی بہت جا چکی ہے، ٹینکوں کی آمد اور گرفتاریاں سب ایسے ہی وقت ہوتی ہیں۔''

سب لوگ پریشان ہو گئے اور سخت بحث چھڑ گئی۔ کیا انھیں ڈنڈی کو باغیچے سے ہٹا دینا چاہیے تاکہ ان کا مکان نشان زد نہ رہے، یا امریکیوں کو اس کا پتا چل جائے گا اور پھر انھیں سزا بھگتنی پڑے گی؟ اگر مکان کی تلاشی لی گئی تو وہ سونے کے زیوروں کو کہاں چھپائیں گے — امریکی بعض اوقات سونا چرا لے جاتے تھے۔ اور کلاشنکوف کا کیا کیا جائے؟ ہر مکان کو ایک کلاشنکوف رکھنے کی اجازت تھی — لیکن کیا انھیں اس کو چھپا دینا چاہیے، کیونکہ بندوق کا برآمد نہ ہونا بہتر ہوگا، اور اگر کلاشنکوف برآمد ہوئی تو شاید وہ لوگ اسے چھین کر لے جائیں؟ لیکن اگر وہ ان کے چھپانے کے باوجود برآمد ہو گئی تو امریکی

ان پر کلاشنکوف چھپانے کا الزام لگائیں گے۔ شاید اسے سامنے پڑا رہنے دینا ہی ٹھیک ہوگا۔

ثائر نے ان سب کو تسلی دی۔

''میں نے انھیں سمجھایا کہ میں فوج کا آدمی ہوں اور ان چیزوں کے بارے میں جانتا ہوں۔'' اس نے اپنے بھتیجے کو بھیجا کہ باغیچے سے ڈنڈی اٹھا کر لے آئے۔ ''اور، پتا ہے،'' اس نے مجھے بتایا، ''گھر میں بجلی نہیں تھی، سو یہ ہمارے کام آ گئی۔''

ثائر سے میری آخری بار جون ۲۰۰۴ء میں اس کے بھائی کے گاڑیوں کے شوروم پر ملاقات ہوئی۔ ہم نے تازہ خربوزے کا رس پیا اور باتیں کرتے رہے۔ چند لوگ، ان کے دوست یا عزیز، آ کر ہمارے پاس بیٹھ گئے۔ ''سامرہ کا کیا حال ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہاں کیا ہو رہا ہے؟''

ثائر یوں مسکرایا جیسے سب کچھ جانتا ہو اور ان نوواردوں کی طرف دیکھ کر سر سے اشارہ کیا۔ ''ان لوگوں سے کیوں نہیں پوچھتیں؟ یہ وہاں مزاحمت میں شامل ہیں،'' ثائر نے تقریباً مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ دونوں آدمی، جو معقول لباس پہنے تھے اور شائستہ، خوشگوار انداز کے حامل تھے، مجھے بتانے لگے کہ انھوں نے پچھلے ہفتے ایک امریکی ہیلی کاپٹر کو مار گرایا تھا جس پر سب کو بہت خوشی ہوئی تھی اور یہ کہ وہاں مزاحمت اچھی چل رہی ہے۔

میں یاد کرتی ہوں (اور یہ الفاظ لکھتے ہوئے، اسے یاد کرتے ہوئے، اُس کی کمی محسوس کرتی ہوں) کہ وہ کس طرح کسی قسم کی تلخی کے بغیر ہنس سکتا تھا۔ میں نے اس سے سیکڑوں بار سوال کیا کہ کیوں؟ آخر کیوں تم اب تک وفادار ہو؟ آخر یہ سب صدام کا کیا دھرا ہے! اسی کی ہولناک، قاتل حکومت نے تمھاری وفاداری سے غداری کی تھی!

وہ ہنستا اور کہتا، ''ہاں، اب یہ بات صاف ہے، لیکن اُس وقت صاف نہیں تھی۔''

ایک بار میں نے اسے یہ یاد دلا کر چھیڑا کہ عراق واپس آتے ہی جو پہلا فقرہ اس کی زبان سے نکلا وہ ''صدام زندہ باد!'' تھا۔ ثائر ہنسنے اور اپنی آنکھیں گھمانے لگا۔ ''پتا ہے۔ مجھے یاد دلانے کی ضرورت نہیں۔ میں کیا سوچ رہا تھا؟ ہمیں بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے اصحاب کہف کی طرح غار سے نکل کر آئے اور خود کو ایک اور ہی دنیا میں پایا۔''

Scanned with CamScanner

اسے اس تمام ضیاع اور جھوٹ سے نفرت محسوس ہوتی تھی، اور ان بہت سے ساتھیوں، برادروں، کی یاد اس پر مسلط تھی جو ایران میں قید کے دوران مر گئے۔ ''ان کا خون رائیگاں گیا۔ یہ ایک جرم تھا۔ لوگوں کو قربانی کسی ایسی شے کے لیے دینی چاہیے جو واقعی اس قابل ہو۔ انھیں کچھ نہیں معلوم تھا۔ وہ ایک ایسی چیز سے وابستہ رہے جو جھوٹی تھی۔ وہ احمق تھے۔''

لیکن بیشتر وقت وہ اپنی ابتلا کو فخر سے برداشت کرتا تھا۔ ''فخر، مجھے لوگوں کی آنکھوں میں یہی دکھائی دیتا ہے۔ وہ میری کسی بھی بات، کسی بھی حکم کے منتظر رہتے ہیں۔ میں دیکھ سکتا ہوں کہ وہ میری کس قدر عزت کرتے ہیں، میں نے جو کچھ کیا اس پر کتنا فخر کرتے ہیں۔ مرنا تو ہر شخص کا مقدر ہے۔ صرف آدمی کا عمل اور اس کی داستان باقی رہ جاتی ہے۔

''میں نے کسی انعام کے لالچ میں قربانی نہیں دی تھی۔ یہ میری زندگی کے اکیس برس تھے، اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اس عرصے کے ایک لمحے پر بھی نہیں پچھتاتا۔ میں اسے اپنی مردانگی اور اپنا وقار سمجھتا ہوں۔ میں، ایک مرد، اپنے دشمنوں کے سامنے جھکا نہیں۔ اور یہی میں لوگوں کی آنکھوں میں دیکھتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں: 'یہ ہے مرد آدمی!'''

❋❋

وینڈل اسٹیونسن (Wendell Steavenson) کا یہ مضمون برطانوی جریدے ''گرانٹا'' کے شمارہ ۹۳ (بہار ۲۰۰۶ء) سے لیا گیا ہے۔ وہ مشرقِ وسطیٰ میں بہت سفر کر چکی ہیں اور آج کل عراقیوں کے بارے میں ایک کتاب لکھنے میں مصروف ہیں۔

Scanned with CamScanner

# ژاں پال سارتر

انگریزی سے ترجمہ: راشد مفتی

## دیوار

انھوں نے ہمیں ایک بڑے اجلے کمرے میں دھکیل دیا جہاں روشنی اتنی تیز تھی کہ میری پلکیں جھپکنے لگیں۔ پھر میری نظر ایک میز اور اس کے پیچھے بیٹھے ہوئے چار غیر فوجیوں پر پڑی جو کاغذات دیکھ رہے تھے۔ ان کے پیچھے قیدیوں کا ایک اور گروہ تھا جس میں شامل ہونے کے لیے ہمیں سارا کمرہ عبور کرنا پڑا۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جنھیں میں جانتا تھا اور کچھ ایسے جو یقیناً غیر ملکی ہوں گے۔ میرے سامنے جو دو قیدی تھے ان کی رنگت گوری اور کھوپڑیاں گول تھیں اور وہ ہم شکل لگ رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ فرانسیسی ہیں۔ ان میں جو چھوٹا تھا وہ اعصابی تشنج کے باعث اپنی پتلون بار بار اوپر چڑھا رہا تھا۔

یہ سلسلہ کوئی تین گھنٹے جاری رہا۔ مجھے چکر آ رہے تھے اور اپنا سر خالی خالی محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن کمرہ خوب گرم تھا اور یہ بات مجھے خاصی خوشگوار لگ رہی تھی کیونکہ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے ہم مسلسل کانپ رہے تھے۔ سنتری یکے بعد دیگرے قیدیوں کو میز تک لاتے اور وہ چاروں اہلکار ان کا نام اور پیشہ پوچھتے۔ زیادہ تر وہ ان سوالوں سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ بس کبھی کبھار ایک آدھ بات اور پوچھ لیتے، جیسے، ''گولا بارود کا ذخیرہ اڑانے میں تمھارا ہاتھ تھا؟'' یا، ''نو تاریخ کی صبح تم کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے؟'' وہ جواب نہیں سن رہے تھے یا کم از کم سنتے ہوئے نہیں لگ رہے تھے۔ وہ لمحہ بھر کو چپ ہوتے اور

Scanned with CamScanner

بالکل سامنے دیکھنے لگتے۔ اس کے بعد وہ پھر لکھنے لگتے۔ انھوں نے ٹام سے پوچھا کیا یہ درست ہے کہ وہ انٹرنیشنل بریگیڈ کا رکن ہے۔ ٹام انھیں اس کے برعکس نہیں بتا سکتا تھا، کہ اس کی جیب سے کاغذات برآمد ہو چکے تھے۔ انھوں نے حوان سے کچھ نہیں پوچھا لیکن جب وہ اپنا نام بتا چکا تو وہ تا دیر لکھتے رہے۔

''انارکسٹ میرا بھائی حوزے ہے،'' حوان نے کہا۔ ''آپ جانتے ہیں وہ اب یہاں نہیں ہے۔ میرا کسی پارٹی سے تعلق نہیں ہے۔ سیاست سے میرا واسطہ کبھی نہیں رہا۔''

انھوں نے جواب نہیں دیا۔ حوان بولتا رہا، ''میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ میں قربانی کا بکرا بننا نہیں چاہتا۔''

اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ ایک سنتری نے اسے خاموش کرایا اور اپنے ساتھ لے گیا۔

اب باری میری تھی۔

''پابلو ابیئیتا تمھارا نام ہے؟''

''ہاں۔''

سوال کرنے والے نے کاغذوں پر نظر ڈالی اور مجھ سے پوچھا۔ ''رامون گرِیس کہاں ہے؟''

''مجھے معلوم نہیں۔''

''تم نے چھ سے انیس تاریخ تک اسے اپنے گھر میں چھپائے رکھا۔''

''نہیں۔''

انھوں نے ایک منٹ تک کچھ لکھا اور پھر سنتری مجھے باہر لے گئے۔ راہداری میں ٹام اور حوان دو سنتریوں کے درمیان منتظر تھے۔ ہم چلنے لگے۔ ٹام نے ایک سنتری سے پوچھا، ''تو؟''

''تو کیا؟'' سنتری نے کہا۔

''یہ جرح تھی یا فیصلہ؟''

''فیصلہ،'' سنتری نے کہا۔

''ہمارے لیے کیا تجویز ہوا ہے؟''

سنتری نے سرد مہری سے جواب دیا، ''سزا تمھاری کوٹھری میں سنائی جائے گی۔''

حقیقت میں ہماری کوٹھری اسپتال کے تہہ خانوں میں سے ایک تھی جو گزرتی ہوئی ہوا کے باعث

Scanned with CamScanner

ہولناک حد تک سرد تھی۔ ہم رات بھر کانپتے رہے تھے اور دن میں بھی حالت کچھ بہتر نہ تھی۔ گزشتہ پانچ دن میں نے ایک خانقاہ کی کوٹھری میں گزارے تھے۔ کوٹھری کیا تھی، بس دیوار میں قرونِ وسطیٰ کے زمانوں کا ایک سوراخ تھا۔ چونکہ قیدی گنجائش سے کہیں زیادہ تھے لہٰذا ہمیں کہیں بھی بند کر دیا جاتا تھا۔ مجھے اپنی کوٹھری یاد نہیں آتی تھی۔ وہاں سردی نے مجھے زیادہ آزار نہیں دیا تھا لیکن میں تنہا تھا؛ اور تنہائی وقت گزرنے کے ساتھ کھلنے لگتی ہے۔ اس تہہ خانے میں مجھے رفاقت میسر تھی۔ حوان بہت کم بات کرتا تھا۔ وہ ڈرا ہوا تھا اور اتنا نوعمر تھا کہ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ تھا۔ لیکن ٹام خاصا باتونی تھا اور پھر ہسپانوی بھی اچھی جانتا تھا۔

تہہ خانے میں ایک بنچ اور چار چٹائیاں تھیں۔ سنتری ہمیں چھوڑ کر رخصت ہوئے تو ہم خاموشی سے انتظار کرنے لگے۔ ایک طویل لمحے کے بعد ٹام بولا، ''ہم پھنس گئے ہیں۔''

''میرا خیال بھی یہی ہے،'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس لڑکے کو کچھ کہیں گے۔''

''اس کے خلاف ان کے پاس کچھ نہیں ہے،'' ٹام نے کہا۔ ''اس کا قصور صرف یہ ہے کہ اس کا بھائی ملیشیا کا رکن ہے۔''

میں نے حوان کی طرف دیکھا۔ وہ ہماری گفتگو سے بے خبر بیٹھا تھا۔ ٹام بولتا رہا، ''تمھیں معلوم ہے وہ سرگوسا میں کیا کر رہے ہیں؟ قیدیوں کو سڑک پر لٹا کے ٹرکوں سے کچل ڈالتے ہیں۔ مجھے یہ بات ایک مراکشی بھگوڑے نے بتائی ہے۔ وہ کہتے ہیں اس طرح گولیوں کی بچت ہوتی ہے۔''

''لیکن پٹرول تو نہیں بچتا،'' میں نے کہا۔

مجھے ٹام پر غصہ آ رہا تھا، اسے یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔

''اور پھر نگرانی کے لیے،'' اس نے بات جاری رکھی، ''سڑک کے کنارے افسر بھی چلتے رہتے ہیں۔ وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے سگریٹ پیتے رہتے ہیں۔ تمھارے خیال میں وہ لوگوں کو ایک دم ہلاک کر دیتے ہیں؟ ارے نہیں! وہ انھیں چیخ پکار کرنے دیتے ہیں، بعض اوقات تو ایک ایک گھنٹے تک۔ اس مراکشی نے بتایا کہ پہلی بار تو اسے ابکائی آتے آتے رہ گئی تھی۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ وہ یہ عمل یہاں بھی دہرائیں گے،'' میں نے کہا، ''تاوقتیکہ ان کے پاس واقعی گولیوں کی قلت نہ ہو۔''

روشنی، ہوا کے لیے بنے چار روزنوں اور اس بڑے گول سوراخ سے آتی تھی جو انھوں نے چھت میں بائیں طرف کو بنا رکھا تھا اور جس میں سے آسمان نظر آتا تھا۔ اس سوراخ کے راستے، جو عام طور پر ایک ڈھکنے سے بند رہتا تھا، کوئلہ تہہ خانے میں پھینکا جاتا تھا۔ سوراخ کے بالکل نیچے کوئلے کے چورے کا بہت بڑا ڈھیر تھا جو اسپتال کو گرم رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن چونکہ جنگ کے آغاز پر مریض کہیں اور منتقل کر دیے گئے تھے، لہٰذا کوئلہ بغیر استعمال ہوئے وہیں پڑا رہا اور بعض اوقات تو بارش میں بھیگتا بھی رہا کیونکہ وہ سوراخ پر ڈھکنا رکھنا بھول گئے تھے۔

ٹام کپکپانے لگا۔ ''خدایا! میں تو ٹھٹھر رہا ہوں،'' اس نے کہا۔ ''سردی پھر شروع ہو گئی۔''

وہ اٹھ کر ورزش کرنے لگا۔ اس کی ہر حرکت کے ساتھ قمیص اس کے سفید اور بالوں بھرے سینے پر کھل کھل جاتی تھی۔ پھر وہ پیٹھ کے بل لیٹا ٹانگیں ہوا میں اٹھائے خیالی سائیکل چلانے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا نچلا دھڑ کانپ رہا تھا۔ ٹام بھاری بھرکم تھا لیکن اس میں چربی بہت تھی۔ میں نے سوچا کہ نرم گوشت کے اس پہاڑ میں رائفل کی گولیاں یا سنگینوں کی تیز نوکیں جلد ہی ایسے اتر جائیں گی جیسے مکھن کے ڈلے میں۔ وہ دبلا پتلا ہوتا تو میں کبھی اس طرح نہ سوچ سکتا تھا۔

گو مجھے سردی نہیں لگ رہی تھی لیکن میں اپنے بازو اور شانے محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ بعض اوقات میرا تاثر یہ ہوتا کہ میری کوئی شے کھو گئی ہے اور میں اپنا کوٹ ڈھونڈنے لگتا۔ پھر یکایک مجھے یاد آتا کہ انھوں نے مجھے کوٹ نہیں دیا تھا۔ یہ بات بڑی تکلیف دہ تھی۔ وہ ہمارے کپڑے اتروا کر اپنے سپاہیوں کو دے دیتے تھے، اور ہمارے بدن پر صرف قمیصیں اور کینوس کی وہ پتلونیں جو اسپتال کے مریض بھری گرمیوں میں پہنتے ہیں، چھوڑ دیتے تھے۔ کچھ دیر بعد ٹام اٹھا اور میرے برابر بیٹھ گیا۔ وہ بھاری بھاری سانسیں لے رہا تھا۔

''کچھ گرمی آئی؟''

''نہیں۔ لیکن میری سانس پھول گئی ہے۔''

شام آٹھ بجے کے قریب دو فلانجسٹوں کے ساتھ ایک میجر آیا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذوں کا ایک دستہ تھا۔ اس نے سنتری سے پوچھا: ''ان تینوں کے نام کیا ہیں؟''

''اسٹائن بوک، ابیئیٹا اور میر بل،'' سنتری نے کہا۔

میجر نے چشمہ لگایا اور فہرست دیکھنے لگا۔ ''اسٹائن بوک... اسٹائن بوک... ہاں... تمھیں سزائے موت دی گئی ہے۔ تمھیں کل صبح گولی ماری جائے گی۔'' وہ فہرست دیکھتا رہا۔ ''اور ان دونوں کو بھی۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے!'' حوان نے کہا۔ ''مجھے نہیں...''

میجر نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ''تمھارا نام کیا ہے؟''

''حوان میربل،'' اس نے کہا۔

''ہاں۔ تمھارا نام فہرست میں ہے،'' میجر بولا۔ ''تم سزا یافتہ ہو۔''

''میں نے کچھ نہیں کیا ہے،'' حوان نے کہا۔

میجر نے اپنے کندھے اچکائے اور ٹام کی اور میری طرف متوجہ ہوگیا۔

''تم باسک (Basque) ہو؟''

''باسک کوئی نہیں ہے۔''

وہ مشتعل نظر آنے لگا۔ ''مجھے بتایا گیا ہے کہ یہاں تین باسک ہیں۔ میں ان کی تلاش میں اپنا وقت ضائع نہیں کروں گا۔ پھر تو ظاہر ہے تمھیں پادری کی ضرورت نہیں ہے؟''

ہم نے جواب دینے کی زحمت نہیں کی۔

وہ بولا، ''تھوڑی دیر میں ایک بیلجیئن ڈاکٹر آرہا ہے۔ اسے تمھارے ساتھ شب گزاری کی اجازت دی گئی ہے۔'' اس نے فوجی سلام کیا اور رخصت ہولیا۔

''میں نے تم سے کیا کہا تھا؟'' ٹام بولا۔ ''وہی ہوا نا؟''

''ہاں،'' میں نے کہا۔ ''لڑکے کے لیے، بہت سخت سزا ہے یہ۔''

یہ بات میں نے شائستہ نظر آنے کو کہی تھی لیکن لڑکا مجھے پسند نہیں تھا۔ اس کا چہرہ بہت دبلا تھا اور خوف و کرب نے اسے مسخ کر دیا تھا، تمام نقوش بگاڑ ڈالے تھے۔ تین روز قبل وہ ایک طرحدار قسم کا لڑکا تھا اور ایسا برا بھی نہ تھا، لیکن اب کسی بڈھی پری کی طرح نظر آرہا تھا۔ میں نے سوچا کہ وہ اب کبھی جوان نہ ہوسکے گا، خواہ وہ اسے آزاد ہی کیوں نہ کردیں۔ اس پر ترس کھانا مشکل نہیں تھا لیکن ترس مجھے اکتا دیتا ہے بلکہ دہلا دیتا ہے۔ لڑکے نے کچھ اور نہیں کہا تھا لیکن وہ سفید پڑ گیا تھا، اس کا چہرہ اور ہاتھ دونوں سفید تھے۔ وہ دوبارہ بیٹھ گیا اور گول گول دیدوں سے زمین کو تکنے لگا۔ ٹام نرم دل تھا۔ وہ اس کا بازو پکڑنا چاہتا

Scanned with CamScanner

تھا لیکن لڑکے نے سختی سے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے منھ بنایا۔

"اسے چھوڑ دو،" میں نے ہلکی آواز میں کہا۔ "تم دیکھ رہے ہو وہ گھگھیا رہا ہے۔"

ٹام نے افسوس کرتے ہوئے اسے جانے دیا۔ وہ اسے تسلی دینا چاہتا تھا کہ اس طرح اس کا وقت گزر جاتا اور اسے اپنی موت کے بارے میں سوچنے کی تحریص نہ ہوتی۔ لیکن مجھے اس بات پر ناگواری محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کبھی موت کے بارے میں نہیں سوچا تھا کیونکہ سوچنے کی کوئی وجہ ہی نہیں ملی تھی، لیکن اب وجہ موجود تھی اور موت کے بارے میں سوچنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

ٹام باتیں کرنے لگا۔ "کہو، تم نے کبھی کسی کو مارا ہے؟" اس نے پوچھا۔ اس نے مجھے بتانا شروع کیا کہ اگست کے آغاز سے اس نے اب تک چھ آدمی مارے ہیں۔ اسے صورت حال کا احساس نہیں تھا اور مجھے یقین ہے کہ وہ احساس کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ خود مجھے بھی صورت حال کا پورا ادراک نہیں تھا۔ میں حیران تھا کہ موت کا کرب کیسا ہوگا۔ میں گولیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے ان کی جلتی ہوئی باڑھ کے اپنے جسم پر پڑنے کا تصور کیا۔ اس سب کا حقیقی سوال سے کوئی تعلق نہ تھا، لیکن میں پرسکون تھا۔ سمجھنے کو ہمارے پاس ساری رات پڑی تھی۔ کچھ دیر بعد ٹام خاموش ہو گیا۔ میں اسے کنکھیوں سے دیکھتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بھی سفید پڑ چکا ہے اور بالکل لاش نظر آ رہا ہے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا، "خوف نے کام دکھانا شروع کر دیا۔" اندھیرا تقریباً چھا گیا تھا۔ ہوا کے روزنوں اور کوئلے کے ڈھیر سے چھنتی ہوئی مدھم روشنی نے، عین اس جگہ جہاں چھت کے سوراخ کا عکس پڑ رہا تھا، ایک بڑا سا دھبا بنا دیا تھا۔ میں اس سوراخ سے ایک ستارہ دیکھ سکتا تھا۔ رات اجلی اور برفانی ہوگی، میں نے سوچا۔

دروازہ کھلا اور دو سنتری اندر آئے۔ ان کے پیچھے ایک گورا آدمی تھا جس نے بھوری وردی پہن رکھی تھی۔ اس نے ہمیں فوجی انداز سے سلام کیا۔

"میں ڈاکٹر ہوں،" اس نے کہا۔ "مجھے ان صبر آزما لمحوں میں تمھاری مدد کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔"

اس کی آواز موافق اور نمایاں تھی۔ میں نے کہا، "یہاں کیا کرنے آئے ہو؟"

"میں تم لوگوں کے تصرف میں ہوں۔ تمھارے آخری لمحوں کو آسان بنانے کے لیے میں جو

کچھ کر سکتا ہوں اس سے دریغ نہیں کروں گا۔''

''ہمارے پاس ہی کیوں آئے ہو؟ اور لوگ بھی ہیں۔ اسپتال ان سے بھرا پڑا ہے۔''

''میں یہاں بھیجا گیا ہوں،'' اس نے مبہم انداز سے جواب دیا۔ ''تم تمباکو نوشی کرنا پسند کرو گے؟'' وہ جلدی سے بولا، ''میرے پاس سگریٹ ہیں اور سگار بھی۔''

اس نے ہمیں برطانوی سگریٹ اور سگار پیش کیے لیکن ہم نے انکار کر دیا۔ میں نے اسے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور وہ جھنجھلایا ہوا سا نظر آنے لگا۔ میں نے اس سے کہا، ''تم یہاں رحم کھانے نہیں آئے ہو۔ اور پھر میں تمھیں جانتا ہوں۔ جس دن میں گرفتار ہوا تھا میں نے تمھیں بیرکوں کے سامنے فاشسٹوں کے ساتھ دیکھا تھا۔''

میں ابھی کچھ اور کہتا لیکن اچانک ایک حیران کن بات پیش آئی۔ اس ڈاکٹر کی موجودگی میرے لیے مزید دلچسپی کا باعث نہ رہی۔ عام طور پر جب میں کسی کے پیچھے پڑتا ہوں تو آسانی سے نہیں چھوڑتا، لیکن بولنے کی خواہش مجھ سے مکمل طور پر رخصت ہو گئی تھی۔ میں نے کندھے اچکاتے ہوئے اپنا منھ پھیر لیا۔ کچھ دیر بعد میں نے اپنا سر اٹھایا۔ وہ عجیب انداز سے دیکھ رہا تھا۔ سنتری چٹائی پر بیٹھے تھے۔ پیدرو، جو لمبا اور دبلا تھا، اپنے انگوٹھے گھما رہا تھا جبکہ دوسرا نیند کے ڈر سے بار بار اپنا سر جھٹک رہا تھا۔

''تمھیں روشنی چاہیے؟'' پیدرو نے اچانک ڈاکٹر سے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں۔'' میرے خیال میں وہ بالکل بے حس تھا لیکن برا یقیناً نہیں تھا۔ اس کی سرد نیلی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ اس کا واحد گناہ صرف تخیل کا فقدان ہے۔ پیدرو باہر گیا اور ایک تیل کا لیمپ لے آیا جو اس نے بنچ کے کونے پر رکھ دیا۔ لیمپ میں روشنی کم اور دھواں زیادہ تھا لیکن کچھ نہ ہونے سے بہرحال بہتر تھا۔ گزشتہ رات انھوں نے ہمیں اندھیرے ہی میں رکھا تھا۔ میں تا دیر روشنی کے اس دائرے کو دیکھتا رہا جو لیمپ چھت پر بنا رہا تھا۔ میں سحر زدہ سا ہو گیا۔ پھر اچانک میں جاگ اٹھا۔ روشنی کا دائرہ غائب ہو گیا اور میں نے خود کو ایک بھاری بوجھ تلے کچلا ہوا محسوس کیا۔ یہ موت کا خیال یا خوف نہیں تھا بلکہ ایک بے نام سی کیفیت تھی۔ میرے گال جل رہے تھے اور سر میں شدید درد تھا۔

میں نے خود کو بحال کیا اور اپنے دونوں دوستوں کی طرف دیکھا۔ ٹام نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا تھا۔ مجھے صرف اس کی موٹی سفید گدّی نظر آ رہی تھی۔ کم عمر حوان کا حال اور بھی ابتر تھا۔ اس کا

Scanned with CamScanner

منھ کھلا تھا اور نتھنے پھڑک رہے تھے۔ ڈاکٹر اٹھا اور اس کے کندھے پر اس طرح ہاتھ رکھا گویا اسے تشفی دینا چاہتا ہو۔ لیکن اس کی آنکھیں منجمد رہیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر کا ہاتھ جوان کے بازو سے چوری چوری سرک کر اس کی نبض پر ٹھہر گیا۔ جوان نے کوئی توجہ نہ دی۔ ڈاکٹر نے بے دھیانی سے اس کی نبض تین انگلیوں کے درمیان تھام لی۔ اس اثنا میں اس نے ذرا پرے کھسک کر اپنی پشت میری طرف کر لی تھی، لیکن میں نے پیچھے کی طرف جھک کر اسے اپنی جیب سے گھڑی نکالتے دیکھ لیا۔ اس نے پل بھر گھڑی کو دیکھا؛ اس دوران اس کا ہاتھ نبض پر ہی رہا۔ ایک منٹ کے بعد اس نے ہاتھ چھوڑ دیا اور دوبارہ اپنی جگہ جا کر دیوار کے ساتھ کمر ٹکا دی۔ پھر، جیسے اسے کوئی بہت ضروری بات یاد آئی ہو جسے فوری لکھنا ضروری ہو، اس نے اپنی جیب سے نوٹ بک نکال کر چند سطریں لکھیں۔ ''حرامی!'' میں نے غصے سے سوچا۔ ''ذرا میری نبض تو دیکھے، منھ پہ تھپڑ دے ماروں گا۔''

وہ میرے نزدیک نہیں آیا لیکن میں نے اسے تکتے ہوئے محسوس کیا۔ میں نے سر اٹھایا اور اس پر جواباً نظر ڈالی۔ اس نے غیر ذاتی انداز میں مجھ سے کہا، ''تمھیں یہاں سردی نہیں لگتی؟'' اسے سردی لگ رہی تھی اور وہ نیلا پڑ چکا تھا۔

''مجھے سردی نہیں لگتی،'' میں نے اسے بتایا۔

اس نے اپنی گہری نظریں مجھ پر گاڑ دیں۔ اچانک میں سمجھ گیا اور میرے ہاتھ اپنے چہرے کی طرف بڑھے۔ میں پسینے میں شرابور تھا۔ اس تہہ خانے میں، سردیوں کے عین وسط میں، جھونکوں کے درمیان مجھے پسینہ آ رہا تھا۔ میں نے اپنی انگلیاں بالوں میں پھرائیں جو پسینے سے آپس میں جڑ چکے تھے۔ اسی وقت میں نے محسوس کیا کہ میری قمیص نم ہے اور میری جلد کے ساتھ چمٹی ہوئی ہے۔ میں محسوس کیے بغیر ایک گھنٹے سے پسینے میں نہا رہا تھا، لیکن اس حرامی بیلجئین نے کوئی بات نظر انداز نہیں کی تھی۔ اس نے میرے گالوں پر لڑھکتے ہوئے قطرے دیکھ لیے تھے اور سوچا تھا: یہ ہے دہشت کی مرضیاتی کیفیت کا اظہار۔ وہ اپنے کو فطری محسوس کر رہا تھا اور اسے اس بات پر فخر تھا کیونکہ اسے سردی لگ رہی تھی۔ میں اٹھ کر اس کے چہرے کو مسخ کر دینا چاہتا تھا لیکن جونہی میں نے خفیف سی حرکت کی، میرا تمام اشتعال اور شرم غائب ہو گئے اور میں بے حسی کے ساتھ بنچ پر گر گیا۔ میں نے اپنی گردن کو رومال سے رگڑ کر خود کو مطمئن کر لیا کیونکہ اب میں پسینے کو اپنے بالوں سے گردن پر ٹپکتا محسوس کر رہا تھا اور یہ احساس ناخوشگوار

تھا۔ میں نے یہ کام جلد ہی ترک کر دیا کیونکہ یہ بے سود تھا۔ میرا رومال پسینے میں تر تھا مگر پسینہ تھا کہ آئے چلا جا رہا تھا۔ میرے کولھوں پر بھی پسینہ آ رہا تھا اور میری گیلی پتلون بنچ سے چپکی ہوئی تھی۔

اچانک جوان بولا، ''تم ڈاکٹر ہو؟''

''ہاں،'' بیلجیئن نے کہا۔

''کیا مرنے سے تکلیف ہوتی ہے.... بہت دیر تک؟''

''کیا؟ اس وقت... ارے نہیں!'' بیلجیئن نے پدرانہ انداز سے کہا، ''ذرا بھی نہیں۔ یہ عمل سرعت سے ختم ہو جاتا ہے۔'' اس کا انداز ایسا تھا گویا کسی نقد سودا خریدنے والے کو مطمئن کر رہا ہو۔

''لیکن میں... میں نے سنا ہے... بعض اوقات انھیں دوبارہ فائر کرنا پڑتا ہے۔''

''بعض اوقات،'' بیلجیئن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ایسا اس صورت میں ہوتا ہے جب پہلی باڑھ اعضائے رئیسہ تک نہ پہنچی ہو۔''

''تب انھیں اپنی رائفلیں دوبارہ بھر کے نئے سرے سے نشانہ لینا پڑتا ہے؟'' اس نے لمحے بھر کو سوچا اور پھر بھرّائی ہوئی آواز میں اضافہ کیا، ''اس میں وقت لگتا ہے!''

اسے تکلیف سہنے سے بہت خوف آتا تھا۔ وہ صرف اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا اور یہ اس کی عمر کا تقاضا تھا۔ میں نے اس بارے میں زیادہ نہیں سوچا تھا۔ مجھے پسینہ آنے کا باعث تکلیف سہنے کا خوف نہیں تھا۔

میں اٹھ کر کوئلے کے ڈھیر تک گیا۔ ٹام نے اچھل کر مجھے نفرت بھری نظروں سے دیکھا۔ میرے جوتوں کی چرچراہٹ اسے بری لگ رہی تھی۔ میں نے سوچا کیا میرا چہرہ بھی اتنا ہی مٹیالا لگ رہا ہے جتنا کہ اس کا۔ میں نے دیکھا کہ پسینہ اسے بھی آ رہا ہے۔ آسمان پر شکوہ تھا۔ روشنی تاریک گوشے تک نہیں پہنچ رہی تھی اور میں صرف اپنا سر اٹھا کر دُبِ اکبر کو دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اب پہلے جیسی بات نہیں تھی۔ گزشتہ رات میں اپنی خانقاہ کی کوٹھری سے آسمان کا ایک بڑا سا ٹکڑا دیکھ سکتا تھا اور دن کا ہر حصہ میرے لیے ایک مختلف یاد لے کر آتا تھا۔ صبح کے وقت جب آسمان ٹھوس اور ہلکا نیلا ہوتا تو میں اوقیانوس کے ساحلوں کے بارے میں سوچتا۔ دوپہر کو میں سورج کو دیکھتا تو مجھے سیویل کا ایک بار یاد آتا جہاں میں منزانیلا پیا کرتا اور زیتون اور ہیرنگ مچھلی کھایا کرتا تھا۔ سہ پہروں کو میں سائبان میں ہوتا اور اس گہرے

سائے کے بارے میں سوچتا جوئیل فائننگ کے آدھے رنگ پر پھیل کر بقیہ آدھے کو دھوپ میں چمکتا چھوڑ دیتا ہے۔ ساری دنیا کو آسمان میں اس طرح منعکس دیکھنا واقعی بہت مشکل تھا۔ لیکن اب میں آسمان کو چاہے جتنا دیکھوں، میرے اندر کوئی چیز نہیں جاگتی تھی۔ وہ صورت حال مجھے زیادہ پسند تھی۔ میں واپس آ کر ٹام کے پاس بیٹھ گیا۔ ایک طویل لمحہ گزر گیا۔

ٹام مدھم آواز میں بولنے لگا۔ اسے بولنا ہی تھا کہ اس کے بغیر وہ، اپنے ذہن میں، خود کو پہچاننے کے قابل ہی نہ ہوتا۔ میرا خیال تھا وہ مجھ سے مخاطب ہے لیکن وہ میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ مجھے دیکھنے سے خوف زدہ تھا، کہ میرا رنگ مٹیالا ہو گیا تھا اور میں پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ ہم دونوں یکساں تھے اور ایک دوسرے کے آئینے سے بدتر۔ وہ بیلجیئن کو دیکھنے لگا جو زندہ تھا۔

''کیا تمھاری سمجھ میں آ رہا ہے؟'' اس نے پوچھا، ''میں تو کچھ بھی نہیں سمجھ پا رہا۔''

میں بھی مدھم آواز میں بولنے لگا۔ میں نے بیلجیئن کو دیکھا۔ ''کیوں؟ کیا بات ہے؟''

''ہمارے ساتھ جو ہونے جا رہا ہے، میں اسے سمجھ نہیں پا رہا۔''

ٹام کے پاس سے عجیب سی بو آ رہی تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ میں بوؤں کے بارے میں معمول سے زیادہ حساس ہو رہا ہوں۔ میں نے کھیسیں نکال دیں۔ ''تھوڑی دیر میں سمجھ جاؤ گے۔''

''بات واضح نہیں ہے،'' وہ ڈھٹائی سے بولا، ''میں بہادر بننا چاہتا ہوں لیکن مجھے کم از کم یہ معلوم تو ہو...سنو، وہ ہمیں صحن میں لے جائیں گے، ٹھیک؟ وہ ہمارے سامنے کھڑے ہوں گے۔ کتنے ہوں گے؟''

''مجھے معلوم نہیں۔ پانچ یا آٹھ۔ اس سے زیادہ نہیں۔''

''اچھا، چلو آٹھ ہوں گے۔ کوئی چلا کر کہے گا، 'نشانہ لو!' اور میں اپنی طرف آٹھ رائفلوں کو نگراں دیکھوں گا۔ میں سوچوں گا کہ اس دیوار میں کیسے گھس جاؤں۔ میں اپنی پیٹھ کا سارا زور اس پر ڈال دوں گا...اس تمام طاقت کے ساتھ جو میرے بدن میں ہے، لیکن دیوار کسی بدخواب کی طرح قائم رہے گی۔ میں یہ سب کچھ تصور کر سکتا ہوں۔ کاش، تم جان سکتے، میں کتنا بہتر تصور کر سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے،'' میں نے کہا، ''اس کا تصور میں بھی کر سکتا ہوں۔''

''بہت تکلیف ہوتی ہوگی۔ تمھیں پتا ہے، وہ آدمی کو مسخ کرنے کے لیے آنکھوں اور منھ کا نشانہ لیتے ہیں،'' اس نے بدطینتی سے اضافہ کیا۔ ''میں ابھی سے زخم محسوس کر سکتا ہوں۔ پچھلے ایک گھنٹے سے

Scanned with CamScanner

میرے سر اور گردن میں درد اٹھ رہا ہے۔ سچ مچ کا نہیں، اس سے بدتر۔ یہی کچھ میں کل صبح محسوس کروں گا۔ اور پھر؟"

میں خوب سمجھتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے لیکن میں یہ دکھانا نہیں چاہتا تھا کہ میں سمجھ گیا ہوں۔ ٹیسیں مجھے بھی محسوس ہو رہی تھیں جو سارے بدن میں چھوٹے چھوٹے زخموں کے ہجوم کی طرح تھیں۔ میں اس حالت سے نباہ نہیں پا رہا تھا، لیکن میں بھی اسی کی طرح تھا کہ اسے کوئی اہمیت نہیں دے رہا تھا۔

"پھر،" میں نے کہا، "پھر تم ڈیزی کے پھول اگا رہے ہو گے۔"

وہ خود کلامی کرنے لگا۔ وہ متواتر بیلجیئن کو دیکھے جا رہا تھا۔

بیلجیئن سنتا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا کرنے آیا ہے۔ اسے ہماری سوچوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ہمارے جسموں کو دیکھنے آیا تھا جو زندہ رہتے ہوئے بھی کرب سے مر رہے تھے۔

"یہ کسی بدخواب کی طرح ہے،" ٹام کہہ رہا تھا، "تم کچھ سوچنا چاہتے ہو۔ تمھارا تاثر ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ سب ٹھیک ہے اور تم سمجھ جاؤ گے، مگر سوچ پھسل جاتی ہے، تمھاری گرفت سے نکل کر کہیں دور چلی جاتی ہے۔ میں اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ بعد میں صرف خلا ہی خلا ہو گا، لیکن سمجھ نہیں پاتا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ بعض اوقات میں تقریباً سمجھ جاتا ہوں مگر یہ پھر گم ہو جاتا ہے اور میں پھر سے ٹیسوں، گولیوں اور دھماکوں کے بارے میں سوچنے لگتا ہوں۔ میں مادّہ پرست ہوں، یہ بات میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں۔ میں پاگل نہیں ہوا ہوں لیکن کوئی بات ہے ضرور۔ میں اپنی لاش دیکھ رہا ہوں۔ یہ مشکل نہیں ہے، لیکن جو شخص اپنی آنکھوں سے لاش دیکھ رہا ہے وہ میں خود ہوں۔ مجھے سوچنا ہے... سوچنا ہے کہ میں آئندہ کوئی چیز نہیں دیکھوں گا اور یہ دنیا دوسروں کے لیے چلتی رہے گی۔ پابلو، ایسا سوچنا ہماری فطرت میں نہیں ہے۔ یقین کرو، میں کچھ ہونے کے انتظار میں پوری ایک رات بیٹھا رہا ہوں۔ لیکن اب معاملہ اور ہے۔ موت ہمارے عقب میں رینگ آئے گی، پابلو، ہم اس کے لیے تیاری بھی نہیں کر سکیں گے۔"

"بکواس بند کرو،" میں نے کہا، "کیا تم چاہتے ہو کہ میں کسی پادری کو بلاؤں؟" اس نے جواب نہیں دیا۔ خود کو پیغمبر دکھانے کا رجحان میں اس میں پہلے سے دیکھ چکا تھا۔ وہ بے لہجہ آواز میں بولتے ہوئے مجھے پابلو پکار رہا تھا۔ یہ بات مجھے پسند نہیں آئی مگر ایسا لگتا ہے کہ سارے آئرش ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مجھے یہ مبہم سا تاثر تھا کہ اس کے پاس سے پیشاب کی بو آ رہی ہے۔ بنیادی طور پر مجھے ٹام سے کوئی

Scanned with CamScanner

خاص ہمدردی نہیں تھی اور میں نہیں سمجھتا کہ اکٹھے مرنے کے بہانے مجھے زیادہ ہمدردی ہونی چاہیے تھی۔ دوسروں کے ساتھ مرنے میں بات مختلف تھی، مثلاً رامون گریس کے ساتھ۔ لیکن ٹام اور جوان کے درمیان میں خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔ پھر بھی، یہ صورتِ حال مجھے زیادہ پسند تھی۔ رامون کے ساتھ میں بہت زیادہ متاثر ہو سکتا تھا۔ لیکن اس وقت میں پتھر بنا ہوا تھا اور پتھر ہی رہنا چاہتا تھا۔

وہ جنون کی سی حالت میں اپنے الفاظ چباتا رہا۔ وہ یقیناً سوچنے سے بچنے کے لیے بول رہا تھا۔ اس کے پاس سے مثانے کے کسی پرانے مریض کی طرح پیشاب کی بو آ رہی تھی۔ فطری طور پر میں اس سے متفق تھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا وہی کچھ میں بھی کہہ سکتا تھا، یعنی یوں مرنا فطری نہیں ہے: اور چونکہ میں مرنے جا رہا تھا، مجھے کوئی چیز فطری نہیں لگ رہی تھی: نہ کوئلے کے چورے کا ڈھیر، نہ بنچ اور نہ پیدرو کا بدنما چہرہ۔ بس میں وہی باتیں نہیں سوچنا چاہتا تھا جو ٹام سوچ رہا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ ہم رات بھر ہر پانچ منٹ بعد یہی باتیں بیک وقت سوچتے رہیں گے۔ میں نے پہلو کی جانب سے اس پر نظر ڈالی اور پہلی بار وہ مجھے عجیب لگا۔ اس نے موت اپنے چہرے پر اوڑھ رکھی تھی۔ میرا فخر مجروح ہو گیا۔ گزشتہ چوبیس گھنٹے سے میں ٹام کے ساتھ جیا تھا۔ میں نے اس کی باتیں سنی تھیں اور اس سے باتیں کی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ ہم میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ لیکن اب ہم اتنے ہی یکساں لگ رہے تھے جتنے کہ دو جڑواں بھائی، محض اس لیے کہ ہمیں ایک ساتھ مرنا تھا۔ ٹام نے میری طرف دیکھے بغیر میرا ہاتھ تھام لیا۔

"پابلو، میں سوچتا ہوں... میں سوچتا ہوں آیا یہ واقعی سچ ہے کہ ہر چیز ختم ہو جاتی ہے۔"

میں نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا، "اپنے پیروں کے درمیان تو دیکھو، سؤر۔"

اس کے پیروں کے درمیان ڈھیر سا غلیظ مائع تھا اور پتلون کی ٹانگوں سے قطرے ٹپک رہے تھے۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

"تم اپنی پتلون میں پیشاب کر رہے ہو،" میں نے اسے بتایا۔

"یہ غلط ہے،" اس نے مشتعل ہو کر کہا، "میں پیشاب نہیں کر رہا۔ مجھے کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا۔"

بیلجیئن ہمارے قریب آیا۔ اس نے مصنوعی پریشانی سے پوچھا، "کیا طبیعت خراب ہو رہی ہے؟"

ٹام نے جواب نہیں دیا۔ بیلجیئن نے غلیظ پانی کو دیکھا اور کچھ نہیں بولا۔

"مجھے معلوم نہیں یہ کیا ہے،" ٹام نے سخت غصے سے کہا، "لیکن میں خوفزدہ نہیں ہوں۔ میں قسم

Scanned with CamScanner

کھاتا ہوں میں خوفزدہ نہیں ہوں۔"

بیلیچین نے جواب نہیں دیا۔ ٹام اٹھ کر ایک کونے میں پیشاب کرنے گیا۔ وہ اپنی پتلون کے بٹن بند کرتا ہوا لوٹا اور کچھ بولے بغیر بیٹھ گیا۔ بیلیچین یادداشتیں قلم بند کر رہا تھا۔

ہم تینوں اسے دیکھ رہے تھے کیونکہ وہ زندہ تھا۔ اس کی نقل و حرکت اور تفکرات ایک زندہ انسان کی نقل و حرکت اور تفکرات تھے۔ وہ تہہ خانے میں اسی طرح کپکپا رہا تھا جس طرح زندوں کو کپکپانا چاہیے۔ اسے ایک فرمانبردار اور کھایا پیا جسم میسر تھا۔ ہم باقی لوگ اپنے جسموں کو بمشکل محسوس کر رہے تھے — کم از کم اس کی طرح تو نہیں کر رہے تھے۔ میں اپنی ٹانگوں کے درمیان پتلون کو چھو کر دیکھنا چاہتا تھا لیکن مجھ میں جرأت نہیں تھی۔ میں بیلیچین پر نظریں گاڑے ہوئے تھا جو اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو رہا تھا، جو اپنے عضلات پر قابو رکھتا تھا، جو آنے والے کل کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔ ہم اس پر نظریں گاڑے، خوں آشام پرندوں کی طرح اس کی زندگی چوس رہے تھے۔

آخرکار وہ چھوٹے جوان کے پاس گیا۔ کیا وہ اس کی گردن کسی پیشہ ورانہ مقصد کے لیے سہلانا چاہتا تھا، یا وہ ترس کھانے کی لمحاتی کیفیت کے تابع تھا؟ اگر اس کا عمل ترس کھانے کے لیے تھا تو یہ رات بھر میں صرف ایک ہی بار تھا۔

وہ جوان کا سر اور گردن سہلانے لگا۔ لڑکے نے خود کو اس کے حوالے کر دیا۔ وہ اپنی نظریں اس پر گاڑے رہا۔ پھر اچانک اس نے بیلیچین کا ہاتھ تھام لیا اور اسے عجیب طور سے دیکھنے لگا۔ اس نے بیلیچین کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے رکھا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں کوئی خوش کن بات نہ تھی۔ دو خاکستری چمٹے ایک موٹے اور سرخی مائل ہاتھ کو تھامے ہوئے تھے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے اور یقیناً ٹام نے بھی اندازہ کر لیا ہوگا؛ لیکن بیلیچین قطعاً غافل تھا، وہ پدرانہ طور سے مسکراتا رہا۔ لمحہ بھر کے بعد لڑکے نے اس موٹے سرخ ہاتھ کو اپنے منھ کے قریب لا کر اسے کاٹنے کی کوشش کی۔ بیلیچین نے جلدی سے ہاتھ کھینچا اور لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگا۔ ایک ثانیے کے لیے اس نے ہمیں دہشت سے دیکھا۔ وہ یقیناً اچانک سمجھ گیا ہوگا کہ ہم اس کی طرح انسان نہیں ہیں۔ مجھے ہنسی آ گئی اور ایک سنتری اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرا سو رہا تھا۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھیں بے عکس تھیں۔

میں بیک وقت سکون اور ضرورت سے زیادہ ہیجان محسوس کر رہا تھا۔ میں اس بارے میں اور سوچنا

نہیں چاہتا تھا کہ علی الصباح کیا ہوگا یا موت کیسی ہوگی۔ اس کی کوئی تُک نہیں تھی۔ مجھے صرف الفاظ میسر تھے یا پھر خالی پن۔ لیکن جونہی میں کسی اور بات کے بارے میں سوچنے کی کوشش کرتا رائفلوں کی نالیں میری طرف اشارہ کرتی نظر آتیں۔ اپنی موت کا عالم مجھ پر غالباً بیس بار گزرا؛ ایک دفعہ تو میں نے سوچا کہ یہ آخری بار ہے۔ میں یقیناً ایک منٹ کو سو گیا ہوں گا۔ وہ مجھے دیوار کی جانب کھینچ رہے تھے اور میں مزاحمت کر رہا تھا۔ میں رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ میں ہڑبڑا کر جاگ اٹھا اور بیلجیئن کی طرف دیکھنے لگا؛ مجھے ڈر تھا کہ میں نیند میں چلایا ہوں گا۔ لیکن وہ اپنی مونچھیں سہلا رہا تھا، اس نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ اگر میں چاہتا تو کچھ دیر سو سکتا تھا، میں اڑتالیس گھنٹے سے جاگ رہا تھا۔ میں اپنی برداشت کی آخری حد پر تھا۔

لیکن میں زندگی کے دو گھنٹے گنوانا نہیں چاہتا تھا: وہ پو پھٹے مجھے جگانے آئیں گے۔ میں نیند سے حواس باختہ ان کے پیچھے چل پڑوں گا اور بھرائی ہوئی آواز میں اُف بھی نہ کر سکوں گا۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا؛ میں جانوروں کی طرح مرنا نہیں چاہتا تھا، میں سمجھنا چاہتا تھا۔ پھر مجھ پر بدخواب دیکھنے کا خوف طاری ہو گیا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور ادھر ادھر چلنے لگا اور اپنے خیالات بدلنے کے لیے گزری ہوئی زندگی کے بارے میں سوچنے لگا۔ منتشر یادوں کا ایک ہجوم میرے پاس لوٹ آیا جو اچھی بھی تھیں اور بری بھی، یا کم از کم پہلے میں انھیں اسی طرح پکارتا تھا۔ میرے سامنے چہرے اور واقعات تھے۔ میں نے ایک کم عمر نوویئیرو کا چہرہ دیکھا جسے والنسیا میں کلیسائی تعطیل کے موقع پر ایک سانڈ نے اپنے سینگوں سے چھید دیا تھا۔ اپنے ایک چچا کا چہرہ دیکھا، رامون گریس کا چہرہ دیکھا۔ مجھے اپنی ساری زندگی یاد آ گئی۔ کس طرح میں ۱۹۲۶ء میں تین مہینے بے روزگار رہا تھا؛ کس طرح میں بھوک سے مرتے مرتے بچا تھا۔ مجھے وہ رات یاد آ گئی جو میں نے غرناطہ میں ایک بنچ پر گزاری تھی۔ میں نے تین دن سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ میں ناراض تھا، میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس یاد نے مجھے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ میں کس دیوانگی سے مسرت، عورتوں اور آزادی کے پیچھے بھاگتا تھا۔ کیوں؟ میں اسپین کو آزاد کرانا چاہتا تھا۔ میں مارگل کا مداح تھا۔ میں انارکسٹ تحریک میں شامل تھا۔ میں عوامی اجتماعات میں تقریریں کرتا تھا۔ میں ہر بات کو اس سنجیدگی سے لیتا تھا گویا کہ میں لافانی ہوں۔

اس لمحے مجھے لگا کہ میری ساری زندگی میرے سامنے ہے اور میں نے سوچا، ''یہ تو محض جھوٹ کا پلندا ہے۔'' میری زندگی بے مایہ تھی کیونکہ یہ ختم ہو گئی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ میں کس طرح چلنے کے قابل

Scanned with CamScanner

تھا، کس طرح لڑکیوں کے ساتھ ہنسنے کے لائق تھا۔ اگر مجھے ذرا بھی گمان ہوتا کہ میں اس طرح مروں گا تو میں اپنی چھنگلیا تک نہ ہلاتا۔ میری زندگی، کسی تھیلے کی طرح بند اور سربمہر، میرے سامنے تھی۔ مگر اس تھیلے میں بند ہر شے نامکمل تھی۔ لمحہ بھر کے لیے میں نے اسے پرکھنے کی کوشش کی۔ میں اپنے آپ سے کہنا چاہتا تھا، یہ ایک خوبصورت زندگی ہے۔ لیکن میں اس پر فیصلہ نہیں دے سکتا تھا، کہ یہ محض ایک سرسری خاکہ تھی۔ میں نے اپنا وقت ابدیت کی جعل سازی کرنے میں گنوایا تھا۔ میں کچھ نہیں سمجھ پایا تھا۔ مجھے کسی چیز کی کمی کا احساس نہیں تھا۔ بے شمار ایسی چیزیں تھیں جن کی کمی محسوس ہونی چاہیے تھی: میز انیلا کا ذائقہ یا گرما کے وہ غسل جو میں کادیز کے نزدیک ایک چھوٹی سی کھاڑی میں کیا کرتا تھا؛ لیکن موت نے ہر چیز کا سحر توڑ دیا تھا۔

اچانک بیلجیئن کو ایک نادر خیال آیا۔ ”دوستو،“ اس نے ہمیں بتایا ”اگر فوجی انتظامیہ نے اجازت دی تو میں تمھارا پیغام بھجوانے کی ذمے داری لیتا ہوں، جو تم سے محبت کرنے والوں کے لیے ایک یادگار ہوگی۔“

ٹام بڑبڑایا، ”میرا کوئی نہیں ہے۔“

میں کچھ نہیں بولا۔ ٹام نے لمحہ بھر توقف کیا، پھر حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ ”تمھیں کونچا کو کچھ نہیں کہلوانا؟“

”نہیں۔“

اس تکلیف دہ ساز باز سے مجھے نفرت محسوس ہوئی۔ قصور میرا اپنا تھا۔ گزشتہ رات میں نے کونچا کے بارے میں بات کی تھی۔ مجھے اپنے آپ پر قابو رکھنا چاہیے تھا۔ میں اس کے ساتھ ایک سال رہا تھا۔ گزشتہ رات اسے پانچ منٹ ملنے کے لیے میں جان دے سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اس کے بارے میں بات کی تھی۔ یہ خواہش مجھ سے زیادہ طاقتور تھی۔ اب مجھے اس سے ملنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ اب مجھے اس سے کچھ نہیں کہنا تھا۔ اب میں اسے اپنے بازوؤں میں بھی نہ لیتا۔ اپنے جسم نے مجھے دہشت زدہ کر دیا تھا، کہ وہ میلا اور پسینے میں ڈوبا ہوا تھا — اور مجھے اس بات کا یقین نہیں تھا کہ مجھے کونچا کے جسم سے دہشت نہیں ہوگی۔ کونچا کو جب معلوم ہوگا کہ میں مر گیا ہوں تو وہ بین کرے گی اور مہینوں تک زندگی سے لطف اندوز نہیں ہوگی۔ مگر اس کے باوجود جسے مرنا تھا وہ تو میں تھا۔ میں اس کی نرم، حسین

آنکھوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ جب وہ مجھے دیکھتی تو اس میں سے کوئی چیز نکل کر مجھ تک پہنچتی تھی۔ مگر میں جانتا تھا کہ قصہ اب ختم ہو چکا ہے۔ اگر وہ اب مجھے دیکھتی تو اس کی نظر اس کی آنکھوں ہی میں رہتی، مجھ تک نہ پہنچ پاتی۔ میں تنہا تھا۔

ٹام بھی تنہا تھا مگر میری طرح نہیں۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا اور ایک طرح کی مسکراہٹ کے ساتھ بنچ کو گھور رہا تھا۔ وہ حیرت زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر لکڑی کو اس احتیاط سے چھوا جیسے کسی شے کو توڑنے سے خائف ہو۔ پھر اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچا اور جھرجھری لی۔ اگر میں ٹام ہوتا تو بنچ کو ہاتھ لگا کر کبھی دل نہ بہلاتا؛ یہ ایک اور آئرش حماقت تھی۔ لیکن اشیا کی مضحکہ خیز صورت کو میں نے بھی محسوس کیا۔ وہ ٹھوس کم تھیں اور نابود زیادہ۔ یہ محسوس کرنے کے لیے کہ میں مرنے جا رہا ہوں، میرے لیے بنچ، لیمپ یا کوئلے کے ڈھیر پر نظر ڈالنا کافی تھا۔ فطری طور پر میں اپنی موت کے بارے میں واضح انداز میں نہیں سوچ سکتا تھا، لیکن چیزوں پر اسے ہر کہیں دیکھ رہا تھا جو ایک خاص انداز سے پیچھے ہٹ کر اپنا فاصلہ برقرار رکھے ہوئے تھیں؛ بالکل اسی طرح جیسے قریب المرگ آدمی کے سرہانے لوگ سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہیں۔ ٹام نے ابھی بنچ پر جسے چھوا تھا وہ اس کی اپنی موت تھی۔

اس کیفیت میں اگر کوئی آ کر مجھے یہ بتاتا کہ میں خاموشی سے گھر جا سکتا ہوں، کہ وہ مجھے میری زندگی ثابت وسالم بخش دیں گے، تو میں یکسر سُن ہو جاتا: جب آدمی ابدی ہونے کے وہم سے نکل آئے تو پھر چند گھنٹوں یا چند سالوں کے انتظار میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ میرے پاس تھامنے کو کچھ نہ تھا۔ میں ایک طرح سے پرسکون تھا۔ لیکن یہ ایک وحشت انگیز سکون تھا، جس کی وجہ میرا جسم تھا، کہ میں اسی کی آنکھوں سے دیکھتا اور اسی کے کانوں سے سنتا تھا۔ میرا جسم اب میرے ساتھ نہیں تھا۔ وہ آپ ہی آپ پسینے میں ڈوب رہا تھا اور خود بخود کانپ رہا تھا۔ وہ اب میری شناخت سے باہر تھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ کیا ہو رہا ہے، مجھے اس کو چھونا پڑتا تھا، اس پر نظر ڈالنی پڑتی تھی گویا وہ کسی اور کا جسم ہو۔ کبھی کبھار جب میں اسے محسوس کر سکتا تو مجھے اس شخص کی طرح اپنے ڈوبنے اور گرنے کا احساس ہوتا جس کا ہوائی جہاز نوک کے بل غوطہ لگا رہا ہو، یا پھر مجھے اپنا دل دھڑکتا محسوس ہوتا۔ لیکن اس بات سے مجھے تقویت نہیں ملتی تھی۔ میرے جسم سے آنے والا ہر اشارہ الٹا تھا۔ وہ بیشتر وقت خاموش تھا اور مجھے ایک طرح کے بوجھ کے علاوہ کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا جیسے کوئی غلیظ وجود میرے مقابل ہو۔ میرا تاثر یہ تھا کہ میں کسی بہت بڑے

Scanned with CamScanner

کپڑے سے بندھا ہوا ہوں۔ ایک بار میں نے اپنی پتلون کو چھوا اور مجھے محسوس ہوا وہ گیلی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ نمی پسینے کی تھی یا پیشاب کی لیکن احتیاط کے طور پر میں کوئلے کے ڈھیر پر پیشاب کرنے گیا۔

بیلجیئن اپنی گھڑی نکال کر دیکھنے لگا۔ وہ بولا، ''ساڑھے تین بجے ہیں۔''

نطفہ حرام! اس نے قصداً ایسا کیا ہوگا۔ ٹام اچھل پڑا۔ ہم نے غور نہیں کیا تھا، وقت تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ رات کسی بے ہیئت تیرہ و تار ڈھیر کی طرح ہمیں گھیرے ہوئے تھی۔ مجھے تو اس کا آغاز بھی یاد نہیں تھا۔

کم عمر جوان نے رونا شروع کر دیا۔ وہ اپنے ہاتھ مروڑ مروڑ کر گڑگڑانے لگا، ''میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔'' وہ ہوا میں اپنے بازو لہراتا سارے تہہ خانے میں دوڑتا رہا، پھر سسکیاں لیتے ہوئے چٹائی پر گر گیا۔ تشفی دینے کی خفیف سی خواہش کے بغیر ٹام اسے ماتمی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اسے تشفی دینے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ لڑکا ہم سے زیادہ شور مچا رہا تھا لیکن وہ متاثر کم تھا۔ وہ اس بیمار شخص کی طرح تھا جو اپنی بیماری کے خلاف اپنا دفاع بخار کے ذریعے کرتا ہے۔ مگر جب بخار نہ ہو تو معاملہ کہیں زیادہ گمبھیر ہوتا ہے۔

وہ رو رہا تھا۔ میں صاف طور پر دیکھ سکتا تھا کہ وہ خود پر ترس کھا رہا ہے۔ وہ موت کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔ میں آپ ایک لمحے کو، فقط ایک لمحے کو خود پر ترس کھاتے ہوئے رونا چاہتا تھا۔ لیکن ہوا اس کے برعکس۔ میں نے لڑکے پر نظر ڈالی۔ میں نے سسکیوں سے مرتعش اس کے دبلے بازوؤں کو دیکھا اور خود کو غیر انسانی محسوس کیا۔ میں اوروں پر ترس کھا سکتا تھا نہ خود پر۔ میں نے اپنے آپ سے کہا، ''میں اس آلائش سے پاک مرنا چاہتا ہوں۔''

ٹام اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ گول سوراخ کے بالکل نیچے گیا اور پو پھٹنے کے آثار دیکھنے لگا۔ میں پاک صاف مرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا اور صرف یہی سوچ رہا تھا۔ لیکن جب سے ڈاکٹر نے ہمیں وقت بتایا تھا، میں وقت کو اڑتا، قطرہ قطرہ بہتا محسوس کر رہا تھا۔

ابھی اندھیرا ہی تھا کہ میں نے ٹام کی آواز سنی۔ ''ان کے قدموں کی آواز سن رہے ہو؟''

''ہاں۔''

فوجی صحن میں مارچ کر رہے تھے۔

Scanned with CamScanner

''یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ اندھیرے میں تو گولی نہیں ماری جاسکتی۔''

کچھ دیر بعد آوازیں آنا بند ہوگئیں۔ میں نے ٹام سے کہا: ''دن نکل آیا ہے۔''

پیدرو جمائیاں لیتا ہوا اُٹھا اور بڑھ کر لیمپ بجھا دیا۔ اس نے اپنے ساتھی سے کہا: ''بلا کی سردی ہے۔''

تہہ خانہ تمام خاکستری تھا۔ ہم نے دوری پر گولیوں کی آواز سنی۔

''کام شروع ہو رہا ہے،'' میں نے ٹام کو بتایا۔ ''انھیں یہ کام پچھواڑے کے احاطے میں کرنا ضروری ہے۔''

ٹام نے ڈاکٹر سے سگریٹ مانگا۔ مجھے سگریٹ درکار نہیں تھا۔ مجھے سگریٹ یا الکحل کی طلب نہیں تھی۔ اس لمحے کے بعد سے انھوں نے فائرنگ بند نہیں کی۔

''جو ہو رہا ہے تمھیں اس کا احساس ہے؟'' ٹام نے پوچھا۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر خاموش رہا۔ اس نے دروازے پر نظریں جما رکھی تھیں۔ دروازہ کھلا اور ایک لیفٹیننٹ چار سپاہیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ٹام نے سگریٹ چھوڑ دیا۔

''اسٹائن بوک؟''

ٹام نے جواب نہیں دیا۔ پیدرو نے اس کی جانب اشارہ کیا۔

''حوان میربل؟''

''چٹائی پر ہے۔''

''اٹھو،'' لیفٹیننٹ نے کہا۔

حوان نے کوئی جنبش نہیں کی۔ دو سپاہیوں نے اس کے بازوؤں کے نیچے ہاتھ دے کر اسے اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ لیکن جونہی انھوں نے اسے چھوڑا وہ نیچے گر گیا۔

سپاہی ہچکچانے لگے۔

''یہ کوئی پہلا بیمار تو نہیں ہے،'' لیفٹیننٹ نے کہا۔ ''تم اسے لے چلو، اس کا بندوبست وہیں ہو جائے گا۔''

وہ ٹام کی جانب مڑا۔ ''چلو۔''

ٹام دو سپاہیوں کے درمیان باہر چلا گیا۔ باقی دو لڑکے کو بغلوں اور ٹانگوں سے اٹھائے، پیچھے چل

پڑے۔ وہ غشی میں نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور آنسو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ جب میں باہر نکلنے لگا تو لیفٹیننٹ نے مجھے روک دیا۔

"تم ابیئیتا ہو؟"

"ہاں۔"

"تم یہیں ٹھہرو۔ وہ تمھیں لینے بعد میں آئیں گے۔"

وہ رخصت ہو گئے۔ بیلجیئن اور دونوں جیلر بھی چلے گئے۔ میں تنہا رہ گیا۔ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے، میں یہ سمجھ نہیں پایا۔ لیکن وہ یہ کام فوری طور پر نمٹا دیتے تو یہ بات زیادہ پسندیدہ ہوتی۔ میں فائرنگ کی آواز باقاعدہ وقفوں سے سن رہا تھا اور ہر فائر کے ساتھ ہل جاتا تھا۔ میں چیخ چیخ کر اپنے بال نوچنا چاہتا تھا، لیکن میں نے دانت کچکچا کر ہاتھ جیبوں میں ڈال لیے، کہ میں پاک صاف رہنا چاہتا تھا۔

گھنٹے بھر بعد وہ مجھے لینے آئے اور پہلی منزل پر ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئے جو سگاروں کی بو سے بھرا تھا۔ کمرے میں دم گھونٹنے والی حرارت تھی۔ دو افسر گھٹنوں پر کاغذات رکھے، ہتھے والی کرسیوں پر بیٹھے تمباکو نوشی کر رہے تھے۔

"ابیئیتا تم ہو؟"

"ہاں۔"

"رامون گرِیس کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

مجھ سے سوال کرنے والا پستہ و فربہ تھا۔ عینک کے پیچھے بھی اس کی نظریں سخت گیر تھیں۔ وہ مجھ سے بولا، "ادھر آؤ۔"

میں اس کے پاس گیا۔ اس نے اٹھ کر میرے بازو پکڑ لیے اور ایسی نظروں سے مجھے گھورا جو زمین میں دھنسا دیتیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی پوری طاقت سے میرے بازوؤں پر چٹکی لی۔ لیکن یہ عمل مجھے آزار پہنچانے کے لیے نہیں تھا۔ یہ فقط ایک کھیل تھا۔ وہ مجھ پر حاوی ہونا چاہتا تھا۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ اسے اپنا متعفن سانس عین میرے چہرے پر چھوڑنا ہے۔ ہم لمحہ بھر اسی طرح رہے۔ میں تقریباً ہنستے ہنستے رہ گیا۔ مرنے والے آدمی کو ڈرانے کے لیے بہت کچھ درکار ہوتا ہے۔ سو یہ عمل بے

Scanned with CamScanner

سود رہا۔ وہ مجھے زور سے پیچھے دھکیل کر دوبارہ بیٹھ گیا۔ اس نے کہا، ''اُس کی زندگی کے مقابلے میں تمھاری اپنی زندگی ہے۔ اگر تم اس کا ٹھکانا بتادو تو تمھاری زندگی برقرار رہے گی۔''

گھڑسواری کے چابکوں اور بوٹوں کے ساتھ ٹھاٹ باٹ سے ملبوس ان لوگوں کو بھی مرنا تھا۔ مجھ سے کچھ دیر بعد سہی، مگر بہت زیادہ دیر بعد نہیں۔ وہ اپنے مڑے تڑے کاغذوں میں نام تلاش کرتے تھے، دوسروں کو مقید کرنے یا ان کا خاتمہ کرنے کے لیے ان کا پیچھا کرتے تھے۔ اسپین کے مستقبل یا دوسرے موضوعات پر اپنی رائے رکھتے تھے۔ مجھے ان کی چھوٹی مصروفیتیں سخت صدمہ انگیز اور جعلی لگتی تھیں۔ میں خود کو ان کی جگہ نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں انھیں پاگل گردانتا تھا۔ گھڑسواری کے چابک سے اپنے جوتے تھپتھپاتے ہوئے پستہ قد آدمی ہنوز مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نپی تلی حرکات کا مقصد اسے ایک زندہ اور خوں آشام درندے کا روپ دینا تھا۔

''تو؟ تم سمجھے؟''

'مجھے معلوم نہیں کہ گرِیس کہاں ہے،'' میں نے جواب دیا۔ ''میرا خیال تھا کہ وہ میڈرڈ میں ہے۔''

دوسرے افسر نے نکلے پن سے اپنا زردی مائل ہاتھ بلند کیا۔ یہ نکما پن بھی نپا تلا تھا۔ میں ان کے تمام چھوٹے چھوٹے منصوبے بھانپ گیا اور یہ جان کر سخت بے لطف ہوا کہ اپنے آپ کو اس طور بہلانے والے بھی ہوتے ہیں۔

''تمھارے پاس سوچنے کے لیے چوتھائی گھنٹہ ہے،'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''اسے لانڈری میں لے جاؤ اور پندرہ منٹ بعد واپس لاؤ۔ اگر یہ پھر بھی انکار کرتا ہے تو اسے موقعے پر ہی ختم کردو۔''

انھیں معلوم تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ گزشتہ رات میں نے انتظار میں گزاری تھی؛ پھر انھوں نے مجھے تہہ خانے ایک گھنٹہ منتظر رکھا تھا جب کہ انھوں نے اس دوران ٹام اور حوان کو گولی ماری تھی، اور اب وہ مجھے لانڈری میں قید کر رہے تھے۔ یقیناً انھوں نے اپنا منصوبہ ایک رات پہلے بنایا ہوگا۔ انھوں نے سوچا ہوگا، اعصاب آخر کار جواب دے جاتے ہیں۔ انھیں امید تھی کہ وہ اس طرح مجھے زیر کرلیں گے۔

وہ بڑی غلط فہمی میں تھے۔ میں لانڈری میں اسٹول پر بیٹھ گیا کیونکہ میں بہت کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ میں سوچنے لگا، مگر ان کی تجویز کے بارے میں نہیں۔ یقیناً مجھے گرِیس کا ٹھکانہ معلوم تھا۔ وہ شہر سے چار کلومیٹر دور اپنے عم زادوں کے ہاں چھپا ہوا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ جب تک وہ مجھے تشدد کا نشانہ

نہیں بنائیں گے میں اس کی پناہ گاہ کا پتا افشا نہیں کروں گا (مگر لگتا تھا وہ اس بارے میں نہیں سوچ رہے ہیں)۔ یہ سب کچھ بالکل منظم اور حتمی تھا اور میرے لیے کسی پہلو سے باعثِ دلچسپی نہ تھا۔ مجھے تو صرف اپنے رویے کی وجوہات سمجھنے میں دلچسپی تھی۔ مجھے گریس سے غداری کی نسبت مرنا قبول تھا۔ کیوں؟ میں اب رامون گریس کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے لیے میری دوستی سحر سے تھوڑی دیر قبل مر چکی تھی، عین اس وقت جب کونچا کے لیے میری محبت نے دم توڑا تھا، عین اس وقت جب میری زندہ رہنے کی خواہش ختم ہوئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ گریس کے بارے میں میرے خیالات بہت ارفع تھے۔ وہ جری تھا، لیکن اس کی جگہ مرنے پر آمادگی کی وجہ یہ نہیں تھی۔ اس کی زندگی کی قیمت میری زندگی سے زیادہ نہیں تھی۔ کسی زندگی کی قیمت تھی ہی نہیں۔ انھیں تو آدمی کو دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑا کرنا تھا اور اس وقت تک گولیاں چلانا تھیں جب تک وہ مر نہ جائے؛ خواہ وہ آدمی میں ہوں یا گریس یا کوئی اور، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں جانتا تھا کہ اسپین کے نصب العین کے لیے میری نسبت وہ زیادہ کارآمد تھا، لیکن میں اسپین اور انارکی، سب کو جہنم رسید کر رہا تھا۔ میرے لیے کوئی چیز اہم نہیں تھی۔ اس کے باوجود میں اڑا ہوا تھا۔ میں گریس کا ٹھکانا بتا کر اپنی جان بچا سکتا تھا، لیکن میں ایسا کرنے سے انکار کر رہا تھا۔

مجھے یہ بات کسی نہ کسی وجہ سے مضحکہ خیز لگی۔ یہ ہٹ دھرمی تھی۔ میں نے سوچا، ''مجھے لازماً ضدی رہنا ہے!'' اور ایک پر لطف قسم کی شادمانی مجھ پر طاری ہو گئی۔

آخرکار وہ مجھے انھیں دو افسروں کے پاس واپس لے گئے۔ ایک چوہا میرے پاؤں کے نیچے سے نکل بھاگا۔ مجھے تفریح کی سوجھی۔ میں نے ایک فلانجسٹ کی طرف منھ کر کے کہا، ''تم نے چوہا دیکھا؟''

اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ بہت متین اور اپنے میں خاصا سنجیدہ تھا۔ مجھے ہنسی آ رہی تھی لیکن میں نے اپنے آپ کو روکا، کیونکہ مجھے خوف تھا کہ ایک بار ہنسا تو پھر رک نہ پاؤں گا۔ اس فلانجسٹ کے چہرے پر مونچھیں تھیں۔ میں دوبارہ اس سے مخاطب ہوا: ''تمھیں اپنی مونچھیں مونڈ دینی چاہییں، احمق۔'' یہ بات کہ وہ اپنے زندہ وجود کے بالوں کو اپنے چہرے پر حملہ آور ہونے دے رہا ہے، میرے خیال میں مضحکہ خیز تھی۔ اس نے بے یقینی سے مجھے لات رسید کی اور میں خاموش ہو گیا۔

''ہاں،'' موٹے افسر نے کہا۔ ''تم نے سوچ لیا؟''

کسی نادر نوع کے کیڑوں کی طرح میں نے انھیں تجسس سے دیکھا۔ میں نے انھیں بتایا، ''مجھے

Scanned with CamScanner

معلوم ہے وہ کہاں ہے۔ وہ قبرستان میں چھپا ہوا ہے۔ کسی تابوت خانے یا گورکنوں کے جھونپڑے میں۔"

یہ ایک ڈھونگ تھا۔ میں انھیں اچھل کر کھڑے ہوتے اور اپنی پیٹیاں کس کر تیزی سے احکامات صادر کرتے دیکھنا چاہتا تھا۔

وہ اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ "چلو، مولیز۔ لیفٹیننٹ لوپیز سے پندرہ آدمی لے لو۔ تم..." پستہ و فربہ شخص بولا، "اگر تم سچ بول رہے ہو تو میں تمھیں چھوڑ دوں گا۔ لیکن اگر ہمیں بے وقوف بنا رہے ہو تو یہ تمھیں بہت مہنگا پڑے گا۔"

وہ بھگدڑ مچاتے ہوئے رخصت ہوئے اور میں فلانجسٹوں کی نگرانی میں سکون سے انتظار کرنے لگا۔ یہ سوچ کر کہ ان کا کیا تماشا بنے گا، میں وقفے وقفے سے مسکراتا رہا۔ مجھے اپنے بے حس اور کینہ جو ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ میں چشم تصور سے دیکھ رہا تھا کہ وہ قبروں کے پتھر اٹھا رہے ہیں اور ایک ایک کر کے تابوت خانوں کے دروازے کھول رہے ہیں۔ میں یہ صورت حال اپنے سامنے اس طرح پیش کر رہا تھا گویا کہ میں کوئی اور ہوں۔ یہ قیدی ہٹ دھرمی سے ہیرو بن رہا ہے۔ یہ مونچھوں والے تند خو فلانجسٹ اور ان کے وردی پوش آدمی قبروں کے درمیان دوڑ رہے ہیں۔ یہ سب بے انتہا مضحکہ خیز تھا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ پستہ و فربہ شخص تنہا واپس آیا۔ میرا خیال تھا وہ مجھے ختم کرنے کا حکم دینے آیا ہے۔ اس کے باقی ساتھی یقیناً قبرستان ہی میں ٹھہر گئے ہوں گے۔

وہ افسر مجھے دیکھنے لگا۔ وہ ذرا بھی جھینپا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔ "اسے دوسرے لوگوں کے ساتھ بڑے صحن میں لے جاؤ،" اس نے کہا، "اس کی قسمت کا فیصلہ فوجی کارروائی کے بعد ایک باقاعدہ عدالت کرے گی۔"

میرا خیال نہیں تھا کہ میں اس کی بات سمجھ پایا ہوں۔ میں نے پوچھا، "یعنی مجھے... گولی نہیں ماری جائے گی؟"

"بہر حال، فی الوقت نہیں۔ بعد میں کیا ہوتا ہے مجھے اس سے غرض نہیں۔"

میں اب بھی نہیں سمجھا تھا۔ میں نے پوچھا، "مگر کیوں...؟"

اس نے جواب دیے بغیر اپنے کندھے اُچکائے اور سپاہی مجھے باہر لے گئے۔ بڑے صحن میں کوئی سو کے قریب قیدی تھے جن میں عورتیں، بچے اور چند بوڑھے تھے۔ میں گھاس کے مرکزی قطعے

Scanned with CamScanner

کے گرد ٹہلنے لگا۔ میں بدحواس ہو کر رہ گیا تھا۔ دوپہر کو وہ ہمیں کھانے کے لیے طعام گاہ میں لے گئے۔ دو تین آدمیوں نے مجھ سے سوال کیے۔ میں یقیناً انھیں جانتا ہوں گا مگر میں نے جواب نہیں دیا۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔

شام کے قریب انھوں نے دس نئے قیدی صحن میں دھکیل دیے۔ میں نے گارشیا نانبائی کو پہچان لیا۔ وہ بولا، ''واہ، کیا قسمت پائی ہے تم نے! میں نہیں سمجھتا تھا کہ تمھیں زندہ دیکھ پاؤں گا۔''

''انھوں نے مجھے موت کی سزا سنائی تھی،'' میں نے کہا، ''مگر پھر انھوں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ مجھے معلوم نہیں انھوں نے ایسا کیوں کیا۔''

''انھوں نے مجھے دو بجے گرفتار کیا تھا،'' گارشیا نے کہا۔

''کیوں؟'' گارشیا کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

''معلوم نہیں،'' اس نے کہا، ''وہ ہر اس شخص کو گرفتار کر لیتے ہیں جو اُن کی طرح نہیں سوچتا۔'' اس نے اپنی آواز مدھم کی: ''انھوں نے گِریس کو پکڑ لیا ہے۔''

میں کانپ گیا۔ ''کب؟''

''آج صبح۔ اس کی غلطی نے سب برباد کر دیا۔ منگل کو اپنے عم زاد سے تکرار کے بعد وہ اس کے ہاں سے نکل آیا تھا۔ اسے پناہ دینے والے بے شمار لوگ تھے مگر وہ کسی کا کوئی احسان لینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کہا: میں اِبیئیتا کے ہاں جا کر چھپ جاتا مگر وہ پکڑا گیا ہے، سو میں قبرستان میں چھپ جاؤں گا۔''

''قبرستان میں؟''

''ہاں۔ کیسا بے وقوف آدمی! بلاشبہ وہ آج وہاں سے گزرے۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ انھوں نے گورکنوں کے جھونپڑے میں اسے پالیا۔ اس نے ان پر گولی چلائی اور انھوں نے اسے پکڑ لیا۔''

''قبرستان میں؟''

ہر چیز گھومنے لگی اور میں نے خود کو زمین پر بیٹھا پایا۔ مجھے اتنے زور کی ہنسی آئی کہ میرے آنسو نکل پڑے۔

❁❁

Scanned with CamScanner

## سودیش دیپک

ہندی سے ترجمہ: اجمل کمال

# کورٹ مارشل

''دس جون کی رات نو بجے جوان رام چندر نے اپنی یونٹ کے دو افسروں پر سرکاری رائفل سے گولی چلائی۔ ایک افسر کیپٹن موہن ورما موقع واردات پر ہی مر گیا۔ دوسرا افسر کیپٹن کپور شدید زخمی ہو گیا۔ گولی اس کے کندھے پر لگی۔ اگر فوجی اسپتال میں اس کا فوری آپریشن نہ کیا جاتا تو شاید وہ بھی مر جاتا۔ ڈاکٹروں کی رپورٹ کے مطابق اگر گولی دو انچ نیچے لگتی تو کیپٹن بی ڈی کپور کی بھی موت ہو جاتی۔ بھارتی فوج کے قانون کی دفعہ ٦٨ اور بھارتی قانون کی دفعہ ٣٠٢ کے تحت جوان رام چندر پر اس جنرل کورٹ مارشل میں قتل کا مقدمہ چلایا جاتا ہے،'' سرکاری وکیل میجر پوری نے اعلان کیا۔

کورٹ مارشل کے سربراہ کرنل صورت سنگھ نے کمرے میں بیٹھے جوانوں اور افسروں پر نگاہیں دوڑائیں، سب کے چہرے پتھرائے ہوئے، نہ کہیں تجسس نہ اندیشہ۔ کورٹ مارشل کے فیصلے کا سب کو پہلے سے پتا جو ہے — سزائے موت۔ خود جوان رام چندر نے قبول کر لیا ہے کہ اس نے گولی چلائی تھی دونوں افسروں پر۔ کرنل کی نگاہ کیپٹن بی ڈی کپور کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے ٹکی۔ اس کی آنکھوں میں انھوں نے ایک وحشی خوشی دیکھی۔ کیپٹن ان کی طرف دیکھ کر ہلکے سے مسکرایا۔ کرنل کے ہونٹوں میں کساؤ آیا۔ انھوں نے کورٹ مارشل کے صلاح کار جج ایڈووکیٹ سے کچھ کہا۔ دونوں نے سرکاری وکیل میجر پوری کی طرف دیکھا۔

اس سے پہلے کہ وہ اٹھے، دفاع کے وکیل کیپٹن بکاش رائے نے اعتراض کیا، ''سر، میجر پوری

نے دو بار جوان رام چندر کہا ہے۔ انھیں سوار رام چندر کہنا چاہیے۔"

کرنل صورت سنگھ اب کیپٹن پرکاش رائے کو لگاتار گھور رہے تھے۔ سب کو پتا چل گیا کہ کیپٹن کی خیر نہیں۔ کرنل صاحب اب تک دس کورٹ مارشلوں کے سربراہ رہ چکے تھے اور ان کا دیا ہوا فیصلہ کبھی نہیں بدلا۔ پنجاب کے اس جاٹ سکھ افسر نے ۱۹۷۱ء کی جنگ میں گلے میں گرینیڈوں کی مالا پہنے ہوے، ران اور بازو میں گولی لگنے کے باوجود، دشمن چوکی پر صرف دو جوانوں کے ساتھ دھاوا بول دیا تھا۔ انھیں مہاویر چکر ملا اور گلے میں گرینیڈوں والی مالا کی تصویر اخباروں میں چھپی۔ ان کے نیچے کام کرنے والے افسروں اور جوانوں نے انھیں کبھی اونچا بولتے نہیں سنا۔ کرنل صورت سنگھ کا کسی کو گھور کر دیکھنا ہی بہت ہے۔

کمرے میں جاری نظروں کی جنگ کا تناؤ اب سرک کر سب کو چھو گیا۔ یہ دبلا پتلا، چھوٹے قد کا بنگالی افسر کیپٹن پرکاش رائے آنکھیں کیوں نہیں جھکاتا؟ کچھ نے سوچا، بے وقوف ہے۔ اسے پتا جو نہیں کہ کرنل صاحب ڈسپلن کے معاملے میں پوری بھارتی فوج میں سب سے سخت افسر ہیں۔ باقی کچھ لوگوں نے سوچا، ہوسکتا ہے کرنل صاحب دفاع کے وکیل کو بدلنے کی ہدایت دیں اور کورٹ مارشل کچھ دنوں کے لیے روکنا پڑے۔

"کیپٹن پرکاش رائے، آپ اور باقی سب لوگ بھی کان کھول کر سن لیں، یہ کورٹ مارشل ہے، کوئی ہندی فلم نہیں۔ فضول اعتراضات اور دیر کرنے کے داؤ پیچ سے کسی کو کورٹ کا وقت ضائع کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ از دیٹ کلیئر ٹو ایوری ون آف یو؟ رام چندر جوان ہے کہ نہیں؟ سوار کہنے سے کیا فرق پڑ جائے گا؟"

سب کا خیال تھا، بنگالی کیپٹن بیٹھ جائے گا، لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس نے کرنل کی طرف دیکھنا اب بھی جاری رکھا۔ "سر، فرق ہے بھی اور نہیں بھی۔ آپ انفنٹری کے کرنل ہیں۔ اگر میں آپ کو ڈاکٹر کرنل بلاؤں تو؟ رام چندر بکتر بند یونٹ میں ہے اور بکتر بند دستے والوں کو سوار کہا جاتا ہے، جوان نہیں۔"

صلاح کار جج نے کاغذ پر کچھ لکھا اور کرنل کو دیا۔ "کیپٹن رائے ٹھیک کہتا ہے۔ سوار رام چندر کہنا چاہیے۔ شاید کیپٹن رائے کسی تکنیکی غلطی سے کورٹ مارشل کا فیصلہ منسوخ کرانے کے چکر میں ہے۔"

"میجر پوری، آپ سوار رام چندر بلائیں۔ پہلا گواہ پیش کیا جائے۔"

صوبیدار بلوان سنگھ اس قتل کا پہلا چشم دید گواہ تھا۔

''صوبیدار صاحب، آپ دس جون کی رات نو بجے یونٹ کی پہرہ چوکی کے پاس کیا کر رہے تھے؟ کیا آپ کسی ڈیوٹی پر تھے؟'' میجر پوری نے سوال کیا۔

''ڈیوٹی پر نہیں تھا صاحب۔ بجلی چلی گئی تھی۔ میرا کوارٹر یونٹ کے پاس ہی ہے۔ بہت گرمی تھی، اس لیے یونٹ کے میدان میں حوالدار راج سنگھ کے پاس ٹہل رہا تھا۔''

''اس دن گارڈ ڈیوٹی پر کون تھا؟''

''سوار رام چندر۔''

''رات کو نو بجے آپ نے کیا دیکھا؟''

''صاحب، بتایا نا، بجلی چلی گئی تھی، اس لیے صاف صاف کچھ دکھائی نہیں دیا۔ یونٹ کے اندر ایک موٹر سائیکل جا رہی تھی...''

میجر پوری نے بات بیچ میں کاٹی، ''صوبیدار صاحب، آپ کی نظر کمزور ہے کیا؟ نظر کا چشمہ لگاتے ہیں؟''

صوبیدار نے بلوں سے بھری اپنی چھاتی چوڑی کی اور تھوڑی سخت آواز میں بتایا کہ اس کے چشمہ نہیں لگا، نظر سو فیصدی ٹھیک ہے۔

''لیکن آپ نے ابھی کہا کہ رات کے نو بجے آپ نے ٹھیک سے کچھ نہیں دیکھا۔''

''صاحب، بتایا نا، بجلی چلی گئی تھی۔''

''صوبیدار صاحب، بجلی چلی گئی تھی تو کیا ہوا؟ دس جون کو پورے چاند کی رات تھی۔ آپ گارڈ ہاؤس سے سو میٹر کے فاصلے پر ٹہل رہے تھے اور پورے چاند کی رات میں اگر نظر بالکل ٹھیک ہو تو پانچ سو میٹر تک صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ خیر چھوڑیے، موٹر سائیکل پر بیٹھے دو آدمیوں نے ہلمٹ پہن رکھا تھا کہ نہیں؟''

''نہیں صاحب۔''

''پھر تو آپ نے دونوں کو پہچان لیا ہوگا؟''

''جی صاحب۔ کیپٹن ورما موٹر سائیکل چلا رہے تھے اور کیپٹن کپور پیچھے بیٹھے تھے۔''

Scanned with CamScanner

''ٹھیک، اگر دور سے چلتی موٹر سائیکل پر بیٹھے دونوں افسروں کو آپ نے پہچان لیا تو گارڈ چوکی پر تعینات سوار رام چندر نے بھی ضرور پہچان لیا ہوگا۔ پھر آپ نے کیا دیکھا؟''

''جی سر۔ سوار رام چندر نے گولی چلا دی۔ پہلی گولی کیپٹن ورما کو لگی۔ موٹر سائیکل سڑک کے نیچے اتر گئی۔ اگلا پہیہ گارڈ ہاؤس سے تھوڑی دور پر پیڑ سے ٹکرایا۔ رام چندر نے جب دوسری گولی چلائی تو موٹر سائیکل زمین پر گر رہی تھی، شاید اسی لیے گولی کیپٹن کپور کے کندھے پر لگی، نہیں تو سر میں لگتی۔ دوسری گولی چلانے کے بعد رام چندر ان افسروں کی طرف بھاگا، لیکن تب تک میں نے اور حوالدار راج سنگھ نے دوڑ کر سوار رام چندر کو پکڑ لیا تھا۔''

جب دفاع کا وکیل کیپٹن بکاش رائے سوال پوچھنے کے لیے اٹھا تو کورٹ کے کمرے میں بیٹھے فوجیوں اور افسروں کو پہلے سے ہی پتا تھا کہ صوبیدار صاحب کو سوالوں میں الجھا نہیں پائے گا، نہ ہی ان کی گواہی بدل سکے گا۔ گولی کی آواز سن کر بیرکوں سے بہت سارے جوان باہر دوڑے تھے۔ سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ صوبیدار صاحب نے رام چندر کو پکڑ رکھا تھا اور سب کے سامنے سوار رام چندر نے ٹھنڈی اور جذبات سے خالی آواز میں قبولا تھا کہ گولی اس نے چلائی۔

''صوبیدار صاحب، اس رات جب یہ واقعہ ہوا تو خفیہ اشارے کا لفظ کیا تھا؟'' بکاش رائے نے صوبیدار کی آنکھوں میں حیرانی دیکھی اور ترجمہ کیا، ''میرا مطلب ہے اُس رات پاس ورڈ کیا تھا؟''

''سر، مجھے یاد نہیں۔ اجازت ہو تو یونٹ کے کلرک سے پوچھ کر بتاؤں؟''

''کوئی بات نہیں صاحب، اگر آپ کو یاد نہیں۔ ہر روز رات کے لیے نیا پاس ورڈ ہوتا ہے۔ اتنے مہینے پہلے کا لفظ بھولنا کوئی بڑی بات نہیں۔ آپ یونٹ کے کلرک سے پوچھ لیں۔ ویسے اُس رات کا پاس ورڈ 'کالا چاند' تھا۔''

یونٹ کلرک نے رجسٹر دیکھ کر بتایا کہ یہی لفظ تھا۔ صوبیدار کو اپنے اوپر تھوڑی شرم آئی۔ دلی سے آئے ایک دفاعی وکیل کو پاس ورڈ کا پتا ہے اور خود اسے یاد نہیں۔

''صوبیدار صاحب، یہ بات تو صاف ہوگئی کہ اگر آپ نے اتنی دور سے افسروں کو پہچان لیا تو سوار رام چندر نے بھی پہچان لیا ہوگا۔''

''جی سر، یہی بات تو میں کہہ رہا ہوں۔'' بکاش رائے ہولے سے مسکرایا، صوبیدار کو حوصلہ دیتی

Scanned with CamScanner

مسکراہٹ۔ ’’یہی بات سچ ہے اور ہم سب نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا ہے۔ کیا آپ نے جوانوں کو ہدایت دے رکھی ہے کہ اگر رات کے وقت کوئی یونٹ کے احاطے میں داخل ہو تو پہچان لینے پر پاس ورڈ نہ پوچھا جائے؟‘‘

’’نہیں سر، میں کون ہوتا ہوں یہ ہدایت دینے والا! رُول از رُول۔ گارڈ ہر حالت میں روک کر پاس ورڈ پوچھے گا۔ میری تیس سال کی سروس ہے، بے داغ سروس۔ کیا مجھے اتنی سی بات پتا نہیں؟‘‘ صوبیدار کی آواز تیکھی ہو گئی۔

’’صوبیدار صاحب، مجھے پتا ہے آپ ایسی غلط ہدایت نہیں دے سکتے۔ کیا سوار رام چندر نے اس رات یونٹ کے اندر موٹر سائیکل پر گھستے افسروں کو 'رکو! کون ہے؟' کہہ کر للکارا تھا؟‘‘

’’سر، میں سب کچھ صاف دیکھ رہا تھا۔ اگر للکارا...‘‘

بکاش رائے نے بات بیچ میں کاٹی، ’’صاحب، میں دیکھنے کی نہیں، سننے کی بات پوچھ رہا ہوں۔ کیا سوار رام چندر نے 'رک جاؤ! کون ہے؟' کہہ کر للکارا تھا؟‘‘

’’صاحب، میں نے نہیں سنا۔ کیسے کہوں کہ للکارا؟‘‘

’’صاحب، جو بات آپ نے نہ سنی ہو، ضروری تو نہیں کہ وہ کہی بھی نہ گئی ہو۔ پردھان منتری نے ۱۵ راگست کو لال قلعے سے کہا کہ بھارت دشمنوں کو لوہے کے چنے چبوا دے گا۔ آپ تو دلی میں اس دن تھے نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پردھان منتری نے یہ کہا ہی نہیں، کیونکہ آپ نے سنا ہی نہیں۔‘‘

’’صاحب، میں سب کچھ صاف دیکھ رہا...‘‘

’’صوبیدار صاحب، آواز سنی جاتی ہے، دیکھی نہیں جاتی۔ آپ لگ بھگ پانچ سو میٹر دور ٹہل رہے تھے۔ موٹر سائیکل تیز چل رہی تھی۔ اتنی دور سے بلٹ موبائل کی تیز آواز کی وجہ سے آپ کو سوار رام چندر کی آواز سنائی دے ہی نہیں سکتی تھی۔‘‘

میجر پوری نے اٹھ کر اعتراض کیا، ’’کیپٹن بکاش رائے گواہ کو جان بوجھ کر کنفیوز کر رہے ہیں۔ یہ بات وہ خود بھی مان چکے ہیں کہ افسروں کو رام چندر نے پہچان لیا ہوگا۔ 'رک جاؤ! کون ہے؟' کی بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا رہا ہے۔‘‘

کرنل صورت سنگھ نے دفاعی وکیل سے کچھ کہا نہیں، صرف لمحے بھر کو گہری نظر سے دیکھا۔

Scanned with CamScanner

صلاح کارجج نے کاغذ کے پرزے پر لکھا کہ کیپٹن کو یہ بات پوری کر لینے دی جائے۔ کرنل نے سر ہلایا۔

''اچھا صاحب، اگر 'رک جاؤ!' کہنے پر کوئی نہ رکے تو...''

میجر پوری نے پھر بات کاٹی، ''دفاعی وکیل جان بوجھ کر سوالوں کو غلط موڑ دے رہے ہیں۔ پھر یہ کہاں ثابت ہوا کہ سوار رام چندر نے 'رک جاؤ!' کہا؟ گواہ کیسے بتا سکتا ہے کہ...''

''میری کورٹ سے درخواست ہے کہ موقع واردات پر چلا جائے۔ اتنی دوری پر کورٹ کے ارکان کھڑے ہوں جتنی دوری پر صوبیدار کھڑے تھے۔ موٹر سائیکل چلائی جائے۔ کوئی چوکی پر کھڑا ہو کر للکارے، 'رک جاؤ!' پتا چل جائے گا کہ آواز سنائی دی کہ نہیں۔''

''اگر پتا چل بھی گیا تو اس سے کیا ثابت ہو جائے گا؟ سوار رام چندر نے گولی نہیں چلائی؟'' کرنل کی آواز سخت ہو گئی۔

''سر، میں کون ہوتا ہوں ثابت کرنے والا کہ رام چندر نے گولی نہیں چلائی۔ یہ بات تو وہ اپنے اقبالی بیان میں قبول کر چکا ہے۔ لیکن میں کورٹ کو فوج کے قانون کی یاد دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر گارڈ کے للکارنے پر، 'رک جاؤ!' کہنے پر، کوئی نہ رکے، اپنا شناختی کارڈ نہ دکھائے، تو گارڈ گولی چلا سکتا ہے۔''

''ڈونٹ ٹرائی ٹو میچ دس کورٹ دی آرمی ایکٹ اینڈ لا!'' کرنل صاحب پہلی بار اونچی آواز میں بولے۔ صلاح کارجج نے پرزے پر لکھا، ''اگر یہ ثابت ہو گیا کہ رام چندر کے للکارنے پر افسر نہیں رکے تب اس نے گولی چلائی، تو بری ہو جائے گا۔'' کرنل نے کاغذ کا پرزہ کورٹ کے باقی چار ارکان کو پڑھوایا۔ عدالت کے کمرے میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ دھاگے سے بندھی لٹکتی تلوار کا مطلب کرنل اور دوسرے ارکان کو پہلی بار سمجھ میں آیا۔ کرنل کی ناک پھولنی سکڑنی شروع ہو گئی — دشمن کی بو، بالکل وہی بو، جنگ کے اُس دن والی جب ان کے گلے میں گرینیڈوں کی مالا لٹک رہی تھی۔

انھوں نے کیپٹن کپور اور سوار رام چندر کی طرف دیکھا۔ نہیں، خطرے کی بو وہاں نہیں۔ اب ان کی آنکھیں دفاع کے وکیل کیپٹن پرکاش رائے کی آنکھوں سے جڑ گئیں۔ انھیں یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں نہ تو فتح کی چمک ہے نہ خوشی کا نام و نشان؛ ہے تو ایک گہری اداسی۔ تب ایک دم کرنل کی ناک نے کیپٹن کے آس پاس سے آتی دشمن کی بو کو سونگھ لیا اور زندگی میں پہلی بار شکست کے احساس

Scanned with CamScanner

نے انھیں ڈرایا۔ اگر گلے میں گرینیڈوں کی مالا بھی ہو تو اس کو ڈرایا نہیں جا سکتا، کیونکہ یہ دشمن نہیں دفاع کا وکیل ہے۔ انھیں جرم کا سا احساس ہوا اس سچ کو قبول کرنے پر کہ وہ تو پہلے سے ہی اپنے ذہن میں فیصلہ کر چکے ہیں کہ سوار رام چندر قاتل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دفاع کے وکیل کے ساتھ ان کا رویہ کڑا اور سخت ہے۔ انھوں نے دل ہی دل میں خود کو گالی دی — باسٹرڈ، تم بھگوان کب سے بن گئے؟ یہ گالی دیتے ہی ان کی روح سے غصہ اور گھمنڈ باہر سرکا۔ انھوں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ دل اور دماغ ایک دم ڈھل گئے، اور یہ ڈھلا پن اندر سے سرک کر ان کے چہرے پر آ گیا۔ ان کی ناک پھولنا بند ہو گئی، کیونکہ اب دفاعی وکیل سے خطرے کی بو نہیں آ رہی۔ یہ ڈھلا پن کیپٹن بکاش رائے نے دیکھا اور اس کی آنکھوں کی اداسی اور گہری ہو گئی۔

صلاح کار جج نے دوسرا پرزہ بڑھایا — ''ہمیں موقع واردات پر نہیں جانا چاہیے۔ دفاع کے وکیل کو اس نکتے پر اور جرح کرنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔'' کرنل نے صلاح پڑھی، کاغذ کے ٹکڑے ٹکڑے کیے اور فیصلہ دیا، ''کیپٹن بکاش رائے، کورٹ حادثے کی جگہ چلے گا۔ پتا چل جائے گا کہ سوار رام چندر نے للکارا تھا کہ نہیں۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ کمرے میں موجود باقی لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔ کرنل نے کیپٹن کپور کا چہرہ دیکھا۔ سفید کیوں پڑ گیا؟ تکبر سے اکڑی گردن جھک کیوں گئی؟ کیا سچ مچ سوار رام چندر نے للکارا تھا اور یہ لوگ نہیں رکے؟

بکاش رائے سوار رام چندر کے پاس گیا۔ دونوں نے خاموش نگاہوں سے بات چیت کی۔ کرنل نے دیکھا کہ کیپٹن نے 'ہاں' میں سر ہلایا۔ انھیں پھر سے خطرے کی بو آنی شروع ہو گئی۔

''میں نہیں چاہتا کہ موقع واردات پر جا کر کورٹ کا وقت ضائع کیا جائے۔ سوار رام چندر کچھ کہنا چاہتا ہے۔''

''نہیں! گواہی صوبیدار صاحب کی چل رہی ہے، رام چندر اس وقت کچھ نہیں کہہ سکتا،'' سرکاری وکیل نے اعتراض کیا۔ بکاش رائے نے سر ہلایا۔ رام چندر اونچی اور غیر جذباتی آواز میں بولا، ''میں نے 'رک جاؤ! کون جاتا ہے؟' کی للکار نہیں لگائی تھی۔''

''رام چندر کا یہ بیان نوٹ کیا جائے کہ اس نے للکارے بغیر گولی چلائی،'' کیپٹن بکاش رائے نے کورٹ سے کہا۔ کرنل نے، کورٹ میں بیٹھے سب لوگوں نے اپنے تصور میں صاف دیکھا کہ پھانسی کا

پھندا، جو تھوڑی دیر پہلے ہٹ چکا تھا، خود سوار رام چندر نے اپنے گلے میں ڈال لیا اور یہ پھندا کسنے میں دفاع کے وکیل نے اس کی مدد کی۔

کرنل نے عدالت کے اٹھنے کا حکم دیا، ساتھ ہی دفاعی وکیل کو رکنے کا اشارہ کیا۔ کمرہ خالی ہو گیا۔ انھوں نے پوچھا: ''کیپٹن، تم نے سوار رام چندر کو یہ اقبال کرنے کا اشارہ کیوں کیا کہ اس نے 'رک جاؤ!' نہیں کہا؟ تم نے اس کے پھانسی کے پھندے میں مضبوط گانٹھ لگا دی۔''

''سر، میں کسی تکنیکی بنیاد پر سوار رام چندر کا بچاؤ نہیں کرنا چاہتا۔ یہ بات تو سب کو پتا ہے کہ اس نے گولی چلائی۔ سوال یہ ہے کہ اس نے گولی کیوں چلائی؟''

کرنل نے پھر بالکل صاف محسوس کیا کہ بکاش رائے سے خطرے کی بو آنی شروع ہو گئی ہے اور وہ ان کا دشمن نہیں... تو پھر اس کیپٹن نے کوئی طلسم تیار کر لیا ہے۔ لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ 'رک جاؤ!' کی للکار کا طلسم تو اس نے خود بنایا تھا اور پھر خود ہی توڑ بھی دیا۔ یہ دشمن نہیں۔ پھر بھی سارے حواس کیوں چوکس ہو کر چیخ رہے ہیں— خطرہ، خطرہ!

اور انھیں اس حقیقت کا پتا چل گیا کہ بکاش رائے دشمن نہ ہونے پر بھی دشمن ہے۔ لیکن کس کا؟

دوپہر کے کھانے کے بعد یونٹ کے ڈاکٹر کیپٹن گپتا کی گواہی شروع ہوئی۔ اس نے بتایا کہ وہ موقع واردات پر پانچ منٹ کے بعد پہنچ گیا تھا۔ کیپٹن ورما کی موت واقع ہو چکی تھی اور کیپٹن کپور کے کندھے سے خون بہہ رہا تھا۔ سوار رام چندر نے اس کے سامنے کہا تھا کہ گولی اس نے چلائی۔

دفاع کے وکیل نے جرح شروع کی۔ ''کیپٹن گپتا، آج سے چار مہینے پہلے آپ نے سوار رام چندر کو کس وجہ سے فوجی اسپتال میں بھرتی کروایا تھا؟''

''اس دن ہماری یونٹ کا ایرفورس والوں سے ہاکی میچ تھا۔ میچ شروع ہونے کے دس منٹ بعد ہی رام چندر، جو فل بیک تھا، میدان میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اسے تیز بخار تھا۔''

''کتنا بخار تھا؟ بیماری کیا تھی؟''

''ایک سو چار سے اوپر۔ میں نے اسپتال فون کیا۔ پانچ منٹ کے اندر ایمبولینس آ گئی۔ میں نے ٹائیفائڈ کہا تھا اور ملٹری ہاسپٹل میں ٹیسٹ کرنے کے بعد میرا ڈائگنوسس کنفرم کر دیا گیا۔''

''آپ کی بتائی ہوئی بیماری غلط کیسے نکلتی۔ آپ کو تو پونا کے آرمی میڈیکل کالج کا گولڈ میڈل ملا

Scanned with CamScanner

ہے۔'' یہ سن کر کیپٹن گپتا کا سینہ چوڑا ہو گیا۔ اسے عجیب بھی لگا کہ دفاع کا وکیل اس کی ہر بات مان بھی رہا ہے اور تعریف بھی کر رہا ہے۔

''کیپٹن گپتا، آپ تو گولڈ میڈلسٹ ڈاکٹر ہیں۔ ہاکی میچ چار بجے شروع ہوا اور دس منٹ کے بعد ہی رام چندر بے ہوش ہو کر گر گیا۔ کیا دس منٹ میں بخار ایک سو چار تک چڑھ سکتا ہے؟''

''نہیں، ٹائیفائڈ کا بخار ملیریا کی طرح ایک دم نہیں چڑھتا۔ رام چندر کو میچ سے پہلے سے بخار ہو گا۔''

''آپ کو پتا نہیں کہ بخار چڑھ چکا تھا یا نہیں؟''

''مجھے کیسے پتا ہو گا؟ میچ شروع ہونے سے پہلے کھلاڑیوں کو تھرمامیٹر نہیں لگایا جاتا۔'' کمرے میں موجود سب لوگ آہستہ سے ہنسے ـــــ کیپٹن گپتا نے دفاع کے وکیل کو خوب پھانسا۔ کرنل نے نگاہیں گھمائیں۔ ہنسی بند۔ ان کے حواس نے بتا دیا کہ دفاع کا وکیل کوئی طلسم بنا رہا ہے، جس میں ڈاکٹر دھیرے دھیرے کھنچا جا رہا ہے ـــــ مکڑی کا نرم لیکن مہلک جالا۔

''کیپٹن گپتا، آپ برا مت مانیں۔ مجھے ڈاکٹری کا بالکل بھی علم نہیں۔ آپ مدد کریں گے تو تھوڑا بہت پتا چل جائے گا۔ آپ کے مطابق تھرمامیٹر لگائے بغیر پتا چل ہی نہیں سکتا کہ کتنا بخار ہے؟''

''نہیں۔ ہاں، نبض دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بخار ہے یا نہیں۔ لیکن کتنا ہے، یہ جاننے کے لیے تو تھرمامیٹر لگانا پڑے گا۔''

دفاع کا وکیل اپنی جگہ سے ہلا۔ وہ کیپٹن بی ڈی کپور کی کرسی کے پاس گیا۔ لمحہ بھر کو اسے بھرپور نگاہ سے دیکھا۔ کپور کے چہرے سے خون کھنچنا شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر گپتا نے کپور کا چہرہ دیکھا اور اس کا اپنا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اسے اچانک اس حقیقت کا پتا چل گیا کہ بکاش رائے نے اس کے چاروں طرف مضبوط قلعہ بندی کر دی ہے۔ وہ اس دشمن قلعے کے دروازے کے اندر پہنچ گیا اور دروازہ بند ہوا کہ ہوا۔ بکاش رائے اب بالکل ہولے، دبے پاؤں، اس کی طرف آیا، کندھے تھوڑے جھکے ہوئے اور بدن سکڑ کر چھوٹا۔ مہلک چھلانگ لگانے سے لمحہ بھر پہلے باگھ۔

''آپ کے پاس اس روز بیماری کی رپورٹ کرنے رام چندر کو کتنے بجے لایا گیا؟''

''سِک رپورٹ کا وقت تین بجے ہے۔''

Scanned with CamScanner

''میں نے یہ نہیں پوچھا کہ بیماری کی رپورٹ کرنے کا وقت کیا ہے۔ رام چندر کو یونٹ کا حوالدار اور دو جوان تھام کر آپ کے پاس لائے تھے۔ گھڑیاں ان لوگوں نے بھی پہن رکھی تھیں۔ میں انھیں گواہی کے لیے بلا سکتا ہوں۔ یاد کر کے بتائیے کہ کتنے بجے رام چندر کو اس کے ساتھی یونٹ اسپتال لائے؟''

ڈاکٹر گپتا چپ۔ کرنل صورت سنگھ نے جھڑکی دی، ''کیپٹن، جواب دو!'' گپتا کو اب اس حقیقت کا احساس ہوا کہ دفاعی وکیل کی قلعہ بندی میں کورٹ مارشل کے پریذائڈنگ افسر بھی ساتھ ہیں۔

''سر، میں نے گھڑی نہیں دیکھی تھی۔''

''چلیے، وقت کی بات چھوڑتے ہیں۔ یہ ضروری تو نہیں کہ جب بھی کوئی مریض کمرے میں آئے تو آپ گھڑی دیکھیں۔'' دفاع کے وکیل نے پھر کیپٹن بی ڈی کپور کی کرسی کی طرف قدم بڑھائے۔ ڈاکٹر نے سکون کا سانس لیا۔ وہیں سے کھڑے کھڑے دفاع کے وکیل نے پوچھا، ''جب حوالدار سوار رام چندر کو اندر لایا تو آپ کے پاس کون بیٹھا تھا؟''

''کیپٹن بی ڈی کپور۔''

''آپ نے تھرمامیٹر لگایا تھا؟ نبض دیکھی تھی؟''

گپتا کا سر اتنا جھک گیا کہ ٹھوڑی چھاتی کو چھونے لگی۔ وہ چپ۔ ''کیپٹن، جواب دو!'' کرنل گرجے۔

''سر، جانیز تو سک رپورٹ کا اکثر بہانہ کرتے ہیں، اس لیے...''

دفاعی وکیل نے بات بیچ میں کاٹی، ''کیپٹن گپتا، یہ 'جانیز' کیا ہوتا ہے؟''

''سر، جانیز سپاہیوں کو کہتے ہیں۔''

''کیپٹن گپتا، آپ مجھے سر مت کہیں۔ میرا رینک بھی کیپٹن ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ غلامی کے دنوں میں انگریز افسر ہندوستانی سپاہیوں کو 'جانیز' کہتے تھے، جو ایک گالی ہے۔ خیر چھوڑیے، اگر آپ جوان کے لیے 'جانیز' لفظ بولتے ہیں تو میں کون ہوتا ہوں روکنے والا؟ لیکن آپ کو بغیر نبض دیکھے، بغیر تھرمامیٹر لگائے پتا چل گیا کہ سوار رام چندر بیماری کا بہانہ کر رہا تھا۔ آپ ڈاکٹر نہیں، سچ مچ بھگوان ہیں۔''

''میں نے تھرمامیٹر اس لیے نہیں لگایا کہ کیپٹن کپور نے مجھے بتایا تھا کہ رام چندر کو کچھ نہیں ہوا،'' گپتا نے لگ بھگ چیخ کر جواب دیا، ڈری ہوئی چیخ، اپنے بچاؤ میں۔

''ڈاکٹر آپ ہیں یا کیپٹن کپور؟ کیپٹن کپور نے آپ کو انگریزی میں روکا تھا، گالی دے کر۔ گالی

یونٹ حوالدار نے بھی سنی تھی۔ اسے انگریزی آتی ہے۔ بتایئے، کیا کہا تھا؟'' باگھ نے مہلک چھلانگ لگائی۔
''دس باسٹرڈ از جسٹ ایکٹنگ۔ تھنگ از رانگ وِدھم۔''
''مطلب یہ کہ حرامی رام چندر بیماری کا بہانہ کر رہا ہے، اسے کچھ نہیں ہوا۔ شکریہ ڈاکٹر گپتا، مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔ آپ کو پونا میڈیکل کالج سے گولڈ میڈل ملا، ڈاکٹری کے بہترین طالبعلم ہونے کا۔ میں کون ہوتا ہوں یہ کہنے والا کہ آپ جو ڈاکٹر نہ ہوں ان کی بات پر یقین کر لیں کہ جوان، میرا مطلب ہے جانی جھوٹ بول رہا ہے۔''
کیپٹن ڈاکٹر گپتا مرے ہوئے قدموں سے اپنی جگہ لوٹا۔ اس کی کرسی یونٹ کے افسر لیفٹنٹ کرنل راؤ کے پاس ہے۔ راؤ نے اسے دبی زبان میں گالی دی، ''یو سن آف اے بچ! میجر بننے کے خواب دیکھنا بند کر دو۔ تمھاری کانفیڈنشل رپورٹ میں نے ہی لکھنی ہے۔''
دفاع کا وکیل اب بھی کیپٹن کپور کی کرسی کے پاس کھڑا اسے ایک ٹک دیکھے جا رہا ہے۔ کورٹ کے سربراہ، صلاح کار جج، چار دوسرے رکن افسروں اور سرکاری وکیل کو یہ عجیب احساس ہونا شروع ہو گیا کہ کیپٹن کپور مجرم کے کٹہرے میں بیٹھا ہے، سوار رام چندر کی جگہ، جس نے گولی چلائی تھی، قتل کیا تھا۔ بکاش رائے اب بھی کپور کی کرسی کے پاس کھڑا اسے لگاتار دیکھے جا رہا ہے۔ کپور نے اس کے کندھے ایک بار پھر سکڑتے دیکھے۔ اس کے تصور میں چھلانگ لگانے کو تیار باگھ ابھرا۔ وہ کھڑا ہوا، دہشت زدہ آواز میں اس نے پریذائڈنگ افسر سے التجا کی، ''سر، کیپٹن بکاش رائے کو روکا جائے کہ مجھے گھور کر نہ دیکھیں۔''
دفاع کے وکیل کے سکڑے ہوئے کندھے پھیل گئے۔ باگھ نے چھلانگ نہیں لگائی۔ کرنل صورت سنگھ نے کڑک کر کہا، ''کیپٹن کپور، اپنی جگہ بیٹھ جاؤ! وقت آنے پر کورٹ تمھیں بولنے کا پورا موقع دے گا۔'' کپور طے نہیں کر پایا کہ کرنل نے صلاح دی ہے یا دھمکی۔
کورٹ دوسرے دن کے لیے اٹھ گیا۔ کیپٹن بی ڈی کپور نے باہر آنے کے بعد کیپٹن بکاش رائے کو روکا۔ آج اس نے پہلی بار دفاع کے وکیل سے بات کی حالانکہ بکاش پچھلے دس دن سے یونٹ میں آیا ہوا ہے۔ جوانوں اور افسروں سے مل کر پتا نہیں کون کون سی باتیں پوچھتا رہا ہے۔ بیچ میں ایک دن کے لیے کہیں گم ہو گیا تھا۔ کورٹ مارشل کا فیصلہ تو کیپٹن کپور اپنے دل میں پہلے ہی کر چکا تھا — رام

چندر کو پھانسی۔ پھر وہ کیوں ملے اس بنگالی کیپٹن سے! پھر اسے اس اَن لکھے قاعدے کا بھی تو پتا ہے کہ ایک افسر دوسرے افسر کا ہمیشہ ساتھ دے گا، حمایت کرے گا۔ لیکن جب بکاش رائے اس کے پاس کھڑا ہوا تو ایسا کیوں لگا جیسے حملے کے لیے تُلا ہوا باگھ ہے کہیں آس پاس، آخری مہلک چھلانگ لگانے کے لیے بدن تولتا۔ اس نے خود کو حوصلہ دیا— یہ دفاع کا وکیل اس کا کیا بگاڑ لے گا! کورٹ مارشل تو رام چندر کا ہو رہا ہے۔ لیکن پھر اس نے کمرے سے باہر آتے ہوئے سب لوگوں کی آنکھوں میں نفرت کا نقطہ کیوں دیکھا؟ اور اسے یقین ہوا کہ نفرت کا یہ نقطہ ایک گھیرے میں پھیل جائے گا۔ اسے کچھ کرنا چاہیے۔ کیوں نہ بکاش رائے کو آج شام گھر بلائے۔ دفاع کا وکیل اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔

''وکاس، شام کو میرے گھر آؤ۔''

''میرا نام وکاس نہیں، بکاش ہے۔ آپ کے گھر کس لیے آؤں؟''

''بیٹھیں گے۔ وی ول ہیو ڈرنکس۔''

''میں پیتا نہیں۔''

''تو کیا ہوا، کچھ اور فن سہی!''

''یہ فن کیا کیپٹن کپور؟ کسی عورت کا انتظام کیا ہے کیا؟ آپ کی پتنی تو پچھلے چار مہینے سے آپ کے پاس نہیں رہ رہیں۔ اور میں ویسے بھی مجرموں کے ساتھ نہ بولتا ہوں، نہ بیٹھتا ہوں۔''

کیپٹن کپور کو پھر اس سے ڈر لگنا شروع ہو گیا۔ غصے کے کوچ سے اس نے ڈر کو دبایا۔ تیز آواز میں بولا، ''بکاش، تم سوچتے ہو میرا کچھ بگاڑ لوگے؟ فارگیٹ اٹ! خونی میں ہوں کہ رام چندر؟ ایک افسر ہو کر تم دوسرے افسر سے کیسے پیش آ رہے ہو؟''

بکاش اس کے بالکل قریب آیا۔ ایک ایک لفظ چبا کر بولا، ''سنو کیپٹن کپور! حرامی بھائی چارے کی اپنے دل سے غلط فہمی نکال دو تم۔ جانتے ہو خونی کون ہے۔ پھر ڈر کیوں گئے ہو؟ کچھ سوال اپنے آپ سے پوچھے جاتے ہیں، دوسروں سے نہیں۔ اور سنو! آج کے بعد کورٹ روم کے باہر مجھ سے کبھی بات مت کرنا۔'' بکاش لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چل پڑا۔ کپور کے پاؤں جیسے وہیں کے وہیں جم گئے۔ غصے کا جھوٹا کوچ ہٹتے ہی خوف کا پودا پھر اگنا، پھیلنا شروع ہو گیا۔ اس جگہ سے، جہاں بکاش کھڑا تھا، اب بھی خوف کی بو آ رہی تھی۔ کپور نے اس جگہ پر اپنا فوجی جوتا رگڑا، بو اور تیز ہو گئی۔ اور سچ کا پتا لگتے ہی،

کہ خوف کی بو اُس کے اندر سے آ رہی ہے، وہ کانپ گیا۔ یونٹ کے افسر اور جوان وہاں سے گزر رہے ہیں۔ اس کے پاس رکنا تو دور، کوئی دیکھ بھی نہیں رہا اسے۔ سب کے سب اس کے دشمن کیوں ہو گئے؟

آج سوار رام چندر کے کمانڈنگ افسر لیفٹننٹ کرنل برجیندر راؤ کی گواہی شروع ہوئی۔ سرکاری وکیل کو انھوں نے بتایا کہ سوار رام چندر نے کبھی بھی ان کے پاس کیپٹن کپور کی شکایت نہیں کی۔ وہ کیونکر بتا سکتے ہیں کہ رام چندر کو ان افسروں سے کیا دشمنی تھی، اس نے گولی کیوں چلائی۔

بکاش رائے نے پہلا سوال پوچھا، ''سر، آپ نے خود بتایا کہ سوار رام چندر کو ان افسروں سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ جس دن اس نے گولی چلائی، کیا وہ پاگل ہو....''

سرکاری وکیل نے بات پوری نہیں ہونے دی۔ ''کیپٹن رائے انسینیٹی کی پلی نہیں لے سکتے۔ انھیں یہ سوال پوچھنے سے روکا جائے۔''

''میں نے کب بات کی پاگل پن کے دورے کی؟ انسینیٹی کی پلی تو آپ لیں گے، میں نہیں۔''

''میں لوں گا؟ انسینیٹی پلی؟ کیوں کیپٹن؟ ہیو یو گون میڈ؟'' میجر پوری نے بالکل حیران آواز میں پوچھا۔

''میجر پوری، مائنڈ یور لینگویج! تم جانتے ہو سوار رام چندر کا میڈیکل ہو چکا ہے۔ کیپٹن رائے کو بیچ میں مت روکو۔''

بکاش نے اگلا سوال پوچھا، ''اچھا سر، کیا آپ سے کبھی کیپٹن کپور نے رام چندر کی کوئی شکایت کی؟''

''نہیں، رام چندر یونٹ کے سب سے چست اور مستعد جوانوں میں سے ایک ہے۔ آج تک کسی نے اس کی شکایت نہیں کی۔''

''مارچ کی دس تاریخ کو آپ جب پریڈ گراؤنڈ گئے تو کیا ہوا تھا؟''

''ہونا کیا تھا، جوان پریڈ کر رہے تھے۔'' کورٹ روم میں بیٹھے سب لوگ مسکرائے۔ یہ دفاع کا وکیل کبھی کبھی کیسے بے وقوفی کے سوال پوچھتا ہے۔ لیکن کرنل صورت سنگھ نہیں مسکرائے، کیونکہ انھیں اب تک پتا چل چکا ہے کہ بکاش رائے سیدھا حملہ نہیں کرتا۔ اس کے عام سے لفظ جال کی پہلی کڑی ہوتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

''سوری سر، میں نے سوال ہی غلط پوچھا۔ آپ کو شاید یاد نہیں کہ اس دن کیپٹن کپور نے سوار رام چندر کو سو بار سلیوٹ کرنے کو کہا تھا۔ کیوں؟''

''میں گولف گراؤنڈ کی طرف جا رہا تھا۔ دیکھا کہ پریڈ گراؤنڈ میں سارے جوان اٹنشن کی پوزیشن میں کھڑے ہیں۔ حیران ہو گیا۔ یہ لوگ پریڈ کیوں نہیں کر رہے؟ گراؤنڈ میں گیا۔ صوبیدار صاحب نے بتایا کہ کیپٹن کپور نے سوار رام چندر کو سو بار سلیوٹ کرنے کی سزا دی ہے، کیونکہ اس نے ٹھیک سے سلیوٹ نہیں کیا تھا۔''

''تو آپ نے کیا کیا؟ آپ نے کوئی پوچھ تاچھ کی؟''

''میں اپنی یونٹ کے افسروں پر شک نہیں کرتا۔ اگر کیپٹن کپور نے دیکھا کہ رام چندر نے ٹھیک سے سلیوٹ نہیں کیا تو ٹھیک دیکھا۔ افسر کو کسی بھی جوان کو چھوٹی موٹی سزا دینے کا حق ہے۔''

''تو پھر آپ نے کیپٹن کپور کو آرڈر کیوں دیا کہ وہ رام چندر کے ہر سلیوٹ کے جواب میں سلیوٹ کرے، پورے سو بار؟''

''کیپٹن، تمھیں اس رُول کا پتا ہے کہ نہیں کہ جب افسر نے وردی پہن رکھی ہو تو اسے جوان کے سلیوٹ کے جواب میں سلیوٹ کرنا پڑتا ہے؟''

کورٹ کے سارے ارکان کو پتا چل گیا کہ اس دن سی او نے دراصل کیپٹن کپور کو سزا دی تھی، سارے جوانوں کے سامنے سو بار سلیوٹ کرنے کی سزا۔

''اچھا سر، آپ نے رام چندر کے لیے روز دو کلو دودھ اور بادام کی خوراک کیوں لگائی؟''

''رجمنٹ کا ریزنگ ڈے تھا۔ سوار رام چندر پانچ ہزار میٹر کی دوڑ میں فرسٹ آیا۔ ٹائمنگ دیکھ کر میں حیران ہو گیا۔ فوج کے ریکارڈ سے صرف آدھا منٹ پیچھے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ رام چندر یہ ریکارڈ توڑ سکتا ہے۔ اس لیے دودھ اور بادام کی خوراک لگائی۔''

''سر، بدھائی! آپ کی جیسی پہچاننے والی نظر کتنے افسروں کے پاس ہے! تو کیا رام چندر آپ کی امیدوں پر پورا اترا؟''

''بالکل اترا۔ کمان کے کھیلوں کے مقابلے میں پانچ ہزار میٹر کی دوڑ اس نے جیتی۔ فوج کے ریکارڈ سے صرف دس سیکنڈ پیچھے۔''

Scanned with CamScanner

''کیا اس نے پوری فوج کا ریکارڈ توڑا؟''

''فوج کا کیا، رام چندر ایشیا کا دوڑ کا ریکارڈ توڑ سکتا تھا۔ لیکن انٹر کمانڈ مقابلوں سے پہلے ہی یہ حادثہ ہو گیا،'' انھوں نے اداس آواز میں کہا، کیونکہ رام چندر نے اس منظر کو صاف کر دیا تھا — ان کی یونٹ کا جوان اور ایشیا کا سب سے تیز دوڑنے والا۔

''اچھا سر، رام چندر کے یونٹ میں آنے سے پہلے پانچ ہزار میٹر کی دوڑ کا چمپیئن کون تھا؟''

''کیپٹن کپور۔'' سی او طلسم کے اندر داخل ہو گیا اور آخری سوال پوچھتے ہوئے بکاش رائے نے طلسم کا دروازہ بند کر دیا۔ کورٹ کے ارکان کو، سربراہ کو، کمرے میں بیٹھے افسروں اور جوانوں کو اس سامری چال کا پتا تو چلا لیکن تب جب بکاش رائے کی چال کامیاب ہو چکی تھی۔

''سر، کیپٹن کپور کی پتنی آج کل کہاں ہیں؟''

''یہ سوال تم کپور سے پوچھو۔ مجھے کسی کے گھریلو معاملوں سے کیا مطلب؟''

''سر، سی او ایک باپ کی طرح ہوتا ہے۔ یونٹ کی کوئی بھی بات گھریلو بات نہیں ہوتی۔ کیپٹن کپور کی پتنی آپ سے ملی تھیں، فروری کی پانچ تاریخ کو۔''

''تمھیں کیسے پتا؟ بھگوان ہو گیا؟'' کرنل کی آواز میں غصہ تھا۔

''سر، کیپٹن کپور کی پتنی آج کل دلی کے ایک اسکول میں پڑھا رہی ہیں۔ میں ان سے مل آیا ہوں۔ انھوں نے مجھے اس درخواست کی کاپی بھی دی ہے جو انھوں نے آپ کو پیش کی تھی۔''

''کیپٹن بکاش رائے کو گھریلو باتیں پوچھنے سے روکا جائے۔ یہ کورٹ مارشل کیپٹن کپور کی وائف کی وجہ سے نہیں ہو رہا، سوار رام چندر کے خون کرنے کی وجہ سے ہو رہا ہے،'' سرکاری وکیل نے اعتراض کیا۔ کرنل صورت سنگھ نے جج ایڈووکیٹ کی طرف دیکھا۔ صلاح کار کا سر جھکا ہوا — نہ بول کر صلاح دی نہ لکھ کر۔ انھوں نے چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتے بکاش رائے کو دیکھا جو اب کیپٹن کپور کی کرسی کے پاس پہنچ گیا۔ یونٹ کے سی او کے چہرے پر کچھ بولنے اور نہ بولنے کے بیچ گھمسان کی جنگ۔ کیپٹن کپور کی حمایت کے لیے لگاتار گھومتی آنکھیں، خوف زدہ، اکیلی اور نہتی ہو گئی آنکھیں۔

کرنل نے پوچھا، ''کیپٹن رائے، جو سوال پوچھ رہے ہو، کیا اس کورٹ مارشل سے ان سوالوں کا کوئی کنکشن ہے؟ اگر ہے تو سوال جاری رکھو۔''

Scanned with CamScanner

کیپٹن بکاش رائے تیزی سے کیپٹن کپور کی کرسی کے چاروں طرف گھوم گیا۔ اب اس نے وہیں سے کھڑے کھڑے بولنا شروع کیا۔ لفظ اتنے ہولے سے اس کے منھ سے نکلنے شروع ہوئے کہ کمرے میں بیٹھے سب لوگوں کو اپنے سارے حواس کانوں میں سمیٹنے پڑ گئے۔

''سر، اب میں کرنل صاحب سے سوال نہیں پوچھوں گا۔ اُس رات کا واقعہ میں بتاتا ہوں جب کیپٹن کپور نے اپنی پتنی کو اتنا مارا کہ ان کا کان پھٹ گیا۔ سوار رام چندر ان دنوں کیپٹن کپور کا سیوادار تھا۔ نشے میں دھت کیپٹن کو پتا ہی نہ چلا کہ کان کے پاس لگی چوٹ سے اس کی پتنی مر سکتی تھی۔ رام چندر نے کیپٹن کپور کی پتنی کو فوجی اسپتال پہنچایا۔ وہ پوری رات زندگی اور موت کے بیچ جھولتی رہی۔ اسپتال کے سی او نے ہدایت دی کہ کیس سول پولیس میں درج کرایا جائے، قاتلانہ حملے کا۔ یونٹ کے سی او اور او اور باقی افسروں نے بیچ بچاؤ کرایا۔ اگر کیس سول پولیس میں دیا گیا تو کتنی بدنامی ہوگی۔ کیپٹن کپور کی پتنی نے طلاق مانگی ہے اور دلّی میں یہ کیس اگلے مہینے شروع ہوگا۔ کورٹ چاہے تو میں اسپتال کے سی او اور بیچ میں پڑنے والے افسروں کو گواہ کے طور پر پیش کر سکتا ہوں۔ یونٹ کے سی او اور او بتا سکتے ہیں کہ جو کچھ میں نے بتایا ٹھیک ہے کہ نہیں۔''

اس سے پہلے کہ راؤ جواب دیں، کپور نے چیخ چیخ کر بولنا شروع کر دیا، ''بکاش رائے، تم نکسلائٹ ہو! تمھارا بڑا بھائی نکسلائٹ تھا! پولیس کے ہاتھوں مارا گیا۔ تمھارے خون میں بغاوت ہے۔ تم...''

کرنل صورت سنگھ نے دروازے پر کھڑے گارڈ کو ہدایت دی، ''کیپٹن کو اپنی کرسی پر بٹھاؤ۔'' گارڈ نے کیپٹن کپور کا کندھا پکڑنے کے لیے ہاتھ آگے کیا، کپور نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ گارڈ نے اسٹین گن کندھے پر جمائی۔ ''گولی مار دوں گا۔'' کیپٹن نے گارڈ کی آنکھوں میں قاتلانہ جھلک دیکھی جس کی شکل رام چندر کی شکل سے بالکل ملتی ہوئی تھی، اور وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ بدن کانپتا ہوا، تھر تھر تھر تھر۔ گارڈ دروازے پر لوٹ گیا، اسٹین گن اس کے کندھے سے اب بھی لگی ہوئی۔ صورت سنگھ نے ہدایت دی، ''ایٹ ایز!'' اور گارڈ نے اسٹین گن اپنے کندھے سے ہٹالی۔

کیپٹن بکاش رائے نے سرکاری وکیل سے پوچھا، ''کیا میجر پوری کیپٹن کپور کے لیے پاگل پن کے دورے کی درخواست دینا چاہیں گے؟ اگر ہاں تو کورٹ مارشل معطل کرنا پڑے گا۔''

سرکاری وکیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''میری درخواست ہے کہ معزز عدالت اس بات پر ضرور سوچے کہ ایک سیدھا سادھا دیہاتی اور نظم وضبط کا پابند فوجی اپنے افسروں کا خون کیوں کر سکتا ہے۔ انسان تو ایک جیسے ہوتے ہیں، لیکن ایک انسان جب جنگلی جانور بن جائے، ہر لمحے حملہ کرنے کو تیار وحشی جانور، تو دوسرا انسان اپنے بچاؤ کے لیے اس جانور کا خون کرے گا کہ نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ سوار رام چندر کے اندر یہ ڈر گھر کر کے بیٹھ گیا ہو کہ کیپٹن کپور اور کیپٹن ورما کبھی بھی اس پر حملہ کر سکتے ہیں، اس لیے...'' وہ رکا۔ کرنل صورت سنگھ کی آنکھیں اس کے جسم کو چھید رہی ہیں، لیکن اسے تو ڈرایا نہیں جا سکتا۔ کورٹ روم میں ایک دھماکا خیز خاموشی چھا گئی۔ بے آواز پھٹتے گرینیڈ۔ بکاش رائے نے بات پوری کی، ''کیپٹن کپور نے کہا ہے کہ میرا بڑا بھائی نکسلائٹ تھا، پولیس کے ساتھ مقابلے میں مارا گیا۔ یہ سچ ہے۔ میرا بڑا بھائی جو لڑائی بندوق سے لڑ رہا تھا وہی لڑائی میں قانون کی طاقت سے لڑ رہا ہوں۔ ہمارے ونش میں یہ لڑائی تو سینکڑوں سالوں سے لڑی جا رہی ہے۔ میرے دادا جج تھے، استعفیٰ دے کر بھگت سنگھ، سکھ دیو اور راج گرو کی وکالت کرنے کلکتہ سے لاہور آئے تھے۔ شاید کیپٹن کپور کو پتا نہیں کہ میرا بڑا بھائی نکسلائٹ تھا تو میرے پتا آج کل کلکتہ ہائی کورٹ میں جج ہیں۔ کیپٹن کپور اگر اپنی پتنی پر جان لیوا حملہ کر سکتا ہے تو پتا نہیں اس نے سوار رام چندر کے ساتھ کیا کیا ہو گا کہ اسے خونی اور ہتیارا بننا پڑا۔'' بکاش رائے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ چیتے جیسا آدمی اب بے جان لگ رہا ہے، لیکن اس کا چہرہ بالکل دھلا ہوا، ایک دھلی ہوئی روح کا دھلا ہوا چہرہ۔

''کیا کیپٹن بکاش رائے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ کیپٹن کپور نے رام چندر پر اتنا ظلم کیا کہ وہ خون کرنے پر مجبور ہو گیا؟ یہ کورٹ مارشل ہے، ٹھوس اور سچے واقعات پر کیا جانے والا کورٹ مارشل۔ آدمی جانور بنتا ہے یا نہیں، اس نفسیاتی بحث کی جگہ کورٹ مارشل کا یہ کمرہ نہیں،'' سرکاری وکیل نے کمرے کی یہ دھماکا خیز خاموشی توڑی۔ کمرے نے پھر سے سانس لینا شروع کیا۔

''میجر پوری ٹھیک کہتے ہیں، مجھے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہیے۔ کورٹ سے میری درخواست ہے کہ صوبیدار صاحب کو دوبارہ سے گواہی کے لیے بلایا جائے۔ مجھے کچھ اور باتیں پوچھنی ہیں۔'' بکاش رائے کے پیچھے ہٹنے پر، غلطی ماننے پر سرکاری وکیل نے اس کی درخواست پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ لیکن

کرنل صورت سنگھ کو تو پتا ہے کہ یہ پیچھے ہٹنا ایک سامری چال ہے۔ ان کے ہاتھ دو بار گلے کے پاس گئے، لیکن آج تو گلے میں گرینیڈوں کی مالا نہیں۔ ہوتی بھی تو کسے مارتے؟ روح کے جاگتے حصے کو تو دشمن کا پتا نہیں، لیکن سویا ہوا حصہ تو کیپٹن کپور کے پاس کھڑا ہے، گھات لگا کر، مہلک حملہ کرنے کے لیے۔ انھوں نے اٹھتے ہوئے ہدایت دی، ''کل صوبیدار صاحب گواہی کے لیے پیش ہوں گے۔''

لوگ باہر نکلے۔ کپور نے ہکاش رائے کا راستہ روک کر کہا، ''تم چاہے میری جتنی بدنامی کرلو، لیکن رام چندر کو پھانسی سے نہیں بچا سکتے۔''

''کیپٹن کپور، میں نے آپ کو کل بھی بتایا تھا کہ میں مجرموں سے بات نہیں کرتا۔ سوال یہ نہیں کہ سوار رام چندر پھانسی سے بچے گا کہ نہیں، کتے، سوال یہ ہے کہ پہلے کون مرے گا۔ تم کہ سوار رام چندر۔ اور سنو! میرا بھائی نکسلائٹ تھا، مجھ میں بھی وہی لہو ہے۔ پھر راستہ روکا تو خون کر دوں گا۔ راستہ چھوڑو!'' ہکاش رائے نے کپور کو دھکا دے کر پرے کیا۔ مڑ کر دیکھا، کرنل صورت سنگھ پیچھے کھڑے تھے، سب کچھ سنتے ہوئے۔ وہ آگے آئے، اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا، ''کیپٹن رائے، آج رات کا کھانا تم میرے ساتھ کھاؤ گے۔'' کپور کی طرف قہر آلود آنکھوں سے دیکھا اور تیز قدموں سے اپنی جیپ کی طرف بڑھ گئے۔

صوبیدار صاحب گواہی کے لیے پیش ہوئے۔ انھیں گھبرایا ہوا دیکھ کر ہکاش رائے نے حوصلہ دیا، ''صاحب، آپ یہ بالکل مت سوچیں کہ پریشان کرنے کے لیے آپ کو دوبارہ بلایا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں، صوبیدار جوانوں اور سی او کے بیچ ایک پل ہوتا ہے۔ جوانوں کے دکھ درد اسی پل سے ہو کر سی او تک پہنچتے ہیں۔ اور سی او بھی اسی پل سے گزر کر جان سکتا ہے جوانوں کے بارے میں۔ کیوں، ٹھیک کہا نا میں نے؟'' صوبیدار صاحب نے ہاں میں سر ہلایا۔ لیکن ہکاش رائے کی بات سے نہ اس کا حوصلہ بڑھا نہ وہ خوش ہوا۔ اتنی لمبی نوکری ہے، اب تک اس کیپٹن کی حکمت عملیاں سمجھ میں آ چکی ہیں۔ پہلے ہاتھ پکڑ کر سہارا دے گا، پھر وہی ہاتھ پکڑ کر کھائی میں دھکیلے گا۔ لیکن پل والی بات تو ٹھیک کہی۔ تو کیا وہ کہیں خود کمزور پل تھا کہ رام چندر نے...

''صاحب، سی او صاحب نے جب سوار رام چندر کی خصوصی خوراک لگائی تو اس سے پہلے رام چندر کیپٹن کپور کا سیوادار تھا نا؟''

''نہیں سر، ریزنگ ڈے پر جب رام چندر نے پانچ ہزار میٹر کی دوڑ جیتی تب سی او صاحب نے اس کے لیے دودھ اور بادام لگائے۔ اس کے بعد ہی رام چندر کو کیپٹن کپور کی اردل میں ڈیوٹی دی گئی۔''

''سی او نے خوراک اس لیے لگائی کہ رام چندر دوڑ کی تیاری کرے، مشق کرے۔ آپ نے اسے سیوادار لگا دیا۔ کیوں؟''

''کیپٹن کپور صاحب نے مجھے آرڈر دیا کہ رام چندر کو ان کا اردلی لگاؤں۔ وہ صبح شام اس کے ساتھ دوڑیں گے۔ رام چندر کی پریکٹس ہو گی۔ مجھے ان کی بات ٹھیک لگی، اس لیے...''

''ان کا سیوادار بننے کے بعد کیا رام چندر صبح شام میدان میں مشق کے لیے آتا تھا؟''

''نہیں سر، مہینے میں دو تین بار آیا۔''

''سی او نے خاص خوراک لگائی اور رام چندر نے مشق بند کر دی۔ کیوں؟ آپ نے پوچھا؟''

''پوچھا تھا سر۔ رام چندر نے بتایا کہ کیپٹن صاحب پریکٹس کے وقت اسے کوئی نہ کوئی کام بتا دیتے تھے، اس لیے...''

''صاحب، سیوادار کو کیا کام کرنے کے لیے افسر کے گھر بھیجا جاتا ہے؟''

''سر، رول کے مطابق تو وردی تیار کرنا، ہتھیار صاف رکھنا۔ لیکن آپ تو جانتے...''

''ہاں، میں جانتا ہوں۔ قاعدے قانون کون مانتا ہے! سیوادار تو افسر کا نجی نوکر بن جاتا ہے۔ بازار سے سامان لاؤ، بچوں کو گھماؤ، میم صاحب کے کپڑے پریس کرو، کھانا بناؤ۔ لیکن اس میں آپ کا کیا قصور۔ خیر، سوار رام چندر کو آپ نے کیپٹن کپور کے سیوادار کے کام سے کب بدلا؟ کیوں بدلا؟''

''سر، رام چندر نے ہی بدلنے کے لیے کہا تھا۔ وہ اتوار کو سی او صاحب کے دربار میں شکایت کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کیپٹن صاحب کو بتایا، بات آگے نہ بڑھے، اس لیے...''

''رام چندر کو کیا شکایت تھی؟''

''سر، آپ تو جانتے ہیں، وہ چھوٹی ذات کا ہے۔ اس نے شکایت کی کہ کیپٹن صاحب اسے ہریجن بلاتے ہیں۔''

''اور آپ نے رام چندر کی یہ غلط شکایت مان لی؟ ہریجن لفظ تو مہاتما گاندھی کا دیا ہوا ہے۔ اگر کیپٹن نے اسے ہریجن بلایا تو گالی کہاں سے ہو گئی؟''

Scanned with CamScanner

"سر، وہ رام چندر کو چوہڑا اور بھنگی کہہ کر پکارتے تھے، سب کے سامنے۔ ان کے دوست کیپٹن ورما بھی چوہڑا کہتے تھے۔"

"رام چندر نے کون سا کام کرنے سے انکار کیا؟"

"صاحب کی چھوٹی بچی کی شِٹ اٹھانے سے۔"

"یہ شِٹ کیا ہوتا ہے؟ مجھے انگریزی کم آتی ہے، ہندی میں بتاؤ۔"

"ٹٹی۔ صاحب نے چھوٹی بچی کی ٹٹی اٹھانے کے لیے کہا تھا۔ رام چندر نے انکار کر دیا۔ صاحب نے کہا، ذات کے چوہڑے ہو، تمھارے پرکھے پشتوں سے ہم لوگوں کی ٹٹی کی ٹوکری سر پر اٹھاتے رہے ہیں۔"

"اس لیے آپ نے رام چندر کی شکایت مان لی؟"

"جی سر۔"

"سی او صاحب کو رپورٹ کی؟"

"نہیں سر، سوچا جھگڑا نمٹا دوں۔ بات نہ پھیلے۔"

"آپ نے ٹھیک سوچا۔ سرکار ہی بے وقوف ہے جو ایک کرنل کو سی او بناتی ہے۔ اسے تو آگے سے صوبیدار کو سی او بنانا چاہیے۔ کیوں، ٹھیک ہے؟"

"نہیں سر، مجھ سے غلطی ہوگئی۔ سی او صاحب کو سب کچھ بتا دیتا تو شاید یہ قتل نہ ہوتا۔" صوبیدار اپنی جگہ پر آیا۔ اس خون کے شریک کاروں میں وہ بھی، اس پاپ کے بوجھ سے دبا ہوا۔

قتل کے چشم دید گواہ کیپٹن کپور سے سرکاری وکیل نے بہت تھوڑے سوال کیے، کیونکہ اسے پتا چل چکا تھا کہ کیپٹن سے پوچھنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں۔ کیپٹن کپور نے بتایا کہ اس رات سوار رام چندر نے چاہے 'رک جاؤ! کون ہے؟' کی للکار نہیں لگائی، پھر بھی اس نے کیپٹن ورما کو موٹر سائیکل روکنے کے لیے کہا تھا۔ وہ فوج کے ہر قانون پر عمل کرنے والا افسر ہے۔

اب دفاع کے وکیل کی باری تھی۔ اس بار کیپٹن پرکاش رائے تیز چال سے کیپٹن کپور کے پاس پہنچا۔ اس کی چھاتی پر لگے میڈل کو دیکھا۔ پوچھا، "یہ میڈل آپ کو کس لیے ملا؟"

"آئی گاٹ اِٹ..."

Scanned with CamScanner

''آپ ہندی میں جواب دیں۔''

کیپٹن کپور نے کورٹ مارشل کے سربراہ کرنل صورت سنگھ کی طرف دیکھ کر کہا، ''سر، مجھے ہندی ٹھیک سے بولنی نہیں آتی۔ انگریزی میں جواب دینے کی اجازت دی جائے۔'' کرنل نے بکاش رائے کی طرف دیکھا، بولے کچھ نہیں۔

''آپ کا جنم کہاں ہوا؟ پڑھائی کہاں کی؟''

''امرتسر میں۔ بی اے تک وہیں پڑھا۔''

''آپ نے دسویں اور بی اے میں ہندی بھی پاس کی۔ پھر بھی آپ کو ٹھیک سے ہندی نہیں آتی۔ میں تو کلکتہ میں پیدا ہوا، وہیں پڑھا۔ مجھے تو ہندی آتی ہے۔ خیر، آپ جوانوں سے بات انگریزی میں کرتے ہیں، کیوں؟''

''ٹوٹی پھوٹی ہندی بول لیتا ہوں۔ افسر تو انگریزی میں بات کرتے ہیں۔ انگریزوں کے ٹائم سے یہ چل رہا...''

کرنل صورت سنگھ نے ٹوکا، ''کیپٹن کپور، انگریزوں کا ٹائم تو چالیس سال پہلے ختم ہو گیا۔ تم ہندی میں جواب دو گے، سمجھے!''

کپور نے ہاں میں سر ہلایا۔

''سوار رام چندر نے صوبیدار صاحب سے آپ کی شکایت کیوں کی؟''

''اب خاندانی لوگ فوج میں بھرتی نہیں ہوتے۔ چھوٹی ذات کے لوگوں کو بھرتی کیا جائے گا تو یہی ہوگا۔ اس لیے انڈین آرمی کا ڈسپلن...''

''آپ بھارتی فوج کے نظم وضبط کی فکر چھوڑیں، یہ خاندانی لوگ کیا ہوتا ہے؟''

''کھاتے پیتے گھروں کے لوگ۔ بھوکے ننگوں کو فوج میں جب روز بھر پیٹ روٹی ملتی ہے تو ان کا دماغ پھرے گا کہ نہیں؟''

''ضرور پھرے گا۔ آپ تو خاندانی ہیں، کھاتے پیتے گھر سے؟''

''جی، میرے پتا ریلوے سے ریٹائر ہوئے۔ امرتسر میں اپنی کوٹھی، گاؤں میں زمین...

''آپ کے پتا ریلوے میں کیا کام کرتے تھے؟''

کپور نے سر جھکا لیا۔ کرنل صورت سنگھ گرجے، ''جواب دو!''

''سر، گڈز کلرک تھے۔''

''بڑی سمجھ داری سے خرچہ کرتے ہوں گے۔ تبھی سامان بک کرنے والا کلرک ہونے پر بھی انھوں نے کوٹھی بنالی، زمین خرید لی۔ انھیں نوکری سے کتنی بار سسپینڈ کیا گیا؟''

''سسپینڈ کیا ہوتا ہے؟''

''سسپنڈ۔ معطل۔ رشوت لینے کے جرم میں آپ کے پتا کو تین بار معطل کیا گیا۔ تینوں بار بچ گئے، دے دلا کر۔''

''سر، کیپٹن رائے کو کوئی حق نہیں کہ کسی کے ماں باپ پر کیچڑ اچھالیں۔ انھیں ایسے سوال پوچھنے سے روکا جائے۔''

''نہیں پوچھوں گا۔ یہ سوال تو میں 'خاندانی' لفظ کے معنی سمجھنے کے لیے پوچھ رہا تھا۔ کیپٹن کپور کے پتا کو مجھے بیچ میں نہیں لانا چاہیے تھا۔'' بکاش رائے نے اپنی غلطی مانی۔ کپور سے اگلا سوال پوچھا، ''آپ کا پریوار چار مہینے سے دلّی میں ہے۔ آپ کھانا تو میس میں کھاتے ہوں گے؟''

''نہیں، گھر ہی کھاتا ہوں۔ روٹی پکانے کے لیے نوکر ہے۔''

''آج کل افسروں کو مفت راشن ملتا ہے۔ آپ پچھلے چار مہینے سے کیپٹن ورما کے گھر کھانا کھاتے رہے ہیں۔''

''کیا میں اپنے دوست کے گھر کھانا نہیں کھا سکتا؟''

''کھا سکتے ہیں۔ لیکن بچے ہوئے راشن کا کیا کیا؟''

''جو راشن بچتا ہے نوکر کو دے دیتا ہوں۔''

''آپ بچا ہوا راشن نوکر کو نہیں دیتے۔ پچھلے کئی مہینوں سے آپ کا سیوادار یہ راشن صدر بازار میں بنواری لال اینڈ سنز کی دکان پر بیچ آتا ہے۔ آپ چاہیں تو بنواری لال کو، آپ کے سیوادار کو گواہی کے لیے پیش کروں کہ آپ سرکاری راشن بیچتے ہیں؟''

''باقی افسر بھی...''

کرنل صورت سنگھ دہاڑے، ''باقیوں کی بات چھوڑو۔ تمھارا سیوادار راشن بیچتا ہے کہ نہیں؟''

Scanned with CamScanner

کپور نے سر جھکالیا۔

''آپ اپنے سیوادار رام چندر کو چوہڑا اور بھنگی پکارتے تھے؟''

''نہیں، وہ جھوٹ بولتا ہے۔ اور اگر بھنگی کو بھنگی بلایا جائے تو اس میں کیا کرائم ہو گیا؟''

''کوئی کرائم نہیں کیپٹن بھکاری داس کپور!'' بکاش رائے نے تسلیم کیا۔

''آپ میرا نام ٹھیک سے لیں۔ کیپٹن بی ڈی کپور،'' کیپٹن چیخا۔

''آپ کے میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں بھکاری داس کپور لکھا ہے۔ جانتے ہیں ایسا نام آپ کی ماں نے کیوں رکھا؟ آپ کا جنم بہت سارے پیر فقیر منانے کے بعد ہوا۔ آپ کے علاقے میں یہ اندھ وشواس ہے کہ لڑکے کا جنم اگر مشکل سے ہو تو نام گھٹیا رکھا جائے۔''

''آئی ایم بی ڈی کپور۔ یو کین ناٹ کال می بائی اینی ادر نیم۔''

''آپ اگر بھنگی کو بھنگی اور چوہڑا پکار سکتے ہیں تو میں بھی آپ کو اصلی نام سے پکار سکتا ہوں، کیپٹن بھکاری داس کپور۔''

''اسٹاپ اٹ! ادروائز...''

''ادروائز کیا؟ مجھے تھپڑ مارو گے؟ جیسے رام چندر کو مارا تھا جب اس نے چوہڑا پکارنے پر اعتراض کیا تھا؟''

''ہاں، ماروں گا۔ آئی ایم بی ڈی کپور۔ یو سن آف اے...'' کیپٹن کپور بکاش رائے کی طرف جھپٹا۔ اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ کو بکاش رائے نے اپنی مٹھی میں کس لیا۔ کمرے میں بیٹھے لوگ کھڑے ہو گئے۔ رائے اسے کرسی تک لے گیا۔ کرنل نے دروازے کے پاس کھڑے گارڈ کو ہدایت دی، ''کیپٹن کپور کی کرسی کے پاس کھڑے ہو جاؤ۔ اسے اپنی جگہ سے ہلنے نہ دینا۔ سمجھے۔'' گارڈ نے اسٹین گن کندھے پر رکھی اور قاتل قدموں سے چلتا ہوا کپور کی کرسی کے پاس کھڑا ہو گیا۔

''میری درخواست ہے کہ دفاع کے وکیل سے کہا جائے کہ کیپٹن کپور سے آج اور سوال نہ پوچھیں۔ کیپٹن کپور ڈسٹربڈ ہیں،'' سرکاری وکیل نے مریل دلیل دی۔

''میجر صاحب، مجھے کپتان کپور سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔ ہاں، 'ڈسٹربڈ' لفظ کا کیا مطلب؟ کہیں آپ یہ تو نہیں کہہ رہے کہ کیپٹن کپور اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے ہیں؟'' سرکاری وکیل نے کوئی جواب

نہیں دیا۔ کرسی پر بیٹھے کیپٹن کپور کو پتا نہیں بکاش رائے کا یہ جملہ کیوں یاد آ گیا کہ سوال یہ نہیں کہ رام چندر کو پھانسی ہو گی کہ نہیں، سوال یہ ہے کہ پہلے کون مرے گا— رام چندر یا کپور؟

سوار رام چندر کی گواہی شروع ہوئی۔ سرکاری وکیل نے صرف ایک سوال پوچھا، ''آپ کو کیپٹن کپور اور کیپٹن ورما گالیاں دیتے تھے؟ کیا آپ نے سی او صاحب سے رپورٹ کی؟''

''سر، مجھے کچھ نہیں کہنا۔ میں نے خون کیا ہے۔ مجھے سزا ملنی چاہیے۔ میں کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔'' سرکاری وکیل اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ صلاح کار جج نے کاغذ پر لکھ کر کرنل کو صلاح دی، ''اقبالی بیان کے بعد رام چندر کو بیان دینے پر مجبور تو نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس سے کورٹ مارشل یک طرفہ ہو جائے گا اور یہ ٹھیک نہیں ہو گا۔''

کرنل نے بکاش رائے کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا۔ کیپٹن بالکل ہولے سے رام چندر کے پاس پہنچا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟''

''سر، میں کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔''

''میں نے سوال تو پوچھا ہی نہیں۔ آپ کا نام رام چندر ہے، بھگوان رام چندر کے نام پر۔ وہ انصاف کے لیے لڑے تھے۔ شاید یہی سوچ کر آپ کے ماں باپ نے آپ کا نام رام چندر رکھا ہو۔''

''صاحب، یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ ماں باپ نے میرا نام رام چندر کیوں رکھا، لیکن کیپٹن کپور اور کیپٹن ورما کہتے تھے کہ آج کل ہر چوہڑے چمار کا نام رام چندر ہے یا کرشن لال۔ اب میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ میں اقبال کر چکا ہوں کہ خون میں نے کیا ہے۔''

''خون کیا ہے تو کیا تمھیں پرم ویر چکر دیا جائے؟ پھانسی ہو گی پھانسی! تم لوگوں کو قانون اور آئین چاہیے برابر کا حق دیں، تم رہو گے وہی ڈرپوک اور بزدل! حلف اٹھانے کے بعد بھی سچ نہیں بولو گے۔ میں کہتا ہوں تمھیں کیپٹن کپور اور کیپٹن ورما ٹھیک ہی پکارتے تھے— رام چندر چوہڑا!''

''صاحب، گالی مت دو۔ نہیں تو میں آپ کا خون کر دوں گا۔ میرے گورے رنگ کو دیکھ کر کیپٹن کپور ہمیشہ کہتے تھے، چٹا چوہڑا، ضرور کسی کپور یا ورما کی سَٹ ہے۔''

''یہ سَٹ کیا ہوتا ہے؟ مجھے پنجابی نہیں آتی۔'' بکاش رائے رام چندر کو تاؤ میں لا چکا ہے۔ اسے

Scanned with CamScanner

سانس لینے، سوچنے کا موقع نہیں دے رہا۔

"سٹ ہوتا ہے اولاد، جو کسی اور آدمی کی ہو۔ یعنی کہ میں اپنے باپ کی نہیں، کسی کپور یا ورما کی اولاد ہوں۔"

"اس رات تم نے انھیں للکارا کیوں نہیں تھا؟ پھر ان افسروں نے موٹر سائیکل گارڈ ہاؤس کے پاس روکی کیوں؟ تم نے ضرور کوئی دھمکی دی ہوگی، گالی دی ہوگی؟"

"نہیں، جب بھی میں گارڈ ڈیوٹی پر ہوتا تھا، میس سے واپس لوٹتے ہوئے دونوں گارڈ ہاؤس کے پاس رکتے تھے، مجھے گالی دینے کے لیے۔"

"اس رات کیا گالی دی؟" بکاش رائے نے گرج کر پوچھا۔

"چھٹے چوہڑے! تو ضرور کسی کپور یا ورما کی سٹ ہے!"

"سچ بولو! کون سی گالی دی؟" بکاش رائے دہاڑا۔

"چھٹے چوہڑے! تیری ماں ضرور کسی کپور یا ورما کے ساتھ سوئی ہوگی۔" اور رام چندر نے منھ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ کرنل صورت سنگھ نے گارڈ کے ہاتھ دیکھے، اسٹین گن پر کستے ہوئے۔

"گارڈ! ایٹ ایز! دروازے پر جا کر کھڑے ہو جاؤ!"

گارڈ کی اسٹین گن کیپٹن کپور کی طرف ایک بار اٹھی۔ کمرے نے سانس لینا بند کر دیا۔ وہ دروازے کی طرف چل پڑا۔ رام چندر اب بھی رو رہا ہے۔ سی او خود اٹھے۔ اسے تھام کر کٹہرے سے باہر لائے۔ گارڈ کو اشارہ کیا۔ وہ پانی کا گلاس لایا۔ اپنے ہاتھ سے رام چندر کو پانی پلاتے دبی اور زہریلی آواز میں کہا، "اس حرامی کپور پر گولی چلاتے ہوئے تیرا نشانہ کیوں چوک گیا؟" رام چندر کے آنسو بند ہوئے۔ اس نے اپنے سی او کی طرف دیکھا۔ اس کی روح سے روشنی کا چمکتا ٹکڑا سرک کر اس کے چہرے پر پھیل گیا۔

سرکاری وکیل نے بات سمیٹی، "چاہے کیپٹن بکاش رائے نے ثابت کر دیا کہ سوار رام چندر کے ساتھ ظلم ہوا، لیکن رام چندر اس کی شکایت سی او سے کر سکتا تھا۔ آرمی چیف اور صدر تک پہنچا سکتا تھا۔ اس نے قانون اپنے ہاتھ میں لیا، خون کیا، اس لیے آرمی ایکٹ کی دفعہ ۶۹ اور انڈین پینل کوڈ کی دفعہ ۳۰۲

Scanned with CamScanner

کے تحت اسے پھانسی کی سزا ملنی چاہیے۔''
پرکاش رائے کھڑا ہوا۔ کیپٹن کپور کو دیکھا، رام چندر کو دیکھا، اور پھر کرنل صورت سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بالکل دبی آواز میں بولا، گھاسے آتی آواز میں، ''سرکاری وکیل ٹھیک کہتے ہیں۔ سوار رام چندر کو پھانسی کی سزا ملنی چاہیے۔ اپنے ملک کی حفاظت کا حلف اٹھانے کے باوجود اس نے ایک افسر کے بچے کی ٹٹی اٹھانے سے انکار کر دیا۔ وفاداری کا حلف اٹھانے کے باوجود اس نے 'حرام کاسٹ' گالی سن کر افسر کا خون کر دیا۔ اسے فوج کے قانون کی دفعہ ۶۹ اور تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۰۲ کی رو سے ہر حالت میں سزائے موت ملنی چاہیے۔''
کورٹ کے ارکان سکتے میں آ گئے۔ یہ کیسا دفاع کا وکیل ہے جو بچاؤ کی اپیل کے بدلے سزائے موت دینے کی سفارش کر رہا ہے؟
پرکاش رائے سرکاری وکیل کے پاس گیا۔ اسے کوئی صلاح دی۔ سرکاری وکیل نے ہاں میں سر ہلایا اور کورٹ مارشل کے سربراہ سے کہا، ''میری درخواست ہے کہ کیپٹن کپور کی زندگی خطرے میں ہے، اسے ریوالور دیا جائے۔ چوبیس گھنٹے اپنے پاس رکھنے کے لیے، حفاظت کے لیے۔''
کرنل صورت سنگھ نے کیپٹن پرکاش رائے کی طرف دیکھا۔ حکمت عملی کے گھٹ پرتی گھات دونوں کی روحوں سے نکلے اور آپس میں جڑ گئے۔ انھوں نے کیپٹن کپور کو ریوالور دینے کا حکم دے دیا۔
کمرے سے اٹھ کر سب باہر چلے گئے۔ انھوں نے رام چندر کو اپنے پاس بلایا۔ ''جوان! تمھیں موت سے ڈر لگتا ہے؟''
رام چندر نے سینہ تان لیا۔ کرنل صورت سنگھ نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا، ''شہید موت سے نہیں ڈرتے۔ اپنے بھگوان کا نام لو۔ بالکل ڈر نہیں لگے گا۔'' رام چندر نے انھیں کھٹاک سے سلیوٹ کیا۔
''میں تمھیں سزائے موت دے رہا ہوں۔ لیکن تمھارا دشمن، وہ حرامی کیپٹن اب فوج میں نہیں رہ سکتا۔ اسے ڈسمس کرنے کے لیے لکھوں گا۔''
کورٹ کے ارکان نے اپنی صلاح لکھ کر دی۔ دو نے لکھا: سزائے موت۔ اور دو نے لکھا: بری۔
کرنل صورت سنگھ نے صلاح کار جج کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا، ''سر، میں آپ کو کوئی صلاح نہیں

دے سکتا۔"

"مجھے تمھاری صلاح کی ضرورت بھی نہیں۔" کرنل نے قلم اٹھایا اور مضبوط ہاتھ سے لکھا: سزائے موت۔

اسی شام کرنل صورت سنگھ کے بریگیڈیر بننے کی اطلاع آرمی ہیڈ کوارٹرز سے آئی۔ میس میں بڑی پارٹی منعقد ہوئی۔ کورٹ مارشل کے سارے ارکان اور کیپٹن بکاش رائے، اور رام چندر کی یونٹ کے افسر بھی پارٹی میں شامل ہوئے۔

کیپٹن کپور نے میس کے دروازے کے پاس کار کھڑی کی۔ ملٹری پولیس کے گارڈ نے اسے کہا کہ کار پارکنگ کی جگہ پر کھڑی کرے۔ کیپٹن کپور نے اس کی طرف چابی اٹھا کر کہا، "تم وہاں پارک کر دو۔"

"میں تمھارے باپ کا نوکر نہیں۔ اپنے آپ کھڑی کرو۔"

"تمیز سے بولو۔ میں تمھاری رپورٹ کردوں گا۔"

"کیپٹن کپور، مجھے رام چندر سمجھنے کی بھول مت کرنا۔ میرا نشانہ کبھی نہیں چوکتا۔ بھین دے یار! میں سرکار کا نوکر ہوں، تیرے باپ کا نہیں۔" گارڈ کا ہاتھ اسٹین گن کی طرف بڑھا۔ کیپٹن کپور نے اپنا ریوالور چھوا اور کار پارکنگ پلیس کی طرف لے گیا۔ اس نے دل ہی دل میں دفاع کے وکیل کیپٹن رائے کا شکریہ ادا کیا کہ اسے ریوالور ایشو کرنے کی سفارش کی۔ اس حقیقت کا اچانک پتا چلتے ہی کہ کوئی بھی جوان اس کا قتل کر سکتا ہے، وہ کانپ گیا۔

وہ میس کے اندر آیا۔ کرنل صورت سنگھ کو سلیوٹ کیا۔ "سر، کانگریٹس آن بی کمنگ اے بریگیڈیر۔ مے آئی جوائن یو ان دی سیلیبریشن؟"

"نو! یو مے ناٹ جوائن می۔ اور زندگی میں جب کبھی مجھ سے آمنا سامنا ہو، انگریزی میں مت بولنا۔ ناؤ گیٹ آؤٹ! ڈونٹ شو می یور ڈرٹی فیس۔"

کیپٹن بی ڈی کپور مرے ہوئے قدموں سے باہر نکلا۔ اس کا ہاتھ ریوالور کی مٹھی پر تھا۔ اگلے ہی لمحے گولی چلنے کی تیز آواز آئی جو کمرے میں گول گول گھومنا شروع ہوگئی۔ باہر کھڑا گارڈ بھاگتا ہوا اندر

آیا۔ ''سر، کیپٹن نے خودکشی کرلی۔''

کیپٹن بکاش رائے نے بریگیڈیر صورت سنگھ کی طرف گلاس بڑھایا۔ ''چیرز، سر!''

''چیرز کیپٹن بکاش رائے!'' انھوں نے اپنا گلاس بکاش رائے کی طرف بڑھایا۔ گلاسوں کی کھنکتی آواز میں گولی چلنے کی گونج دب کر مر چکی تھی۔

❀❀

# ہندوستانی اردو انگریزی کتابیں

منٹو: ایک مطالعہ
وارث علوی
قیمت: 375 روپے

سرخ وسیاہ
بلراج مین را
قیمت: 750 روپے

آدھا گاؤں (ناول)
راہی معصوم رضا
قیمت: 375 روپے

کرشن چندر: شخصیت اور فن
جگدیش چندر ودھاون
قیمت: 600 روپے

حاضر حال جاری (افسانے)
سریندر پرکاش
قیمت: 375 روپے

حشر کی صبح درخشاں ہو (شاعری)
عادل منصوری
قیمت: 300 روپے

واپسی (افسانے)
اظہار الاسلام
قیمت: 210 روپے

گفتگوؤں کی (انٹرویوز)
مرتب: اطہر فاروقی
قیمت: 225 روپے

مثنوی لختِ جگر
بال مکند بے صبر
(شاگرد غالب)
قیمت: 240 روپے

دیوانِ بیاںؔ
احسن اللہ خاں بیاںؔ
مرتب: ارجمند آرا
قیمت: 225 روپے

Scanned with CamScanner

# پاکستانی اردو کتابیں

راستہ چلتی عورت اور دوسری کہانیاں
بلونت سنگھ
قیمت: 260 روپے

جنوں میں جتنی بھی گزری (آپ بیتی)
حسن عابدی
قیمت: 250 روپے

میرے حصے کی روشنائی
نور سجاد ظہیر
قیمت: 100 روپے

روشنائی
سجاد ظہیر
قیمت: 350 روپے

لندن کی ایک رات
سجاد ظہیر
قیمت: 175 روپے

سجاد ظہیر: شخصیت اور فکر
مرتب: ڈاکٹر سید جعفر احمد
قیمت: 250 روپے

مغنیِ آتش نفس، سجاد ظہیر
ترتیب: ڈاکٹر سید جعفر احمد
قیمت: 150 روپے

انگارے سے پگھلا نیلم تک
سید مظہر جمیل
قیمت: 250 روپے

چاک ہوا دل (کہانیاں)
ڈاکٹر شیر شاہ سید
قیمت: 80 روپے

دل میرا بالا کوٹ (کہانیاں)
ڈاکٹر شیر شاہ سید
قیمت: 80 روپے

Scanned with CamScanner

# نوم چومسکی

انگریزی سے ترجمہ اور تدوین: اجمل کمال

## ناکام ریاستیں: ایک گفتگو

میساچوسٹس انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں لسانیات کے پروفیسر اور امریکی خارجہ پالیسی کے ایک نمایاں ترین ناقد نوم چومسکی (Noam Chomsky) کی ایک کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے جس کا عنوان ہے: *Failed States: The Abuse of Power and the Assault on Democracy* اس کتاب میں اس بات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ کس طرح امریکہ ایک ناکام ریاست سے مشابہ ہوتا چلا جارہا ہے جو اپنے باشندوں کو تشدد سے محفوظ رکھنے کی اہلیت نہیں رکھتی اور جہاں ایک ایسی حکومت قائم ہے جو خود کو ہر ملکی اور بین الاقوامی قانون سے بالاتر سمجھتی ہے۔ اس کتاب میں پروفیسر چومسکی نے بہت سی تجاویز پیش کی ہیں جو اس ملک کو ایک ناکام ریاست بننے سے بچانے میں مدد کرسکتی ہیں۔ یہ تجاویز ہیں: جرائم کی بین الاقوامی عدالت اور عالمی عدالت انصاف کو تسلیم کیا جائے؛ گلوبل وارمنگ سے متعلق معاہدے کیوٹو پروٹوکول پر دستخط کیے جائیں؛ بین الاقوامی بحرانوں سے نمٹنے کا کام اقوام متحدہ کی قیادت میں کیا جائے؛ دہشت گردی کے مقابلے کے لیے فوجی اقدامات کے بجائے سفارت کارانہ اور معاشی اقدامات پر انحصار کیا جائے؛ اور فوجی اخراجات میں زبردست کمی اور سماجی سہولتوں پر کیے جانے والے اخراجات میں زبردست اضافہ کیا جائے۔ اس کتاب کے شائع

Scanned with CamScanner

ہونے کے بعد براڈکاسٹ ہونے والے اپنے پہلے انٹرویو میں پروفیسر نوم چومسکی
آج بوسٹن سے ہمارے ساتھ ہیں۔ !Democracy Now میں خوش آمدید۔
— ایمی گڈمین (Amy Goodman) اور
حوان گونزالیز (Juan Gonzalez)

❁

ناکام ریاستوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟

پچھلے کئی برسوں میں کئی تصورات کا ایک سلسلہ وضع کیا گیا ہے تاکہ بین الاقوامی امور میں طاقت کے لمبے عرصے تک استعمال کا جواز پیش کیا جا سکے۔ پہلے یہ جواز اس بہانے سے پیش کرنا ممکن تھا، جو اکثر بے بنیاد ثابت ہوتا تھا، کہ امریکہ خود کو کمیونسٹ خطرے سے محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے تک آتے آتے یہ بہانہ خاصا کھوکھلا ہو چکا تھا۔ ریگن حکومت نے ملکوں کا ایک نیا زمرہ ایجاد کیا: ''دہشت گرد ریاستیں''۔ اس نے ۱۹۸۰ء کے عشرے میں، ۱۹۸۱ء میں، اقتدار میں آتے ہی دہشت گردی کے خلاف جنگ کے آغاز کا اعلان کر دیا۔ ''ہمیں اپنا تحفظ کرنا ہے، جدید دور کے خطرے کے خلاف، بربریت کی طرف واپسی کے خطرے کے خلاف، دہشت گردی کے شرانگیز عذاب کے خلاف،'' وغیرہ وغیرہ، اور خاص طور پر ریاستوں کی جانب سے چلائی جانے والی بین الاقوامی دہشت گردی کی مہم کے خلاف۔

اس کے چند سال بعد، کلنٹن کے دور میں، ''بدمعاش ریاستوں'' (rogue states) کا زمرہ ایجاد کیا گیا۔ ''یہ ۱۹۹۴ء ہے، ہمیں بدمعاش ریاستوں سے اپنا دفاع کرنا ہے۔'' اس کے بعد ان ملکوں کو بیان کرنے کے لیے ''ناکام ریاستوں'' (failed states) کی اصطلاح سامنے آئی۔ یہ ریاستیں یا تو عراق کی طرح ہماری سلامتی کے لیے خطرہ ہیں، یا ہائیتی کی طرح خود ان کو بچانے کے لیے ہمارا مداخلت کرنا ضروری ہے، گو اکثر اس قسم کی مداخلت ان ملکوں کو تباہ و برباد کر ڈالتی ہے۔ ہر صورت میں ان اصطلاحات کی تعریف کا درست طور سے اطلاق کرنا خاصا مشکل ہے، کیونکہ ان ملکوں [بدمعاش

Scanned with CamScanner

ریاستوں] کو کتنے ہی روایتی، قدامت پسندانہ طریقے سے بیان کیا جائے — مثلاً امریکی قانون کی رو سے — تو خود امریکہ اس تعریف پر بڑی حد تک پورا اترتا معلوم ہوتا ہے، اور اس حقیقت کی نشان دہی بھی کی جاتی رہی ہے۔ اب تک بہت سے اسکالر اس بات کو تسلیم کر چکے ہیں — خود کلنٹن کے دور میں سیموئل ہنٹنگٹن جیسے اسکالر نے، Foreign Affairs جیسے نمایاں جریدے میں، لکھا تھا — کہ دنیا کے بیشتر حصوں میں، بہت سے حصوں میں امریکہ کو سب سے بڑی بدمعاش ریاست خیال کیا جاتا ہے اور ان خطوں کے وجود کے لیے سب سے بڑا خطرہ سمجھا جاتا ہے۔

اب، اس کے کئی برس بعد، بش کے دورِ صدارت میں، انھی جریدوں میں لکھنے والے نمایاں ترین ماہرین اب اس بات کے لیے بین الاقوامی رائے عامہ کی شہادت پیش کرنا تک ضروری نہیں سمجھتے، بلکہ اسے محض ایک سامنے کی حقیقت کے طور پر بیان کرتے ہیں کہ امریکہ سب سے بڑی بدمعاش ریاست بن چکا ہے۔ بلاشبہ، خود اپنی وضع کردہ بین الاقوامی دہشت گردی کی تعریف کی رو سے، یہ ایک دہشت گرد ریاست ہے، جو نہ صرف پرتشدد دہشت گردی کے افعال انجام دیتی ہے اور ان کی حمایت کرتی ہے بلکہ اس نام نہاد ''بش ڈاکٹرائن'' کی سنگین خلاف ورزی کرتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جو ریاست دہشت گردوں کو پناہ دے وہ دہشت گرد ریاست ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا کہ امریکہ نے نمایاں ترین بین الاقوامی دہشت گردوں کو پناہ دے رکھی ہے، ایسے لوگوں کو جنھیں ایف بی آئی اور امریکی محکمۂ انصاف نے نمایاں ترین دہشت گرد قرار دیا ہے، مثلاً اورلینڈو بوش (Orlando Bosch) اور پوسادا کاریلیس (Posada Carriles)[1] — اگر ان افراد کا ذکر نہ بھی کیا جائے جو ریاستی دہشت گردی کی حکومتی پالیسیوں کو عملی طور پر نافذ کرنے کے ذمے دار ہیں۔

اور میری رائے میں ''ناکام ریاستوں'' کی اصطلاح بھی امریکہ پر درست بیٹھتی ہے۔ ہم جس قسم کی ریاست کو ناکام ریاست کہتے ہیں، امریکہ اس کی خصوصیات زیادہ سے زیادہ اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اس قسم کی ایک نہایت اہم خصوصیت وہ ہے جسے ''جمہوری خسارہ'' (democratic deficit) کہا جاتا ہے، یعنی عوام کی رائے اور سرکاری پالیسی کے درمیان ایک وسیع خلیج۔ اس لیے جن تجاویز کا انٹرویو کے

---

[1] بوش اور کاریلیس ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو کیوبا کی قومی ایرلائن کے طیارے کو تباہ کرنے کی واردات میں ملوث تھے جس میں ۷۳ افراد ہلاک ہوئے۔

Scanned with CamScanner

آغاز میں ذکر کیا گیا، یہ میری تجاویز نہیں ہیں، یہ خاصی احتیاط پسندانہ تجاویز ہیں۔ یہ امریکی عوام کی اکثریت کی تجاویز ہیں، اور ان تجاویز کو سامنے لانا محض جمہوریت کو سنجیدگی سے لینے کے مترادف ہے۔ جن تجاویز کا یہاں ذکر ہوا ان پر، اور ان کے علاوہ اور بہت سی تجاویز پر، عوامی رائے اور سرکاری پالیسی کے درمیان بہت بڑی خلیج واقع ہے۔ یہ تجاویز، اور عوام کا عمومی رویہ ایسا ہے جس کا خاصا گہرا مطالعہ بھی کیا جا چکا ہے، اور ہماری دونوں بڑی سیاسی پارٹیاں عوامی رجحان کے مقابلے میں خاصی دائیں بازو کی طرف واقع ہوئی ہیں۔

کتاب کے ابتدائی حصوں میں، خاص طور پر جہاں ناکام ریاستوں کی اس خصوصیت کا ذکر ہوا ہے کہ ایسی ریاست اپنے شہریوں کو سلامتی اور تحفظ فراہم کرنے میں ناکام رہتی ہے، آپ نے خاصی جامعیت سے اس بات کا جائزہ لیا ہے کہ، خاص طور پر بش کی صدارت کے برسوں میں، دہشت گردی کے خلاف جنگ کا امریکی شہریوں کے تحفظ کے معاملے میں کیا نتیجہ رہا ہے۔ اور آپ نے بہت واضح طور پر دکھایا ہے کہ اس جنگ کے آغاز سے، خصوصاً عراق پر حملے کے بعد سے، دنیا میں دہشت گردی کی کارروائیاں اور سرگرمیاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ اس سلسلے میں آپ نے امریکہ کے خلاف نیوکلیئر اسلحے کے استعمال کے امکان کا بھی ذکر کیا ہے۔ کیا آپ اس کی مزید وضاحت کر سکتے ہیں؟

نیوکلیئر جنگ کا بہت سنگین خطرہ لاحق ہے۔ بدقسمتی سے عوام کے سامنے اس کا زیادہ ذکر نہیں کیا جاتا۔ لیکن اگر آپ حکمت عملی کے تجزیہ نگاروں وغیرہ کی تحریروں پر نظر ڈالیں تو انھیں اس بات پر بہت تشویش ہے۔ اور وہ اس سلسلے میں بش حکومت کی جارحانہ جنگ آزمائی کو، ان میں سے ایک کے الفاظ میں ''حتمی تباہی کے شدید خطرے'' کا حامل قرار دیتے ہیں۔ رابرٹ میکنمارا نے اس کا ذکر apocalypse soon کے لفظوں میں کیا ہے۔ اور بھی بہت سے لوگوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اور اس تشویش کی معقول وجہ موجود ہے جس سے اس خطرے کی وضاحت ہوتی ہے، اور ان لوگوں نے یہ وضاحت کی ہے۔ بش حکومت اپنی اس پالیسی کو جان بوجھ کر آگے بڑھا رہی ہے، اس لیے نہیں کہ یہ لوگ نیوکلیئر جنگ چاہتے ہیں، بلکہ صرف اس لیے کہ اس کی پروا کرنا ان کی اونچی ترجیحات میں شامل نہیں۔ امریکہ کی فوجی

Scanned with CamScanner

صلاحیت میں نہایت تیز رفتاری سے اضافہ کیا جا رہا ہے، جس میں خلا کا فوجی استعمال بھی شامل ہے (اور اس میدان میں امریکہ اکیلا سرگرم ملک ہے)۔ باقی پوری دنیا اس عمل کو روکنے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ اس سلسلے میں ۹۵ فیصد اخراجات امریکہ کی جانب سے کیے جا رہے ہیں، اور یہ اخراجات متواتر بڑھ رہے ہیں۔

ان ملکوں کی طرف سے جو ان تمام تیاریوں کا ممکنہ ہدف ہیں، جو ردعمل ہوتا ہے وہ مکمل طور پر قابل پیش گوئی ہے۔ ظاہر ہے، وہ یہ تو کہنے سے رہے کہ "بہت بہت شکریہ جناب، یہ رہے ہمارے گلے، مہربانی کر کے انھیں کاٹ دیجیے۔" وہ اس عمل کے خلاف جن طریقوں سے ردعمل کر سکتے ہیں، کرتے ہیں۔ کچھ ملکوں کی طرف سے یہ ردعمل ہو سکتا ہے کہ اس کے جواب میں امریکہ کے خلاف دہشت گردی کی دھمکی دی جائے، یا دہشت گردی کو عملی طور پر استعمال کیا جائے۔ دوسرے ملکوں کے لیے، جو زیادہ طاقتور ہیں، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خود اپنی جارحانہ فوجی صلاحیت میں تیزی سے اضافہ کریں۔ چنانچہ بش کے منصوبوں کے جواب میں روس کے فوجی اخراجات میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ چین بھی اپنی جارحانہ فوجی صلاحیت میں اضافہ کرنا شروع کر رہا ہے۔ ان سب چیزوں سے اس بات کا خطرہ پیدا ہوتا ہے — بلکہ پہلے سے موجود خطرے کی سنگینی میں اضافہ ہوتا ہے — کہ کہیں محض حادثاتی طور پر نیوکلیئر جنگ نہ چھڑ جائے۔ یہ تمام ایٹمی ہتھیاروں کے نظام ایسے چوکنے پن کی حالت میں ہیں جو مکمل طور پر کمپیوٹروں کے کنٹرول میں ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ خود ہمارے اپنے کنٹرول کے نظام میں بہت سے نقائص موجود ہیں، جنھیں انسانی مداخلت کے ذریعے رفع کیا جاتا ہے۔ دوسرے ملکوں کے نظام اس سے کہیں زیادہ غیر محفوظ حالت میں ہیں، خاص طور پر روسی ایٹمی ہتھیاروں کے نظام کی صورت حال پہلے سے خراب ہوئی ہے۔ ان سب باتوں سے نیوکلیئر جنگ کا خطرہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ اس وقت میں باقاعدہ نیوکلیئر جنگ کی بات کر رہا ہوں۔ اس کے علاوہ چھوٹے [بے قاعدہ] "ڈرٹی" بموں، یعنی چھوٹے نیوکلیئر دھماکوں کا خطرہ بھی موجود ہے۔ اور چھوٹے دھماکوں کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بہت کم نقصان پہنچائیں گے، بلکہ یہ صرف اُس بڑے نیوکلیئر حملے کے مقابلے میں چھوٹے ہوں گے جو پوری انسانی تہذیب کو تباہ کر دینے کی طاقت رکھتا ہے۔ امریکی انٹیلی جنس اداروں کے مطابق، مثال کے طور پر نیویارک میں، اگلے دس برس میں، ڈرٹی بم کے حملے کا امکان پچاس فیصد سے

زیادہ ہے۔ اور جوں جوں دہشت گردی کا خطرہ بڑھتا جاتا ہے، یہ امکان بھی بڑھتا جاتا ہے۔

اور بش حکومت کی پالیسیاں، ان تمام خطروں کا علم رکھتے ہوئے بھی، اس طرح آگے بڑھائی جا رہی ہیں جس سے دہشت گردی کے خطرے میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کی سب سے عیاں مثال عراق پر حملہ ہے۔ یہ حملہ اس امر کی پیش آگہی کے ساتھ کیا گیا تھا کہ اس سے دہشت گردی اور نیوکلیئر اسلحے کے پھیلاؤ کے خطرے میں اضافے کا غالب امکان ہے۔ اور در حقیقت ایسا ہی ہوا بھی ہے، جیسا کہ سی آئی اے، نیشنل انٹیلی جنس کاؤنسل، غیر ملکی انٹیلی جنس ایجنسیوں اور آزاد ماہرین نے بتایا ہے۔ انھوں نے نشان دہی کی ہے کہ ہاں، جیسا کہ توقع کی جا رہی تھی، اس سے دہشت گردی کے خطرے میں اضافہ ہوا ہے۔ بلکہ یہ اضافہ اس سے کہیں زیادہ اور متنوع طریقوں سے ہوا ہے جس کی توقع کی جا رہی تھی۔

اس کی صرف ایک مثال: ہم اکثر پڑھتے ہیں کہ عراق میں وسیع تباہی کے ہتھیار نہیں ملے۔ دراصل یہ بات مکمل طور پر درست نہیں ہے۔ عراق کے پاس، اور عراق کی سرزمین پر، وہ وسائل موجود تھے جو وسیع تباہی کے ہتھیار بنانے میں استعمال ہو سکتے ہیں۔ وہ اقوام متحدہ کے انسپکٹروں کے پہرے میں تھے جو انھیں رفتہ رفتہ منہدم کر رہے تھے۔ جب رمزفیلڈ، وولفووِٹز اور دوسرے امریکی حکام نے وہاں فوجیں بھیجیں تو ان کو یہ ہدایات دینے میں کوتاہی کی کہ وہ ان جگہوں کی نگرانی کریں۔ اقوام متحدہ کے انسپکٹروں کو نکال دیا گیا، اور یہ جگہیں کسی پہرے سے آزاد ہو گئیں۔ انسپکٹروں نے اپنا کام سیٹلائٹ کے ذریعے جاری رکھا اور رپورٹ دی کہ ان میں سے سو سے زیادہ جگہوں کو لُوٹ لیا گیا ہے، اور یہ لُوٹ بڑے منظم طریقے سے ہوئی ہے، یہ نہیں کہ یونہی کوئی شخص اندر چلا آیا اور کوئی چیز اٹھا کر چلتا بنا، بلکہ یہ عمل بڑی احتیاط سے کیا گیا ہے۔ ان وسائل میں نہایت خطرناک زہریلے مادّے (biotoxins) اور ان نازک آلات کو پوشیدہ رکھنے کے وسائل جو نیوکلیئر اسلحے اور میزائلوں کی تیاری میں استعمال ہوتے ہیں، اور کیمیائی ہتھیاروں کی تیاری کے وسائل شامل ہیں۔ یہ سب غائب ہو چکے ہیں۔ اس بات کا تصور کرنا بڑا ہولناک کام ہے کہ یہ سب کچھ کہاں گیا، لیکن یہ سامان نیویارک بھی پہنچ سکتا ہے۔

اپنی کتاب میں آپ نے اس پر بھی بات کی ہے کہ عراق دہشت گردوں کی تربیت کے لیے انکیوبیٹر، بلکہ یونیورسٹی بن چکا ہے جہاں سے تربیت یافتہ دہشت گرد ملک سے باہر نکل کر دنیابھر میں پھیل رہے ہیں، تقریباً اسی طرح جیسے ۱۹۸۰ء

کے عشرے میں افغانستان میں ہوا تھا۔ کیا آپ اس کی تفصیل بیان کر سکتے ہیں؟

دراصل یہ سب اطلاعات سی آئی اے اور دوسری امریکی انٹیلی جنس ایجنسیوں اور تجزیہ نگاروں کی فراہم کی ہوئی ہیں۔ یہ لوگ آج کے عراق کو ایسے انتہائی پیشہ ور دہشت گردوں کی تربیت کا میدان قرار دیتے ہیں جنھیں خاص طور پر بڑے شہری علاقوں میں دہشت گردی کی وارداتیں کرنے کی مہارت حاصل ہے۔ یہی لوگ اس صورت حال کا موازنہ افغانستان سے بھی کرتے ہیں، لیکن کہتے ہیں کہ عراق میں یہ صورت حال کہیں زیادہ سنگین ہے جس کی وجہ تربیت اور مہارت کی نہایت اعلیٰ سطح ہے۔ یہ ماہر دہشت گرد قریب قریب یقینی طور پر عراقی باشندے ہیں۔ بہت تھوڑی تعداد میں غیر ملکی بھی عراق میں داخل ہوئے ہیں؛ ان کی تعداد کا تخمینہ پانچ سے دس فیصد تک لگایا گیا ہے۔ اور یہ لوگ، جیسا کہ افغانستان میں ہوا تھا، متوقع طور پر دنیا کے بہت سے خطوں میں پھیل کر اسی قسم کی دہشت گردی کی کارروائیاں کریں گے جیسی انھیں تربیت دی گئی ہے — اور یہ سب واضح طور پر عراق پر امریکی حملے کا ردعمل ہے۔ عراق کے بارے میں آپ اور جو کچھ بھی سوچتے ہوں، امریکی حملے سے پہلے یہ ملک دہشت گردی کے ساتھ ہر قسم کے تعلق سے آزاد تھا۔ اب وہ دہشت گردی کا ایک نمایاں مرکز ہے۔

بات یوں نہیں ہے جیسا صدر بش کا کہنا ہے، کہ دہشت گرد عراق میں جمع ہو رہے ہیں، جہاں ہم ان سب کو ایک ساتھ ختم کر ڈالیں گے۔ یہ وہ دہشت گرد ہیں جن کا اس سے پہلے دہشت گردی میں ملوث ہونے کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ غیر ملکی جنگجو جو عراق میں ہاتھ آئے ہیں، بیشتر سعودی عرب سے تعلق رکھتے ہیں، وہ سب سعودی، اسرائیلی اور امریکی انٹیلی جنس کے ہاتھوں مفصل تفتیش سے گزر چکے ہیں، اور اس تفتیش سے یہ نتیجہ نکلا ہے کہ وہ عراق پر ہونے والے حملے سے متاثر ہو کر اس میدان میں آئے تھے اور اس سے پہلے دہشت گردی کی کارروائیوں میں کبھی ملوث نہیں رہے۔ اور بلاشبہ، توقع کے مطابق، عراق کی جنگ نے دنیا کے بیشتر حصے میں، خصوصاً مسلم دنیا میں، امریکہ کے خلاف معاندانہ جذبات میں زبردست اضافہ کیا ہے۔

یہ جنگ، اپنے شروع ہونے سے بھی پہلے سے، دنیا کی غالباً سب سے زیادہ غیر مقبول جنگ رہی ہے۔ امریکہ، برطانیہ اور اکا دکا اور جگہوں کو چھوڑ کر، اسے دنیا میں کہیں سے حمایت حاصل نہیں ہوئی۔ اور چونکہ یہ جنگ خود تاریخ کی سب سے زیادہ ناقابل یقین اور تباہ کن فوجی کارروائی ہے، اس کا

نتیجہ عراق میں مکمل تباہی کی صورت میں نکل رہا ہے — اور اس سے اس جنگ کے خلاف شدید مزاحمت پیدا ہوئی ہے۔ لیکن اس سے دہشت گردوں کو ملنے والی حمایت اور مدد کے امکان میں بھی زبردست اضافہ ہوا ہے؛ یہ دہشت گرد خود کو ہراول دستہ سمجھتے ہیں اور دوسروں کی حمایت حاصل کرنے اور انھیں اپنے ساتھ شامل کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ اور بش حکومت گویا ان کی سب سے بڑی اتحادی ہے۔ اور ایک بار پھر، یہ میرے الفاظ نہیں ہیں، اس بار یہ الفاظ دہشت گردی کے مطالعے کے ایک نمایاں امریکی ماہر مائیکل شوئر (Michael Scheuer) کے ہیں۔ اور اس کی بات درست ہے، قطعی طور پر ایسا ہی ہوا ہے۔

اور یہ واحد مثال نہیں ہے۔ ایک کے بعد ایک سامنے آنے والی مثال میں بش حکومت نے دہشت گردی کے خطرے کی اہمیت کو گھٹا کر پیش کیا ہے۔ ایک مثال گیارہ ستمبر کے تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ ہے۔ یہاں، امریکہ میں، بش حکومت کمیشن قائم کرنا ہی نہیں چاہتی تھی، اس نے اس کی راہ روکنے کی کوشش کی، لیکن آخر کار کمیشن قائم ہوا۔ اس دوفریقی کمیشن نے بہت سی سفارشات پیش کیں۔ ان میں سے بیشتر سفارشات پر عمل نہیں کیا گیا۔ کمیشن کے ارکان کو، اس کے سربراہ سمیت، اس پر سخت ناگواری ہوئی، اور انھوں نے اس کمیشن کی میعاد پوری ہونے پر اپنا پرائیویٹ کمیشن قائم کیا، اور اس بات کی اطلاعات جاری کرتے رہے کہ مطلوبہ اقدامات نہیں کیے جا رہے ہیں۔

اور بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک بہت نمایاں مثال مالیاتی اثاثوں کے کنٹرول کے دفتر کی ہے، جو محکمہ خزانہ کی ایک شاخ ہے اور جس کے ذمے دنیا بھر میں فنڈز کی مشتبہ منتقلی کی نگرانی کرنا ہے۔ اور یہ دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ کا ایک اہم عنصر ہے۔ اس دفتر میں چند اہلکار القاعدہ اور صدام حسین پر نظر رکھنے کے لیے لگائے گئے ہیں، لیکن اس سے تقریباً چھ گنا تعداد میں اہلکار اس بات پر نظر رکھنے کے لیے متعین کیے گئے ہیں کہ کیوبا کے خلاف امریکہ کی لگائی ہوئی (یکسر غیر قانونی) اقتصادی پابندیوں کی کہیں کوئی خلاف ورزی تو نہیں ہو رہی۔ اس کی ایک مثال چند ماہ پہلے ہی سامنے آئی جب امریکہ نے میکسیکو سٹی کے شیرٹن ہوٹل کو حکم دیا کہ کیوبا کے تیل کے ماہرین اور امریکی تیل کمپنیوں کے درمیان کیوبا کے سمندر پار تیل کے ذخائر کو ترقی دینے کے بارے میں اس ہوٹل میں ہونے والی میٹنگ منسوخ کر دی جائے، جس پر تیل کمپنیاں چراغ پا ہو گئیں۔ امریکی حکومت نے، اثاثوں کی

Scanned with CamScanner

نگرانی کے اس دفتر نے، اس امریکی ہوٹل کو حکم دیا کہ کیوبا کے باشندوں کو باہر نکال کر میٹنگ کو ختم کر دے۔ میکسیکو کو بھی اس سے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ یہ انتہا درجے کا گھمنڈی پن تھا۔ لیکن اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کیوبا کا اقتصادی طور پر گلا گھونٹنے کے سلسلے میں کس سطح کا ہسٹیریائی جنون پایا جاتا ہے۔

اور اس کی وجہ بھی ہمیں معلوم ہے۔ یہ ایک آزاد ملک ہے۔ ہمارے پاس بہت پرانے دنوں کا ریکارڈ موجود ہے جو کینیڈی اور جانسن کے ادوار صدارت سے تعلق رکھتا ہے۔ انھیں کیوبا کے خلاف دہشت گردی کی ایک جنگ کرنی تھی، جو انھوں نے کی، اور کیوبا کو اقتصادی طور پر بے جان کرنا تھا، کیونکہ کیوبا نے — خود ان ذرائع کے استعمال کردہ الفاظ میں — امریکی پالیسیوں سے اپنی کامیاب مدافعت کی تھی، جس کا سلسلہ منرو ڈاکٹرائن (Monroe Doctrine) [۲] کے دنوں تک جاتا ہے، یعنی سوویت روس کے زمانے میں نہیں بلکہ منرو ڈاکٹرائن کے زمانے میں جسے اُس وقت بھی ۱۵۰ سال گزر چکے تھے۔ اور مقصد یہ تھا، جیسا کہ آئزن ہاور اور کینیڈی حکومتوں نے نہایت صاف لفظوں میں بیان کیا، کہ کیوبا کے لوگوں کو تکلیف میں مبتلا کیا جائے (to make the people of Cuba suffer) ۔ کیوبا کے عوام ہی کی وجہ سے وہاں یہ حکومت قائم ہے، چنانچہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ انھیں تکلیف پہنچائی جائے اور بھوکا مارا جائے، تاکہ وہ اپنی حکومت کا تختہ الٹ دیں۔ یہ ہماری سرکاری پالیسی ہے، جو کم و بیش متواتر جاری رہی ہے۔ یہی پالیسی حالیہ دور میں فلسطین میں نافذ کی جارہی ہے۔ اسی پالیسی کو عراق پر لگائی جانے والی اقتصادی پابندیوں کے زمانے میں نافذ کیا گیا، اور چلے (Chile) میں کی جانے والی سازشوں میں اور دوسری جگہوں پر استعمال کیا گیا۔ یہ وحشیانہ پن ہے۔

آپ نے اسرائیل اور فلسطین کا ذکر کیا، تو آپ سے اس مطالعے کے بارے میں کیوں نہ سوال کیا جائے جو ابھی حال ہی میں سامنے آیا ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے ایک ڈین اور شکاگو یونیورسٹی کے ایک پروفیسر پر اس بنا پر سخت تنقید کی جا

---

[۲] امریکہ کے پانچویں صدر جیمز منرو (۱۸۱۷ - ۲۵ء) نے ۱۸۲۳ء میں کانگریس سے اپنے خطاب میں یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ پرانی دنیا کی نوآبادیاتی طاقتیں (اسپین، فرانس، روس وغیرہ) امریکی براعظم میں مداخلت نہ کریں اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ ان کے باہمی معاملات میں دخل نہیں دے گا۔ اس نظریے کو، جو بعض مبصروں کی رائے میں منرو کے سیکرٹری خارجہ جان کوئنسی ایڈمز کے خیالات پر مبنی تھا، امریکی خارجہ پالیسی کی بنیاد خیال کیا جاتا ہے۔

Scanned with CamScanner

رہی ہے کہ انھوں نے واشنگٹن میں سرگرم اسرائیل کی حامی لابی پر ایک عالمانہ تنقید شائع کرائی۔ان کے مقالے میں قرار دیا گیا ہے کہ امریکہ جان بوجھ کر اپنی سلامتی اور اپنے بہت سے اتحادیوں کی سلامتی کو، اسرائیل کے مفادات کو آگے بڑھانے کی خاطر، داؤ پر لگاتا آیا ہے۔اس کے علاوہ اس مطالعے میں اسرائیل کی حامی لابی پر، خاص طور پر امریکہ اسرائیل پبلک افیئرز کمیٹی (AIPAC) پر ، یہ الزام بھی لگایا گیا ہے کہ وہ امریکی ذرائع ابلاغ پر دست اندازی کرتی ہے، اکیڈمک اداروں اور یونیورسٹیوں میں پولیس کا سا کردار ادا کرتی ہے، اور اسرائیل پر تنقید کرنے والوں کو یہوددشمن کا لیبل لگا کر خاموش ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ اس مطالعے میں عراق پر امریکی حملے سے پہلے کے دنوں میں اسرائیل کے حامی نوقدامت پسندوں (neo-conservatives) کے فعال کردار کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے۔

اس کے مصنفین ہارورڈ کے کینیڈی اسکول آف گورنمنٹ کے ایک ڈین اسٹیفن والٹ (Stephen Walt) اور شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر جان میئرسہائمر (John Mearsheimer) ہیں۔ اب خود ان کو بھی یہوددشمنی کا مرتکب ٹھہرایا جا رہا ہے۔ واشنگٹن میں ڈیموکریٹک پارٹی کے ایک رکنِ کانگریس ایلیٹ ایگل (Eliot Engle) نے ان دونوں کو "بے دیانت نام نہاد دانشور" اور یہوددشمن قرار دیا۔ ہارورڈ کی پروفیسر روتھ ویس (Ruth Wisse) نے اس مقالے کے واپس لیے جانے کا مطالبہ کیا۔ ہارورڈ لا اسکول کے پروفیسر ایلن ڈرشووِٹز (Alan Dershowitz) نے اس مقالے کو "کوڑاکرکٹ" (trash) قرار دیاجس کا مصنف نیونازی ڈیوڈ ڈیوک بھی ہو سکتا تھا۔ اخبار "دی نیویارک سن" کی رپورٹ کے مطابق ہارورڈ یونیورسٹی کو اسرائیل کے حامی کئی عطیہ دہندگان کی طرف سے فون کالیں موصول ہوئیں جن میں اس مقالے کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا گیا، اور یونیورسٹی نے اس مقالے سے اپنی لاتعلقی ظاہر کرنے کے اقدامات شروع کر دیے ہیں۔ پچھلے ہفتے اس نے مقالے پر سے کینیڈی اسکول آف گورنمنٹ کا نشان (logo) ہٹا دیا اور اس کے مندرجات سے لاتعلقی کا ایک نیا اعلان شامل کیا۔ یہ مقالہ ۸۱ صفحوں کا ہے۔ اسے پہلے ہارورڈ کی ویب سائٹ پر شائع کیا گیا تھا اور پھر یہ مدوّن صورت میں

Scanned with CamScanner

"لندن ریویو آف بکس" میں شائع ہوا۔

اس تنازعے سے پہلے، سال بھر سے کم عرصہ ہوا، ہارورڈ کے قانون کے پروفیسر ایلن ڈرشووِٹز نے نارمن فنکلسٹین (Norman Finkelstein) کی کتاب *Beyond Chutzpah: On the Misuse of Anti-Semitism and the Abuse of History* کی اشاعت رکوانے کی کوشش کی تھی۔ اب اس معاملے میں بہت سی چیزیں گفتگو کے قابل ہیں: مقالے کے مندرجات، اس کے بارے میں آپ کے خیالات، اس پر ہونے والا ردعمل اور پوری تنقید۔ اس ملک میں جو لوگ اسرائیل کی ریاست پر تنقید کرتے ہیں ان کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟

آپ نے جو سوال سب سے آخر میں کیا ہے، اس کا جواب نارمن فنکلسٹین کی غیر معمولی کتاب میں بہت خوبی سے دیا گیا ہے، اور یہ جواب اس کتاب کی اشاعت رکوانے کی ایلن ڈرشووِٹز کی کوششوں میں بھی بڑی وضاحت سے سامنے آتا ہے۔ بعض دستاویزات صرف Journal of Palestine Studies میں شائع ہوئی تھیں۔ فنکلسٹین کی کتاب میں اسرائیل کے جرائم اور زیادتیوں کے لرزہ خیز ریکارڈ کی پوری تفصیل بیان کی گئی، اور یہ وہ عمدہ ترین تفصیل ہے جو اب تک ہمارے سامنے آئی ہے، اور اس میں مصنف نے سب سے محترم ذرائع پر انحصار کیا ہے، انسانی حقوق کی بڑی تنظیمیں، اسرائیل کی انسانی حقوق کی تنظیمیں، وغیرہ، اور بڑے فیصلہ کن طور پر یہ دکھایا ہے کہ ایلن ڈرشووِٹز کی جانب سے ان مظالم کی مدافعت، جس کے لیے اس کے پاس کوئی شہادت موجود نہیں ہے، کس قدر مضحکہ خیز اور بدہیئت ہے۔

اس کے باوجود فنکلسٹین یہود دشمنی وغیرہ کے الزامات کے ساتھ بڑے زبردست حملے کی زد میں آیا۔ اب یہ تو ایک معمول کی بات ہے۔ اس کا سلسلہ میرے خیال میں اس ممتاز سفارت کار ابا ایبان (Abba Eban) تک پہنچتا ہے — اس بات کو کوئی تیس برس ہو گئے ہوں گے — جس نے ایک امریکی یہودی جریدے میں یہ لکھا تھا کہ "صیہونیت کا کام یہ دکھانا ہے کہ صیہونیت کی ہر سیاسی مخالفت" — جس کا مطلب ہے ریاست اسرائیل کی پالیسیوں پر کی جانے والی ہر تنقید — "یا تو یہود دشمنی پر بنیاد رکھتی ہے یا یہودیوں کی طرف سے خود اپنے آپ سے نفرت پر۔" چلیے، اس طرح تمام ممکنہ تنقید کا

قصہ ہی پاک ہو جاتا ہے۔ جہاں تک یہودیوں کی اپنے آپ سے جنونی نفرت کا تعلق ہے، مجھے اس معاملے میں اپنے ملوث ہونے کا بھی اقرار کر لینا چاہیے۔ ابا ایبان نے اس قسم کے جن دو افراد کی مثالیں دی تھیں ان میں سے ایک میں تھا؛ دوسرا شخص اِزی اسٹون (Izzy Stone) تھا۔

ایک بار جب آپ گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دیں تو پھر دلیل اور شہادت سے بے نیاز ہو جاتے ہیں، آپ گلا پھاڑ کر چلا سکتے ہیں۔ پروفیسر والٹ اور پروفیسر میئرسہائمر ایک ایسے مقالے کو شائع کرانے پر داد کے مستحق ہیں جس سے، ان کو معلوم تھا کہ اسرائیلی جرائم اور تشدد کے حامیوں کی طرف سے گالیوں اور ہسٹیریا کی وہی پرانی بوچھاڑیں شروع ہو جائیں گی۔ تاہم ہمیں یہ پہچاننا چاہیے کہ یہ معمول خاصا یکساں رہا ہے۔ کسی بھی ایسے معاملے کے بارے میں جسے دانشوروں کے طبقۂ اشرافیہ نے مقدس حکم کا درجہ دے رکھا ہو، ذرا کوئی ہوشمندانہ اور غیر متنازعہ بات کہہ کر دیکھیے، آپ کو اسی ردعمل کا سامنا ہوگا۔ ایسی کوئی اور لابی نہیں ہے جو چند فروعی نکات پر سوال اٹھا کر پوری تنقید ہی کو بے بنیاد قرار دے ڈالے۔

یہ ایک سنجیدہ، بڑی احتیاط سے کی جانے والی تحقیق ہے اور پڑھے جانے کی مستحق ہے۔ اس کے دونوں مصنفین داد کے قابل ہیں۔ لیکن اس میں اس سوال کو بے جواب چھوڑ دیا گیا ہے کہ یہ تجزیہ خود کتنے استناد کا حامل ہے، اور میں دیکھتا ہوں کہ اس میں ایک بہت نازک سوال مضمر ہے۔ اس سے ہر شخص اتفاق کرتا ہے کہ بہت سے عناصر ہیں جو امریکی خارجہ پالیسی کے تعین پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان میں امریکہ کے اندر اقتدار کے بڑے مراکز کے اپنے اسٹریٹیجک اور اقتصادی مفادات کا عنصر بھی ہے۔ مشرق وسطیٰ کے معاملے میں ان مراکز سے مراد توانائی کے ادارے، اسلحہ ساز، ہائی ٹیک صنعت، مالیاتی ادارے وغیرہ ہیں۔ اب یہ کوئی غیر اہم ادارے نہیں ہیں، خاص کر بش حکومت کے لحاظ سے۔ چنانچہ ایک سوال یہ ہے کہ پالیسی اقتدار کے ان مراکز کے مفادات کی کس حد تک آئینہ داری کرتی ہے۔ ایک اور سوال یہ ہے کہ یہ ملکی لابیوں سے کس حد تک اثر قبول کرتی ہے۔ پھر دوسرے عناصر بھی ہیں۔ لیکن اگر صرف ان دو ہی کو لیں، تو ان کا عمل دخل بیشتر معاملات میں دکھائی دیتا ہے، اور ان کی اثر انگیزی کا اندازہ لگانا آسان کام نہیں ہے۔ خاص طور پر اس وقت آسان نہیں ہے جب ان کے مفادات ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوں اور بڑی حد تک ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہوں۔

Scanned with CamScanner

اگر ایسے معاملوں میں آپ ریکارڈ پر نگاہ ڈالیں تو جس چیز کو قومی مفاد کہا جاتا ہے وہ ایسی صورت میں ان لابیوں کے مفادات پر مشتمل ہوتی ہے۔ چنانچہ ایسے معاملوں میں ان کے مفادات کو الگ الگ جاننا بہت دشوار ہوتا ہے۔

اس کتاب کا لب لباب یہ ہے کہ لابیوں کا غالب اثر ہوتا ہے اور نام نہاد "قومی مفاد" کو ان کی سرگرمیوں سے نقصان پہنچتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ ایک امید افزا نتیجہ نکالا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نکلتا کہ امریکی پالیسی کو آسانی سے درست سمت میں موڑا جاسکتا ہے۔ بس اقتدار کے بڑے مراکز، یعنی توانائی کے اداروں، اسلحہ سازوں، ہائی ٹیک صنعت، مالیاتی اداروں وغیرہ، کو یہ بات سمجھانے کی ضرورت ہے کہ ان کے مفادات کو اس چھوٹی سی لابی سے زک پہنچ رہی ہے جو چلا چلا کر یہود دشمنی کے الزام لگاتی ہے، کانگریس کے ارکان کو فنڈز فراہم کرتی ہے، وغیرہ۔ ظاہر ہے یہ ادارے اس چھوٹی سی لابی کو بہت آسانی سے سیاسی اثر کے معاملے میں مغلوب کرلیں گے اور اس طرح امریکی پالیسی کو درست کردیں گے۔

لیکن ایسا نہیں ہوتا، اور اس کی کئی وجوہ ہیں۔ ایک تو اس تجزیے میں مضمر مفروضہ یہ ہے کہ ان پالیسیوں سے نام نہاد قومی مفاد کو نقصان پہنچا ہے۔ اب آپ کو اس مفروضے کو ثابت کرنا ہوگا۔ اچھا، تو نقصان کس کے مفاد کو پہنچا ہے؟ کیا توانائی کی کارپوریشنوں کو مشرق وسطیٰ سے متعلق پچھلے ساٹھ برس کی امریکی پالیسی سے نقصان پہنچا ہے؟ وہ تو اتنا منافع کما رہے ہیں کہ حرص کے اپنے خواب میں بھی نہ آیا ہوگا، جیسا کہ ان کے بارے میں جانے والی بڑی حکومتی تحقیقات سے ثابت ہوا ہے۔ اور یہ سلسلہ آج تک، یعنی ایک دو برس پہلے تک جاری تھا۔ امریکی پالیسی کا بنیادی سروکار مشرق وسطیٰ کے تیل کو کنٹرول کرنا رہا ہے جسے اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ نے ساٹھ برس پہلے "اسٹریٹیجک طاقت کا بے پناہ منبع" قرار دیا تھا۔ ہاں، اس کو کنٹرول کرلیا گیا ہے۔ درحقیقت عراق پر حملہ اسی کنٹرول کو مزید سخت کرنے کی ایک کوشش تھی۔ یہ کوشش ہوسکتا ہے کامیاب نہ ہو، ممکن ہے اس کا نتیجہ اس کے برعکس نکلے، لیکن وہ الگ بات ہے۔ حملے کے پیچھے نیت بہرحال یہی تھی۔

اس کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں رہی ہیں۔ بڑی رکاوٹ تو وہی ہے جو ساری دنیا میں عام ہے: آزاد قوم پرستی۔ اسے "شدت پسند قوم پرستی" کہا جاتا ہے، جو سنگین معاملہ ہے۔ اس کی علامت جمال

عبدالناصر تھا، لیکن عراق کا عبدالکریم قاسم بھی تھا، اور دوسرے بھی تھے۔ تو امریکہ اس رکاوٹ کو ہٹانے میں کامیاب ہوا۔ کس طرح؟ اسرائیل نے ناصر کو نیست و نابود کر دیا۔ یہ اس کی طرف سے امریکہ کی، امریکی اقتدار کی، یعنی توانائی کی کارپوریشنوں کی، سعودی عرب کی، یہاں کے اقتدار کے بڑے مراکز کی ایک بڑی خدمت تھی۔ درحقیقت ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیل کی فتح کے بعد ہی امریکہ اور اسرائیل کے تعلقات ٹھوس بنیادوں پر استوار ہوے، اور انھوں نے وہ شکل اختیار کی جسے ''اسٹریٹیجک اثاثہ'' کہا جاتا ہے۔

یہ بھی انھی دنوں کی بات ہے کہ اسرائیل کی حامی لابی کو یہاں طاقت حاصل ہوئی۔ اور اتفاق سے یہ بھی اسی زمانے میں ہوا کہ تعلیم یافتہ طبقے اور دانشور سیاسی طبقے کا اسرائیل کے ساتھ ایک حیران کن رومان شروع ہوا، جب اسرائیل نے اپنے تیسری دنیا سے تعلق رکھنے والے دشمن کے مقابلے میں اپنی زبردست طاقت کا مظاہرہ کیا۔ اور یہ طبقہ اس لابی کا بہت اہم حصہ ہے۔ والٹ اور میرشہائمر نے اس کا ذکر ضرور کیا ہے لیکن میرے خیال میں اس پر زور دیا جانا چاہیے۔ اور یہ طبقہ بہت اثر رکھتا ہے۔ یہ لوگ جریدوں اور ذرائع ابلاغ میں دی جانے والی خبروں اور اطلاعات کو، اور عالمانہ تحقیق وغیرہ کو اگر کنٹرول نہیں کرتے تو اس پر اثرانداز یقیناً ہوتے ہیں۔ میرا اپنا احساس یہ ہے کہ یہ غالباً لابی کا سب سے زیادہ بااثر حصہ ہے۔ اب ہمیں یہ سوال اٹھانے کی ضرورت ہے: اس لابی اور ملک میں اقتدار کے مراکز کے درمیان کیا فرق ہے؟

اسرائیل نے امریکہ کی اور بھی بہت سی خدمات انجام دی ہیں۔ آپ ریکارڈ کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ اس نے ثانوی قسم کی خدمات بھی انجام دی ہیں۔ چنانچہ، خاص طور پر ۱۹۸۰ء کے عشرے میں، کانگریس ریگن کی جانب سے وسطی امریکہ میں کی جانے والی دہشت گردی کی سفاکیوں کی حمایت اور عملی مدد کی راہ میں رکاوٹیں ڈال رہی تھی۔ اسرائیل نے اس کا حل یوں پیش کیا کہ دہشت گردوں کو تربیت دینے وغیرہ کی ذمے داریاں خود سنبھال لیں۔ کانگریس نے جنوبی افریقہ کے ساتھ امریکہ کی تجارت پر پابندی لگا دی۔ اسرائیل نے اس پابندی سے بچنے کی راہ فراہم کی۔ اور بھی کئی مثالیں ہیں۔ اب اسرائیل عملاً مشرقِ وسطیٰ میں امریکہ کا ایک سمندر پار قائم فوجی اڈا اور ہائی ٹیک مرکز بن چکا ہے۔

**آپ کی کتاب میں ایک نہایت مسحورکن حصہ وہ ہے جس میں آپ حفظِ**

Scanned with CamScanner

ماتقدم کے طور پر پہلے حملہ کردینے کے بش کے نظریے کی تاریخی بنیادوں کا، اور اس نظریے کے امریکی ایمپائر کے قیام سے تعلق کا ذکر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ نے ایک تاریخ داں جان لوئیس گاڈیس (John Lewis Gaddis) کا ذکر کیا ہے جو بش حکومت کو بہت محبوب ہے کیونکہ اس نے اس قسم کے حملے کا تاریخی جواز فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہاں، یہ ایک بڑا دلچسپ کیس ہے۔ جان لوئیس گاڈیس نہ صرف بش حکومت کا پسندیدہ تاریخ داں ہے بلکہ اسے سرد جنگ کے سلسلے میں امریکی اسکالرشپ کا سربراہ خیال کیا جاتا ہے۔ وہ ییل یونیورسٹی کا پروفیسر ہے۔ اس نے بش ڈاکٹرائن کی بنیادوں کے بارے میں تحقیقی مقالہ لکھا ہے جو کتاب کی ضخامت کا ہے، اور وہ بش کے اس نظریے کو عمومی طور پر درست سمجھتا ہے، بس اِدھر اُدھر اس کے اسلوب کے بارے میں اسے معمولی سے اعتراضات ہیں۔ وہ اس کے نشانات ماضی میں اپنے ہیرو جان کوئنسی ایڈمز (John Quincy Adams) [۳] تک تلاش کرتا ہے جس نے ۱۸۱۸ء میں اسٹیٹ پیپرز کا ایک مشہور سلسلہ تحریر کیا تھا جس میں اس نے جنرل اینڈریو جیکسن (Andrew Jackson) کے فلوریڈا پر حملے کا بعد از وقوع جواز پیش کیا تھا۔ اور یہ خاصا دلچسپ تھا۔

گاڈیس ایک اچھا تاریخ داں ہے۔ وہ اپنے مصادر سے واقف ہے اور تمام درست ذرائع کا حوالہ دیتا ہے۔ لیکن آپ کو یہ نہیں بتاتا کہ یہ ذرائع کہتے کیا ہیں۔ اس لیے میں نے اپنی کتاب میں صرف یہ کیا کہ اس کے دیے ہوے حوالے کے سامنے یہ اضافہ کر دیا کہ اس ذریعے نے دراصل کہا کیا تھا جسے گاڈیس نے حذف کر دیا۔ اصل میں ان ذرائع میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بھاگ نکلنے والے نیگرو اور بے قانون انڈین باشندوں کے خلاف کی جانے والی سفاکیوں اور جرائم کا ایک صدمہ انگیز ریکارڈ ہے جس نے فلوریڈا کے اصل باشندوں یعنی سیمینول قبیلے (Seminoles) [۴] کو نیست و نابود کر ڈالا۔ سیمینول قبائلیوں کے خلاف اس کے بعد ایک جنگ اور ہوئی، جو کسی اشتعال کے بغیر چھیڑی گئی

---

[۳] چھٹا امریکی صدر (۲۹-۱۸۲۵ء)، جو صدر جیمز منرو کے دورِ صدارت میں سیکرٹری خارجہ تھا۔

[۴] فلوریڈا کو امریکہ نے اسپین سے خریدا اور پھر وہاں کے اصل باشندوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے تین جنگیں چھیڑیں۔ اس طویل وحشیانہ مہم کے نتیجے میں کم و بیش تین سو سیمینول قبائلی زندہ بچے جنھیں دلدلی زمین پر دھکیل دیا گیا۔ موجودہ سیمینول انھی تین سو باشندوں کی اولاد بتائے جاتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

تھی اور جس میں انھیں یا تو ہلاک ' یا دلدلی علاقوں میں ہنکا دیا گیا۔ اس حملے کے مصنوعی جواز
تراشے گئے۔ گاڈیس برطا ـ سے لاحق خطرے کی بات کرتا ہے۔ برطانیہ کی طرف سے کوئی
خطرہ لاحق نہیں تھا کچھ بھی نہیں کیا۔ یہاں تک کہ ایڈمز نے بھی ایسا دعویٰ نہیں کیا۔ لیکن
اس سے گاڈ' یال کو تقویت حاصل ہوگئی کہ قبضے کی توسیع ہی سلامتی کی بہترین ضمانت
ہے پ سلامتی چاہتے ہیں تو اپنی سرحدوں کو توسیع دیجیے، زیادہ سے زیادہ علاقہ فتح
ب ہی آپ کو تحفظ حاصل ہوگا۔

اور وہ کہتا ہے کہ یہ نظریہ امریکہ کی ہر حکومت کے دور میں قائم رہا ہے — اس کی یہ بات بالکل درست ہے — اور یہ کہ بش ڈاکٹرائن کی بنیاد اسی پر استوار ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ بش ڈاکٹرائن کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ توسیع ہی سلامتی کی کلید ہے۔ اس کی بالکل سامنے کی مثالیں موجود ہیں جو فوراً ذہن میں آتی ہیں، لیکن جن کا وہ ذکر نہیں کرتا، سو میں بھی انھیں چھوڑ دیتا ہوں، لیکن آپ ان پر غور کر سکتے ہیں۔ اور اس کی اس بات میں کچھ سچائی ضرور ہے، سوائے ان چیزوں کے جن کے ذکر سے اس نے احتراز کیا ہے، بلکہ جن کو جھٹلایا ہے، یعنی وہ تمام سفاکیاں جو ان تمام ذرائع، تمام مستند ذرائع نے ریکارڈ کی ہیں جن کا اس نے حوالہ دیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایڈمز نے جنرل جیکسن کی جنگ کا جواز پیش کر کے — وہ حکومت میں اس کا اکیلا حامی تھا، لیکن اس نے باقی سب لوگوں کو قائل کر لیا — انتظامی جنگوں کا نظریہ رائج کیا، یعنی ایسی جنگوں کا جو کانگریس کی اجازت کے بغیر اور امریکی آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے لڑی جائیں۔ ایڈمز کو بعد میں اس پر بہت پچھتاوا ہوا، بے حد پچھتاوا، لیکن، بہرحال، یہ نظریہ اسی کی کوشش سے رائج ہوا اور یہ سلسلہ، یعنی کانگریس کی اجازت کے بغیر لڑی جانے والی جنگوں کا سلسلہ، اُسی وقت سے جاری ہے۔ ہم اس کی ایک کے بعد ایک کئی مثالوں سے واقف ہیں۔ اس سے بظاہر ان لوگوں کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی جو ان جنگوں کے ''اصل ارادے'' پر اصرار کرتے ہیں۔

لیکن اس سے قطع نظر، جن عالمانہ ذرائع کا گاڈیس نے حوالہ دیا ہے لیکن اقتباس نہیں دیا، وہی اس بات کی نشان دہی بھی کرتے ہیں کہ ایڈمز نے کچھ اور اصول بھی رائج کیے، جو اب تک رائج چلے آتے ہیں، مثلاً عوام سے بے تحاشا جھوٹ بولنا، حقائق کو مسخ کرنا، ہسٹیریائی خوف ابھارنا، اپنے مظالم

کے حق میں عوام کو ہموار کرنے کی ہر فریب کارانہ کوشش کرنا۔ اور یہ سلسلہ بھی آج تک جاری ہے۔ سو بہت ہی دلچسپ ریکارڈ موجود ہے، لیکن وہ جو کچھ ثابت کرتا ہے وہ گاڈیس کے دعوے کے برعکس ہے، اور بش حکومت گاڈیس کے نظریے کو پسند کرتی ہے۔

پچھلے دنوں عراق کے وزیراعظم ابراہیم جعفری نے کہا تھا کہ اس کے پسندیدہ ترین مصنفوں میں سے ایک آپ، نوم چومسکی، ہیں۔ جب امریکی جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کے سربراہ جنرل پیٹر پیس (General Peter Pace) کے سامنے عراقی وزیراعظم کی یہ بات رکھی گئی اور اس پر جنرل کا تبصرہ [illegible] کا کہنا تھا: "میں امید کرتا ہوں کہ وزیراعظم کی خوابگاہ کے شیلف پر ایک سے زیادہ کتابیں موجود ہوں گی...اگر غیرملکی خیالات تک وزیراعظم کی رسائی صرف اس ایک مصنف کے ذریعے سے ہے تو مجھے تشویش ہو گی۔ لیکن اگر یہ بہت سے مصنفوں میں سے ایک ہے، اور وہ مختلف قسم کی رائیں پڑھ کر ان کو ہضم کر رہا ہے تو یہ غالباً صحت مندانہ بات ہے۔" جنرل پیس نے یہ بات جعفری کے بارے میں کہی جو عراقی وزیراعظم کے طور پر اپنی حیثیت قائم رکھنے کی جدوجہد میں اس وقت بھی مصروف ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟

صاف بات یہ ہے کہ مجھے اس میں شک ہے کہ جنرل پیس میرے نام سے واقف رہا ہو گا یا جانتا ہو گا کہ وہ کس کتاب کی بات کر رہا ہے، لیکن ہو سکتا ہے وہ واقف ہو۔ جنرل سے انٹرویو کرنے والے نے، اگر مجھے درست یاد ہے تو، سوال کرتے ہوئے یہ بات کہی تھی کہ مذکورہ کتاب عراق کی جنگ پر سخت تنقید کرتی ہے۔ لیکن خیر، اس سے عراق کے وزیراعظم کو تو حیران نہیں ہونا چاہیے۔ آخر خود امریکیوں کے کرائے ہوئے رائے عامہ کے جائزوں کے مطابق، جن میں سے تازہ ترین بروکنگز انسٹیٹیوٹ کا کیا ہوا ہے، ۸۷ فیصد عراقی اتحادی فوجوں کے انخلا کا ٹائم ٹیبل چاہتے ہیں۔ یہ ایک حیران کن تعداد ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ عراق کے تمام عرب باشندے، جن علاقوں میں فوج لگائی گئی ہے وہاں کے تمام باشندے، یہ رائے رکھتے ہیں۔ مجھے یقین نہیں کہ مثلاً ویشی (Vichy)، فرانس، میں، یا پولینڈ میں، جب وہ ایک روسی طفیلی ریاست تھا، لوگوں کی اتنی بڑی تعداد اس رائے کی حامل پائی جاتی۔

اس کا مطلب یقینی طور پر یہ ہے کہ کم و بیش ہر شخص فوجوں کے انخلا کے ٹائم ٹیبل کا خواہش مند

ہے۔ تو کیا یہ حیرت کی بات ہے اگر عراق کا وزیر اعظم ایک ایسی کتاب پڑھے جس میں جنگ پر تنقید کی گئی ہو اور فوجوں کی واپسی کے بارے میں یہی بات کہی گئی ہو؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ بش اور بلیئر نے، جو اپنی جمہوریت سے محبت کا مسلسل بکھان کرتے رہتے ہیں، واضح اعلان کیا ہے کہ فوجوں کی واپسی کا کوئی ٹائم ٹیبل نہیں دیا جائے گا۔ اس سے اس حقارت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو یہ دونوں، اور ان کے ساتھی، جمہوریت کے لیے رکھتے ہیں اور جس کا مظاہرہ وہ متواتر کرتے آ رہے ہیں۔

لیکن اس کے زیادہ گہرے اسباب بھی ہیں، اور ہمیں ان پر غور کرنا چاہیے۔ اگر ہم امریکی فوجوں کی عراق سے نکلنے کی حکمت عملی کی بات کرتے ہیں تو ہمیں یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ امریکہ کا ایسی حالت میں عراق سے نکلنا کہ وہ ایک ماتحت، طفیلی ریاست نہ بن چکا ہو، واشنگٹن کے لیے کسی بھیانک خواب سے کم نہیں ہوگا۔ آپ کو صرف اتنا کرنا ہے کہ ان پالیسیوں پر غور کریں جو کوئی آزاد عراقی حکومت، اگر وہ ذرا سی بھی جمہوری ہو، اختیار کرے گی۔ وہ کم و بیش یقینی طور پر شیعہ پڑوسی ریاست ایران کے ساتھ اس وقت موجود رشتوں کو مضبوط کرنے کی کوشش کرے گی۔ عراق میں خودمختاری کی کم سے کم سطح بھی سرحد پار سعودی عرب میں خودمختاری کے لیے دباؤ میں اضافہ کر دے گی جہاں ایک خاصی بڑی شیعہ آبادی موجود ہے جنھیں سعودی عرب کی آمریت، امریکی حمایت سے، بری طرح کچلتی چلی آ رہی ہے۔ اور اتفاق سے عراق کی سرحد سے لگا ہوا یہی علاقہ ہے جہاں بیشتر سعودی تیل پایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ سب باتیں جن کا آپ تصور کر سکتے ہیں، مجھے یقین ہے واشنگٹن کے منصوبہ سازوں کی نیندیں اڑا رہی ہوں گی۔

جہاں تک جمہوریت کا سوال ہے، آپ نے اپنی کتاب میں "جمہوری خسارے" کی بات کی ہے۔ ظاہر ہے، بش حکومت کو دنیابھر میں جمہوریت رائج کرنے کے اپنے نظریے کے سلسلے میں بہت سے مسائل درپیش ہیں، مثلاً فلسطینی علاقوں میں انتخابات کے نتائج، عراق کی موجودہ صورت حال، جہاں کا صدر انتخابات جیتنے والی مخلوط حکومت کے وزیراعظم کو معزول کرنے کی کوششوں میں ہے، اور وینزویلا، اور ایران۔ آپ کا "جمہوری خسارے" کا تصور کیا ہے اور موجودہ امریکی حکومت خود امریکہ میں اب تک اپنے آپ کو کیونکر برقرار رکھے ہوئے ہے؟

اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو امریکہ کا داخلی جمہوری خسارہ، یعنی یہاں کی رائے عامہ اور

سرکاری پالیسی کے درمیان واقع وسیع خلیج۔ دوسرا پہلو دنیا میں جمہوریت پھیلانے کا اس حکومت کا نام نہاد مشن۔ یہ آخرالذکر شے تو فراڈ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ ان لوگوں کی دنیا میں جمہوریت کو فروغ دینے سے دلچسپی کی شہادت ملتی ہے تو بس ان کے قول میں۔ البتہ اس کے خلاف شہادتیں بے شمار ہیں جن میں وہ مثالیں بھی شامل ہیں جن کا آپ نے ذکر کیا اور ان کے علاوہ بہت سی دیگر مثالیں بھی۔ اگر لوگ اس کو محض زیر بحث لانے پر ہی آمادہ ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ہم شمالی کوریا جیسا ہونے پر مصر ہیں: اگر ''ڈیر لیڈر'' نے کہہ دیا تو بس یہی حتمی سچ ہے، حقائق خواہ کچھ بھی کیوں نہ کہتے ہوں۔ میں نے کتاب میں اس کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

داخلی جمہوری خسارہ ایک الگ معاملہ ہے۔ ان لوگوں کی سیاسی اقتدار پر گرفت بہت تھوڑی ہے۔ ان کی پالیسیوں کے زیادہ تر شہری سخت مخالف ہیں۔ پھر وہ ایسی پالیسیاں کیونکر چلا رہے ہیں؟ یہ فریب کاری، دروغ گوئی، جعل سازی اور تعلقات عامہ کے ایک آمیزے کے ذریعے ممکن ہوا ہے۔ درحقیقت اس کا ایک بڑا اچھا مطالعہ دو سماجی سائنسدانوں ہیکر (Hacker) اور پیئرسن (Pearson) نے کیا ہے، جنھوں نے ان لوگوں کے ہتھکنڈے بیان کیے ہیں اور بتایا ہے کہ وہ کیسے کام کرتے ہیں۔ یہ لوگ حکومت پر بمشکل اپنی گرفت برقرار رکھے ہوئے ہیں اور اسے اس اداراتی ڈھانچے کو، عوام کو ملنے والی محدود مراعات کے نظام کو منہدم کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں جسے برسوں کے عمل میں زبردست عوامی حمایت سے تعمیر کیا گیا تھا؛ وہ سوشل سکیورٹی کے نظام کو مسمار کرنے کی کوشش میں ہیں اور یہ کوشش واقعی آگے بڑھ رہی ہے؛ ٹیکس کم کرنے کے معاملے میں، جو بیشتر مالدار لوگوں کے فائدے کی چیز ہے، وہ مستقبل میں ایسی مالیاتی صورت حال پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو حادثے کا شکار ہونے والی ٹرین سے مشابہ ہوگی، لیکن ساتھ ساتھ وہ ایسی صورت حال بھی ہوگی جس میں اس قسم کی سماجی پالیسیاں اختیار کرنا قریب قریب ناممکن ہو جائے گا جنھیں غالب عوامی حمایت حاصل ہے۔ یہ سب کچھ کامیابی سے کر لینا بڑا متاثر کن ہے، اور یہ فریب کاری، جھوٹ وغیرہ کے ذریعے ہی ممکن ہوا ہے۔ یہاں اس کا ذکر کرنے کی گنجائش نہیں، لیکن اپنی کتاب میں میں نے اسے خاصی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ داخلی جمہوری خسارہ ہے، اور انتہائی سنگین نوعیت کا۔ نیوکلیئر جنگ اور ماحولیاتی تباہی کے مسائل، یہ دونوں انسانی بقا کے مسائل ہیں، اور انھیں کسی بھی ہوشمند انسان کی

Scanned with CamScanner

اعلیٰ ترین ترجیح ہونا چاہیے۔ تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ امریکی حکومت ان خطرات کو اور بڑھا رہی ہے۔ اور چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ امریکی عوام اس سیاسی نظام کے مخالف، لیکن اس نظام سے باہر ہیں۔ یہ جمہوری خسارہ ہے۔ اور ہمیں اس سے نمٹنا ہوگا۔

اس وقت جبکہ بش حکومت کی پالیسیوں کی عوامی مخالفت پچھلے کسی بھی موقعے سے زیادہ ہے، ایسا کیوں ہے کہ یہ بے اطمینانی کسی وسیع تر سیاسی تحرک میں تبدیل نہیں ہو پا رہی؟

سب سے پہلی وجہ ایڈورٹائزنگ یا اشتہار سازی ہے، جسے ٹھیک اس مقصد سے وضع کیا گیا تھا کہ آزاد منڈی کی بنیاد کو کھوکھلا کیا جا سکے۔ یہ ہر اس شخص کو معلوم ہے جس نے کبھی ٹی وی پر کوئی اشتہار دیکھا ہے۔ آپ کو معاشیات کے کورسوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس کے مطابق ہمارا معاشی نظام آزاد منڈیوں پر مبنی ہے جہاں تاجروں کی طرف سے جدت پسندانہ اقدامات کیے جاتے ہیں اور معلومات رکھنے والے صارفین عقلی بنیاد پر انتخاب کرتے ہیں۔ تاہم، حقیقت اس سے یکسر مختلف ہے۔ تاجرانہ جدت پسندی کا ایک بہت بڑا حصہ، اگر آپ اسے یہی نام دینا چاہتے ہوں، فعال ریاستی سیکٹر کی طرف سے آتا ہے، جس پر زیادہ تر معیشت کا انحصار ہے، تاکہ لاگت اور مالی خطرات کو عوام پر لاد دیا جائے اور منافعے کو پرائیویٹ ہاتھوں میں پہنچایا جائے۔ اور یہ کام ایڈورٹائزنگ کے ذریعے سے کیا جاتا ہے۔ جہاں تک صارفین کا تعلق ہے، اگر آپ ٹی وی پر کسی اشتہار کو دیکھیں تو آپ کو احساس ہوگا کہ یہ ایسے صارفین تیار کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہے جنھیں معلومات حاصل ہوں اور جو عقلی بنیاد پر کسی چیز کو خریدنے یا نہ خریدنے کا انتخاب کر سکیں۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں۔ اگر مقصد یہی ہوتا تو جنرل موٹرز والے صرف اپنی گاڑیوں کی خصوصیات کی فہرست بنا دیتے، اور بس، بات پوری ہو جاتی۔ اشتہاروں کا اصل مقصد لوگوں کو مسحور کرنا اور فریب دینا ہے، اثرانگیز مناظر کے ذریعے انھیں دام میں لانا ہے، تاکہ معلومات نہ رکھنے والے صارفین غیرعقلی بنیاد پر انتخاب کر سکیں۔

اور ٹھیک یہی عمل جمہوری خسارے کے معاملے میں ہوتا ہے۔ امریکہ میں سنجیدہ معنوں میں انتخابات ہوتے ہی نہیں۔ یہاں اشتہاری مہمیں چلائی جاتی ہیں، اور انھی صنعتی اداروں کی طرف سے جو ٹوتھ پیسٹ بیچتے ہیں: یعنی اشتہار ساز اداروں کی طرف سے۔ جب وہ انتخابی امیدواروں کو فروخت

کے لیے پیش کرتے ہیں تو آپ کو ان کے بارے میں اس سے زیاد نہیں کرتے جتنی مثال کے طور پر لائف اسٹائل ادویات یا کاروں کے سلسلے میں کرتے ہیں۔ بسے مناظر تخلیق کرتے ہیں جو لوگوں کو مسحور کر سکیں اور انھیں فریب دے سکیں۔ اور اسے انتخابی مہم کہا ب تا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ ٹھوس مسائل پر امیدواروں کے موقف سے بے خبر رہتے ہیں۔

اس کی ایک اہم مثال کے طور پر [ماحول کے تحفظ کے بارے میں] کیوٹو پروٹوکول کو لیجیے۔ اب یہ معاہدہ کوئی ایسی چیز نہیں جو سارے ماحولیاتی مسائل کو حل کر دے، لیکن بہر حال ماحولیاتی تباہی ایک سنگین معاملہ ہے۔ عوام اس معاہدے کے حق میں ہیں، اتنی شدت سے اس کے حق میں ہیں کہ بش کو ووٹ دینے والوں کا — جی ہاں، بش کے ووٹروں کا — یہ خیال تھا کہ وہ کیوٹو پروٹوکول کا حامی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ بالکل بے خبر تھے۔ اور اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ موزوں ذہنی صلاحیت یا اس معاملے سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ اس کی وجہ انتخابی مہم کو پیش کیے جانے کا انداز ہے۔ انتخابی مہم اس طرح چلائی جاتی ہے کہ اصل مسائل ایجنڈا سے باہر رہیں۔

اب صحت کی سہولیات کو لیجیے، جو بدترین داخلی مسائل میں سے ایک ہے، سنگین ترین مسائل میں سے ایک؛ بیشتر لوگوں کے لیے یہ نہایت بنیادی مسئلہ ہے۔ صحت کی سہولیات کا امریکی نظام دنیا کا سب سے خراب کارکردگی رکھنے والا نظام ہے۔ اس کی فی کس لاگت، موازنے کے قابل دوسرے ملکوں کے مقابلے میں، دُگنی ہے، اور اس سے حاصل ہونے والی سہولتیں دنیا میں صحت کی بدترین سہولتوں میں سے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ پرائیویٹ ہاتھوں میں ہے۔ عوام اس کی پرائیویٹائزیشن کے سخت مخالف ہیں۔ عوام بہت لمبے عرصے سے صحت کی سہولتوں کے کسی قسم کے قومی نظام کے حق میں رہے ہیں۔ پچھلے صدارتی انتخابات میں جان کیری کو ان لوگوں کی نمائندگی کرنے والا صدارتی امیدوار خیال کیا جاتا تھا جو حکومت کی طرف سے سماجی خدمات فراہم کرنے پر پیسہ خرچ کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ انتخابات سے چند روز پہلے دونوں امیدواروں کے درمیان جو آخری صدارتی مباحثہ ہوا اس کا موضوع داخلی مسائل تھے۔ ''نیویارک ٹائمز'' میں اس مباحثے کی تفصیلی روداد چھپی۔ اس روداد میں اس بات کو نوٹ کیا گیا کہ کیری نے صحت کی سہولیات کے کسی نظام میں حکومت کی شمولیت کے بارے میں سرے سے کوئی بات ہی نہیں کی۔ اور اس کا سبب، اخبار کے رپورٹر کے مطابق، یہ تھا کہ اس خیال کو کوئی

Scanned with CamScanner

سیاسی حمایت حاصل نہیں؛ مطلب یہ کہ اسے محض عوام کی غالب اکثریت کی حمایت حاصل ہے، لیکن دوا ساز کارپوریشنیں، انشورنس کی صنعت وغیرہ اس کی مخالف ہیں۔ چنانچہ کیری نے اس کا ذکر ہی نہیں کیا اور عوام کو ان مسئلوں پر کیری کے موقف کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوا۔ اور بہت سے اہم مسئلوں کا بھی یہی قصہ ہے۔ چنانچہ یہ حقیقی انتخابات نہیں ہیں۔ یہ اتنے ہی مضحکہ خیز ہیں جیسے تیسری دنیا کے کسی ملک میں ہوتے ہیں۔

اب عراق کی جنگ کو لیجیے۔ جب حکومت کے پروپیگنڈا کے نظام کی بات ہو رہی ہو تو ہمیں یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ ذرائع ابلاغ بھی اسی نظام کا حصہ ہیں۔ اور صحافی وغیرہ بھی۔ یہ سب مل کر سرکاری پروپیگنڈا کا نظام بناتے ہیں جس کے مختلف اجزا ایک دوسرے سے بہت قریبی طور پر منسلک ہیں۔ عراق میں ہونے والی جنگ پر کہیں کوئی تنقید سنائی نہیں دیتی۔ میرے خیال میں صحافیوں کو اس پر حیرت ہونی چاہیے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جنگ پر تنقید کر رہے ہیں، لیکن دراصل وہ ایسا نہیں کر رہے۔ نظریے کی قید میں جکڑے ہوئے اس نظام میں، ذرائع ابلاغ میں عراق کی جنگ کے بارے میں اگر کسی تنقید کی اجازت دی جاتی ہے تو وہ کچھ اس قسم کی تنقید ہوتی ہے جیسی، مثلاً، اسٹالن گراڈ کی لڑائی کے بعد جرمنی کے جنرل اسٹاف کی طرف سے ہو سکتی تھی: یعنی یہ لڑائی کامیاب نہیں ہو رہی؛ اس پر بہت اخراجات ہو رہے ہیں؛ ہم سے لڑائی کی کمان کرنے والے جنرل کے انتخاب میں غلطی ہوئی ہے، اس قسم کی نکتہ چینی۔ درحقیقت یہ تنقید قریب قریب اس سطح کی ہے جیسی کسی ہائی اسکول کے اخبار میں مقامی فٹ بال ٹیم پر کی جانے والی تنقید۔ آپ یہ سوال نہیں کرتے: ''کیا اس ٹیم کو جیتنا چاہیے؟'' آپ صرف یہ سوال کرتے ہیں: ''اس ٹیم کی کارکردگی کیسی ہے؟'' آپ پوچھتے ہیں: ''کیا کوچ سے کوئی غلطی ہوئی ہے؟ کیا انھیں کوئی اور حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے؟'' اور اس کو تنقید کہا جاتا ہے!

لیکن اس معاملے کا نہایت اہم سوال یہ ہے: ''امریکہ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ بین الاقوامی قانون کی سنگین خلاف ورزی کرتے ہوئے، اور یہ سمجھتے ہوئے کہ اس سے دہشت گردی اور نیوکلیئر اسلحے کے پھیلاؤ کے خطرے میں اضافہ ہونا اغلب ہے، کسی دوسرے ملک پر حملہ کر دے؟'' یہ انتہائی درجے کا بین الاقوامی جرم ہے —— یہ نیورمبرگ ٹریبونل کے کہے ہوئے الفاظ ہیں —— اور اس جرم کی سزا کے طور پر جرمن لیڈروں کو پھانسی دی گئی تھی۔ تو آپ دیکھتے ہیں کہ اصل سوال یہ نہیں ہے کہ امریکی فوج کس

Scanned with CamScanner

طرح جیتے گی، بلکہ یہ ہے: ''یہ وہاں، اُس ملک میں داخل کیوں ہوئی؟''

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ امریکی فوج کو فوری طور پر عراق سے نکل جانا چاہیے؟

میرا خیال ہے کہ ایک اصول ہے جس پر ہمیں کاربند ہونا چاہیے۔ وہ اصول یہ ہے کہ حملہ آور فوج کے کسی قسم کے حقوق نہیں ہوتے۔ اس کے صرف فرائض ہوتے ہیں۔ ان میں سے پہلا فرض یہ ہے کہ یہ حملے کا شکار ہونے والوں کی مرضی پر توجہ دے اور دوسرا یہ کہ اپنے جرم کا نشانہ بننے والوں کو بھاری تاوان ادا کرے۔ عراق کے سلسلے میں یہ جرم اس ملک پر لگائی گئی پابندیوں کے زمانے تک پہنچتا ہے جو ایک بھیانک جرم تھا، اور اس سے پہلے صدام حسین کے بدترین مظالم میں اس کا ساتھ دینے تک، لیکن خاص طور پر اس ملک پر حملہ کرنے کا جرم۔ قابض فوج کی یہ دو ذمے داریاں ہیں۔

عراقی عوام نے اپنی مرضی اچھی طرح واضح کر دی ہے۔ یہاں تک کہ امریکی اور برطانوی جائزوں سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ عراقی عوام کی بھاری اکثریت چاہتی ہے کہ امریکہ اپنی فوجوں کے انخلا کے ٹائم ٹیبل کا اعلان کرے اور پھر اس کی پابندی کرے۔ امریکہ اور برطانیہ ایسا کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔ رہا تاوان، تو اس کا تو نام تک نہیں لیا جا سکتا؛ یہ نظریے میں قید اس پروپیگنڈا کے نظام کے شعور سے اس قدر باہر کی چیز ہے۔ میرے خیال میں آپ کے سوال کا یہی جواب ہے۔ لیکن میرے خیال سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اصل بات یہ ہے کہ عراقی کیا سوچتے ہیں، اور یہ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے۔ امریکہ اور برطانیہ اگر اپنی فوجیں واپس نہیں بلا رہے ہیں تو اس کی وجوہ وہی ہیں جن کا میں نے ذکر کیا۔ کہ عراق کی آزادی کا مطلب جو کچھ ہوگا وہ ان کے لیے ایک بھیانک خواب سے کم نہیں۔ اور وہ عراق میں جمہوریت کی راہ روکنے کے لیے سب کچھ کر گزریں گے، جیسا کہ ماضی میں کرتے آئے ہیں۔

اور یہ تمام دلائل کہ فوجوں کے انخلا سے عراق خانہ جنگی میں غرق ہو جائے گا، اور فرقہ وارانہ تشدد میں اضافہ ہو گا، اور چونکہ امریکہ وہاں داخل ہو چکا ہے اس لیے اس کی ذمے داری ہے کہ اس کے معاملات کو الجھا ہوا نہ چھوڑ جائے؟

میرا خیال ہے یوروپ پر قبضہ کرنے کے بعد جرمن بھی یہ دلائل دے سکتے تھے، اور روس اپنی

طفیلی ریاستوں کے سلسلے میں، اور جاپانی ایشیا میں۔ یہ سب اسی قسم کی باتیں کر سکتے تھے: اب ہم اندر چلے ہی آئے ہیں تو ہم پر ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ ہولناک چیزوں کو ہونے سے روکیں، وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ جب جرمنوں کو مثلاً فرانس سے باہر نکالا گیا تو ہزاروں، بلکہ دسیوں ہزار افراد کو اس بنا پر ہلاک کیا گیا کہ انھوں نے قابض فوج کا ساتھ دیا تھا، اور ایشیا میں اس سے بھی زیادہ افراد کو۔ لیکن کیا اس دلیل کو قابض فوجوں کے حق میں استعمال کیا جا سکتا ہے؟ نہیں، اس کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ [فوجوں کے انخلا کے بعد] کیا ہوگا، اور یہ فیصلہ کرنا ہمارا کام نہیں۔ یہ فیصلہ کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو ہمارے کیے ہوئے فیصلے کا شکار ہوئے ہیں۔ قابض فوج کو یہ فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ ہم اس موضوع پر ایک عالمانہ سیمینار کر سکتے ہیں اور انخلا کے ممکنہ نتائج پر گفتگو کر سکتے ہیں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ فیصلہ کرنا ہمارا کام نہیں۔

چنانچہ جب تک یہ بات گفتگو میں شامل نہ ہو، اور جنگ کا اصل سوال، یعنی یہ کہ ہمیں کسی بیرونی ملک پر حملے کا کیا حق تھا، گفتگو کا حصہ نہ بنے، اس وقت تک ذرائع ابلاغ اور صحافی اور یہ سب لوگ محض سرکاری پروپیگنڈا کے نظام کا حصہ ہیں، بالکل اس طرح جیسے افغانستان پر روسی حملے کے دوران روسیوں کا اخبار ''پراودا'' تھا۔

اور اس عمل میں امریکی عوام کا کیا کردار رہا ہے؟ مجھے یہ بات واضح طور پر محسوس ہوتی ہے کہ جنگ کے خلاف اٹھنے والے جذبات بہت تیزی سے کسی ایک یا دوسرے سیاسی امیدوار کے حق میں استعمال ہو جاتے ہیں، بجائے اس کے کہ ان جذبات سے کوئی عوامی تحریک شروع ہو جو، اس سے قطع نظر کہ اقتدار پر کون سے سیاسی افراد متمکن ہیں، امریکہ کو اس حملے سے واپس بلانے کا اقدام کرے۔

آپ کی بات بالکل درست ہے۔ لیکن یہی ہمارا مسئلہ ہے۔ میرا مطلب ہے، آپ اقتدار کے مراکز سے، خواہ وہ حکومت میں ہوں یا معاشی نظام میں، یا ذرائع ابلاغ میں — جو سب کے سب ایک دوسرے سے بہت قریبی طور پر منسلک ہیں — یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ ایسی تحریک برپا کرنے میں حصہ لیں جو اقتدار کی مخالف ہو اور اقتدار کا زور توڑنے کی کوشش کرے۔ درحقیقت ان کا کام اس

کے عین برخلاف ہے۔ اس لیے یہ کام کسی عوامی تحریک ہی کو کرنا ہوگا۔ ماضی میں ہر تعمیری تبدیلی اسی طریقے سے آئی ہے۔ ہمیں شہری آزادیاں کس طرح ملیں؟ اور اقلیتوں کے حقوق، عورتوں کے حقوق، اور عوامی بہبود کا جو بھی نظام اس وقت موجود ہے — یہ سب چیزیں ہمیں اوپر والوں سے تحفے کے طور پر نہیں ملیں: انھیں نیچے والوں نے کوشش کر کے حاصل کیا ہے۔ اور موجودہ معاملے میں بھی یہ کام اسی طرح ہوگا۔

عوامی تحریکوں کے ذکر میں، آپ کا امیگریشن کی بابت امریکی پالیسی کے خلاف اس زبردست احتجاج کے بارے میں کیا خیال ہے جس سے انگریزی زبان کے امریکی ذرائع ابلاغ کا اس سے پہلے کبھی سابقہ نہیں پڑا؟ اس سلسلے میں جو احتجاجی مظاہرے ہوے ہیں وہ نہ صرف امیگریشن کے مسئلے پر ہونے والے مظاہروں میں بلکہ اس ملک کی تاریخ کے تمام مظاہروں میں سب سے بڑے ہیں؛ دس لاکھ سے زیادہ افرادنے لاس اینجلز کی سڑکوں پر نکل کر احتجاج کیا، دسیوں ہزار لوگوں نے اٹلانٹا اور ایری زونا میں، اور شکاگو کی تاریخ کا یہ شاید سب سے بڑا احتجاجی مظاہرہ تھا۔ اور پھر ہائی اسکول کے چالیس ہزار طلبا کا واک آؤٹ...

اس احتجاج کا اثر ضرور ہوا۔ سینیٹ کی عدلیہ سے متعلق کمیٹی کے پاس جو مسودۂ قانون بھیجا گیا اس میں کسی حد تک اس احتجاج کی عکاسی ہوتی تھی۔ اقتدار کے مراکز عوامی احتجاج کو نظر انداز نہیں کر سکتے، اور اس سے بھی زیادہ ناقابلِ برداشت شے، ان کے نقطۂ نظر سے، تنظیم کا تسلسل ہے۔ یعنی کبھی کبھار کسی مظاہرے کی حد تک تو ٹھیک ہے، اس کے ساتھ گزارا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ سلسلہ جاری رہے اور بڑھ کر کسی نچلی سطح کی عوامی تنظیم کی صورت اختیار کرنے لگے، ایک کارگر سیاسی نظام وضع کرنے لگے جس میں عوام پالیسیاں وضع کرنے اور ان کی شکل متعین کرنے کے عمل میں سچ مچ شرکت کرنے لگیں اور خود اپنے امیدواروں کو منتخب کرنا شروع کر دیں، اگر معاملہ اس سطح پر پہنچ جائے تب وہ یقیناً مصیبت میں آ جائیں گے۔ اور ابھی ہم اس مقام سے بہت دور ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ہولناک ستم ظریفی ہے۔ ہمیں اس پر شرمندہ ہونا چاہیے، لیکن اگر آپ دنیا کے مغربی حصے میں جمہوری انتخابات کو تلاش کریں تو وہ آپ کو بولیویا جیسے ملکوں میں نظر

Scanned with CamScanner

آئیں گے، نہ کہ امریکہ میں۔ بولیویا میں حقیقی انتخابات ہوے۔ یہ جنوبی امریکہ کا غریب ترین ملک ہے۔ پچھلے دسمبر میں وہاں انتخابات ہوے اور منظم غریب عوام نے، وہاں کے اصل باشندوں نے، خود اپنی صفوں میں سے ایک امیدوار کو منتخب کیا۔ وہاں حقیقی، سنجیدہ مسائل زیرِ بحث آئے، اور لوگوں کو ان مسائل کا علم تھا۔ اور انھوں نے انھی مسائل کی بنیاد پر ووٹ دیا۔ یہ صورت حال ہمارے یہاں سے ڈرامائی طور پر مختلف ہے۔ یہ اصل جمہوریت ہے۔

یہی بات وینزویلا کے بارے میں بھی سچ ہے۔ یہاں، امریکہ میں سرکاری اور ذرائع ابلاغ کا پروپیگنڈا کا نظام وینزویلا کو آمریت اور بہت کچھ کہہ کر اس کی مذمت کرتا ہے۔ آپ ہیوگو چاویز (Hugo Chavez) کے بارے میں کچھ بھی رائے رکھتے ہوں — دراصل اس بات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں — اصل بات یہ ہے کہ وینزویلا کے باشندے اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ اگر جمہوریت پر آپ کا یقین ہو تو اصل سوال یہی ہے۔ اور ہمیں اس کا جواب معلوم ہے۔ چاویز کی صدارت کے برسوں کے دوران منتخب حکومت کی حمایت تیزی سے بڑھی ہے۔ اس وقت اس حمایت کی شرح پورے لاطینی امریکہ کے ملکوں میں سب سے زیادہ ہے۔ چاویز نے صدر منتخب ہونے کے بعد متواتر ریفرنڈم اور انتخابات جیتے ہیں، اور ان کی تعداد کم و بیش چھ ہے، اور یہ ذرائع ابلاغ کی چلائی ہوئی ایسی مخالفانہ مہم کے باوجود ہوا ہے جس کا آپ یہاں تصور بھی نہیں کر سکتے، اور دنیا کی سپر پاور کی سازش کے باوجود۔ امریکہ اس منتخب حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے ایک فوجی بغاوت کی حمایت کر چکا ہے۔ بعد میں اسے پیچھے ہٹنا پڑا تھا، جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ عوامی اقدام سے اس بغاوت کا منھ پھیر دیا گیا، لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پورے لاطینی امریکہ میں احتجاج کی زبردست لہر اٹھی، کیونکہ وہاں لوگ جمہوریت کے بارے میں وہ حقارت آمیز رویہ نہیں رکھتے جو ہماری قیادت اور ہمارے ذرائع ابلاغ رکھتے ہیں، اور وہ لوگ اس خیال کو ناپسند کرتے ہیں کہ کوئی منتخب حکومت فوج کے ہاتھوں برطرف کر دی جائے۔ اس کے بعد سے امریکہ متواتر در پردہ سازشوں میں مصروف ہے۔ ابھی چند ہفتے پہلے میں نے شمالی امریکہ کا ایک جائزہ دیکھا جس میں وینزویلا کے عوام سے پوچھا گیا تھا کہ آئندہ انتخابات میں وہ کس کو ووٹ دیں گے، اور میرے خیال میں دو تہائی لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ چاویز کو ووٹ دیں گے، اور شاید کوئی چار فیصد اس سے اگلے امیدوار کے حق میں تھے۔ ایسے حالات میں

امریکہ کم وبیش یقینی طور پر وہی ہتھکنڈے اختیار کرے گا جو ایسے موقعے پر اختیار کیے جاتے ہیں جب آپ کو یقین ہو کہ آپ انتخابات نہیں جیت سکتے؛ ایسی صورت میں اپوزیشن سے بائیکاٹ کروا کر ان انتخابات کو بے اعتبار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

آپ دنیا میں جمہوریت کے فروغ کی بات کرتے ہیں، ہمیں تو اس کی یہاں، اس ملک میں سب سے زیادہ ضرورت ہے، اور اس سلسلے میں ہم ان ملکوں سے سبق سیکھ سکتے ہیں۔

آپ کو یہ سن کر خوشی ہو گی کہ چند ماہ پہلے جب ہم نے ہیوگو چاویز کا انٹرویو کیا تو اس نے آپ کو اپنا پسندیدہ امریکی مصنف قرار دیا تھا، اور آپ کی کئی کتابوں کے حوالے بھی دیے تھے۔ چنانچہ میرا خیال ہے، ایک جائزہ اس قسم کا بھی مرتب کیا جانا چاہیے کہ تیسری دنیا کے کتنے رہنما نوم چومسکی کو پڑھتے ہیں، کیونکہ آپ واضح طور پر ان میں سے بہت سے رہنماؤں کو متاثر کر رہے ہیں۔

میں خودستائی نہیں کرنا چاہتا، لیکن درحقیقت میں اس قسم کی کئی مثالوں سے واقف ہوں۔

اور کون کون ہیں؟

ان کا نام لینا غیر منصفانہ بات ہوگی۔ انھیں امریکی حکومت کے ساتھ اپنے اپنے مسائل درپیش ہیں۔

آپ جو تصویر پیش کر رہے ہیں اس میں ہائیتی کا مقام کہاں ہے؟

میں اس پوری کہانی کو نہیں دہرانا چاہتا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہائیتی میں بھی جمہوری انتخابات ہوئے تھے، اس قسم کے انتخابات کہ انھیں دیکھ کر ہمیں شرم آنی چاہیے۔ بولیویا کی طرح، ۱۹۹۰ء میں وہاں بھی حقیقی جمہوری انتخابات ہوئے۔ نچلی سطح پر کام کرنے والی بہت بڑی بڑی تنظیمیں، غریب لوگ جن پر کوئی توجہ نہیں دیتا، ان سب نے خود اپنے امیدوار کو منتخب کر کے ہر ایک کو حیران کر دیا۔ ہر شخص نے فرض کر رکھا تھا کہ جو امیدوار مراعات یافتہ طبقے کا اور اقتدار کے مراکز کا نمائندہ ہے، اور جس کو امریکی حمایت بھی حاصل ہے، آسانی سے جیت جائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اسے ۱۴ فیصد ووٹ ملے۔ امریکہ نے فوری اقدام کر کے ان انتخابات کو غیر موثر کرنے کی کوشش کی، فوراً، اور اُسی طریقے سے جسے جمہوریت کو فروغ دینے کے طریقوں میں شامل کیا جاتا ہے، یعنی اپوزیشن کی حمایت کر کے۔

Scanned with CamScanner

یوایس ایڈ وغیرہ نے بھی یہی کیا، یعنی ہر اس شخص کی حمایت کرنا جو حکومت کا مخالف ہو۔

اس کے علاوہ اور بھی اقدامات کیے گئے۔ بہت جلد فوجی بغاوت ہوئی، جس کا نتیجہ برسوں طویل دہشت ناک آمریت کی صورت میں نکلا۔ لوگوں کے خیال کے برعکس، امریکہ نے اس فوجی بغاوت کا ساتھ دیا تھا۔ کلنٹن کے دور صدارت میں امریکہ نے فوجی جنتا اور مالدار مراعات یافتہ طبقے کے ساتھ تجارت جاری رکھی۔ کلنٹن نے ٹیکسا کو آئل کمپنی کو باقاعدہ اجازت نامہ جاری کیا کہ وہ فوجی جنتا اور امرا کو تیل فراہم کر سکتی ہے، جبکہ اس پر پابندی لگانے کا صدارتی حکم موجود تھا۔ آخر کار کلنٹن حکومت نے فیصلہ کیا کہ عوام کو کافی اذیت دی جا چکی ہے، چنانچہ امریکی میرینز کو بھیجا گیا۔ تاہم، جیسا کہ ایلن نائر (Allan Nairn) اور دوسروں نے فوری طور پر نشان دہی کی، آرستید (Aristide) کو اس کے عہدے پر اس شرط پر بحال کیا گیا کہ وہ ان پالیسیوں کی منظوری دے جو ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں ہارنے والے امریکی حمایت یافتہ امیدوار کی پالیسیاں تھیں، یعنی ایسی سخت گیر نیولبرل پالیسیاں جو معیشت کو تباہ کرنے والی تھیں، اور جن سے معیشت واقعی تباہ ہوئی، اور نتیجہ افراتفری، المیے اور مزید امریکی سازش کی صورت میں نکلا۔ آخر کار بش حکومت نے امداد بند کر دی۔ تباہی اور انتشار میں مزید اضافہ ہوا، اور اب ملک ایک لحاظ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ آپ اس کی تفصیل میں جا سکتے ہیں۔

لیکن آخر میں امریکہ اور فرانس نے براہ راست مداخلت کر کے صدر کو ہٹا دیا۔ فرانس خاص طور پر طیش میں تھا کیونکہ آرستید نے بڑی شائستگی سے فرانس کی توجہ اس بات کی طرف دلائی تھی کہ ۱۸۲۵ء میں فرانس سے آزادی حاصل کرنے کی سزا کے طور پر جو بھاری قرض ہائیتی پر لاد دیا گیا تھا وہ اسے چکلے دے رہا ہے۔ وہ اسے اس وقت سے اب تک ادا کرتے چلے آ رہے ہیں، اور ظاہر ہے یہ بات سن کر فرانس کو بے حد غصہ آیا۔ ہائیتی والوں کو ایسی بات کرنے کی جرأت کیونکر ہوئی؟ امریکہ اور فرانس نے مل کر آرستید کو ٹھوکر مار کر باہر نکال دیا۔ اور اس کے بعد سے ہولناک مظالم جاری ہیں۔ اب وہ کسی طرح کی تعمیر نو کے لیے کوشاں ہیں۔ ہائیتی کے سلسلے میں بھی ہمیں، اور فرانس کو، ان مظالم کے لیے بھاری تاوان ادا کرنا چاہیے جو ہم وہاں درحقیقت ایک صدی سے زیادہ عرصے سے کرتے چلے آ رہے ہیں، اس وقت سے جب ہم نے ہائیتی کے باشندوں کو اذیت پہنچانے کا کام فرانس سے اپنے ہاتھوں میں

لیا۔ یہ معاشرہ حقیقی طور پر برباد ہو چکا ہے۔ یہ دنیا کے مفلس ترین ملکوں میں سے ایک ہے۔

اور تازہ ترین یہ کہ آرستید کو دوبارہ منتخب ہونے کے بعد، ۲۹ فروری ۲۰۰۴ء کو، امریکی طیارے پر، جس میں امریکی فوجی موجود تھے، ہائیتی سے زبردستی نکال کر سنٹرل افریکن ریپبلک پہنچایا گیا۔

ہاں، اور یہی نہیں بلکہ امریکہ نے اس کی اس خطے میں واپسی پر پابندی لگادی ہے، اور اصرار کر کے اسے جنوبی افریقہ میں قید کروادیا ہے۔ اس پر کریبیئن ملکوں کی طرف سے سخت احتجاج ہوا۔ اس کی جگہ جو امیدوار منتخب ہوا وہ وہی تھا جسے اس کے بعد سب سے زیادہ ووٹ ملے تھے؛ اگر وہ خود انتخابات میں حصہ لیتا تو غالباً جیت جاتا، لیکن امریکہ ایسا ہرگز نہیں ہونے دے گا، اور جیسا کہ میں نے کہا، اسے اس خطے میں لوٹنے تک نہیں دے گا۔

یہ جمہوریت سے قریب قریب جذباتی قسم کی نفرت کی ایک اور مثال ہے، جو متواتر موجود رہی ہے، اور جسے تسلیم بھی کیا جا چکا ہے۔ اسے اسکالروں نے، انتہائی محترم اسکالروں نے بھی تسلیم کیا ہے، جو جمہوریت کے فروغ کے وکیل ہیں۔ ان لوگوں نے — کارنیگی اینڈ اومنٹ پروجیکٹ کا سربراہ ٹامس کیروتھرز (Thomas Carothers) ان میں سب سے زیادہ ممتاز تھا — کہا کہ جمہوریت بلاشبہ ایک بڑی عمدہ شے ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ امریکہ بڑی استقامت کے ساتھ اس کی مخالفت کرتا رہا ہے۔ اس کے الفاظ میں، اس بارے میں امریکی حکومتوں کے درمیان ایک مضبوط تسلسل قائم رہا ہے کہ جمہوریت کو صرف اور صرف اسی صورت میں فروغ دیا جائے جب اس سے امریکہ کے اسٹریٹیجک اور معاشی اہداف پورے ہوتے ہوں۔ مثلاً وسطی امریکہ میں، جہاں کیروتھرز خاص طور پر سرگرم رہا تھا، کیونکہ وہ ریگن کے دور میں اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ سے وابستہ تھا، اس کا کہنا ہے کہ امریکہ نے جمہوریت کی مخالفت کی اور اس کے کہنے کے مطابق اس کی وجہ یہ تھی کہ امریکہ صرف اوپر سے نافذ کیے جانے والے جمہوری ڈھانچوں کی حمایت کرتا ہے، جن میں روایتی مراعات یافتہ طبقہ، جو امریکہ کے ساتھ منسلک ہے، نہایت غیر جمہوری معاشروں میں برسراقتدار رہے۔ ہاں، ہم اسی قسم کی جمہوریت کو فروغ دیتے آئے ہیں، امریکی حکومت اسی قسم کی جمہوریت کا پرچار کرتی ہے، اور پریس اور صحافی اسی قسم کی جمہوریت کی ستائش کرتے ہیں۔ یہ بھی بالکل شمالی کوریا سے ملتی جلتی بات ہے۔

Scanned with CamScanner

اب ایک اور خطے کی طرف، اسرائیل کی طرف، جہاں کدیمہ پارٹی نے انتخابات جیتے ہیں، جسے ذرائع ابلاغ ایسی معتدل پارٹی کے طور پر پیش کر رہے ہیں جو دریائے اردن کے مغربی کنارے پر واقع بہت سی یہودی بستیوں کو سچ مچ ختم کر دے گی، اور اُدھر فلسطین کے مقبوضہ علاقوں میں حماس کی منتخب ہونا۔ آپ ان حالات پر کیا تبصرہ کریں گے؟

جو شخص اس پر غور کرنا چاہے اسے میں دعوت دوں گا کہ کل کے ''نیویارک ٹائمز'' کا پہلا اداریہ پڑھے اور کل ہی کے، دنیا کے سب سے نمایاں تجارتی جریدے ''لندن فنانشیل ٹائمز'' کے پہلے اداریے سے اس کا موازنہ کر لے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے بالکل متضاد ہیں۔ ''نیویارک ٹائمز'' کے اداریے میں کہا گیا ہے کہ یہ بڑی عمدہ بات ہے کہ اسرائیلی مغربی کنارے سے انخلا پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ یہ درست ہے کہ سرحدوں کا تھوڑا بہت معاملہ ابھی متنازعہ ہے، لیکن اس اخبار کا کہنا ہے کہ یہ کوئی ایسی اہم بات نہیں۔ ظاہر ہے، اس سے کوئی ایسا فرق نہیں پڑتا کہ سرحدیں کہاں واقع ہیں! درست ہے، بس ان لوگوں کو فرق پڑتا ہے جو وہاں آباد ہیں۔ یہ ہے ''نیویارک ٹائمز''۔ اس اخبار نے ان یہودی آبادکاروں کے کرب کا ذکر کیا ہے جنھیں اپنے گھر چھوڑنے ہوں گے۔ یہ تبصرہ کچھ اسی قسم کا ہے جیسے میں آپ کے گھر میں گھس کر پورے گھر پر قبضہ کرلوں، اور آپ کو سخت تکلیفیں پہنچانے اور آپ کا سب کچھ چھین لینے کے بعد، آخرکار اس بات پر آمادہ ہو جاؤں کہ برساتی اور تہہ خانہ آپ کے حوالے کر دیا جائے اور باقی پورا مکان میرے قبضے میں رہے۔ اور یہ کرتے ہوئے بھی مجھے نہایت کرب محسوس ہو، کیونکہ میں برساتی سے نکلنا نہیں چاہتا، کیونکہ وہ جگہ مجھے پسند آ گئی ہے۔ ''نیویارک ٹائمز'' میں کی جانے والی رپورٹنگ اسی انداز کی ہے۔ یہ ناقابلِ برداشت بات ہے۔

❋❋

# دنیا پر کارپوریشنوں کی حکمرانی

## ڈیوڈ سی کورٹن

ترجمہ: حمید زماں، محسن جعفری، زینت حسام

تدوین: اجمل کمال

Rs. 400

سٹی پریس بک شاپ

سے دستیاب ہے

Scanned with CamScanner

۳۵

قیمت

۱۳۰ روپے